انیسویں صدی میں

اردو کے تصنیفی ادارے

سمیع اللہ

انیسویں صدی میں

اردو کے تصنیفی ادارے

ڈاکٹر سمیع اللہ

شعبۂ اردو

رانا پرتاپ پوسٹ گریجویٹ کالج

سلطان پور

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

تمام حقوق بہ حق مصنف محفوظ ہیں

134705

پہلی اشاعت ـــــــــــ اکتوبر ۱۹۸۸ء

تعداد ـــــــــــ چھ سو

کتابت ـــــــــــ ایم عادل ٹانڈوی

طباعت ـــــــــــ نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ فیض آباد

پبلشر ـــــــــــ ڈاکٹر سمیع اللہ

قیمت ـــــــــــ 48 روپئے

ملنے کے پتے :-

۱۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی ۶
۲۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ شمشاد مارکیٹ علیگڈھ
۳۔ دانش محل۔ امین آباد لکھنؤ
۴۔ نصرت پبلیکیشنز امین آباد پارک لکھنؤ

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

انتساب

استاذ گرامی

ڈاکٹر سیّد حنیف احمد نقوی صاحب

کے نام

سمیع اللہ

اس مقالے پر مصنف کو بنارس ہندو یونیورسٹی نے
۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو) کی ڈگری تفویض کی۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

یہ کتاب
فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اترپردیش
لکھنؤ کے مالی تعاون سے
شائع ہوئی۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

سپاس گذاری

کسی تحقیقی مقالے کی ترتیب کوئی آسان کام نہیں۔ یہ کام جوئے شیر لانے کے مرادف نہ سہی لیکن ہفت خوان رستم کا ہم پلہ ضرور ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ یکسوئی، جگر کاوی اور ان تھک محنت کا متقاضی ہوتا ہے۔ اگر مقالہ تاریخی ہو تو بعض اوقات دانتوں پسینہ آنے لگتا ہے اور اگر اس کام سے کسی کا پہلا پہلا سابقہ ہو تو کبھی کبھی کلیجہ منھ کو آنے لگتا ہے، اور کبھی ایسے مراحل بھی پیش آتے ہیں، کہ فرار کی راہ ڈھونڈنا پڑتی ہے۔ اس کا اندازہ وہ لوگ لگا سکتے ہیں جنھیں اس کا سابقہ اور تجربہ ہو۔

اس میں شبہہ نہیں کہ مجھے ان سارے حالات سے دوچار ہونا پڑا، لیکن خدا کی رحمت اور میرے کرم فرماؤں کی اعانت شامل حال رہی ہے جس کی وجہ سے یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچ سکا۔ چنانچہ اس موقع پر میرا یہ اولین اور خوش گوار فریضہ ہے کہ میں ان سارے کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کروں جنھوں نے اپنے کمال خلوص سے اس کی ترتیب میں میری اعانت کی ہے۔ سب سے پہلے میں خدا کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے اس مقالے کی ترتیب کے دوران مجھے صحت مند رکھا۔

یہ مقالہ جو آپ کے پیش نظر ہے استاذ گرامی ڈاکٹر سید حنیف نقوی صاحب ریڈر شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے زیر نگرانی تیار کیا گیا ہے۔ ان کی شفقتوں کو رسمی الفاظ کے ذریعہ بیان نہیں کیا جا سکتا اور نہ شکریے کا کوئی لفظ میرے جذبات کی ترجمانی کر سکتا ہے۔ انھوں نے جس فاضلانہ انداز سے قدم بہ قدم میری رہنمائی کی، موضوع سے متعلق نہایت مفید کار آمد کمیاب اور نادر مطبوعات و مضامین کی فراہمی میں مدد دی اور پھر مقالے کو ناقدانہ نظر سے دیکھا اور تصحیح فرمائی در اصل یہ انھی کا حصہ ہے۔ اگر موصوف کی رہنمائی شامل نہ ہوتی تو یہ کام

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

اس حسن وخوبی کے ساتھ انجام نہیں پا سکتا تھا۔

استاذی المحترم ڈاکٹر حکم چند نیر پروفیسر وصدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کا بھی میں صمیم قلب سے ممنون ہوں، جن کی بے پناہ محبت وخلوص، فیضان وہمت افزائی نے مجھے اس کام پر مستعد اور کمربستہ رکھا۔ موصوف نے اپنی مشغولیتوں اور ذمہ داریوں کے باوجود وقتاً فوقتاً اس مقالے کو دیکھا اور گراں قدر مشوروں سے نوازا۔

ڈاکٹر قمر جہاں صاحبہ استاذ شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی نے نہ صرف میرے موضوع سے متعلق کتابوں کی فراہمی میں میری مدد کی بلکہ اس کے ایک حصے کو دیکھا اور تصحیح فرمائی اس لیے میں تہہ دل سے ان کا احسان مند ہوں۔

ماسٹر اکرام الدین احمد مرحوم ومغفور اور ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کا بھی بے حد شکر گزار ہوں، جنھوں نے بعض دشواریوں میں میری حتی المقدور مدد کی ہے۔

اس مقالے کی ترتیب وتکمیل کے سلسلے میں مجھے لکھنو، الہ آباد اور اعظم گڈھ کا سفر کرنا پڑا۔ الہ آباد میں بیگم ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے سابق صدر شعبۂ ہندی الہ آباد یونیورسٹی اور اعظم گڈھ میں جناب ضیاء الدین صاحب رفیق دار المصنفین نے میری جو مدد کی ہے اسے میں حین حیات فراموش نہیں کر سکتا، میں ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اس موقع پر مجھے محترمی آغا جمیل صاحب کاشمیری برادر زادہ آغا حشر کاشمیری اور اپنے دوست سید مہدی حیدر صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیے، جنھوں نے میرے لیے اپنی ذاتی لائبریری کا دروازہ ہمیشہ وا رکھا۔

پرورش وپرداخت اور تعلیم وتربیت میں گھر کا ماحول، والدین کی شفقت اور بھائیوں کا سلوک اور پھر ان کے نقطہ نظر کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ خاص طور سے میرے بڑے بھائی جناب صدیق اللہ صاحب نے اوائل عمری ہی سے میری تعلیم وتربیت کا بڑا خیال رکھا۔ بلا مبالغہ اگر مجھے ان جیسا شفیق بھائی نہ ملا ہوتا تو شاید میں اپنے خوابوں کو حقیقت کا جامہ نہیں پہنا سکتا تھا۔ ان کی شفقتوں کو میں صرف رسمی الفاظ تشکر کے ذریعے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

سمیع اللہ ۷ ستمبر ۱۹۸۸ء

پیش آہنگ

انیسویں صدی اردو نثر کا عہد زریں کہی جاتی ہے۔ اس صدی سے قبل اُردو نظم ارتقائی منازل طے کر چکی تھی اور اس کا معیار بھی متعین ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے مقابلے میں نثر جمود کے عالم میں پڑی تھی اور کبھی اس کی ترویج و ترقی کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ چنانچہ ترقی کے میدان میں یہ نظم سے کوسوں دور تھی۔ انیسویں صدی سے قبل اردو نثر کی جتنی کتابیں تصنیف کی گئیں وہ عموماً مذہبی نوعیت کی تھیں۔ ان کے مصنفین اپنی تصانیف کے چار چھ نسخے کتابت کرا کے اپنے اعزہ و اقربا اور کتب خانوں کی نذر کر دیا کرتے تھے۔ نثر نویسی کا یہ کام انفرادی طور پر سرانجام پا رہا تھا۔

دراصل اردو نثر کی ترویج و ترقی کا سہرا ان تصنیفی اداروں کے سر ہے جو انیسویں صدی میں معرض وجود میں آئے۔ ان اداروں نے اردو نثر کے فروغ و اشاعت میں مہتمم کا کام کیا۔ یہ ادارے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ بالفاظ دیگر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان و ادب کی کوئی تاریخ ان اداروں کے تذکرے کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ بعض کتابوں میں انیسویں صدی کے بعض اداروں کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ابھی تک کسی کتاب میں ان کے حالات و خدمات کا کما حقہ جائزہ نہیں لیا گیا۔ اسی کمی کا احساس کرتے ہوئے استاذ گرامی ڈاکٹر سید حنیف نقوی صاحب نے میری تحقیق کے لیے "اردو کے تصنیفی ادارے" کا موضوع تجویز کیا جس میں ان تمام اداروں کا مطالعہ شامل تھا جو ۱۸۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک معرض وجود میں آئے۔ کام کے آغاز کے بعد جب میں نے بعض اداروں سے متعلق فراہم شدہ مواد کا جائزہ لیا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ مذکورہ عہد کے تمام تصنیفی اداروں کے تفصیلی مطالعے کے لیے ایک مقالے کے محدود صفحات ناکافی ہیں

ذرا شنا مجھے اس موضوع پر جموں یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر جناب دیوا بندر کمار گپتا کے پیش کردہ مقالے کے مطالعے کا موقع ملا۔ اس میں شبہ نہیں کہ گپتا صاحب نے ہندو پاک کا دورہ کر کے ۱۸۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کے تصنیفی و تالیفی اداروں کے حالات اور ان کی تصانیف کی فہرست فراہم کی ہے۔ لیکن مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ انھوں نے تحقیق سے بہت کم سروکار رکھا ہے۔ مثلاً فورٹ ولیم کالج کے ضمن میں انھوں نے گل کرسٹ کو اس کالج کا پرنسپل لکھا ہے[1]، جبکہ جدید انکشاف سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں پرنسپل کا کوئی عہدہ ہی نہیں تھا۔ پرنسپل کی جگہ پر پرووسٹ ہوا کرتے تھے، لیکن اس عہدے پر بھی گل کرسٹ کبھی متمکن نہیں رہا۔ اس کے علاوہ کالج کے حالات اور اس کی تصانیف کی فہرست بھی نامکمل ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ گپتا صاحب کے مقالے میں انیسویں صدی کے بعض اہم اداروں کے نام بھی ذکر ہونے سے رہ گیے ہیں۔

اب مجھے اس کا احساس ہوا کہ ۱۸۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کے تصنیفی اداروں کے حالات، ان کی تصانیف کی فہرست، ان سے وابستہ مصنفین کے حالات و کوائف نیز ان کے تنقیدی تجزیے کے مباحث کو کسی طرح بھی ایک مقالے میں سمیٹنا ممکن نہیں۔ چنانچہ اپنے نگرانِ کار ڈاکٹر حنیف نقوی صاحب کے مشورے سے میں نے ریسرچ کمیٹی میں اپنے مقالے کے زمانے کو محدود کرنے کی درخواست کی۔ کمیٹی نے مجھے اپنے دائرہ کار کو انیسویں صدی کے اداروں تک محدود کرنے کی اجازت دے دی، جس کا میں ممنون ہوں۔

اس مقالے کی تصنیف کا مقصد انیسویں صدی کے تصنیفی و اشاعتی اداروں کے حالات، خدمات اور ان کے مصنفین کے حالات اور ان کے کارناموں کا جائزہ لینا ہے۔ اس کا پہلا باب فورٹ ولیم کالج پر مشتمل ہے۔ یہ کالج برصغیر ہند و پاک کا وہ عظیم و وقیع ادارہ تھا جہاں سب سے پہلے باقاعدہ اور منظم طور پر اردو میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا گیا۔

---

[1] اردو کے تصنیفی و تالیفی ادارے (غیر مطبوعہ) ص ۵۰

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

باب کے شروع میں اس کالج کے قیام کا پس منظر پیش کرتے ہوئے اس کے قیام کے اغراض ومقاصد پر بحث کی گئی ہے۔ بعد ازاں زمانۂ قیام کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ اس کے بعد "ما لہ وما علیہ" کے عنوان سے کالج کی خدمات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے بعد کالج کی تصانیف کی فہرست درج کی گئی ہے اور آخر میں اس کے مصنفین کے مختصر لیکن جامع حالات اور ان کے کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کو مصنفین کے حالات میں طوالت کا احساس ہو کیونکہ اردو ادب کے تقریباً سبھی مورخوں نے فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ خاص طور پر مولوی سید محمد اور ڈاکٹر جاوید نہال نے بالترتیب "ارباب نثر اردو" اور "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" کے عنوان سے اس کے مصنفین کے مفصل حالات لکھے ہیں۔ میرے خیال سے مصنفین کے ذکر کے بغیر کالج کا ذکر تشنہ رہ جاتا۔ مقالہ کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ میں نے ماقبل کے مورخین کی تحقیق کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے اور بعض مصنفین کے حالات زندگی کے بعض ایسے گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے جن پر اب تک تاریکی کے پردے پڑے ہوئے تھے۔

دوسرے باب میں دلی کالج کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ہندوستان کی پہلی درسگاہ تھی جس میں مشرقی علوم والسنہ کے پہلو بہ پہلو سائنس اور جدید علوم وفنون کی تعلیم کا [illegible] انتظام کیا گیا تھا۔ اس باب کے شروع میں کالج کے قیام کے محرکات اور اغراض ومقاصد بیان کیے گئے ہیں، اس کے بعد قیام کے زمانے کی مختصر تاریخ [illegible] ہے۔ بعد ازاں [illegible] خدمات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے بعد [illegible] میں تصنیف [illegible] پیش کی گئی ہے۔ اس ضمن میں ان کتابوں کی بھی فہرست درج کی گئی ہے جو [illegible] کے پیش نظر کالج کی جانب سے شائع کی گئی تھیں اور آخر میں اس کالج [illegible] مصنفین کے حالات اور ان کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سائنٹفک سوسائٹی کے حالات تیسرے باب کے تحت بیان کیے گئے ہیں۔ [illegible] ہندوستان کا پہلا ادارہ تھا جس کا قیام ہندوستانیوں کی [illegible] کا [illegible] منت ہے۔ [illegible] کا قیام [illegible] ہندوستان کی جنگ آزادی کے [illegible] عمل میں آیا تھا اس لیے پس منظر کے طور [illegible]

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کے بعد کے بدلے ہوئے حالات اور ان سے پیدا ہونے والے اثرات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔
اس باب کی ترتیب بھی متذکرہ بالا ابواب کی ترتیب کے مطابق رکھی گئی ہے۔ مثلاً پہلے قیام کے محرکات اور اغراض و مقاصد کا ذکر ہے۔ بعد ازاں زمانۂ قیام کی مختصر تاریخ پیش کی گئی ہے، اس کے بعد اس کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور پھر سوسائٹی کی ترجمہ شدہ کتابوں کی فہرست اور آخر میں اس کے بانی سرسید احمد خان اور سوسائٹی سے متعلق ان کے رفقا کے حالات اور ان کی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں انیسویں صدی کے ان تمام باقی ماندہ اداروں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو علم و ادب کی ضیا پاشیوں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی سرانجام دیتے رہے ہیں۔ چونکہ ان سارے اداروں کا ذکر ایک ہی باب میں سمیٹا گیا ہے اس لیے ان پر تفصیلی بحث نہیں آسکی ہے۔ تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان کی تاریخ اور خدمات کا کوئی گوشہ نظر انداز نہ ہونے پائے۔ مثلاً قیام کے مقاصد، مختصر تاریخ اور ان کی تصنیفی سرگرمیوں کی نشاندہی وغیرہ۔

پانچویں باب میں پورے مطالعے کا ماحصل نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو نثر کی ترویج و ترقی ان اداروں کے بغیر محض دو تہائی صدی میں ممکن نہ تھی۔

ضمیمے کے تحت شروع کے تین اداروں سے متعلق وہ معلومات فراہم کی گئی ہیں، جو مضمون کی طوالت کے خوف کی وجہ سے درج نہیں کی جاسکیں۔ "ماخذ و مصادر" کے ضمن میں ان کتابوں اور اخبارات و جرائد کی فہرست (Bibliography) پیش کی گئی ہے، جن کی مدد سے یہ مقالہ ترتیب دیا گیا ہے۔

سمیع اللہ

۱۱۔ جولائی ۱۹۸۱ء

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ترتیب

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

پہلا باب

فورٹ ولیم کالج

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

فورٹ ولیم کالج

قیام کے محرکات اور اغراض و مقاصد

انگلینڈ کے چند سوداگروں نے باہمی شرکت سے تیس لاکھ روپیے کا سرمایہ جمع کیا اور ہندوستان میں تجارت کرنے کی غرض سے ۱۵۹۹ء میں ایک کمپنی قائم کی جس کے لئے انھوں نے اسی سال ملکہ ایلزبتھ سے چارٹر حاصل کیا اور اس بات کی بھی سند حاصل کی کہ پندرہ برس تک بغیر ان کی اجازت کے انگلینڈ کا کوئی شخص بلاد شرقی میں تجارت نہ کرنے پائے۔ ۱۶۱۵ء میں شاہ برطانیہ جیمس اول کا سفیر سر ٹامس رو شاہجہاں کے دربار میں آیا اور اپنی عیاری و چرب زبانی سے سورت میں کوٹھی قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی جس کے لئے انگریز تاجروں نے تین روپیے آٹھ آنے فی صد محصول دینا منظور کر لیا[1]۔ اس طرح سے وہ اپنی ہوشیاری اور حکمت عملی سے سورت کو اپنی تجارت کا صدر مقام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ۱۶۳۲ء میں ایک اور کارخانہ موسلی پٹم میں قائم کیا گیا، اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد ایک قلعہ "سینٹ جارج" کے نام سے مدراس میں تعمیر کیا گیا۔ چارلس دوم کی تاج پوشی کے بعد اس کی شادی پرتگال کی شہزادی سے ہو گئی اور شہر بمبئی اس کو جہیز میں ملا۔ ۱۶۶۸ء میں شاہ چارلس نے سو روپیے سالانہ خراج پر بمبئی کے انتظام کی ذمہ داری کمپنی کے سپرد کر دی[2]۔ اس طرح سے جنوبی ہند کے تین اہم مقام سورت، مدراس اور بمبئی پر کمپنی کا قبضہ ہو گیا۔ چونکہ بنگال ہندوستان کا سب سے زرخیز علاقہ تھا اس لئے انگریز

---

[1] شیو پرشاد راجہ ستارۂ ہند، آئینہ تاریخ نما ترجمہ اتہاس تمر ناشک ص ۵

[2] ایضاً ص ۵

کی نظریں اس پر بھی پڑیں، اور وہ وہاں بھی تجارتی کوٹھیاں تعمیر کرنے میں کامیاب ہوگئے۔
ہندوستان میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی نبرد آزمائی میں انگریزوں کو کامرانی و کامیابی حاصل ہوئی تو ان کے حوصلے اور بڑھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ بنگال پر کسی طرح سے ان کا تسلّط و اقتدار قائم ہو جائے۔ پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷ء) میں نواب سراج الدولہ کی شکست فاش سے انگریزوں کی یہ مراد بھی بر آئی۔

اورنگ زیب کی موت کے بعد مغلیہ سلطنت کی شان و شوکت اور صولت و دولت روز افزوں زوال پذیر تھی۔ ملک میں ہر طرف انارکی اور طوائف الملوکی چھائی ہوئی تھی۔ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" جس کو جہاں موقع ملتا وہ وہاں کا بادشاہ بن جاتا اور اپنے حریفوں کو قتل کر ڈالتا۔ پروفیسر حکم چند نیر نے اس عہد کے ہندوستان کا مختصر لیکن جامع نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"... اورنگ زیب کی وفات (1707ء) اور بہادر شاہ ظفر کی معزولی (۱۸۵۷ء) کے درمیان کا زمانہ مغلیہ سلطنت کا نہایت پر آشوب زمانہ تھا۔ اس ڈیڑھ صدی میں مغل شہنشاہوں کی حالت چند در چند وجوہ سے حکومت کی بساط پر شطرنج کے بادشاہ سے زیادہ کی نہ تھی جس کی نقل و حرکت وزیر کے تابع ہوتی ہے۔ سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ اس زمانے میں کیسی کیسی تبدیلیاں نہیں ہوئیں کیا کیا انقلاب نہیں آئے۔ بہادر شاہ اول کی تجہیز و تکفین کا اہتمام ایک ماہ تک نہ ہو سکا۔ جہاں دار شاہ کی عیاشیوں نے لال کنور نام کی طوائف کو درباری اعزاز عطا کیا۔ فرخ سیر کی آنکھوں میں لوگوں نے سلائیاں پھرتی دیکھیں۔ محمد شاہ رنگیلا تو رنگیلا ہی تھا۔ نادر شاہ کے قتل عام اور لوٹ مار نے سلطنت کی زندگی پر کاری ضرب لگائی اور شاہان ہند کو اب تخت طاؤس کی بجائے تختے پر چڑھنا پڑا۔ احمد شاہ کو عماد الملک کے اشارے پر اندھا کر کے قتل کر دیا گیا۔ شاہ عالم کی آنکھیں غلام قادر روہیلہ نے نکال لیں۔ ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک کے درمیان احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر نو حملے کیے۔ طاقت ور امرا نے اپنی خود مختاری

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

اور بادشاہیت کا اعلان کر دیا تھا۔ روہیلوں، مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں نے
دلی کی رہی سہی آبرو بھی لوٹ لی۔ مرکزی سلطنت کا اندازہ "سلطنت شاہ
عالم از دلی تا پالم" کی مشہور کہاوت سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ دکن اودھ اور بنگال
کے صوبے دار بادشاہ بن چکے تھے۔ پنجاب پر سکھوں کی حکومت تھی۔ باقی ملک
مرہٹوں اور کمپنی بہادر کے زیر نگیں تھا۔"[۱]

۱۷۸۵ء تک کمپنی کو ملک فتح کرنے کی کوئی خواہش نہ تھی[۲] کمپنی کے ڈائرکٹر گورنر جنرلوں
کو بارہا متنبہ کرتے کہ وہ ہندوستان کے اندرونی معاملات میں مخل نہ ہوں، لیکن ملک کے بگڑے
ہوئے حالات اور ان کی حریص نگاہیں دخل اندازی کے لیے انھیں مجبور کرتی تھیں۔ آخر کار ۱۷۸۶ء
میں ایک قانون پاس ہوا جس میں گورنر جنرل کو سپہ سالار اعظم تسلیم کر لیا گیا[۳] علاوہ بریں کونسل
کی کثرت رائے کو رد کرنے کا اختیار بھی گورنر جنرل کو دے دیا گیا اس قانون سے ایسٹ انڈیا کمپنی
صرف ایک تجارتی کمپنی ہی نہیں رہی بلکہ ہندوستان میں ایک سیاسی قوت بن گئی۔ اب اسے
ہندوستان کے سیاسی معاملات میں ایں وآں کرنے کا قانونی اختیار بھی حاصل ہو گیا۔

بکسر کی جنگ (۱۷۶۴ء) میں اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور دلی کے بادشاہ شاہ عالم
نے بنگال کے نواب میر قاسم کو نہ صرف عسکری کمک پہنچائی تھی بلکہ کھل کر اس کا ساتھ بھی
دیا تھا۔ اس لیے اس شکست کے بعد انگریزوں نے شاہ عالم اور شجاع الدولہ کی گوشمالی کی۔
"بن کے گیدڑ جاتے کدھر" دونوں نے طوعاً وکرہاً اور چار و ناچار انگریزوں کی شرطیں قبول کر لیں
اور ان کے کیمپ میں داخل ہو گئے، جس سے ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی بنیاد اور
مستحکم ہو گئی۔ انگریزوں کی حکمت عملی اور جارحانہ رویے سے اب ان کی سلطنت کا حلقۂ اثر
بنگال سے بڑھ کر دلی تک پہنچ گیا تھا۔ پھر جنوبی ہند میں ٹیپو سلطان کی شکست و شہادت

---

[۱] سرور جہان آبادی حیات اور شاعری ص ۱۰

[۲] ڈاکٹر ایشوری پرشاد، اے نیو ہسٹری آف انڈیا ریوائزڈ ایڈیشن (اردو) ص ۲۱۱

[۳] ایضاً ص ۲۱۲

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

اور میسور پر آمرانہ و بہیمانہ قبضہ اور دوسری فتوحات نے حالات اور بدل دیے۔ یہاں کے رجواڑوں کے باہمی تصادم، نوابوں اور بادشاہوں کے آپسی تنازعوں اور ملک کی سیاسی تاریخ کے غائر مطالعہ نے انگریزوں کو یقین دلا دیا کہ ہندوستان میں ان کی سیاسی قوت نہ صرف روز افزوں ترقی پذیر ہے بلکہ وہ دن دور نہیں جب یہاں صرف ہمیں ہم ہوں گے اور عنان حکومت ہمارے ہی ہاتھ میں ہوگی۔ کسی اجنبی ملک میں اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے وہاں کی زبان سے کماحقہ واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ پھر کمپنی کے سول ملازمین ایک تجارتی ادارے کے ایجنٹ ہی نہیں رہ گئے تھے جیسا کہ گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے ۱۸ اگست ۱۸۰۰ء کی یاد داشت میں کہا تھا۔ "کمپنی کے انگریز سول سرونٹس کو محض ایک تجارتی ادارے کا ایجنٹ نہیں سمجھا جا سکتا، وہ اب دراصل ایک طاقت ور شہنشاہ کے وزیر اور افسر ہیں"[1]۔ چناں چہ ولزلی نے یہ محسوس کیا کہ اگر یہ ملازمین دیسی زبانوں سے واقف ہوں تو انھیں یہاں کے انتظام میں مزید سہولتیں بہم پہنچ سکتی ہیں۔ جہاں تک مشرقی زبانوں کا تعلق تھا کمپنی فارسی کا استعمال کرتی تھی۔ اچھی یا کام چلاؤ فارسی جاننے والوں کو کمپنی کے اعلا افسر سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے لیکن بنگال پر قبضہ کے بعد انھیں ملکی زبان سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے مالی اور فوجی شعبوں میں پریشانیاں اٹھانی پڑتی تھیں۔ دیسی سپاہی اپنے صوبے کی زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں سمجھ پاتے تھے۔ ایسی حالت میں ملک کی مروجہ زبان کی تعلیم کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ شروع میں کمپنی کے گنے چنے ملازم دیسی زبانوں کی طرف مائل ہوئے لیکن ۱۵ جنوری ۱۷۸۴ء کو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے قیام کے ساتھ یہ رجحان تیزی سے ترقی کرنے لگا۔ خود وارن ہیسٹنگز نے فارسی کے علاوہ ہندوستانی زبان کی تعلیم بڑی حد تک حاصل کرلی تھی۔ کمپنی کے مشہور ملازمین ولفورڈ، شور، کرک پیٹرک، گلیڈون، گلسٹن، ڈاکٹر ہیرس وغیرہ نے ملک کی عوامی زبان سے بقدر استطاعت و ضرورت واقفیت حاصل کرلی تھی۔ لیکن باقاعدہ اور منظم طور پر کمپنی نے ابھی تک دیسی زبانوں کی تعلیم کی کوشش نہیں کی تھی۔ جب اس کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی تو اس غرض سے ایک مستقل تعلیمی

---

[1] بحوالہ مقدمہ گنج خوبی از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ص III اور Gilchrist and the Language of Hindoostan P.15

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ادارہ فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ ولزلی کے نزدیک کمپنی کے ملازموں کے لیے دیسی زبانوں کی تعلیم کی زیادہ اہمیت اس لیے بھی تھی کہ وہ ملازمین کم سنی میں ہندوستان آتے تھے جن کو کوئی سیاسی شعور اور تجربہ نہیں ہوتا تھا۔ بقول خواجہ احمد فاروقی

"... یہ ملازم عام طور پر ۱۵، اور ۱۶ برس کی عمر میں ہندوستان بھیج دیے جاتے تھے اور اکثر و بیشتر بد شوق یا بد اطوار طلبہ میں شمار ہوتے تھے۔ جن کی کھپت گھر میں نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے لارڈ ولزلی نے یہ تجویز پیش کی کہ انگلستان سے آنے والے کمپنی کے یہ ملازمین ہندوستان پہنچنے کے بعد کم سے کم تین برس ایک ایسے ادارے میں تعلیم حاصل کریں جو انھیں ہندوستانی زبانوں سے، یہاں کی تاریخ و تہذیب اور یہاں کے قوانین سے آشنا کر سکے۔ ساتھ ہی مغربی دستور کے مطابق وہ تعلیم بھی دی جائے جس سے وہ اس لیے بھی محروم ہو جاتے ہیں کہ انھیں کم سنی میں انگلستان کو خیر باد کہہ کر ایک اجنبی دیس میں آنا پڑتا ہے۔"[1]

رام بابو سکسینہ نے فورٹ ولیم کالج کے قیام کے دو مقاصد بیان کیے ہیں۔ اولاً سیاسی ثانیاً اخلاقی وہ لکھتے ہیں۔

"انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے تجارتی تعلقات کے سلسلے میں بڑے بڑے قطعات ملک حاصل کر لیے تھے جن کے عمدہ انتظام کے واسطے ضروری تھا کہ ان کے اعلیٰ عمال اس ملک کی زبان سے جس کا انتظام عاملانہ خواہ تاجرانہ ان کے سپرد تھا اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ تجارتی تعلقات یوماً فیوماً کم ہوتے جاتے تھے مگر انتظامی معاملات بڑھتے جاتے تھے مترجم جن کے ذریعے سے اہل ملک کی زبان اور خیالات کو یورپی عمال پا جاتے ہو سکتے تھے اب بے کار ہو گئے تھے۔ کیونکہ یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ کوئی قوم تا وقتیکہ مفتوح قوم کی زبان اور رسم و رواج اور روایات تاریخی و مذہبی سے کماحقہ

[1] مقدمہ گنج خوبی ص III - IV

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

بلا واسطہ واقف نہ ہوگی اس پر پورے طور پر حکومت نہیں کر سکتی۔ اور ان
سب باتوں کے لئے ضروری تھا کہ حاکم اپنے محکوموں کی زبان سیکھیں۔ لہٰذا۔
...یہ تاکیدی حکم دے دیا گیا کہ آئندہ سے ان کے حکام مقامی اپنے عمال کے
واسطے دیسی زبانوں کے (کذا) کماحقہ واقفیت کو ضروری قرار دیں۔[1]

اخلاقی مقصد کے متعلق ان کا بیان ہے کہ

"چونکہ بڑے بڑے قطعات ملک انگریزی عمل داری میں داخل
ہوتے جاتے تھے۔ لہٰذا پارلیمنٹ انگلستان کو اب یہ محسوس ہونے لگا کہ رعایا
کی فلاح و بہبود اور تعلیم و ترقی کی ذمہ داری بھی ہمیں پر عائد ہوتی ہے چنانچہ
اب اس کی کوشش ہونے لگی کہ جو رکاوٹ خانہ جنگیوں اور ملکی لڑائیوں سے
کی وجہ سے لوگوں کے (کذا) تعلیم میں پڑ گئی تھی جس کی وجہ سے تعلیم کو بہت سخت
صدمہ پہنچ رہا تھا اب دور ہو جائے۔"[2]

رام بابو سکسینہ کا یہ بیان خلاف واقعہ ہے کہ پارلیمنٹ انگلستان کو اب یہ محسوس
ہونے لگا کہ رعایا کی فلاح و بہبود اور تعلیم و ترقی کی ذمہ داری انھیں پر عائد ہوتی ہے۔ کیوں کہ
فورٹ ولیم کالج کے قیام میں برطانوی پارلیمنٹ کا سرمو بھی دخل نہ تھا۔ اور ڈائرکٹرز بھی تعلیم
پر کیے گیے اخراجات کو پسند نہیں کرتے تھے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۸۱۳ء سے پہلے انگریزوں نے ہندوستانی رعایا کی تعلیم کے سلسلے
میں کوئی قدم ہی نہیں اٹھایا۔ کیوں کہ ان دنوں تعلیم خود انگلستان میں اسٹیٹ کی ذمہ داری نہیں
نہیں تھی۔[3] فورٹ ولیم کالج کے قیام کے وقت اگر کمپنی کے پیش نظر کچھ اخلاقی پہلو بھی ہوتے
تو اس کے آئین و ضوابط میں ان پہلوؤں سے چشم پوشی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ کالج کا آئین

---

[1] تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص ۴

[2] ایضاً ص ۵ - ۴

[3] نور اللہ و نایک، تاریخ تعلیم ہند ص ۸۳

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

اور قواعد وضوابط منضبط کرتے وقت تمہید کے طور پر کالج کے اغراض و مقاصد کا بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں اخلاقی پہلو کو کس حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے اس کا اندازہ اس تمہید کے مطالعے سے بخوبی کہا جا سکتا ہے۔ جسے سطور ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"ہرگاہ کہ پاک پروردگار کو منظور تھا کہ برطانیہ عظمیٰ کے منصوبوں اور فوجوں کو انگلستان میں مسلسل خوشحالی اور شان و شوکت کے راستے پر گامزن رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اور ہرگاہ کہ پے بہ پے کئی جنگوں کی فتح مندی پر منتج ہونے سے اور ایک منصفانہ، دانش مندانہ اور معتدل پالیسی سسٹم کے خوشگوار نتیجے کے طور پر ہندوستان میں اور دکن میں وسیع و عریض علاقے پر برطانیہ عظمیٰ کے زیر نگیں اور آنریبل انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے تحت آ گئے ہیں۔ مرور وقت سے ایک عظیم اور طاقت ور ایمپائر کی بنیاد پڑ گئی ہے جو متعدد کثیر آبادی رکھنے والے اور مال و زر سے معمور صوبجات پر مشتمل اور متعدد اقوام کو محیط ہے، جو مذہبی اعتقادات میں، زبان میں، اطوار و عادات میں اختلاف رکھتی ہیں اور اسی ترتیب سے وہ اس کے عادی ہو گئے ہیں کہ ان کے مخصوص رواجوں، اصولوں، نظریوں اور قوانین کے مطابق ان پر حکمرانی کی جائے۔

اور ہرگاہ کہ برطانوی قوم کا مقدس فرض، حقیقی مفاد، وقار اور پالیسی اس کے متقاضی ہیں کہ تمام زمانوں کے لیے ہندوستان میں برطانوی ایمپائر کی عمدہ طور پر حکومت کے لیے اور اس ملک میں بسنے والے لوگوں کی مسرت اور خوشحالی کے لیے ایک مؤثر اہتمام کیا جائے، چنانچہ بہت سے دانشمندانہ اور سودمندانہ ضوابط وقتاً فوقتاً گورنر جنرل باجلاس کونسل کی طرف سے اس کریمانہ عزم و ارادہ اور غرض و مقصد سے جاری کیے جاتے رہے ہیں کہ لوگوں کو جن کا ذکر ہوا ان کے اپنے قوانین، رواجات اور رسوم، برطانوی آئین کی نرم مزاج اور مشفقانہ اسپرٹ کے ساتھ حکومت کے زیر انتظام و انصرام

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

لایا جائے۔
اور ہرگاہ کہ یہ ناگزیر طور پر ضروری ہے کہ ان مذکورہ دانش مندانہ، سودمندانہ اور کریمانہ ضوابط کی آنے والے ہر زمانے میں مناسب تعمیل اور انتظام و انصرام کو محفوظ بنایا جائے، نیز ایسے ضوابط اور قوانین کی مناسب تعمیل اور انتظام و انصرام کو بھی جو آئندہ گورنر جنرل باجلاس کونسل کی طرف سے جاری کیے جائیں اور یہ کہ آنریبل انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کے وہ سول ملازمین جو حکومت ہندستان کے اعلیٰ اور اہم کارہائے منصبی انجام دے رہے ہیں، اپنے مناصب اور مقامات تقرر کے دشوار فرایض کی انجام دہی کے لیے مناسب طور پر لیاقتوں کے حامل ہوں، ادبیات اور سائنس کے عمومی اصولوں میں کافی طور پر تعلیم پائے ہوئے ہوں، نیز برطانیہ کے قوانین، حکومت اور آئین سے اور ہندوستان اور دکن کی متعدد دیسی زبانوں سے بھی واجب طور پر واقف ہوں اور ان صوبوں کے قوانین، رواجات اور رسوم سے بھی واقف ہوں جہاں یہ مذکورہ سول ملازمین حاکم مقرر کیے جا سکتے ہیں۔

اور ہرگاہ کہ جن اشخاص کو آنریبل انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کی سول ملازمت کے لئے مختص کر دیا گیا ہے۔ ان کی تعلیم اور مطالعے کا ابتدا ہی میں خلل پذیر ہو جانا انھیں محروم کر دیتا ہے کہ وہ ہندوستان پہنچنے سے قبل ایسی تحصیلات کی بنیاد ڈال سکیں کہ ادبیات اور سائنس کے عمومی اصولوں سے واقفیت یا برطانیہ عظمیٰ کے قوانین، حکومت اور آئین کی کافی معلومات حاصل کریں اور ہندوستان میں سول ملازمت کے دشوار اور اہم فرائض کی مناسب طور پر انجام دہی کے لیے درکار لازمی لیاقتیں پوری طرح حاصل نہیں ہو پائیں، جو بہ صورت دیگر ہندوستان میں تعلیم و مطالعہ کے ایک باقاعدہ نصاب کی تکمیل سے ہو سکتی ہے، جسے ان مقبوضات کی حکومت اعلیٰ ترین مقتدرہ کی نگرانی، ہدایت و رہنمائی اور کنٹرول میں روبہ عمل لا رہی ہو۔

اور ہرگاہ کہ ہندوستان میں کوئی پبلک ادارہ ایسا موجود نہیں ہے جس کے تحت آنریبل انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کے سول ملازمت میں اپنی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں مقرر ہونے والے جونیر ملازمین، ان اعلیٰ اور مشکل فرائض

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

منصبی کے لحاظ سے آگے چل کر انھیں مامور کیا جانا ہے، ضروری لیاقتوں کی تحصیل کر سکیں اور کوئی نظام، ڈسپلن کا یا تعلیم کا ہندوستان میں اس غرض سے قائم نہیں کیا گیا ہے کہ مذکورہ جونیر ملازمین کی تعلیم میں رہنمائی کی جائے اور اسے باقاعدہ بنایا جائے، یا اول اول ہندوستان پہنچنے پر طور طریق کے باب میں ان کی رہ نمائی کی جائے یا ان کے اخلاقیات کی تعمیر، اصلاح اور حفاظت کی جائے یا سعی و محنت، دیانت اور مذہب کی باقاعدہ اور منظم راہ و روش پر چل کر ہندوستان میں برطانیہ کے نام کی عزت کو بحال و برقرار رکھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

اشرف الاشراف، رچرڈ مارکویس ویلزلی، نائٹ آف دی اِلسٹریس آرڈر آف سینٹ پیٹرک وغیرہ وغیرہ، گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے ہندوستان میں برطانوی ایمپائر کے استحکام اور عمدہ حکومت کے لیے ڈسپلن تعلیم اور مطالعے کے ایک ایسے ادارے اور نظام کے قیام کو ناگزیر باور کیا ہے اور اس لیے ہز لارڈ شپ نے حکم جاری کیا ہے۔"[1]

دستور کے محولۂ بالا تمہیدی کلمات سے ظاہر ہوتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے انگریزوں کا مقصد دیسی زبان و ادب کی ترویج و ترقی تھی نہ ہندوستانی رعایا کی فلاح و بہبود، بلکہ اسے ہندوستان پر حکم رانی کرنے، اپنی معاشی حالت بہتر بنانے اور اپنی سیاسی گرفت مضبوط سے مضبوط تر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا۔ صدیق الرحمٰن قدوائی لکھتے ہیں:

"فورٹ ولیم کالج کے مقاصد کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں، اس کے قیام کا مبینہ مقصد ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود نہ تھی، بلکہ برطانوی سول اور فوجی افسروں کو ہندوستانی زبان کی تعلیم تھا۔ تاکہ وہ اس کے ذریعے ہندوستانی رعایا کے ساتھ رابطہ قائم کر کے ہندوستان میں برطانوی

---

[1] بحوالہ، نقوش۔ دسمبر ۱۹۶۰ء، ص ۴۲۔ ۴۱

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

اقتدار کو مستحکم بنانے میں مدد کر سکیں۔ کالج کے قیام کی مہم کو مفید اور قابل قبول بنانے کے لیے جو انسانی فلاح و بہبود کی بحثیں چھیڑی گئی تھیں ان کا واحد مقصد برطانوی شہنشاہیت کو استحکام بخشنا اور اس کے نقایص کو دور کرنا تھا"[1]

شانتی رنجن بھٹاچاریہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے متعلق لکھتے ہیں۔

"انگریزوں کو ہندوستانی زبانوں کی ترقی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، نہ وہ ہندوستانی عوام کی فلاح و بہبود کے خواہاں تھے اور نہ ہی ہندوستان کی ترقی سے انھیں کوئی دلچسپی تھی"[2]

وفا راشدی رقم طراز ہیں۔

"(کالج کے قیام کا) اصل مقصد یہ تھا کہ حکومت کو زبان کے ذریعے امور سیاست اور تنظیم اور ملک گیری میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں پیدا ہو جائیں"[3]

احراز نقوی کا دو ٹوک فیصلہ ہے کہ

"فورٹ ولیم کالج کا نثری دبستان ایک سیاسی منفعت کی خاطر معرض وجود میں آیا"[4]

پھر ولزلی کے نزدیک فورٹ ولیم کالج کی سیاسی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ کورٹ کی طرف سے اس کے توڑ دینے کا حکم دیے جانے کے بعد اس نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ "اس معاملے میں کورٹ کے حکم کی اگر تعمیل کی جاتی تو اس وقت جو فتنے برپا ہوتے میں بیان نہیں کر سکتا، کالج کو قائم رہنا ہوگا ورنہ سلطنت ختم ہو جائے گی"[5]

---

[1] Gilchrist and the Language of Hindoostan, P 28

[2] بنگال میں اردو زبان و ادب ص ۸-۷

[3] بنگال میں اردو ص ۱۶

[4] مقدمہ اخوان الصفا ص ۵

[5] بہ حوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۴۱

بہرحال فورٹ ولیم کالج کا مقصد ایسے انگریز حکمراں اور کارپرداز پیدا کرنا تھا جو ہندوستان میں برطانوی سامراج کو مضبوط و مستحکم بنانے کے اہل ہوں جن کے لیے ہندوستانی زبان وادب کے علاوہ ہندوستانی رسم ورواج، تاریخ وجغرافیہ اور مذاہب و قوانین کی تعلیم حاصل کرنا بھی ضروری تھا تاکہ ہندوستان کے جن علاقوں میں وہ مامور کیے جائیں وہاں کے لوگوں سے رابطہ قائم کرکے وہاں کا نظم ونسق بہتر طور پر انجام دے سکیں۔

لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کا اصل محرک گل کرسٹ اور اس کا اورنیٹل سمنری Oriental Seminery یا مدرسۂ ہند، تھا کیوں کہ گل کرسٹ نے ہندوستان میں وارد ہوتے ہی یہ محسوس کرلیا تھا کہ ہندوستانی زندگی سے اس وقت تک پورے طور پر فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا جب تک کہ یہاں کی زبان سے واقفیت حاصل نہ کی جائے۔ اس لیے ہندوستانی زبان سیکھنے میں وہ ہمہ تن مصروف ہوگیے جس کے لیے انھوں نے گورنر جنرل وارن ہسٹنگز سے اجازت بھی حاصل کرلی تھی۔ دس پندرہ برس کی عرق ریزی و جفاکشی کے بعد انھوں نے ہندوستانی زبان پر کامل عبور حاصل کرلیا تھا۔ اس درمیان میں انھوں نے ہندوستانی زبان کی قواعد اور لغت اور اس کا ضمیمہ اور "مشرقی زبان داں" مرتب کرلیا۔ ان کتابوں کی اشاعت سے گل کرسٹ کو صرف ہندوستان ہی میں شہرت نہیں ملی بلکہ سات سمندر پار انگلینڈ تک ان کا نام مشہور ہوگیا۔ اس کے بعد وہ ہندوستانی زبان میں مزید شہرت اور اس کی خدمت کے لئے ذرائع تلاش کرنے لگے۔ اس زمانے میں سول ملازمین کو فارسی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی جسے ہندوستانی منشی انجام دیتے تھے لیکن نہ تو وہ منشی انگریزی زبان سے واقف ہوتے اور نہ تو انگریز سول ملازم دیسی زبانوں سے جس کی وجہ سے اس تعلیم میں بڑی دشواریاں حائل ہوتی تھیں، اور وقت بھی زیادہ صرف ہوتا تھا۔ اس لیے گل کرسٹ نے گورنر جنرل لارڈ ولزلی کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اگر ان سول ملازمین کو پہلے دیسی زبان کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ منشیوں سے ان کی زبان میں بات کرسکیں تو وہ آسانی سے اور کم وقت میں فارسی سیکھ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ پیش کش بھی کی کہ دیسی زبان کی مجوزہ تعلیم کے لیے وہ خود سول ملازمین کو روزانہ درس دیا کریں گے اور

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

ساتھ ساتھ فارسی بھی بڑھایا کریں گے۔"[1] ولزلی نے گل کرسٹ کی اس تجویز کو منظور کرتے ہوئے اپنی کونسل کے سامنے مندرجہ ذیل قرارداد پیش کی۔

"مسٹر گل کرسٹ کی پیشکش کو قبول کرلینا ہی مناسب ہوگا۔ کیوں کہ دیسی زبان کی تعلیم کو فروغ دینے میں یہ تجویز ممد ثابت ہوگی۔ میری رائے ہے کہ اس کو منظور کرلیا جائے۔ اور آئندہ جنوری سے اس پر عمل درآمد شروع ہوجائے۔ کلکتے میں جو نووارد رائٹر[2] اس وقت موجود ہیں ان کو ایک سال تک گل کرسٹ سے درس لینے کی ہدایت کی جائے۔ اس معینہ مدت کے بعد ان کا امتحان لیا جائے گا جن کے اصول بعد میں متعین کیے جائیں گے، تاکہ مجوزہ طریق تعلیم کی موزونیت کے متعلق صحیح رائے قائم کی جاسکے۔"[3]

مندرجۂ بالا یادداشت کی روشنی میں ۲۱ر دسمبر ۱۷۹۸ء کو گورنر جنرل کی کونسل نے یہ تجویز منظور کی کہ بنگال میں کمپنی کی حکومت کو کامیاب بنانے کے پیش نظر یکم جنوری ۱۸۰۱ء کے بعد اہم عہدوں پر وہی لوگ مقرر کیے جائیں گے جو لوگ گورنر جنرل کی کونسل کے پاس کیے گئے قانون کے مطابق ملک کی ایک یا ایک سے زیادہ زبانوں سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔[4] چنانچہ یکم جنوری ۱۷۹۹ء کو اس منصوبہ کو عملی شکل دی گئی۔[5] ۲۴ر دسمبر ۱۷۹۸ء کو سرکاری سکریٹری جی۔ ایل۔ بارلو نے گل کرسٹ کے پاس تقرری کا خط بھیجا۔ ۲۵ر دسمبر ۱۷۹۸ء کو انھوں

---

[1] بحوالہ Origin of Modern Hindustan Literature p.70

[2] پہلے سول ملازم کورائٹرز (Writers) کہا جاتا تھا۔ ۱۸۳۴ء میں جب ملازمتوں کے عہدوں کی ازسرنو تنظیم ہوئی تو یہ اصطلاح ترک کرکے انھیں سول سرونٹ کہا جانے لگا۔

[3] بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۱۰

[4] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۱۱

[5] دارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۷-۶

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

نے تدریس کی ذمہ داری باقاعدہ طور پر قبول کرلی[1] جس کے لیے رائٹرس بلڈنگ[2] میں ان کو ایک کمرہ دے دیا گیا۔ اس طرح اس مکتب یا ادارے کی بنیاد پڑی جو اورنٹیل سمنری اور گل کرسٹ کا مدرسہ یا مدرسۂ ہندی کے ناموں سے مشہور ہوا[3]۔ کمپنی کے ملازمین کے لیے ہندوستانی زبان کی تعلیم کی یہ پہلی باقاعدہ منظم کوشش تھی۔ اس خدمت کے لیے گل کرسٹ کو الگ سے تنخواہ مقررہ نہ تھی بلکہ فارسی زبان کی تعلیم کے لیے سول ملازمین کو جو تیس روپیے ماہانہ بھتے دیے جاتے تھے اورنٹیل سمنری میں تعلیم حاصل کرنے والے ملازمین کے وہ بھتے گل کرسٹ کو دیے جانے لگے۔ ۲۹ جنوری ۱۷۹۹ء کے خط کے ساتھ ۲۱ طلبہ کی فہرست گل کرسٹ کو موصول ہوئی اور فروری کے اوائل سے باقاعدہ تعلیم و تعلم کا کام شروع ہوا۔

۹ جنوری ۱۸۰۰ء کو گورنر جنرل نے طلبہ کا امتحان لینے کے لیے ایک حکم جاری کیا اور اس غرض سے ایک باقاعدہ کمیٹی بنائی گئی جس کے سکریٹری گل کرسٹ ہی مقرر ہوئے۔ امتحان کے بعد کمیٹی نے طلبہ کی زبان سے متعلق ترقی کی بڑی تعریف کی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ ۲۹ جولائی ۱۸۰۰ء کو کمیٹی نے ایک رپورٹ تیار کر کے گورنر جنرل کے پاس بھیج دی۔ جب وہ رپورٹ گورنر جنرل کے سامنے پیش کی گئی تو انھوں نے گل کرسٹ کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے ان سے خیالات کا اظہار کیا:۔

> "ہندوستانی کی اہم قواعد اور لغت کی تصنیف سے ہندوستان کی عام مروجہ زبان کی تعلیم حاصل کرنے میں طلبہ کو آج جو آسانی بہم پہنچی ہے اس کے

---

[1] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۸

[2] کمپنی کے افسروں نے پلاسی کی جنگ فتح کرنے کے بعد ۱۷۵۱ء میں کلکتہ میں مٹیا برج کے علاقے سے متصل ایک قلعہ (فورٹ ولیم) کی بنیاد ڈالی۔ یہ ۱۷۰۲ء میں تیار ہوا اس کے بعد ایک [illegible] عمارت رائٹرس بلڈنگ کے نام سے ۱۷۰۰ء میں بنائی گئی۔ فورٹ ولیم کالج بھی اسی رائٹرس بلڈنگ میں جاری تھا یہ عمارت آج بھی موجود ہے۔

[3] عتیق صدیقی نے اسے ایک خالص سرکاری ادارہ تسلیم کیا ہے (گل کرسٹ اور اس کا عہد، [illegible]) لیکن جاوید نہال نے ان کے اس بیان کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "گل کرسٹ کا یہ مدرسہ نجی تھا" لیکن اس کے متصل بعد یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ "بلاشبہ حکومت کی سرپرستی اس مدرسۂ ہندی کو حاصل تھی" (انیسویں صدی میں بنگال [illegible] ۴۲)

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

لیے ہم گل کرسٹ صاحب کی قابلیت کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ انھوں نے جس حوصلے، قابلیت اور محنت سے کمپنی کے ملازمین کو ہندوستانی اور فارسی زبانوں کی تعلیم دینے میں اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے اس کے لیے وہ صد شکریے کے مستحق ہیں"[۱]

یہ تھی مختصر روداد اورینٹل سمنری کی جو ہندوستانی زبان کی تعلیم کے لیے تجربے کے طور پر قائم کی گئی تھی اور جس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی سامنے آیا یہی وہ ادارہ تھا جس کے اچھے نتائج اور تحریک نے فورٹ ولیم کالج کو جنم دیا، بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اورینٹل سمنری فورٹ ولیم کالج کا پیش خیمہ تھا۔

اورینٹل سمنری جیسے معمولی ادارے کے قیام سے لارڈ ولزلی کو اطمینان نہ ہوا بلکہ جس عظیم ادارے کے قیام کا خیال اس کے دماغ میں تھا اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ ہمہ وقت بے چین رہنے لگا تھا۔ اسی اثنا میں اسے ٹیپو سلطان سے معرکہ آرائی میں حصہ لینے کے لیے مدارس جانا پڑا۔ لیکن جنگی مصروفیات میں بھی اس نے کمپنی کے ملازمین کی تعلیمی ضروریات کو فراموش نہیں کیا چنانچہ مدارس سے واپسی کے بعد ۲۴۔ اکتوبر ۱۷۹۹ء کو اس نے رائٹ آنریبل ہنری ڈنڈاس کے نام ایک خط لکھا اور اپنے اس خیال کی وضاحت کی، جس میں کالج کا شاید پہلا بین اشارہ بھی تھا۔ بارلو کمیٹی برائے امتحان کی رپورٹ[۲] موصول ہونے پر وہ جلد سے جلد اپنے منصوبے کو روبہ عمل لانے کی کوشش کرنے لگا چنانچہ ۹ جولائی ۱۸۰۰ء کو اس نے کالج کے قیام کی تجویز کونسل کے سامنے پیش کر دی۔ اور منطقی استدلال سے کونسل کے ارکان کو اپنا ہم خیال و ہم نوا بنا کر اس منصوبے کو ڈائرکٹروں کی منظوری کے لیے بھیجنے پر آمادہ کر لیا[۳]

۱۔ J. Roebuck, Annals of fort william College P.13

۲۔ یعنی اورینٹل سمنری کے طلبہ کے امتحان کے لیے جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی مسٹر بارلو اس کے ہیڈ تھے اس لیے یہ بارلو کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔

۳۔ لکشمی ساگر وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۱۱

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

زمانۂ قیام کی تاریخ

کالج کا قیام :-

ولزلی نے مختلف پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد کالج کے قیام سے متعلق جو فیصلہ کیا تھا، اسے روبہ عمل لانے کے لیے وہ اس قدر بے تاب تھا کہ اس نے ڈائرکٹروں کی منظوری کا انتظار کیے بغیر کونسل میں اس تجویز کی منظوری کے دوسرے ہی دن یعنی ۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء مطابق ۱۷ر صفر ۱۲۱۵ھ، ۴ر ساون، ۱۸۵ سمبت، ۴ر ساون ۱۲۰۷ فصلی سمبت، ۲۸ر اساڑھ ۱۲۰۷ بنگالی سمبت کو کالج کی باقاعدہ داغ بیل ڈال دی[۱]۔ کالج کا دستور بھی اسی روز مرتب کیا گیا۔ لیکن گورنر جنرل کے حکم خاص سے قانونی دستاویز پر قیام کی تاریخ ۴ر مئی ۱۸۰۰ء ڈالی گئی، جو میسور کی راجدھانی سرنگاپٹم پر برطانوی افواج کی فتح کی پہلی سالگرہ کی تاریخ ہے[۲]۔ طلبہ کو بطور انعام دینے کی غرض سے جو تمغے تیار کرائے گئے تھے ان پر اس یادگار کو دوام بخشنے کے لیے ایک طرف دارالخلافہ سرنگاپٹم کی خوب صورت تصویر اور دوسری طرف فتح کی تاریخ کندہ تھی[۳]۔

کالج کا دستور :-

کالج کے آئین و دستور کے تمہیدی حصے پچھلے اوراق میں دیے جا چکے ہیں۔ یہاں اس کی دفعات پیش کی جاتی ہیں۔

---

۱ وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۱۲

۲ ایضاً ص ۲۴۔ ڈاکٹر نجم الاسلام، نقوش دسمبر ۸۶ء ۱۹ص ۴۱۔ اور [illegible] Origin of Modern Hindustani Literature P.102

۳ [illegible] Gilchrist and the Language of Hindustan P.14

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

ا۔ بذریعہ ہذا، فورٹ ولیم بنگال میں ایک کالج قائم کیا جاتا ہے تاکہ کمپنی کے جونیر سول ملازمین کو ادبیات، سائنس اور معلومات (نالج) ایسے شعبوں میں بہتر طور پر تعلیم دی جائے جو ایسٹ انڈیز میں برطانوی مقبوضات کے انتظام حکومت سے متعلق، مختلف عہدوں کے فرائض کی انجام دہی کے لیے درکار لیاقتوں کی تحصیل میں ضروری باور کیے جائیں۔

۲۔ ایک موزوں و مناسب عمارت کالج کے لیے تعمیر کی جائے جو حکام بالا کے لیے طلبہ کے لیے ایک کتاب خانے کے لیے اور ایسے دوسرے مقاصد کے لیے جو ضروری سمجھے جائیں، کمروں پر مشتمل ہوگی۔

۳۔ گورنر جنرل کالج کے سرپرست (Patron) اور وزیٹر (Visitor) ہوں گے۔

۴۔ سپریم کونسل کے اراکین اور صدر دیوانی عدالت اور نظامت عدالت کے جج صاحبان کالج کے گورنر ہوں گے۔

۵۔ گورنر جنرل باجلاس کونسل کالج کے مالی ذرائع کے بندوبست کے متولی (ٹرسٹی) ہوں گے اور اس حیثیت میں باقاعدگی سے اپنی کارروائیوں کی روداد آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹرس کو پیش کریں گے۔

۶۔ سرکاری خزانے کی کامپٹرولنگ کمیٹی (Comptrolling Committee) کالج کے خزانچیوں کا کام کرے گی۔

۷۔ اکاؤنٹنٹ جنرل اور سول آڈیٹر بالترتیب کالج کے اکاؤنٹنٹ اور آڈیٹر ہوں گے۔

۸۔ ایڈووکیٹ جنرل اور آنریبل کمپنی کے معینہ مشیر قانونی کالج کے لا افسران ہوں گے۔

۹۔ کالج کی بلا واسطہ سربراہی مستقلاً ایک پرو۔ووسٹ اور ایک وائس پرو۔ووسٹ کے ذمے ہوگی۔ اور اسی نوعیت کے ان دوسرے افسروں کے ذمے جن کے تقرر کو سرپرست اور وزیٹر مناسب خیال کرے گا۔ ان تنخواہوں کے ساتھ جن کو وہ مناسب حال خیال کرے۔ پرو۔ووسٹ اور وائس پرو۔ووسٹ اور کالج کے جملہ دیگر حکام، سرپرست اور وزیٹر کی مرضی کے مطابق قابل برطرفی ہوں گے۔

۱۰۔ پرو۔ووسٹ ہمیشہ کلیسائے انگلستان کا پادری (Clergyman) ہوگا۔ جیسا

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کہ قانوناً تسلیم کیا گیا ہے۔

۱۱۔ سرپرست اور وزیٹر کا سراجلاس کار اور ایکٹ آنریبل کورٹ آف ڈائریکٹرس کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اور ان کی مرضی ومنشاء کے تابع ہوگا۔

۱۲۔ پرو۔ ووسٹ کے اولین فرائض یہ ہوں گے کہ فورٹ ولیم پہلی مرتبہ پہنچنے پر جونیر سول ملازمین کا استقبال کرے، ان کے عمومی چال چلن اور طرز عمل کی نگرانی کرے اور ان میں باقاعدگی لائے، اپنی نصیحت وملامت اور تنبیہ وہدایت سے ان کی مدد کرے اور کلیسائے انگلستان کے عقیدے، ڈسپلن اور مذہبی رسوم کے مطابق، جیسا کہ قانوناً تسلیم کیا گیا ہے، عیسائی مذہب کے اصولوں کی تعلیم دے انھیں پکا پیروکار (کنفرم) بنادے۔

۱۳۔ سرپرست اور وزیٹر پروفیسری کی ایسی اسامیاں ایسے حقوق ومراعات کے ساتھ قائم کرے گا جنھیں مناسب خیال کیا جائے۔

۱۴۔ جوں ہی قابل عمل ہو، پروفیسری کی اسامیاں قائم کردی جائیں اور باقاعدہ لیکچروں کے کورس، ادبیات، سائنس اور معلومات (نالج) کی حسب ذیل برانچوں میں شروع کر دیے جائیں گے۔

زبانیں: عربی، فارسی، سنسکرت (کذا) ہندوستانی، بنگال، (بنگالی)، تلنگا (تلنگی)، مرہٹہ (مرہٹی) تامل اور کنارا (کنڑ)

قوانین:۔ محمڈن لا، ہندو لا، اخلاقیات، سول فلسفۂ قانون (جیورس پروڈنس) اور قانون اقوام، انگلش لا، ہندوستان کی برطانوی عملداریوں میں سول حکومت کی غرض سے گورنر جنرل باجلاس کونسل یا بالترتیب فورٹ سینٹ جارج اور بمبئی کے گورنر صاحبان باجلاس کونسل کے جاری کردہ ضوابط وقوانین۔

دیگر:۔ اقتصادیات (پولیٹیکل اکانومی) اور بالخصوص ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی ادارت و مفادات، جغرافیہ اور ریاضیات۔

یورپ کی جدید زبانیں، یونانی، لاطینی اور انگریزی ادب القدما (کلاسکس) تاریخ عمومی، قدیم وجدید۔ ہندوستان اور دکن کی تاریخ اور باقیات سلف (انٹی کوٹیز)

سائنس:۔ تاریخ طبعی (نیچرل ہسٹری) نباتات، کیمیا اور علم ہیئت۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

۱۵۔ سرپرست اور وزی ٹر، ایک ہی پروفیسر کو مطالعے کی شمار کردہ بالا برانچوں میں سے ایک سے زیادہ پر لکچروں کے پڑھنے دینے (To read lectures in) کا مجاز و ممتاز بناسکتا ہے اور کسی بھی وقت، یکجا یا جدا جدا، مذکورہ پروفیسروں میں سے کسی کو بھی مجاز و ممتاز بناسکتا ہے یا ان برانچوں میں جن میں ضروری معلوم ہو پروفیسر کی مزید اسامیاں قائم کرسکتا ہے۔

۱۶۔ پرو۔ دوسٹ اور وائس پرو۔ ووسٹ کالج کے نظم و نسق میں رہ کر سات سال مدت پوری کر لینے پر، اور ایک پروفیسر کالج میں پورے سات سال کی مدت تک لکچروں کی خواندگی کر لینے پر، یا اٹھائیس میقاتوں کی مدت اور سرپرست اور وزی ٹر کے اپنے قلم اور اپنی مہر سے بالترتیب اس مدت وقت کے دوران عمدہ طرز عمل کا صداقت نامہ جاری ہو کر موصول ہو جانے پر تا حیات سالانہ وظیفۂ حسن خدمت (پینشن) کے حقدار ہوں گے، جو یورپ میں یا ہندوستان میں، فریق جہاں کا انتخاب کرے، ادا کی جائے گی۔ وظیفۂ حسن خدمت کسی حالت میں بھی اس سالانہ تنخواہ کے ایک تہائی سے کم نہیں ہوگا جو یہ پرو۔ دوسٹ یا وائس پرو۔ ووسٹ کالج کا نظم و نسق چلاتے رہنے کے دوران، یا کوئی ایسا پروفیسر اپنے باقاعدہ لکچروں کی مدت کے دوران وصول کرتے رہے ہوں۔ بہرحال، وظیفۂ حسن خدمت میں سرپرست اور وزی ٹر کے اختیارِ تمیزی سے اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۷۔ کمپنی کے وہ تمام سول ملازمین جن کا آئندہ سے بنگال کی پریزیڈنسی کے عملے میں تقرر کیا جائے۔ بنگال میں پہنچنے کے بعد پہلے تین سال کالج سے وابستہ رکھے جائیں گے اور اس مدتِ وقت کے دوران کالج کے اندر منظور شدہ نصابات کا مطالعہ ہی ان کی واحد پبلک ڈیوٹی قرار پائے گی۔

۱۸۔ بنگال کی پریزیڈنسی کے عملے کے وہ سب سول ملازمین جن کی بنگال میں اقامت تین سال کی مدت سے زیادہ نہیں بڑھ گئی ہوگی، اس ضابطے کی تاریخ سے تین سال کی مدت کے لیے فی الفور کالج سے وابستہ کر دیے جائیں گے۔

۱۹۔ گورنر جنرل با جلاس کونسل کے حکم سے، ایسی شرائط پر اور ایسے ضوابط کے تحت جنھیں قرینِ مصلحت باور کیا جائے، ہندوستان میں کمپنی کا کوئی بھی جونیر سول ملازم ادارے سے استعفا دے

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کے لیے داخل ہوسکتا ہے۔ چاہے وہ اس پریزیڈنسی کے عملہ سے تعلق رکھتا ہو یا فورٹ سینٹ جارج یا بمبئی کے عملے سے۔

۲۰۔ گورنر جنرل باجلاس کونسل کے حکم سے، ایسی شرائط پر اور ایسے ضوابط کے تحت جنھیں قرین مصلحت باور کیا جائے، ہندوستان میں کمپنی کے جونیر فوجی ملازمین میں سے کوئی بھی اس ادارے سے استفادے کے لیے داخل ہوسکتا ہے۔ چاہے وہ اس پریزیڈنسی کے عملے سے تعلق رکھتا ہو یا فورٹ سینٹ جارج یا بمبئی کے عملے سے۔

۲۱۔ فورٹ ولیم کالج میں ہر سال چار میقاتیں (Terms) ہوں گی، ہر میقات کی مدت دو مہینے ہوگی۔ ہر سال چار بڑی تعطیلات (vacations) دی جائیں گی ہر بڑی تعطیل کی مدت ایک مہینہ ہوگی۔

۲۲۔ سالانہ دو پبلک امتحانات منعقد کئے جائیں گے اور انعامات و اعزازات پرو ووسٹ کے ہاتھوں علی الاعلان سرپرست گورنروں کی موجودگی میں ایسے طلبہ میں تقسیم کئے جائیں گے جو ان کے اہل نظر آئیں گے۔

۲۳۔ ڈگریاں دی جائیں گی اور انھیں بنگال، فورٹ سینٹ جارج اور بمبئی کی سول حکومتوں کے بعض عہدوں کے لیے لازمی لیاقتوں میں شمار کیا جائے گا، اور سول ملازمت میں ترقی کالج میں ڈسپلن اور ادارات کے مطابق علانیہ تسلیم شدہ اہلیت کا لازمی نتیجہ ہوگی۔

۲۴۔ کالج کی داخلی باقاعدگی، ڈسپلن اور نظم و نسق کے متعلق آئین و قوانین (Statutes) کالج کے گورنروں کی نگرانی میں کالج کے پرو۔ ووسٹ کو بنانے ہوں گے لیکن کوئی قانون سے (Statutes) نافذ العمل نہیں ہوگا تا وقتیکہ سرپرست اور وزیٹر نے اس کی منظوری نہ دی ہو، جن قوانین کی اس طور پر منظوری دی جائے گی انھیں ایک فارم کے مطابق طبع لیا جائے گا ان کی حتمی تجویز و ہدایت سرپرست اور وزیٹر کی طرف سے ہوگی۔

۲۵۔ سرپرست اور وزیٹر اپنے تنہا اور بلا شرکت غیرے اختیار (اتھارٹی) کے ہر زمانے میں، کسی بھی موجودہ قانون (کے) رد و بدل کا یا اسے منسوخ کرنے کا یا کالج کی باقاعدگی، ڈسپلن اور نظم و نسق کے لیے کسی نئے قانون کے جاری کرنے کا مجاز و مختار ہوگا۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

۲۶۔ کالج کے حکام کی تمام تنخواہوں، تقرریوں یا علاحدگیوں کا ایک باقاعدہ گوشوارہ بہ میقات، کے اختتام پکالج کے سرپرست اور وزی ٹر کی طرف سے گورنر جنرل باجلاس کونسل کو گورنر جنرل باجلاس کونسل کی طرف سے آنریبل کورٹ آف ڈائریکٹرس کو پیش کیا جاتا رہے گا، سرپرست اور وزی ٹر کے جاری کردہ تمام آئین وقوانین ([illegible]) کی مطبوعہ کاپیاں بھی ان ہی عرصہ ہائے وقت کے دوران اور بعینہٖ اسی طریقے پر، گورنر جنرل باجلاس کونسل اور آنریبل کورٹ آف ڈائریکٹرس کو پیش کی جائیں گی۔ فقط"[1]

داخلی دستور :۔

ا۔ طلبہ کے داخلے سے متعلق :

ہر طالب علم کو داخلے سے پہلے مندرجہ ذیل اعلان تحریراً داخل کرنا ہوگا کہ "

میں فلاں (نام) بصمیم قلب اور اخلاص کے ساتھ وعدہ کرتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ میں کالج (جس میں اب میں بطور ممبر داخلہ پانے والا ہوں) کے جملہ ضوابط و قوانین کا پابند رہوں گا، یہ کہ میں ہمیشہ اس کے وقار اور مفادات و مراعات کا لحاظ رکھوں گا، اور یہ کہ میں ان جملہ احکامات کے باب میں جو ضابطے کے مطابق جاری ہوں گے پرو۔ ووسٹ کا وائس پرو۔ ووسٹ کا اور کالج کے جملہ حکام بالا کا تابع دار رہوں گا۔ دستخط"[2]

یہ قرارنامہ پیش کرنے کے بعد طالب علم کا نام کالج کے رجسٹر میں درج کرلیا جاتا تھا۔ اس میں اس کی عمر، ملازمت کی نوعیت، تقرر کی تاریخ، ہندوستان آمد کی تاریخ بھی درج کی جاتی۔ نیز اس کا اندراج بھی ہوتا کہ اس کا اصل وطن مع ضلع کے کیا ہے اور اس کی تقرری بنگال، فورٹ سینٹ جارج اور بمبئی میں کس پریزیڈنسی میں اور کہاں ہوئی ہے۔ اور اگر وہ کسی یونیورسٹی کا سند یافتہ ہوتا تو رجسٹر میں اس کی نشاندہی بھی کی جاتی تھی۔

---

[1] بحوالہ نقوش دسمبر ۱۹۸۶ء ۴۴ تا ۴۶

[2] ایضاً ۴۶

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۲۔ اعلیٰ حکام اور پروفیسروں کے تقرر کے متعلق:

"چونکہ فورٹ ولیم کالج کی بنیاد عیسائی مذہب کے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اور اس ارادے سے قائم کیا گیا ہے کہ نہ صرف مشرقی ادبیات سے آگہی کو بڑھائے اور طلبہ کو ان مختلف مناصب کے فرائض کی تعلیم و ہدایت دے جن پر آگے چل کر انھیں ہندوستان میں برطانوی ایمپائر کی حکومت میں مقرر کیا جاتا ہے، اور ان مقبوضات میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے سول ملازمین کے اندر برطانیہ عظمیٰ کے عاقلانہ قوانین اور پر مسرت آئین سے ان کے تعلق کو مضبوط سے مضبوط تر بنائے، بلکہ کرۂ ارض کے اس حصے میں عیسائی مذہب کو بلند و برقرار رکھے، تو یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص اس ادارے میں اس وقت تک کسی اعلیٰ منصب کا حامل نہیں ہوگا یا اس میں بہ حیثیت پروفیسر یا لکچرر تقرر نہیں پائے گا جب تک کہ بادشاہ معظم سے وفاداری کا حلف نہ اٹھائے اور مندرجہ ذیل اعلان تحریری طور پر داخل نہ کر دے۔"

"میں فلاں (نام) صمیم قلب سے اور اخلاص کے ساتھ یہ وعدہ کرتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ میں نہ تو ایسے اصولوں یا رایوں کی تعلیم دوں گا نہ پبلک یا پرائیوٹ طور پر ایسے اصول یا ایسی رائیں رکھوں گا جو عیسائی مذہب کے خلاف ہوں یا جیسا قانوناً مسلم ہے، کلیسائے انگلستان کے اصول اور ضابطے کے خلاف ہوں۔"

"میں فلاں (نام) صمیم قلب سے اور اخلاص کے ساتھ وعدہ کرتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ کلیسا یا مملکت کے باب میں ایسے اصولوں یا رایوں کی نہ تو تعلیم دوں گا اور نہ پبلک یا پرائیوٹ طور پر ایسے اصول یا ایسی رائیں رکھوں گا جو برطانیہ عظمیٰ کے قانوناً جائز آئین کے خلاف ہوں، یا اس فریضے کے منافی ہوں جو ہز مجسٹی کی ذاتِ شاہانہ، شاہی خاندان اور حکومت کے لیے ایک مخلص اور وفادار رعایا کی حیثیت سے مجھ پر عاید ہوتا ہے۔"

"میں فلاں (نام) صمیم قلب سے اور اخلاص کے ساتھ یہ وعدہ کرتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ کالج (جس میں اب میں بطور ممبر داخلہ پانے والا ہوں) کے آئین و قوانین اور داخلی ضابطوں کا پابند رہوں گا اور یہ کہ میں قول و عمل سے اس ادارے میں نظم، ضبط اور اچھے اخلاق کو بحال و برقرار

دیکھنے اور ترقی دینے میں کوشاں رہوگا۔ دستخط"

۳۔ میقاتوں کے متعلق: ہر سال کے اندر چار میقاتیں ہوں گی۔

پہلی میقات ۱۔ فروری کو شروع ہوگی اور مارچ کے آخری دن ختم ہوگی۔
دوسری میقات ۴ مئی کو شروع ہوگی اور جون کے آخری دن ختم ہوگی۔
تیسری میقات یکم اگست کو شروع ہوگی اور ستمبر کے آخری دن ختم ہوگی
چوتھی میقات یکم نومبر کو شروع ہوگی اور دسمبر کے آخری دن ختم ہوگی [۱]

۴۔ لیکچروں اور مشقوں کے متعلق:

ہر میقات کے دوران پروفیسر صاحبان، لیکچرر صاحبان اور معلمین طلبہ کو اس طور پر تعلیم دیں گے جس کی منظوری کالج کونسل نے دی ہوگی۔

ہر طالب علم کو ہر میقات کے دوران مشرقی زبانوں کے مطالعے کی کم سے کم ایک جماعت میں ضروری حاضری دینی ہوگی۔ طالب علم جس جماعت یا جماعتوں میں بھی داخلہ لے، یہ ضروری ہوگا کہ میقات کے اختتام تک وہیں حاضری دے کر منظور شدہ نصاب کا مطالعہ جاری رکھے۔

مختلف لیکچروں کو جاکر سننے کی اجازت پرو۔ دوسٹ دے گا۔

کالج کونسل طے کرے گی کہ طلبہ کو ہر میقات کے دوران کیا پبلک مشقیں کرنی ہیں

۵۔ امتحانات کے متعلق: ہر سال دو پبلک امتحانات منعقد کیے جائیں گے

پہلا امتحان دوسری میقات کے اختتام پر ہوگا۔
دوسرا امتحان چوتھی میقات کے اختتام پر ہوگا۔
ان میں سے ہر امتحان میں مشرقی زبانوں میں ہر طالب علم کی استعداد برسرِ عام جانچا جائے

---

[۱] اس طرح وقفے علی الترتیب اپریل، جولائی، اکتوبر اور جنوری متعین تھے۔

134705

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

گا اور اس کی استعداد کے مطابق درجہ دیا جائے گا۔

طلبہ کی تقابلی استعداد کا اندازہ ہر ممکن صورت سے لگایا جائے گا تحریری مشقوں سے بھی اور ممتحنوں کے تحریری طور پر تجویز کردہ سوالوں کے تحریری جوابات سے بھی۔ جس زبان یا سائنس میں طالب علم کا امتحان ہوا ہے اس زبان یا سائنس کا پروفیسر امتحان میں موجود ضرور رہے گا اور کے انعقاد میں ممکنہ معاونت بھی کرے گا جس کی ممتحن حضرات کو ضرورت ہو۔ لیکن طلبہ کی فرداً فرداً استعداد کا تعین کرنے میں یا انعامات و اعزازات کا فیصلہ کرنے میں اس کی رائے کو دخل نہ ہوگا۔

اس خیال سے طلبہ کو عمومی تعلیم کے باب میں اور ان زبانوں کے سلسلہ میں بھی جو اس ادارے کا فوری مقصد نہیں، استعداد کی حوصلہ افزائی ہو اور ترقی کیا جا سکے۔ (یہ اجازت دی جاتی ہے کہ) کوئی بھی طالب علم ان منظور شدہ امتحانات کے موقع پر علوم مفیدہ، سائنس یا ادبیات کی کسی بھی شاخ میں امتحان دے سکتا ہے۔

ہر سال کے انعامات و اعزازات کا اعلان ۳ مئی کو کیا جائے گا اور ان کا فیصلہ ممتحن حضرات ہر سال دوسرے امتحان میں کریں گے اور ان کی تقسیم برسر عام آئندہ ۶ فروری کو ایسے طلبہ کے حق میں عمل میں آئے گی جو ممتحنوں سے خصوصی مہارت کے سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں کامیاب رہیں گے۔

علوم کے مختلف شعبہ جات میں امتحانات کمیٹی کا تقرر کالج کونسل کرے گی۔

ممتحن حضرات کو مندرجہ ذیل اعلان نامہ تحریراً داخل کرنا ہوگا۔

میں فلاں (نام) صحیح قلب سے اور اخلاص کے ساتھ یہ وعدہ کرتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ اب جن طلبہ کا امتحان لیا جانا ہے میں ان کی تقابلی لیاقتوں کے بارے میں غیر جانبدارانہ فیصلہ دوں گا۔ دستخط۔

۶۔ مشرقی زبانوں کے مباحثوں اور تقریری مقابلوں سے متعلق:۔

چونکہ یہ ضروری ہے کہ طلبہ، جن کو آگے چل کر ہندوستان میں اہم اور اعلیٰ عہدوں پر کام کرنا ہے مشرقی زبانیں روانی اور صحت و درستی کے ساتھ بولنے کے قابل ہوں۔ اس لیے

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

اعلان کیا جاتا ہے کہ مقررہ وقتوں میں (جن کا تعین کالج کونسل کرے گی) مشرقی زبانوں میں پبلک مباحثے اور تیار شدہ تقریروں کے جلسے منعقد کئے جائیں گے۔

۷۔ انگریزی مضمون نویسی کی مشقوں سے متعلق:

ہر طالب علم ہر میقات کے دوران ایک مضمون یا تیار شدہ لکھی ہوئی تقریر انگریزی زبان میں کرے گا۔

ان مضامین یا تیار شدہ تقریروں کا عنوان کالج کونسل تجویز کرے گی اور ایسے مضامین جو امتیازی لیاقت کے حامل متصور ہوں گے، بر سر عام پڑھے جائیں گے۔

۸۔ سرٹیفکیٹ اور ڈگریوں سے متعلق:

کسی طالب علم کے بارے میں اس وقت تک یہ تصور نہیں کیا جائے گا کہ اس نے فورٹ ولیم کالج میں اپنا نصاب تعلیم مکمل کر لیا ہے جب تک کہ اس نے بارہ میقاتوں یا تین سال اس طور پر پورے نہ کر لیے ہوں جیسا کہ داخلی قوانین کا تقاضا ہے۔ اس مدت وقت کے اختتام پر طالب علم کو کالج کونسل کی طرف سے ایک سرٹیفکیٹ ملے گا، جس میں اس استعداد و مہارت کی صراحت ہوگی جسے کالج میں اپنی نصابی تعلیم کے دوران اس نے حاصل کیا ہوگا اور کالج میں قیام کے عرصے کے دوران اس کے عمومی چال چلن کے رنگ و روش کی بھی۔

ایسے تمام سرٹیفکیٹوں کی مصدقہ نقلیں وزیٹر (گورنر جنرل) کی خدمت میں پیش کی جائیں گی جو انھیں حکومت کے پبلک رکارڈس میں داخل فرمائیں گے۔

ایک اعزازی ڈگری وزیٹر کی طرف سے ایسے اشخاص کو عطا کی جائے گی جو مشرقی زبانوں میں سے کسی میں یا قانون محمدی میں یا ہندوؤں کے قانون میں یا مشرقی ادبیات کے علم میں خصوصی مہارت کا اعزاز حاصل کریں گے۔

یہ ڈگری ایسے طالب علم کو نہیں دی جائے گی جس نے کالج کونسل سے داخلی قوانین

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کے تحت منظور شدہ سرٹیفکیٹ حاصل نہ کر لیا ہو۔

۹۔ پرو۔ ووسٹ کا دائرہ اختیار:

پروفیسر صاحبان، حکام، طلبہ، معلمین اور کالج کے ملازمین پرو۔ ووسٹ کے فوری دائرہ اختیار کے تحت ہوں گے۔

مقدس سروس (عبادت) کالج کے گرجا میں ان اوقات میں ہوگی جن کا تعین پرو۔ ووسٹ کرے گا اور اس میں تمام طلبہ کو شریک ہونا پڑے گا۔

یہ فورٹ ولیم کالج کے نظم و نسق کے سربراہ پرو۔ ووسٹ کا مخصوص دائرہ کار اور مقدس فرض ہوگا کہ ادارے کے اخلاقی، مذہبی مفادات اور مزاج و منہاج (کیریکٹر) کی نگرانی کرے اور مستعدی کے ساتھ اس کے جملہ اراکین کے طرز عمل اور اصولوں کی نگہداشت کرے۔ اس معتبر ذمے داری کو بطور خاص اس طرح انجام دے گا کہ کالج کے ایسے پروفیسروں اور افسروں کو تنبیہہ و ہدایت کرے گا جو اپنی ڈیوٹی سے غفلت برتیں گے یا طلبہ کے لیے ایک ایسی موزوں مثال بننے میں ناکام رہیں گے جن کی وہ پیروی کر سکیں اور اگر اس کی تنبیہہ و ہدایت غیر موثر ثابت ہوگی تو اس معاملے کی صورت حال سے وزیٹر کو مطلع کرے گا۔

جو طلبہ غیر شائستہ طرز عمل کے مرتکب ہوں گے یا جو کالج کے اصولوں کو یا آئین و قوانین کو نظر انداز کریں گے یا دانستہ عدول حکمی کریں گے، ان کو پرو۔ ووسٹ کی طرف سے نجی طور پر یا کالج کی کونسل کی طرف سے معاملے کی نوعیت اور صورت حال کے لحاظ سے تنبیہہ کی جائے گی۔

جب خلاف ورزی کا ارتکاب ایسا سنگین ہو کہ اس قسم کی کارروائی ضروری ہو جائے تو کالج کے آئین و قوانین یا اصولوں کی خلاف ورزی کرنے والے یا نظم و ضبط، اخلاقیات یا مذہب کے اصولوں کو پامال کرنے والے طالب علم کا نام کالج کی طرف سے وزیٹر کے علم و اطلاع میں لایا جائے گا۔

۱۰۔ کالج کی کونسل سے متعلق: کالج کی کونسل پانچ اراکین پر مشتمل ہوگی، جن میں سے

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

پرو۔ ووسٹ اور وائس پرو۔ ووسٹ فی الوقت، دو ہوں گے۔ باقی تین اراکین وزی ٹر کی طرف سے مقرر کیے جائیں گے۔ کوئی بھی چار یا تین اراکین مل کر کونسل (کے کورم) کی تشکیل کریں گے، بہ شرطیکہ پرو۔ ووسٹ یا وائس پرو۔ ووسٹ موجود ہو۔

کالج کے نظم و نسق کے لیے کالج کی کونسل کسی نئے قانون (statute) کے اجرا، یا کسی موجودہ قانون میں رد و بدل یا اس کی منسوخی کی تجویز وزی ٹر کو پیش کرنے کی مجاز ہوگی۔

کالج کی کونسل کالج کے داخلی نظم و نسق اور ڈسپلن کے لیے قواعد اور نجی ضابطے جاری کرنے کی مجاز ہوگی ایسے تمام قواعد وقتاً فوقتاً معائنے کے لئے وزی ٹر کو پیش کیے جاتے رہیں گے اور تنہا اس کے اختیار (اتھارٹی) سے قابل منسوخی ہوں گے۔

کالج کی کونسل عمومی حالت کی تحقیق و تفتیش کیا کرے گی جس میں تمام ادائیگیاں اور چارجز، پروفیسروں، لیکچرروں، منشیوں، مولویوں اور پنڈتوں کے عملے شامل ہیں یا اسی میں وزی ٹر کو ایسی تبدیلیوں کی تجویز بھی پیش کرے گی جو مقتضائے حالات کے موافق معلوم ہوں کالج کی کونسل میں تمام مسائل (Question) کثرتِ آرا (majority of Voices) سے طے کئے جائیں گے۔ کسی ایسی صورت میں کہ آرا مساوی طور پر منقسم ہوں، پرو۔ ووسٹ یا اس کی غیر موجودگی میں وائس پرو۔ ووسٹ کالج کی کونسل کی جملہ کاروائی باقاعدگی سے وزی ٹر کو پیش کی جایا کرے گی۔

۲۔ پبلک میز اور کمروں سے متعلق فورٹ ولیم کالج کے طلبہ کو کالج کے خرچ پر کمرے مہیا کئے جائیں گے۔ کالج کے خرچ پر طلبہ کے لئے ایک پبلک میز بھی رکھی جائے گی۔

دوران میقات کوئی طالب علم ہفتے میں دو بار سے زیادہ خود کو پبلک میز سے غیر حاضر نہیں رکھے گا۔

۳۔ قرضوں سے متعلق ہر گاہ کہ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہر طالب علم تین سو سکہ روپے (تین سو روپے سکۂ رائج الوقت) کا ماہانہ الاؤنس پائے گا۔ اور

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کالج کے خرچ پر مشترک میز اور کمرے بھی فراہم کیئے جائیں گے۔ (دریں صورت) یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی طالب علم کالج میں اپنے قیام کے دوران (جسے داخلے کے وقت سے آخری امتحان تک شمار کیا جائے گا) قرضہ اپنے سر لے گا تو وہ کالج کی کونسل کی طرف قانون ۸ باب اول میں تجویز کردہ سرٹیفکیٹ وصول نہیں کر سکے گا تا آں کہ وہ کالج کی کونسل کو اس قرضے کی رقم کے بارے میں ایک اطمینان بخش بیان حل کر دے، جس بیان کو سرٹیفکیٹ مذکورہ کے ساتھ ملحق کر دیا جائے گا۔"[1]

ویلزلی

سرپرست اور وزیٹر کے حکم سے

ڈیوڈ براؤن

کالج کمیٹی کالج کے دستور کے مطابق کالج کے انتظامی اور تعلیمی امور کی دیکھ بھال کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔

۱۸ ستمبر ۱۸۰۰ء کے اعلان میں مندرجہ ذیل ارکان کے نام شائع ہوئے تھے۔

۱۔ پرووسٹ — پادری رورنڈ ڈیوڈ براؤن[2]

۲۔ وائس پرووسٹ — پادری رورنڈ کلوڈیس بکے نن

۳۔ رکن — جارج ہلے رو بارلو

۴۔ " — این۔ بی۔ ایڈمونسٹن

۵۔ " — لفٹننٹ کرنل ولیم کرک پیٹرک

کالج کا نصاب: فورٹ ولیم کالج دراصل گل کرسٹ کی فکر رسا کی پیداوار تھا۔ اس کی مشرقی ادب السنہ سے دلچسپی اور تشویق و ترغیب ہی نے لارڈ ولزلی کے ذہن کو ایک مشرقی کالج کے قیام کی جانب مبذول کیا تھا لیکن ولزلی نے کالج کا جو نظام وسیع و وقیع ہیولا تیار کیا وہ حقیقتاً ایک یونیورسٹی کے تصور سے مطابقت رکھتا تھا اس نے دیسی ملکی زبانوں کی تعلیم کے انتظام پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ یورپی ادب السنہ اور جدید علوم

---

[1] نقوش لاہور دسمبر ۱۹۶۶ء ص ۴۹ تا ۵۱

[2] یہ فورٹ ولیم کالج کا فرسٹ چیپلین (اعلیٰ پادری) اور کلکتہ بائبل سوسائٹی کا بانی تھا۔ اس کی لسانی لیاقت اور دانائی کی شہرت مغربی ممالک میں بھی تھی۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

فنون کے ساتھ ساتھ قانون و علم تمدن کے مضامین بھی شامل نصاب کیے تھے۔ درسیات کے اس وسعت اور تنوع کا اندازہ مضامین کی مندرجہ ذیل فہرست سے کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ زبانیں: **الف** ۔ مشرقی زبانیں۔ عربی، فارسی، ہندوستانی، سنسکرت، بنگلہ، تلگو، مرہٹی تامل اور کنڑ۔

ب۔ یورپی زبانیں۔ یونانی، لاطینی اور انگریزی

۲۔ قوانین اسلامی فقہ، ہندو دھرم شاستر، علم اخلاق، علم قانون، قوانین اقوام، قانون انگلستان، گورنر جنرل کی کونسل، قلعہ سینٹ جارج اور بمبئی پریسیڈنس کی حکومتوں کے نافذ کردہ قوانین۔

۳۔ تجارتی و کاروباری مضامین معاشیات، تجارتی اداروں خصوصاً ایسٹ انڈیا کمپنی کے مفاد کی تعلیم، جغرافیہ اور علم حساب۔

۴۔ تاریخ قدیم وجدید تاریخ (عالم) ہندوستان اور دکن کی قدیم وجدید تاریخ

۵۔ سائنس: علم نباتات، علم کیمیا (Chimistry)، علم نجوم اور تاریخ طبعی (نیچرل ہسٹری)

کالج میں پروفیسروں کا تقرر:

۱۸ راگست ۱۸۰۰ء کے ایک سرکاری اعلان حسب ذیل پروفیسروں کا تقرر عمل میں آیا۔

۱۔ جان بیلی	(John Baillie)	شعبۂ عربی زبان و اسلامی فقہ
۲۔ ولیم کرک پیٹرک	W. Kirkpatrick	شعبۂ فارسی زبان وادب
۳۔ فرانسس گلیڈوِن	France Gladwin	شعبۂ فارسی زبان وادب
۴۔ ایڈمونسٹن	N.B. Edmonstone	شعبۂ فارسی زبان وادب
۵۔ گل کرسٹ	Gilchrist	شعبۂ ہندوستانی
۶۔ جارج ہلے روبارلو	G.H. Barlow	شعبۂ قانون

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۷۔ ریورنڈ بکنن Rev. Buchanan شعبۂ یونانی، لاطینی اور انگریزی

معلمین کا تقرر:

ولیم کیری[1]	Mr. W. Carey	بنگالی اور سنسکرت، زبانوں میں
جیمس ڈنوڈی ایل ایل ڈی	Mr. J. Dinwiddie L.L.D.	ریاضیات میں
ڈیو پلے سی	Mr. Du Plessy	جدید زبانوں میں
لمسن ڈن	Mr. Lumsden	فارسی میں مددگار معلم
روتھ مین	Mr. Rothman	کالج کونسل کے سکریٹری[2]
ہارنگٹن	Mr. Harngtan	قانون میں[3]

اس کے بعد ۶ جنوری ۱۸۰۱ء کو ایڈورڈ اسکاٹ وارنگ کا تقرر بہ حیثیت مددگار معلم شعبہ ہندوستانی میں عمل میں آیا۔[4]

منشیوں کا تقرر:

کالج کے دستور کی رو سے پروفیسروں اور معلمین (ٹیچروں) کے عہدے صرف یورپی عالموں کے لیے مخصوص تھے۔ پروفیسروں سے عہدہ سنبھالتے وقت عیسائیت کی تبلیغ و حفاظت کا حلف لیا جاتا تھا۔ ہندوستانیوں کے لیے صرف ہیڈ منشی، نائب منشی، مترجمین اور سرٹیفکیٹ

---

[1] یہ بھی ایک پادری تھا، جو سیرام پور مشن کا سربراہ تھا۔ اس کا تقرر اس کے مذہبی جذبات کے پیش نظر کیا گیا تھا۔

[2] نقوش، دسمبر ۱۹۸۶ء ص ۴۸ تا ۵۲ اور فورٹ ولیم کالج ص ۱۹

[3] [4] ایشیاٹک اینول رجسٹر ۱۸۰۱ء لندن (۱۸۰۲ء) ص ۴۴
بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۹

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

منشی[1] کی جگہیں تھیں[2]۔ ۲۹ر اپریل ۱۸۰۱ء کے اجلاس میں کونسل نے عربی، فارسی ہندوستانی اور بنگلہ شعبوں میں ایک ایک ہیڈ منشی ایک ایک نائب منشی اور طلبہ کی تعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے ضرورت کے مطابق دیگر منشی رکھنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن کل ملا کر پچاس منشیوں سے زیادہ نہیں رکھے جا سکتے تھے۔ اس کے مطابق ۴ر مئی ۱۸۰۱ء کو کالج کونسل کے اجلاس میں فارسی، عربی ہندوستانی اور سنسکرت و بنگلہ کے ہیڈ اور سکنڈ منشیوں اور مولویوں کا تقرر عمل میں آیا۔ چوں کہ ہمارے مطالعے کا دائرہ ہندوستانی شعبے تک محدود ہے اس لیے صرف اس شعبے کے منشیوں کی فہرست سطور ذیل میں پیش کی جاتی ہے:-

نام	عہدہ		
۱۔ میر بہادر علی حسینی	ہیڈ منشی	ماہانہ تنخواہ	۲۰۰ روپیے
۲۔ تارنی چرن مشر	سکنڈ منشی	" "	۱۰۰ "
۳۔ مرتضیٰ خاں	منشی	"	۴۰ "
۴۔ غلام اکبر	"	"	" "
۵۔ نصر اللہ	"	"	" "
۶۔ میر امن	"	"	" "
۷۔ غلام اشرف	"	"	" "
۸۔ جلال الدین	"	"	" "
۹۔ محمد صادق	"	"	" "

---

[1] یہ کالج کے باقاعدہ ملازم نہیں ہوتے تھے لیکن جب کبھی کالج کو ضرورت پیش آتی انھیں رکھ لیا جاتا تھا۔ وہ جتنے دن کام کرتے تیس روپے ماہانہ کے حساب سے انھیں اتنے دن کی تنخواہ دی جاتی تھی۔ سرٹیفکیٹ منشی انھیں اس لیے کہا جاتا تھا کہ انھیں باقاعدہ کالج کا امتحان پاس کرنا پڑتا تھا، جو لوگ کامیاب ہوتے تھے انھیں سرٹیفکیٹ دیا جاتا تھا۔ انھیں سندی یا سند یافتہ منشی بھی کہا جاتا تھا۔ ان کی حیثیت منشی اور ماتحت منشی سے کم ہوتی تھی۔ انھیں طلبہ کو اپنے گھر پڑھانے کا اختیار بھی حاصل تھا۔

[2] سید ظہیر الحسن، نوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۵ء

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۱۰۔ رحمت اللہ خاں	منشی	ماہانہ تنخواہ	۴۰ روپیے
۱۱۔ غلام غوث	〃	〃	〃 〃
۱۲۔ کندن لعل	〃	〃	〃 〃
۱۳۔ کاشی راج	〃	〃	〃 〃
۱۴۔ میر حیدر بخش حیدری	〃	〃	〃 〃

اکتوبر ۱۸۰۱ء تک ہندوستانی شعبے کے چار منشیوں محمد صادق، رحمت اللہ خاں، کاشی راج اور غلام غوث نے یا تو استعفا دے دیا یا انھیں برطرف کر دیا گیا تھا۔ ان کی جگہوں پر جن چار منشیوں کا تقرر ہوا ان کے نام ہیں سید جعفر، محمد تقی، مبارک محی الدین اور اسد علی خاں ان کا مشاہرہ بھی چالیس روپیہ ماہانہ تھا۔

ہیڈ اور سکنڈ منشیوں کو اتوار کے علاوہ باقی تعطیلوں میں بھی دس بجے صبح سے ایک بجے دن تک کالج میں حاضر رہنا پڑتا تھا تاکہ طلبہ جب چاہیں ان سے استفادہ کر سکیں۔ کالج میں تعلیم کے اس انتظام کے علاوہ طلبہ کو باہری مدرسوں سے بھی استفادے کی اجازت حاصل تھی۔ لیکن شرط یہ تھی کہ وہ ان ہی منشیوں سے رجوع کریں جنھیں کالج کی طرف سے پڑھانے کی سند دی گئی ہو۔

کالج کی عمارت کے لیے جگہ کا انتخاب:

ولزلی کے منصوبے کے مطابق کالج کا احاطہ (Campus) ایسا ہونا چاہیے تھا جہاں پانچ سو طلبہ سارے اساتذہ، ایک پبلک ہال، ایک کتب خانہ اور گرجا گھر کے لئے جگہ ہو۔ اس کے لیے ولزلی نے گارڈن ریچ[1] کا انتخاب کیا۔ کالج کی عمارت تعمیر کرنے کی غرض سے سرکاری طور پر اس کا سروے بھی کر لیا گیا تھا۔ اس میں بسنے والے کاشت کاروں کی فہرست سازی، ان کی باز آبادکاری اور ان کی زمینوں کی قیمت متعین کرنے کی کارروائی بھی عمل میں آ چکی تھی۔ لیکن کالج

---

[1] گارڈن ریچ فورٹ ولیم کی دوسری جانب واقع ہے جو خضر پور سے متصل ہے۔ اس کے بعد مٹیا برج کا علاقہ پڑتا ہے۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کی پوری زندگی میں اس کی ایک عمارت بھی تعمیر نہ ہو سکی۔ بلکہ اس منصوبے کو بعد میں ملتوی کر کے ایک بہت بڑی عمارت اور پانچ دوسری عمارتیں[1] بیش قرار قیمتوں پر خریدی گئیں۔ سب سے بڑی عمارت طلبہ کے لئے طعام گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی جس میں سارے طلبہ ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے۔[2]

کالج کے اخراجات کا انتظام :

کالج چلانے کے لیے ایک خطیر وکثیر رقم کی ضرورت تھی جس کے لیے ڈائرکٹر راضی نہ تھے۔ لیکن ولزلی جیسے مدبر شخص کے لیے روپیے کی فراہمی کوئی پریشان کن مسئلہ نہیں تھا، اور نہ اس کے منصوبے میں فی الواقع مالی مشکلات سدراہ بنی۔ اس نے اپنی ذمہ داری پر مختلف ذرائع سے اخراجات کا انتظام کیا۔ چناں چہ پہلے سال کا خرچ اس طرح پورا کیا گیا کہ

"۱۔ کمپنی جونشی الاؤنس اپنے ملازمین کو فرداً فرداً دیا کرتی تھی اسے روک کر جمع کر لیا۔

۲۔ ہند اور بیرون ہند کے سول ملازمین سے بطور چندے کے رقمیں وصول کیں۔

۳۔ گورنمنٹ پرنٹنگ پریس سے جو فائدے ہو رہے تھے، ان رقوم کو بھی حاصل کیا۔

۴۔ بنگال اور میسور کی مال گزاری امداد کے طور پر حاصل کی"[3]

اسی کے ساتھ انھوں نے ہندوستان میں برطانوی مفادات کے بہی خواہوں سے کورٹ کے زیر صدارت یورپ سے چندہ جمع کرنے کی اپیل کی۔ اس طرح سے گورنر جنرل نے یہ ثابت کر دیا کہ شروع میں کمپنی پر زیادہ بار نہ پڑے گا۔ سالانہ اخراجات کے لیے جتنے روپیے کی منظوری اس نے دی ہے اس سے کام چل جائے گا۔ لیکن بنگال اور میسور کی مال گزاری سے کچھ روپیے کالج کے لیے مقرر کر دیے جائیں تاکہ آئندہ اس کی بقا اور ترقی کی راہ میں مالی

---

[1] غالباً یہ عمارتیں لال بازار اور چیت پور کے قریب تھیں اور ان عمارتوں میں بھی کلاسیں چلتے تھے۔

[2] Siddiqur Rahman Qidwai, Gilchrist and the Language of Hindustan ... P.17

[3] ایضاً " " " " P.18

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

مشکلات حائل نہ ہوں۔

کالج میں طلبہ کا داخلہ:

۱۶ اکتوبر ۱۸۰۰ء کو مدراس اور بمبئی کے گورنروں کو مطلع کیا گیا کہ ۱۷۹۸ء میں آئے ہوئے کمپنی کے ملازمین میں سے جو لوگ فورٹ ولیم کالج میں داخلے کے خواہش مند ہوں انھیں اس کی اجازت دے دی جائے۔ ۲۰ اکتوبر کو گورنر جنرل نے ایک قرار داد کے ذریعے سول ملازمین کا منشی الاؤنس بند کرنے کا حکم بھی جاری کر دیا۔ ۴ نومبر ۱۸۰۰ء کو ایک سرکاری اعلان میں کہا گیا کہ ۴ مئی ۱۷۹۸ء اور دسمبر ۱۷۹۸ء کے درمیان آئے ہوئے بنگال پریسیڈنسی کے جو ملازمین چاہیں وہ کالج میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ ان اعلانوں کے بعد کلکتہ، راج شاہی، میمن سنگھ، جون پور، پٹنہ بھاگل پور، سارن، چاٹ گام، مالدہ، ڈھاکا، مرشد آباد، رنگ پور، مدراس، بمبئی اور کمپنی کے دیگر مقبوضات سے سرکاری ملازمین داخلے کے لیے آنا شروع ہو گیے۔ اور پہلے سال میں چونسٹھ (۶۴) طلبہ کا داخلہ ہوا[1]

کالج میں تعلیم کی ابتدا:

کالج کی داغ بیل ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء کو ڈالی گئی لیکن درس و تدریس کا سلسلہ ۲۴ نومبر سے پہلے شروع نہ ہو سکا۔ پروسٹ نے ۱۵ نومبر ۱۸۰۰ء کو عربی فارسی اور ہندوستانی زبانوں پر لکچروں کے آغاز کا نوٹس جاری کیا۔ یہ لکچرز ۲۴ نومبر ۱۸۰۰ء سے شروع ہو کر دسمبر کے آخر تک چلتے رہے۔ لیکن باقاعدہ طور پر درس و تدریس کا آغاز ۶ فروری ۱۸۰۱ء سے کیا گیا[2]

---

[1] وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۱۹

[2] سلیم اختر، مقدمہ باغ و بہار ص ۱۰۔ وارشنے کا یہ خیال صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ "کالج کا پہلا سشن باقاعدہ طور پر ۶ جنوری ۱۸۰۱ء سے رکھا گیا۔ (فورٹ ولیم کالج ص ۱۹-۱۰) کیوں کہ دستور کے مطابق کالج کی پہلی میقات ۶ فروری سے شروع ہوتی تھی اور جنوری کا مہینہ وقفے کا ہوتا تھا۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

طلبہ کے کردار کے لیے کالج میں خاص اہتمام :

لارڈ ولزلی کو سول ملازمین کے لیے دیسی زبانوں کی تعلیم کے انتظام کے ساتھ ساتھ ان کے کردار و اخلاق درست کرنے کی فکر بھی لاحق تھی۔ کیوں کہ وہ طلبہ کم سنی میں انگلینڈ کو خیرباد کہہ کر ہندوستان چلے آتے تھے اور سماجی شعور اور علمی تجربے کے اعتبار سے بالکل ناپختہ ہوتے تھے۔ اس لیے ان کی تہذیب و تربیت اور اخلاقی حیثیت سے انھیں وقیع بنانے کے لیے کالج میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیتی پروگرام کا بھی اہتمام کیا گیا تھا جس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ بہ قول صدیق الرحمٰن قدوائی

"کالج کے ذمہ داروں نے طلبہ کے کردار اور نظم و نسق کی اصلاح پر بہت زیادہ توجہ صرف کی۔ ان کے سارے کام نجی ہول یا سرکاری پرووسٹ کے زیر نگرانی ہوتے تھے۔ اس طرح پرووسٹ کی وساطت سے گورنمنٹ کی نگرانی ہوتی تھی۔ باری باری سے ہر طالب علم ایک ہفتہ کے لیے ہاسٹل کے ٹیبل (طعام گاہ) کے صدر کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اپنے ساتھی طلبہ کی حرکتوں کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اور ان طلبہ کی پرووسٹ کو رپورٹ دینے کا ذمہ دار تھا جو دو مرتبہ سے زیادہ طعام گاہ سے غیر حاضر ہوتے تھے۔ پروفیسر بھی باری باری سے طلبہ کے ساتھ کھانا کھایا کرتے تھے۔ انھیں دوران لکچر بھی طلبہ کی حاضری لینے کی ذمہ داری سپرد تھی۔ ہیڈ اور نائب منشیوں کا یہ فرض تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ طلبہ کی علمی مدد کرتے رہیں۔ ۔ ۔ جو طالب علم ضابطے کی خلاف ورزی کرتا اس پر جرمانہ عاید کیا جاتا تھا۔ کالج کے رکارڈز ظاہر کرتے ہیں کہ اس قسم کی سخت نگرانی سے طلبہ کے کردار میں ایک مثالی اصلاح ہوئی تھی"[1]

---

[1] Gilchrist and the Language of Hindoostan P. 22-23

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

گورنر جنرل اور کورٹ کے درمیان کش مکش :

قیام کالج کے متعلق گورنر جنرل کے فیصلے پر کورٹ کے مخالفانہ ردعمل کو مالی مشکلات پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ جہاں تک مالیات کا تعلق تھا گورنر جنرل نے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ اس کا بار کمپنی پر نہیں پڑنے دیں گے۔ ڈائرکٹروں کے لیے سب سے بڑی پریشانی یہ ہوئی کہ کالج کے قیام سے ملازمین کی تقرری ان کے ہاتھ سے جاتی رہی۔ کیوں کہ اس سے پہلے ہندوستانی ملازمین کے تقرر ڈائرکٹروں کی پیشگی نامزدگی پر ہوا کرتے تھے[1]۔ ہندوستان میں ملازمت کرنے کا مطلب دولت کمانے کا ایک لائسنس تھا۔ کمپنی کی سول ملازمت کا کھلا اشتہار ہوتا تھا جو قیمتاً فروخت ہوتی تھی۔ دوسری بات جو ڈائرکٹروں کو کھٹکتی تھی وہ یہ کہ مختلف پریسیڈنسیو کے نوجوان جب ایک جگہ طالب علم کی حیثیت سے جمع ہوں گے تو ان کے اندر حریت اور سرکشی کے جذبات و خیالات پرورش پائیں گے اور پروان چڑھیں گے جس سے برصغیر ہند میں برطانوی اقتدار کی بنیاد پر کاری ضرب لگے گی اور کمپنی کے مفاد کو نقصان پہنچے گا۔ انگلینڈ کے غیر جانب دار لوگ سول ملازمین کی تربیت کے لیے ایک ادارے کے قیام سے تو متفق تھے لیکن ان کے خیال کے مطابق اس طرح کی تعلیم و تربیت کے لیے انگلینڈ ہی بہتر جگہ تھی کالج کی مخالفت میں چاہے کتنے ہی منطقی دلائل پیش کئے جائیں لیکن سچی اور صحیح بات تو یہ ہے کہ ہندوستان میں صالح خیالات کا ابھرنا ڈائرکٹروں کو پسند نہیں تھا۔ ولزلی نے کالج قائم کرنے سے پہلے کورٹ کو اس لیے مطلع نہیں کیا کہ اخراجات کے پیش نظر ڈائرکٹر اس کی اجازت نہیں دیں گے اور کالج کا قیام کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ لیکن انھیں اس کا بھی یقین تھا کہ کالج کے قیام کے بعد ڈائرکٹرز اسے توڑنے سے پہلے اپنے فیصلے کے نتائج و عواقب پر سنجیدگی سے غور کریں گے اور توڑنے کا حکم بہرحال نہیں دیں گے۔

---

[1] Gilchrist's India Language of Hindoostan P. 19

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کالج توڑنے کا حکم؛

کالج کا نظم بہتر طور پر چلانے کے لیے ولزلی نے کالج کے پہلے دستور کا پہلا باب (chapters) منظور کیا۔ جسے وزی ٹر کی اجازت سے پردوسٹ نے ۱۰ اپریل ۱۸۰۱ء سے نافذ کیا۔ ان ہی دنوں ڈائرکٹروں کی ایک بڑی تعداد ولزلی کے خلاف خفیہ سازش کرنے لگی تھی۔ ایسی حالت میں ان کا اپنے عہدے پر قائم رہنا مشکل تھا۔ انھوں نے ڈائرکٹروں کو لکھا کہ ۱۸۰۲ء کے اواخر یا ۱۸۰۲ء کے اوائل میں وہ انگلینڈ واپس چلے جائیں گے۔ لیکن کچھ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر کورٹ نے ان سے جنوری ۱۸۰۴ء تک رکنے کی درخواست کی[1]۔ اس پر ولزلی نے ۱۰ جنوری ۱۸۰۲ء کو رائٹ آنریبل ہنری ایڈنگٹن کے نام ایک خط میں لکھا کہ جو وقت میں نے ہندوستان میں رکنے کا متعین کیا ہے اس سے زیادہ میرا رکنا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ کیوں کہ ڈائرکٹروں کا اعتماد مجھ پر ختم ہوتا جارہا ہے اور برٹش انڈیا کی فلاح و بہبود کے لیے فورٹ ولیم کالج کا جو منصوبہ میں نے بنایا ہے وہ ڈائرکٹروں کو باطل پسند نہیں۔ بالآخر انھیں ڈائرکٹروں کی طرف سے ۲۷ مارچ ۱۸۰۱ء کا لکھا ہوا ایک خط موصول ہوا جس نے ان کے خرمن امید پر بجلی گرادی۔ اس خط میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا ان کا خلاصہ یہ ہے

"فورٹ ولیم میں ایک کالج کے قیام کے سلسلے میں مارکوس ولزلی کی تجاویز پر ہم نے کافی غور و خوص کیا، اگرچہ ہمیں ولزلی کی تجاویز کا جو وسیع النظری، بلند خیالی اور اعلا قابلیت سے مملو ہیں، مبنی بر انصاف ہونا تسلیم ہے۔ تاہم موجودہ حالات میں جب کہ کمپنی قرض کے بھاری بوجھ کے تلے دبی ہوئی ہے اور روپیے کی کمی کی وجہ بہت سے کاموں میں یا تو تخفیف کردی گئی ہے یا انھیں بالکل بند کردیا گیا ہے، ہم اپنے فرض کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک ادارے کے فوری قیام کے منصوبے کو جس کے کچھ حصے ہمیں پسند ہیں اپنی منظوری نہیں دے سکتے۔ ادارے کے قیام پر خرچ کی جانے والی رقم کسی دوسرے منفعت بخش

---

[1] وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۲۰

کام میں لگائی جاسکتی ہے۔"

"پیشگی اطلاع اور منظوری کے بغیر کالج قائم کرنے کے سلسلے میں گورنر جنرل کی سے توجیہات پر ہم نے بطور خاص غور کیا ہے۔ ان کے جذبات قابل تحسین ہیں لیکن ایک مسلمہ ضابطے سے انحراف کی اجازت ہم کبھی نہیں دے سکتے۔ کیوں کہ اس رجحان سے اس ملک میں قانونی طور پر قائم شدہ اقتدار کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہے۔"

"گورنر جنرل کی تجاویز پر کسی قسم کی بحث کیے بغیر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ کمپنی کی موجودہ حالت کے پیشِ نظر ان تجاویز کو روبہ عمل لانا بس کے باہر کی چیز ہے۔"

"دسمبر ۱۷۹۸ء میں گل کرسٹ نے علوم کی تدریس کے لیے ایک سمنری ادارہ قائم کرنے کی تجویز رکھی تھی۔ اسی کے اصولوں کی روشنی میں بڑے پیمانے پر ایک ادارے کے قیام سے ہمارے نزدیک ان مفید نتائج کا حصول ممکن ہے جن کی توقع گورنر جنرل اپنے مجوزہ ادارے سے کرتے ہیں۔ اس سمنری میں پڑھنے والوں کے جون ۱۸۰۰ء کے امتحان کے نتیجے سے ہمارے اس قیاس کو مزید تقویت ملتی ہے۔ اس لئے ہم آپ کو اس ادارے کی تجدید پر غور کرنے کی اجازت دیتے ہیں کیونکہ ہماری رائے میں اسے کمپنی پر اخراجات کا زیادہ بوجھ ڈالے بغیر بحسن وخوبی چلایا جاسکتا ہے۔"

"لہٰذا اس خط کے موصول ہوتے ہی کالج سے متعلق جتنے بھی اخراجات ہوں فوراً بند کر دیے جائیں اور ساتھ ہی دیگر علاقوں سے بلائے گئے طلبہ جلد سے جلد واپس بھیج دے جائیں۔"[1]

ولزلی نے کورٹ کے حکم کی تعمیل میں ۲۴ جون ۱۸۰۲ء کو کالج توڑنے کی ہدایت تو جاری کر دی، لیکن اپنے خاص اختیار سے سلسلہ تعلیم کے اختتام کی قطعی تاریخ ملتوی رکھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کام بہ تدریج ہونا چاہیئے اور کسی بھی حالت میں ۳۱ دسمبر ۱۸۰۳ء سے قبل کالج کا بند کرنا مناسب نہ ہوگا کیوں کہ دستور کے مطابق ۱۷۹۹ء اور ۱۸۰۰ء میں بمبئی اور مدراس سے آئے ہوئے طلبہ دسمبر ۱۸۰۲ء تک اور ۱۸۰۱ء میں آئے ہوئے طلبہ ۱۸۰۲ء کے

---

[1] بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۲۲۔۳۰

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

آخیر تک اپنی تعلیم مکمل کر سکیں گے۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اساتذہ اور منشیوں سے جو معاہدے ہو چکے ہیں ان کا پورا کرنا بھی فرض ہے۔ ولزلی کے لیے یہ بات باعث شرم و عار تھی کہ اہل علم حضرات جو دور دراز علاقوں سے مدعو کیے گیے ہیں انھیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر کیا جائے اور وہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جاکر یہ کہتے پھریں کہ برطانوی حکومت ان اخراجات کو برداشت نہیں کرسکتی جنھیں اس نے علم و ادب کی توسیع و ترقی کے لیے اپنے ذمہ لیا تھا۔

۱۵ اگست ۱۸۰۲ء کو ولزلی نے اپنے ایک مراسلے میں ڈائرکٹروں کو لکھا کہ ۳۱ دسمبر ۱۸۰۲ء سے قبل کالج توڑ کر کے میں آپ کی وفاداری کا فریضہ تو انجام دے سکتا ہوں لیکن یقین کیجئے کہ اس کے لیے مجھے اپنے مستحکم اعتقاد کو خیرباد کہنا پڑے گا اور اپنے دلی جذبات کی آگ کو بجھا دینا پڑے گا اور اگر اس بات پر غور کروں کہ اس کالج کی بقا سے عوام کو کتنے فائدے پہنچ سکتے ہیں اور اسے توڑ دینے سے انھیں کتنی پریشانیاں لاحق ہوں گی تو میرے دل کو بڑا صدمہ پہنچے گا۔[۱]

کورٹ نے کالج توڑنے کے جواز میں مالی مشکلات کا خاص طور سے ذکر کیا تھا۔ اس کے جواب میں گورنر جنرل نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ پچھلے نو مہینوں کے حساب سے کورٹ کو اندازہ ہوگا کہ کمپنی کے اوپر قرض اب بہت کم رہ گیا ہے۔ بنگال، بمبئی اور مدراس میں جو رقوم خرچ ہو رہی ہیں ان سے اب فائدہ ہی فائدہ ہوگا اور ہندوستان کے سیاسی حالات بھی اب اعتدال پر ہیں جس سے کمپنی کے خزانے میں اضافے کی قوی امید ہے۔ ٹیکس کا ذکر کرتے ہوئے ولزلی نے لکھا تھا کہ ۱۸۰۲-۱۸۰۱ء میں نئے ٹیکس سے بارہ لاکھ ستر ہزار روپیے کی مزید آمدنی ہوئی ہے جبکہ اگلے سال چودہ لاکھ کی امید ہے۔[۲] کالج پر کیے گیے اخراجات کی معقولیت کا اندازہ اس کے اغراض و مقاصد اور اس سے ہونے والے فوائد سے کیا جاسکتا ہے

---

[۱] بحوالہ Gilchrist and the language of Hindoostan p. 21

[۲] بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۳۴

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

اس کے علاوہ ولزلی نے اپنے ہم خیال اور ہمدرد افراد کا ایک حلقہ بنانے کے لیے انگلینڈ کے دوسرے بااثر لوگوں سے بھی مراسلت شروع کی۔ ۵۔ اگست ۱۸۰۲ء ہی کو اس نے رائٹ آنریبل دی ارل آف ڈارٹ منتھ کو ایک خط لکھا اور اس کے ساتھ کورٹ کو لکھے گیے خط کی ایک نقل بھی منسلک کر دی۔ ولزلی نے اس خط میں ان سے گذارش کی تھی کہ کالج کی تجدید کے لیے آپ سے جو کچھ ہو سکے کریں ورنہ میرے فیصلے کے بموجب کالج توڑ دیا جائے گا۔ اس طرح کی خط وکتابت سے ولزلی نے متعدد اعلیٰ افسروں اور انگلینڈ کے معزز لوگوں کو اپنا ہم خیال و ہم نوا بنا لیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بورڈ آف کنٹرول بھی ہر طرح سے اس کی معاونت و مساعدت کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

کالج میں عارضی ہنگامہ :

ولزلی چاہتا تھا کہ جب تک اس قضیے کا قطعی اور آخری فیصلہ نہ ہو جائے تب تک اس خبر کو صیغۂ راز میں رکھا جائے لیکن ایسی خبروں کو تو پر لگ جاتے ہیں چناں چہ یہ خبر بھی کونسل تک ہی محدود و محصور نہ رہ سکی بلکہ جنگل کی آگ کی طرح کالج تک جا پہنچی جس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کے اساتذہ وطلبہ میں بے چینی پھیل گئی۔ نائب پرووسٹ پادری بکے نن نے ۱۴۔ جون ۱۸۰۲ء کو طلبہ کے نام ایک نوٹس جاری کر کے بمشکل ان کے برانگیختہ جذبات کو ٹھنڈا کیا۔

کورٹ اور ولزلی میں مصالحت اور کالج کی تجدید کا حکم :

کورٹ اور ولزلی کے تصادم میں انگلینڈ کے وہ سبھی لوگ ملوث ہو گئے تھے جو ولزلی کے ہم خیال تھے۔ ولزلی اور بورڈ آف کنٹرول نے اس معاملے کو پارلیمنٹ میں لے جانے کی دھمکی دی۔ اس دھمکی نے کورٹ کو ایک حد تک ٹھنڈا کر دیا تھا۔ کیوں کہ پارلیمنٹ میں لے جانے کا مطلب یہ تھا کہ کمپنی کے سارے معاملات کھل کر سامنے آئیں۔ اس سے ڈائرکٹروں

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کے ذاتی مفاد پر پانی پھر جاتا اس لیے انھیں صلح پر مجبور ہونا پڑا۔ چارس گرانٹ[1] نے اس کا حل یہ نکالا کہ کالج کو ختم نہ کیا جائے بلکہ اس کا دائرہ عمل کچھ فروعات کو کم کر کے دیسی زبانوں اور قوانین کی تعلیم تک محدود کر دیا جائے۔ اس تجویز کے بعد ڈائرکٹروں نے ۲ ستمبر ۱۸۰۳ء کے مراسلے میں تاحکم ثانی کالج کو بدستور قایم وجاری رہنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔[2]

ولزلی کی انگلینڈ واپسی اور کالج کی حیثیت!

اس صفائی اور مصالحت کے باوجود گورنر جنرل اور کورٹ کے درمیان تلخیوں کا سلسلہ جاری رہا تاہم اپنی ناگزیر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ولزلی کو کچھ دنوں تک ہندستان میں رکنا پڑا۔ ۱۸۰۵ء میں کورٹ نے اس پر تین الزامات عاید کیے۔

۱۔ کورٹ کی حکم عدولی، اور انتہائی ضروری معاملات میں حکومت کی منظوری حاصل نہ کرنا۔

۲۔ ملازمین کی غیر قانونی تقرری کرنا۔

۳۔ قانون کی خلاف ورزی اور عوام کے سرمائے کا بے جا مصرف۔

اس پر ولزلی اپنے غصے کو قابو میں نہ رکھ سکا اور اسی سال ۱۵۔ اگست ۱۸۰۵ء کو استعفا دے کر انگلینڈ کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس سے قبل پرووسٹ ڈیوڈ براؤن کو کالج کو محدود پیمانے پر چلانے کا حکم مل چکا تھا، جو ڈائرکٹروں کے منشا کے عین مطابق تھا۔ پرووسٹ نے ۱۸۰۶ء میں کالج کے لیے دوسرا دستور مرتب کر کے گورنر جنرل کی کونسل میں پیش کیا، اور ۳۱ دسمبر ۱۸۰۶ء کو گورنر جنرل بارلو نے اس کی منظوری عطا کی۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کالج صرف نام کا کالج رہ گیا۔ اس کی حیثیت گھٹ کر صرف بنگال سول سرونٹس کے لیے ایک سمنری کی رہ گئی۔

---

[1] چارس گرانٹ دو مرتبہ ہندستان آچکے تھے۔ اب وہ مستقلاً انگلینڈ میں رہ کر عیسائیت کی تبلیغ میں سرگرم عمل تھے اور ارباب سیاست سے بھی ان کے خوش گوار تعلقات تھے۔

[2] عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۴۲۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

جان گل کرسٹ: صدر شعبۂ ہندوستانی: (اگست ۱۸۰۰ء تا فروری ۱۸۰۴ء)

یہ ایک عجیب سوءِ اتفاق تھا کہ فورٹ ولیم کالج کے معرض وجود میں آتے ہی اس کے اندر اور باہر تصادم اور کشاکش کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک طرف ولزلی اور کورٹ کے درمیان رسہ کشی جاری تھی تو دوسری طرف کالج کے اندر گل کرسٹ اور کالج کونسل کے مابین اختلاف رائے اور ناخوش گوار مراسلت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور جس طرح ولزلی اور کورٹ کی نبرد آزمائی، ولزلی کے استعفے اور اس کی انگلینڈ مراجعت پر ختم ہوئی، اسی طرح گل کرسٹ اور کونسل کا تصادم بھی گل کرسٹ کے استعفے اور اس کی انگلینڈ واپسی پر منتج ہوا۔

کالج کے قیام سے قبل اُردو نثر میں کوئی ایسی عام فہم کتاب تصنیف نہیں ہوئی تھی جسے انگریز طلبہ آسانی سے پڑھ سکتے۔ اور جو کتابیں موجود تھیں وہ بھی چھاپے خانے کی عدم موجودگی کی وجہ سے زیادہ تعداد میں دستیاب نہیں ہوتی تھیں۔ اس لیے ہندوستانی نثر میں عام فہم اور سلیس کتابوں کی ضرورت محسوس کی گئی شروع میں کتابوں کے دستی نسخے تیار کرا کے کسی طرح کام چلایا گیا۔ لیکن نقل کرانے میں کافی غلطیاں رہ جاتی تھیں اور اس میں خرچ بھی زیادہ ہوتا تھا۔ چنانچہ کالج کونسل نے نومبر ۱۸۰۱ء میں یہ طے کیا کہ صدر شعبہ مختلف کتابوں کے مفید انتخابات مرتب کرکے انھیں چھپوائیں تاکہ آسانی سے کتابیں فراہم کی جا سکیں۔ لیکن کونسل نے یہ شرط بھی رکھی کہ شائع کرانے سے پہلے ان کتابوں کے مسودے کونسل کے پاس منظوری کے لیے بھیجنا ضروری ہوگا۔ اس فیصلے کے بعد ہندوستانی شعبے کے صدر مسٹر گل کرسٹ نے ۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء کو کالج کونسل کے نام ایک خط لکھا کہ

> "ہندوستانی میں ایسی کتابیں دستیاب نہیں ہیں جن سے تھوڑی بہت بھی مدد لی جا سکے۔ اس لیے مجھے حسب ذیل کتابیں مختلف شرح پر چھپانے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ اس کام کے لیے میں نے کلکتے کے تقریباً سبھی چھاپے خانوں کی مدد حاصل کرلی ہے، تاکہ کم وقت میں ہم اپنے گوہر مراد کو حاصل کرسکیں۔ مجھے یقین ہے کہ کالج کونسل اس اقدام کو قطعاً ناگزیر سمجھ کر ممکنہ طور

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

پر میری حوصلہ افزائی کرے گی۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ برسوں تک ان کتابوں کے نئے ایڈیشنوں کی ضرورت نہ پڑنے سے کالج کا مزید خرچ بھی نہ ہوگا اور آدھے نسخوں کی فروخت ہی سے کتاب کی پوری قیمت نکل آئے گی۔ چھپائی کا خرچ کم کرنے کی غرض سے نسخوں کی تعداد پانچ سو کر دی گئی ہے۔ اگر کالج کونسل ان کتابوں کی فروخت۔ برٹش انڈیا کی فلاح و بہبود کے لیے مفید سمجھے تو میں مستقبل میں پانچ سو کی بجائے ایک ہزار نسخے چھپوانے کی سفارش کر دوں گا۔"[1]

گل کرسٹ نے اس خط کے ساتھ کتابوں کی جو فہرست مع اخراجاتِ طباعت کے تخمینے کونسل کے پاس منظوری کے لیے بھیجی تھی، وہ حسب ذیل ہے۔

نام کتاب	تعداد	رسمِ خط	مطبع	تخمینۂ اخراجات (روپیوں میں)	کیفیتِ طباعت
۱۔ مسکین کے مرثیے	۵۰۰	ناگری	ہرکارہ پریس	۳۴۳	طباعت مکمل ہو چکی ہے
۲۔ سنگھاسن بتیسی	"	"	" "	۴۵۰۰	۲۶ صفحات چھاپے جا چکے ہیں
۳۔ شکنتلا ناٹک	"	"	کلکتہ گزٹ	۲۰۰۰	۲۴ " "
۴۔ اخلاق ہندی	"	"	ٹیلی گراف	۴۵۰۰	طباعت شروع
۵۔ مادھونل	"	"	---	۲۰۰۰	ابھی طباعت شروع نہیں ہوئی
۶۔ بیتال پچیسی	"	"	---	۸۵۰۰	" "
۷۔ چار درویش	"	فارسی	ہرکارہ پریس	۸۸۰۰	۵۸ صفحات چھپ چکے ہیں
۸۔ مثنوی میر حسن	"	"	کلکتہ گزٹ	۵۰۰۰	۳۶ " "
۹۔ گلستاں (اردو ترجمہ)	"	"	میرر پریس	۸۵۰۰	طباعت شروع
۱۰۔ توتا کہانی	"	"	ٹیلی گراف	۵۵۰۰	" "

[1] بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۴۴

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۱۱۔ گلشن (ہفت گلشن)	۵۰۰	فارسی	۔ ۔ ۔	۳۰۰۰	ابھی طباعت شروع نہیں ہوئی
۱۲۔ ہندوستانی پرنسپلس	۵۰۰	انگریزی	مارننگ پوسٹ	۲،۵۰۰	۴۰ صفحات چھپ چکے ہیں
۱۳۔ مشقیں	۲۰۰	تینوں زبانوں میں	۔ ۔ ۔	۱۰۰۰	طباعت شروع نہیں ہوئی
				۵۹۲۹۲	

ان کتابوں کے متعلق گل کرسٹ نے لکھا تھا کہ ان میں کالج کے منشیوں اور طالب علموں کے لیے سبھی سوالوں کے جوابات موجود ہوں گے۔ فہرست کے آخر میں انھوں نے یہ صراحت بھی کر دی تھی کہ اخراجات کا جو تخمینہ لگایا گیا ہے اس میں منشیوں اور مترجمین کی اجرت جس کی وہ کالج سے امید کرتے ہیں شامل نہیں ہے۔ سرسری اندازے کے مطابق اس مد پر چار ہزار روپیے سے زیادہ صرف نہ ہوں گے۔

کالج کونسل نے گل کرسٹ کے تخمینے کو دیکھنے کے بعد اس پر قطعی فیصلے کو ملتوی رکھتے ہوئے وقتی طور پر صرف "مسکیں کے مرثیے" کی پانچ سو کاپیاں چھاپنے کی منظوری دے دی۔ کتابوں کی طباعت کی کل لاگت تقریباً ۴۳ ہزار روپیے آتی تھی۔ اس لیے کونسل نے گل کرسٹ کو لکھا کہ آئندہ جب تک مسودات کونسل کو نہ دکھا دیے جائیں اور چھاپے جانے والے اجزا، ان کی تعداد اور ان پر خرچ کی منظوری نہ لے لی جائے تب تک اس مد میں کوئی رقم خرچ نہ کی جائے۔ نیز مستقبل میں کالج کی طرف سے طلبہ کو کتابوں کی فراہمی کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔ اس ہدایت کے ساتھ ہی ۲۰ جون ۱۸۰۱ء سے تا وقتِ تحریر جو کتابیں شائع ہو چکی تھیں ان کی فہرست اور اخراجات کی تفصیلات بھی گل کرسٹ سے طلب کی گئیں۔

گل کرسٹ نے ۱۲ جنوری کے محولہ بالا خط کا حوالہ دیتے ہوئے ۲۰ جنوری ۱۸۰۲ء کو کونسل کے نام پھر ایک خط لکھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کونسل ہندوستانی شعبے کے لیے اتنی بڑی رقم منظور کرنا نہیں چاہتی۔ اب تک وہ صرف پندرہ روپیے قیمت تک کی کتابیں پریس بھیج چکے تھے۔ چار درویش کے ساٹھ صفحے تیار کرنے میں آٹھ مہینے لگے تھے اور اتنا ہی وقت اسے مکمل کرنے میں انھیں اور صرف کرنا پڑتا۔ ان کا خیال تھا کہ سرکاری بحث و مباحثے میں وقت ضائع کرنا بے کار ہے۔ ہندوستانی زبان کے اس نہال نو نے ابھی جڑ پکڑی ہے۔ اگر اس وقت

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کفایت شعاری اور کونسل کے نظم ونسق کی پابندی کی گئی تو اس کے پھولنے پھلنے میں ایک زمانہ لگ جائے گا۔ ہندوستانی شعبے کے صدر اور پروفیسر کی حیثیت سے میرے اوپر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ ہندوستانی زبان میں اچھی اور مفید کتابیں تیار کراؤں۔ اس سے نہ صرف کالج کے طلبہ مستفیض ہوسکیں گے بلکہ برطانوی مقبوضات میں بھی اس کے اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔ چنانچہ سارے اخراجات کا بار خود اپنے اوپر لیتے ہوئے حسب ذیل شرائط کے ساتھ گل کرسٹ نے اپنا خط ارسال کردیا۔

۱۔ جو کتابیں میں طلبہ کے لیے چھاپوں ان میں سے ہر کتاب کے سو سو نسخے مصنف اور ناشر کی حیثیت سے میری ہمت افزائی کے لیے بازاری قیمت پر گورنمنٹ خرید لے گی۔

۲۔ ہر کتاب جو میں چھاپوں گا اس کا مواد طباعت سے پہلے کالج کونسل کی منظوری کے لیے پیش کروں گا۔

۳۔ گورنمنٹ کی طرف سے خریدی ہوئی کتابیں دنیا کے مختلف کالجوں میں مفت تقسیم کی جائیں گی، یا پورے ایڈیشن ختم ہونے تک کالج میں محفوظ رہیں گی۔

۴۔ محفوظ شدہ نسخوں میں سے مطلوب نسخوں کی لاگت دیتے ہی وہ میری ملکیت سمجھی جائیں۔

۵۔ ہندوستانی درجے کی ضروری کتابوں کا ایک ایک نسخہ ہر طالب علم کو بازاری قیمت پر خریدنا پڑے گا۔

۶۔ طلبہ کی ضرورت پوری ہونے پر مجھے وہ کتابیں فروخت کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ مصنف کے سبھی حقوق، اصطلاح کے وسیع ترین مفہوم میں مجھے حاصل ہوں گے۔

۷۔ تالیف، ترجمہ اور نقل کا پورا خرچ میں اس شرط پر دوں گا کہ گورنمنٹ میر بہادر علی کو اپنے مصارف پر ہندوستانی کتابوں کی تصحیح اور مقابلے کے لیے میری ماتحتی میں بحال رکھے گی اور ان کے استعفے یا انتقال پر ان کی جگہ دوسرا صاحب استعداد شخص مقرر کرے گی۔

۸۔ ہندوستانی شعبے کے ہر طالب علم کو پہلے سال پچاس روپیے ماہوار، دوسرے سال تیس روپیے ماہوار اور تیسرے سال بیس روپیے ماہوار کی کتابیں بہرحال خریدنا ہوں گی۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۹۔ ناشر کی حیثیت سے میرے طرزِ عمل کے احتساب کا پورا حق کونسل کو حاصل ہوگا لیکن طلبہ کے کالج چھوڑنے سے پہلے ان سے میرا قرض وصول کرنے میں گورنمنٹ ہر طرح سے میری معاونت کرے گی۔

۱۰۔ جو کتابیں اس وقت چھپ رہی ہیں وہ مختلف حالات میں دی گئی ہیں اس لیے ان کا مناسب معاوضہ مجھے دیا جائے۔

گل کرسٹ کالج کونسل کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ اس نئے منصوبے کو قبول کر لینے میں کالج ہی کا فائدہ ہوگا۔ کیوں کہ بعض طلبہ اتنے لاپروا تھے کہ کالج کی طرف سے دی گئیں کتابیں کھو دیتے تھے یا ان کے دو چار صفحات پھاڑ ڈالتے تھے جس سے چالیس پچاس روپیے قیمت کی کتاب بے کار ہو جاتی تھی۔ اس خرچ کو روکنے کے دو ہی طریقے تھے۔ اولاً یہ کہ گورنمنٹ گل کرسٹ کے منصوبے کے مطابق ان کتابوں کی طباعت کی ذمہ داری قبول کر لے۔ ثانیاً یہ کہ لاپروا طلبہ کو کتابوں کی فراہمی بند کر دی جائے۔ لیکن اس سے طلبہ کی ترقی کی راہ مسدود ہو جاتی، جس کے لیے گل کرسٹ تیار نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ تین سال تک کتابوں کی چھپائی کا انتظام ان ہی کے ہاتھ میں رہنے دیا جائے۔

کونسل نے ۲۵ جنوری ۱۸۰۲ء کو ایک خط کے ذریعے گل کرسٹ سے منتخب کتابوں کی فہرست اور ان کی چھپائی کی لاگت کا حساب طلب کیا۔ لیکن اس خط میں ان کی پیش کردہ شرائط کا سرے سے کوئی ذکر نہیں تھا، بلکہ کونسل نے یہ حکم بھی دیا کہ تمام کتابوں کی طباعت کی بجائے ان کا خلاصہ ایک یا دو جلدوں میں شائع کیا جائے۔ گل کرسٹ نے اس کے جواب میں ۲۷ جنوری ۱۸۰۲ء کو کونسل کو لکھا کہ "ایسی جگہ سے شہد نکالنا ہے جس کی آبادی نہیں جہاں مکھیوں کا ایک چھتہ بھی موجود نہ ہو"[1] انھوں نے ۳۱ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ہندوستانی نثر میں قدر و قیمت کے اعتبار سے کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو میرے طلبہ کے لیے مفید ہو سکے۔ جہاں تک ہندوستانی شاعری کا تعلق ہے تو اسے محض اس زبان کے عالم ہی پڑھ اور سمجھ سکتے

۱۔ Gilchrist and the Language of Hindoostan, p.50

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

ہیں۔ کالج کے طلبہ کے لیے وہ دن ابھی دور ہے۔ دو تین سال کے بعد وہ اس لائق ضرور ہو جائیں گے کہ ہندوستانی شاعری سے استفادہ کر سکیں۔ مالی نقطہ نظر سے کتابوں کی نقلیں کرانے کی بہ نسبت ان کی طباعت سے کالج کو فائدہ تھا کیوں کہ شروع کے اخراجات بہت جلد پورے ہونے کی امید تھی۔

اسی خط میں گل کرسٹ نے کونسل سے دس سے بیس ہزار تک روپیہ ابتدائی خرچ کے طور پر اس شرط کے ساتھ مانگا تھا کہ کتابوں کی طباعت میں اتنے مصارف کے بعد بھی کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا تو ہندوستانی شعبے میں کفایت شعاری سے کام لیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی وضاحت کر دی تھی کہ اگر اب بھی کونسل میری تجویز قبول نہیں کرتی تو میں ان کتابوں کی سے چھپائی کا کام فوراً بند کر دوں گا۔ اور ایک ایسی زبان میں جس میں طلبہ کے لیے ایک بھی سے مناسب کتاب موجود نہیں ہے بطور انتخاب ایک یا دو جلدیں مرتب کر کے طباعت کے لیے کونسل کے پاس بھیج دوں گا۔

اس خط کے جواب میں یکم فروری ۱۸۰۲ء کو کونسل نے گل کرسٹ کو مکرر ہدایت کی کہ "کتابوں کے جو حصے باقاعدہ چھپ چکے ہیں ان کا ایک انتخاب تیار کیا جائے"[1] اس کے ساتھ ہی یہ شرط بھی عاید کر دی گئی کہ یہ انتخاب پانچ سو صفحے سے زیادہ کا نہ ہو، اور پانچ سو نسخوں کی طباعت میں پانچ ہزار روپیے سے زیادہ خرچ بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ اس رقم میں "مسکین کے مرثیے" کے اخراجاتِ طباعت بھی شامل تھے۔ ضرورت کے پیش نظر گل کرسٹ کی تصنیف "ہندوستانی پرنسپلس" (ہندوستانی صرف و نحو) اور مشقوں کی طباعت کے لیے پانچ ہزار روپیے کی علاحدہ سے منظوری دی گئی۔ علاوہ بریں کونسل نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ اگر چندے سے "چار درویش" اور "گلستاں" (اردو ترجمہ) کی چھپائی ممکن ہو تو کونسل حکومت سے سفارش کرے گی کہ ان کے سو سو نسخے کالج کے لیے خرید لیے جائیں۔

بہر حال ہندوستانی زبان کی ترویج و ترقی میں گل کرسٹ کے منصوبے کو روبہ عمل لانے

---

[1] M. Siddiqi's modern Hindustani Literature. P. 114

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

یں کونسل نے بخل سے کام لیا، جس کی وجہ سے گل کرسٹ کی ہمت افزائی نہ ہوسکی۔ آخر میں کونسل نے کالج کے لیے چھاپی گئی اور زیر طباعت کتابوں کا انتخاب اور ان کی لاگت کا تفصیلی نقشہ بنا کر گل کرسٹ کے پاس بھیج دیا[1] اس نقشے میں جس رقم کا تعین کیا گیا تھا وہ ۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء کے خط میں گل کرسٹ کی مجوزہ رقم سے بہت کم تھی۔ کونسل کی اس سرد مہری کی وجہ سے گل کرسٹ کے حوصلے اور جذبات کو ٹھیس لگی۔ اس کے بعد انھوں نے کتابوں کی طباعت سے متعلق کونسل سے کسی قسم کی خط و کتابت مناسب نہیں سمجھی۔

گل کرسٹ کے دیگر مطالبات:

جس زمانے میں گل کرسٹ ہندوستانی نثر کی کتابوں کی طباعت کے لیے جدوجہد کر رہے تھے اسی زمانے میں اپنے شعبے میں منشیوں، قصہ خواں اور خوش نویسوں کی تعداد میں اضافے کے لیے بھی ان کے مطالبات جاری تھے۔ نومبر ۱۸۰۱ء تک ہندوستانی شعبے میں تقریباً ساٹھ طلبہ تھے جنھیں پڑھانے کے لیے بارہ منشی مامور تھے۔ لیکن کام بڑھ جانے کی وجہ سے گل کرسٹ نے غلام اشرف کو، جو کالج سے برطرف کر دیے گیے تھے مکرر اپنے شعبے میں بلا لیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے بارہ سند یافتہ منشیوں کو جنھیں ہندوستانی زبان میں مہارت نہ ہونے کی بنا پر ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا تھا دوبارہ ملازم رکھ لیا[2]۔ اور ۱۵ دسمبر ۱۸۰۱ء کو کونسل سے ان بارہ کے علاوہ آٹھ مزید منشیوں کے تقرر کا مطالبہ کیا۔

طلبہ کو خوش نویسی کی مشق کرانے کے لیے کالج میں خوش نویسوں کے تقرر کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ ان خوش نویسوں کی تنخواہ صرف بیس روپیے ماہوار ہوتی تھی۔ شروع میں فارسی خوش نویس کی حیثیت سے کلب علی خاں اور ناگری خوش نویس کے طور پر سند رپنڈت ملازم

---

[1] اس کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ الف (۱)

[2] ان منشیوں میں سے بعض کو گل کرسٹ رومن اور ناگری رسم خط میں ہندوستانی قواعد کی تعلیم بھی دیتے تھے۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

رکھے گئے تھے۔ بعد میں اس نظم کو بدل کر ناگری خوش نویس کو برطرف کر دیا گیا تھا اور فارسی خوش نویس کی تنخواہ سو روپیہ ماہوار مقرر کر کے ان سے فارسی اور ہندوستانی دونوں شعبوں کے طلبہ کی تربیت کا کام لیا جانے لگا تھا۔ ۴ر جنوری ۱۸۰۲ء کو گل کرسٹ نے پچاس روپیے ماہوار پر ناگری خوش نویس کی جگہ دوبارہ بحال کرنے کی مانگ کی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک قصہ خواں کا بھی مطالبہ کیا۔ اور اس کی ضرورت اہمیت واضح کرتے ہوئے کونسل کو لکھا:۔

"اپنے طویل تجربے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قصہ خواں سے بھی طالب علم بہت زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو گھروں پر جا کر ان کو قصہ سنائے۔ اس لیے مستدعی ہوں کہ میرے شعبے کے لیے چالیس روپیے ماہوار کے ایک قصہ خواں کا تقرر منظور کیا جائے۔ نیز اس کی بھی مجھے اجازت دی جائے کہ جب تک کوئی ایسا آدمی مجھے نہ مل سکے جو اس تنخواہ کا اہل ہو اس وقت تک (کے لیے) کم تر درجے کے دو قصہ خواں بیس بیس روپیے ماہوار پر رکھ لوں۔"[۱]

۱۹ر فروری ۱۸۰۲ء کو کونسل نے گل کرسٹ کے مذکورہ بالا تینوں مطالبات منظور کر لیے۔ ناگری خوش نویس کی حیثیت سے للولال کا تقرر عمل میں آیا جو اس سے قبل اگست ۱۸۰۱ء سے سندی منشی کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اور خلیل علی خاں اشک[۲] کا تقرر بحیثیت قصہ خواں کے ہوا۔

عملے اور اخراجات میں تخفیف اور ہندوستانی شعبے کی تنظیم جدید:

کورٹ اور ولزلی کے تصادم میں کورٹ نے ۲۷ر جنوری ۱۸۰۲ء کو کالج توڑنے کا حکم

---

[۱] بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۵۸

[۲] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مقالہ (دو ماہی اکادمی لکھنؤ شمارہ ستمبر اکتوبر ۱۹۸۶ء)

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

دیا تھا لیکن ولزلی نے اس حکم کو ۳۱ر دسمبر ۱۸۰۲ء تک ملتوی رکھا۔ (گذشتہ صفحات میں اس پر مفصل بحث کی جاچکی ہے) دریں اثنا کونسل نے کالج کے مختلف شعبوں کے اخراجات اور ملازموں میں کمی کرنے کا فیصلہ کیا۔ یکم جون ۱۸۰۲ء سے کالج میں کام کرنے والے خانساماؤں، طباخوں، مشعلچیوں، فراشوں، بہشتیوں، دھوبیوں اور مہتروں کی تعداد کم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تنخواہوں میں بھی کمی کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی فارسی اور ہندوستانی شعبوں کے پروفیسروں سے دریافت کیا گیا کہ ہیڈ اور سکنڈ منشی کیا کام انجام دیتے ہیں؟ اور ان کا متعلقہ شعبوں میں برقرار رہنا کس حد تک ضروری ہے؟ اس استفسار کے جواب میں ایڈ منسٹن اور جے۔ بیلی نے شعبۂ فارسی کی طرف سے اور گل کرسٹ نے ہندوستانی شعبے کی طرف سے بالترتیب ۲، اور ۷، جون ۱۸۰۲ء کو خطوط لکھے۔ ہیڈ اور سکنڈ منشیوں کی ضرورت اور ان کے کام کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے گل کرسٹ نے بتایا کہ ان کے فرائض میں تالیف یا ترجمہ ہونے والی کتابوں کی تصحیح، قواعد کے لیے مختلف کتابوں سے مواد کی فراہمی، ماتحت منشیوں کی نگرانی، نو وارد منشیوں کا امتحان لینا اور پروفیسروں کے اشکالات میں مدد کرنا شامل ہے۔ اس طرح جب ہیڈ اور سکنڈ منشیوں کی خدمات ضروری اور ناگزیر برقرار پائیں تو کالج کونسل نے دوسری جگہوں میں کمی کر کے ۷، جون ۱۸۰۲ء کو ہندوستانی شعبے کی ازسرِ نو تنظیم کی۔ اس تنظیم جدید کے تحت مندرجہ ذیل جگہوں کی منظوری دی گئی۔

میر شیر علی افسوس	مترجم	۲۰۰ روپیے ماہانہ تنخواہ
کاظم علی جواں	"	۸۰ "
مظہر علی ولا	"	۸۰ "
میر بہادر علی حسینی	چیف منشی	۲۰۰ "
تارنی چرن متر	نائب منشی	۱۰۰ "
۲۰ ماتحت منشی	ہر ایک کو ۴۰ روپیہ ماہوار	۸۰۰
۲۰ سندی منشی	" ۳۰ "	۶۰۰ "
للو لال بھاکھا منشی		۵۰ "

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

قصہ خواں ۴۰ روپیہ ماہانہ تنخواہ

مہانند پنڈت ناگری خوش نویس ۵۰ 〃 〃

میرامن کو انعام :

۶ر جون ۱۸۰۲ء کو گل کرسٹ نے ایک خط کے ذریعے میرامن کو "باغ و بہار" کی تصنیف پر پانچ سو روپیے کا انعام دینے کی سفارش کی۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنی تصنیف "Fables and principles" کو شائع کرنے کی اجازت مانگی کونسل نے میرامن کو انعام دینا تو منظور کر لیا لیکن گل کرسٹ کی کتاب کی طباعت کے لیے راضی نہیں ہوئی۔

ولّا اور قصہ خواں کی برطرفی : میکڈ یوگل اور موئٹ کا تقرر :

کونسل نے ۳۰ر ستمبر ۱۸۰۲ء کو ولّا اور قصہ خواں کی خدمات کو غیر ضروری قرار دے کر انھیں ملازمت سے برطرف کر دیا لیکن کام کی زیادتی کے پیش نظر ایک اسسٹنٹ پروفیسر کی جگہ بڑھادی گئی جس پر ۲۹ر نومبر ۱۸۰۲ء کو میک ڈیوگل کا تقرر عمل میں آیا۔ پانچ ماہ بعد ۲ر مئی ۱۸۰۳ء کو اساتذہ کے عملے میں فرسٹ اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کیپٹن موئٹ کا اضافہ ہوا[1]، جو بعد میں شعبۂ ہندوستانی کے پروفیسر اور صدر مقرر ہوئے۔

ہندوستانی مصنفین کو انعامات :

گل کرسٹ نے ۱۹ر اگست ۱۸۰۳ء کو کالج کونسل کو ایک خط لکھا جس میں انھوں نے ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصانیف کی فہرست پیش کرتے ہوئے یہ سفارش کی کہ ہندوستانی علما اور قلم کاروں کی ہمت افزائی کے لیے انھیں انعام و اکرام سے نوازا جائے[2]۔ اس سلسلے میں انھوں

---

[1] وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۵۴

[2] اس کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ الف (۲)

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

نے ایک تجویز کا بھی حوالہ دیا تھا جو کچھ عرصے پہلے کونسل نے منظور کی تھی اور جسے اطلاع عام کے لیے شائع بھی کیا گیا تھا۔

گل کرسٹ کی پیش کردہ سفارشات کا جواب دیتے ہوئے کونسل کے سکریٹری نے لکھا تھا کہ ہمارا مقصد یہ کبھی نہیں تھا کہ جو عالم کالج کے باقاعدہ ملازم ہوں انھیں بھی انعام دیا جائے گا، یا نامکمل تصانیف کے لیے پہلے ہی سے انعام کا اعلان کر دیا جائے گا۔ ۲۰ نومبر ۱۸۰۱ء کی جس تجویز کی رو سے انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا اس کے زمرے میں صرف وہی جفاکش، ثقہ اور قابل قدر مصنفین آتے ہیں جو بہ حیثیت ملازم کالج سے منسلک نہ ہوں یا جنھیں کالج سے معقول تنخواہ نہ مل رہی ہو۔ مسٹر گل کرسٹ نے تمام ہندوستانی مصنفین کا احاطہ کر لیا ہے اور وہ کتابیں بھی فہرست میں شامل کر لی ہیں جو ابھی زیر تصنیف ہیں اس لیے اس تجویز پر غور نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے معاً بعد گل کرسٹ نے کونسل کے سکریٹری کی تجویز کے مطابق دوسری فہرست تیار کر کے بھیج دی۔ ۱۲ ستمبر ۱۸۰۳ء کی کاروائی میں کونسل نے یہ فہرست کول بروک (Coolebrooke) کے سپرد کر دی۔ اور انھیں یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق ایسے مصنفین کا انتخاب کریں جو واقعی قدر دانی کے مستحق ہوں۔

کول بروک نے یہ تصانیف دو ہندوستانی علما کے حوالے کر دیں اور انہی کی رائے کے مطابق ایک رپورٹ تیار کر کے ۱۰ اکتوبر ۱۸۰۳ء کو کونسل کو بھیج دی۔ کونسل نے اسی تاریخ کو ان کی رپورٹ کے مطابق حسب ذیل مصنفین کو انعام دینے کا اعلان کیا۔

۱۔ حاجی مرزا مغل	بوستاں (ترجمہ)	۴۰۰ روپئے کا انعام
۲۔ کندن لعل	کلا کام	۱۰۰ روپئے کا انعام
۳۔ غلام حیدر	گل ہرمز	۱۰۰
۴۔ نہال چند	گل بکاولی	۱۰۰ " "
۵۔ محمد بخش	فیروز شاہ	۱۰۰ " "

جن کتابوں پر کوئی انعام نہیں دیا گیا تھا وہ ہیں گل صنوبر، الف لیلہ، دل ربا اور

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

حسن اختلاط"۔ گل صنوبر" کے متعلق کول بروک نے لکھا تھا کہ مصنف کی جہالت کی وجہ سے یہ کتاب غلطیوں) سے مملو ہے۔ اس کا مصنف اس اعتبار سے بھی انعام کی بجائے سرزنش کا مستحق ہے کہ اس نے ایسی کتاب کالج کے لیے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو نہایت غیر مہذب ہے[1]۔

گل کرسٹ کا استعفا اور انگلینڈ واپسی :

یہ صحیح ہے کہ لسانیات کے مطالعے اور کالج کے ناگزیر تعلیمی امور میں منہمک رہنے کی وجہ سے گل کرسٹ کی صحت خراب ہونے لگی تھی جس کی وجہ سے انھوں نے ۱۱ر اپریل ۱۸۰۳ء کو کالج کونسل کے سکریٹری چارلس روتھ کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ "آپ کونسل کو میرے اس ارادے سے مطلع کر دیں کہ میں یورپ جانا چاہتا ہوں۔ اور میرے اس ارادے کی محرک صرف یہ خواہش ہے کہ فرصت حاصل کر کے اپنی صحت بحال کر دوں، جو متواتر دردِ سر، بخار اور زکام کی وجہ سے خراب ہو چکی ہے[2]" گل کرسٹ کا یہ خط ۲ر مئی ۱۸۰۳ء کے اجلاس میں پیش ہوا لیکن کونسل نے کسی آخری فیصلے پر پہنچے بغیر اپنی نشست برخاست کر دی۔ اور ولزلی نے ہندوستانی شعبے کی ضرورت کے پیش نظر گل کرسٹ کو رکنے کی ترغیب بھی دی جس کی وجہ سے انھیں اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ لیکن ۲۳ر فروری ۱۸۰۴ء کو بغیر کسی اطلاع کے یکایک گل کرسٹ کا استعفا پیش کر دینا سب کو حیرت اور شبہے میں ڈال دیتا ہے۔ استعفے کے اس خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ

> "ناگہانی اور شدید علالت سے مجبور ہو کر پہلے جہاز سے یورپ واپس جانے کے لیے ہز اکسیلنسی گورنر جنرل سے اجازت حاصل کرنے کی مجھے ضرورت پیش آئی ہے، جو میں نے حاصل کر لی ہے اب یہ میرا فرض ہے کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل کے قائم کردہ کالج میں ہز لارڈشپ کی عنایت سے ہندوستانی

---

[1] بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۷۷

[2] Qidwai, Gilchrist and the Language of Hindoostan P. 54

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

پروفیسر کے جس عہدے پر میں مامور ہوں، اس سے میں باضابطہ مستعفی ہو جاؤں۔ مستدعی ہوں کہ آپ کالج کونسل کو مطلع فرمادیں کہ کلکتہ (نامی) جہاز کی روانگی کی تاریخ سے جس کا میں نے ٹکٹ بھی خرید لیا ہے، میرا استعفا قبول کیا جائے۔"[1]

اکثر و بیشتر تاریخ نویسوں نے گل کرسٹ کے استعفے کی یہی وجہ بیان کی ہے جس کا اس نے اپنے استعفے میں ذکر کیا ہے۔ لیکن لکشمی ساگر وارشنے اور عتیق صدیقی نے اس میں کچھ قیاس آرائیاں بھی کی ہیں۔ وارشنے لکھتے ہیں "گورنر جنرل کی سفارش پر انھوں نے یورپ جانا ملتوی کر دیا تھا لیکن چوں کہ کونسل نے ان کے کئی مالی مطالبات مسترد کر دیے اس لیے انھیں ... مایوسی ہوئی ہوگی۔ خطوں سے ان کی علالت کا حال بھی معلوم ہوتا ہے، ممکن ہے ان ہی وجوہ سے انھوں نے یورپ لوٹ جانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہو۔"[2]

عتیق صدیقی کے مطابق "ایسا محسوس ہوتا ہے (کہ) گل کرسٹ علالت کی وجہ سے مستعفی نہیں ہوا تھا (بلکہ) حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی زبان کی ترویج و اشاعت اور جدید ہندوستانی ادب کو فروغ دینے کے سلسلے میں کالج کونسل نے اس کی توقعات کے مطابق اس کی ہمت افزائی نہیں کی تھی .... گل کرسٹ کو اس باب میں کالج کونسل اور حکومت دونوں سے شکایت تھی۔ لیکن اس نے اپنے آخری خط میں اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔"[3]

لیکن گل کرسٹ کے استعفے کے خط کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے سے کچھ دوسرے امور کا بھی انکشاف ہوتا ہے۔ جو یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ انھوں نے استعفا کسی دوسری بنا پر دیا ہوگا۔ انھوں نے اس وقت تک اپنے حسابات بھی کونسل کو پیش نہیں کیے تھے اور اس کی ذمہ داری انھوں نے جاتے وقت اپنے ایجنٹ مارکن ٹوش فلٹن کے سپرد کر دی تھی اور

---

[1] بہ حوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۰۵

[2] فورٹ ولیم کالج ص ۴۱

[3] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۰۵

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کئی کتابیں ابھی پریس ہی میں تھیں جن کی طباعت کی تاخیر پر انھوں نے اپنے خط میں نہایت افسوس کا اظہار کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ "میرے استعفے سے میری ان امیدوں پر پانی پھر جائے گا جو میں نے گورنر جنرل کے قائم کردہ کالج میں رہتے ہوئے ایک طویل عرصے کی ادبی خدمات کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کے متعلق قائم کی تھی"۔[1] مالی مشکلات کا تذکرہ انھوں نے اس خط میں ان الفاظ میں کیا تھا۔

سال گزشتہ یعنی ۱۸۰۳ء میں چھپائی میں میرے ۲۲ ہزار آٹھ سو روپے سے زیادہ خرچ ہوئے۔ عجلت سے روانہ ہونے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہ ہونے کی وجہ سے میرا جتنا نقصان ہوا ہے۔ اس کا میں اندازہ نہیں لگا سکتا۔ اس وقت مجھے بہت کم روپیے ملیں گے، اور اگر میں ایک سال اور یہاں رک جاتا تو شاید میرے سب روپیے موصول ہو جاتے"۔[2]

گل کرسٹ کے خط کی یہ تفصیلات یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ انھوں نے خرابی صحت کے علاوہ کسی اور معقول وجہ سے استعفا دیا ہوگا۔ "Life and time of carey" کے مصنف کا بیان اس سلسلے میں کسی حد تک ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ

"۱۸۰۴ء کے اوائل میں کلکتہ میں یورپیوں اور مسلمانوں کے درمیان زبردست کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کشیدگی کی وجہ ایک موضوع بحث تھا جو ہندوستانی زبان کے پروفیسر ڈاکٹر گل کرسٹ نے فورٹ ولیم کالج کے سالانہ جلسے میں اظہار خیال کی غرض سے ہندوستانی شعبے کے طلبہ کے سامنے پیش کیا تھا۔۔۔ مباحثے کے لئے گل کرسٹ نے یہ موضوع تجویز کیا تھا کہ "اگر ہندوستانی باشندے عیسائی اصولوں کا مقابلہ اپنی مذہبی کتابوں سے کریں تو وہ عیسائیت کو قبول کر لیں گے"۔ اس موضوع نے ان

---

[1] وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۶۲

[2] ایضاً ۶۳

منشیوں کو جو کالج میں ملازم تھے سخت برہم کر دیا اور انھوں نے مسلمانوں میں ایک زبردست تحریک شروع کر دی۔ مسلمانوں نے عیسائیوں کی تبلیغی کوششوں کے خلاف اظہار نفرت شروع کر دی اور لوگوں کو حیرت میں ڈالنے اور ان کے خلاف لوگوں کو مشتعل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ بڑی تگ و تاز اور دوا دوش سے ایک عرض داشت تیار کر کے مشتہر کی گئی کہ مباحثے کی کارروائی جیوں ہی مکمل ہو جائے گی مسلمانوں کو زبردستی گورنمنٹ ہاؤس لاکر عیسائی بنا دیا جائے گا۔ برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کی جو رعایت رکھی تھی اس کی کھلی ہوئی خلاف ورزی کی تائید میں مسلم دوست انگریزوں نے ایک یادداشت مسلمانوں کے لیے تیار کی جس پر بہت سے لوگوں کے دستخط کرائے گئے۔۔ جب یہ یادداشت گورنر جنرل کے روبرو پیش ہوئی تو انھوں نے ٹھنڈے دل سے جواب دیا کہ مجوزہ موضوع میں کوئی قابل اعتراض رجحان نہیں پایا جاتا، لیکن اس خیال کے پیش نظر کہ ہندوستانیوں کے جذبات اس سے برانگیختہ ہوتے ہیں، حکم دیا کہ بحث کے اس موضوع کو بدل دیا جائے[1] گورنمنٹ کی اس مداخلت سے گل کرسٹ اتنا زیادہ متاثر ہوا کہ غصے میں آکر اپنی تقریر پھینک دی اور استعفا دے کر انگلینڈ واپس چلا گیا۔[2]

کالج کونسل نے گل کرسٹ کا استعفا اس کی خدمات اور قابلیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے قبول کر لیا۔

"مسٹر گل کرسٹ نے جس جوش و خروش ۔۔۔ لیاقت ۔۔۔ اور ان تھک محنت کے ساتھ ہندوستانی زبان کے پروفیسر کی خدمات انجام دی ہیں۔"

---

[1] لہٰذا ۲۰ ستمبر ۱۸۰۴ء کے سالانہ جلسے میں اس موضوع [illegible] پر بحث لایا گیا تھا، وہ تھا "ممالک ہند کی زبانوں کی اصل بنیاد سنسکرت ہے۔"

[2] M. E. Kaman: The Life and Times of Carey Vol. 1, P 191-92

ان کا اعتراف کرنا کالج کونسل اپنا فرض سمجھتی ہے نیز اس کا بھی اعتراف کرتی ہے کہ گل کرسٹ کی تصانیف نے اور ہندوستانی زبان کی ان کتابوں نے جو انھوں نے چھاپی ہیں کالج کے قیام کے مقاصد کو بدرجہ اتم پورا کیا ہے۔[۱]

گل کرسٹ کے عہد تک فورٹ ولیم کالج میں اُردو زبان میں یا اُردو زبان و ادب سے متعلق ناگری، خط میں تقریباً ساٹھ کتابیں تالیف یا ترجمہ ہوئیں، جن میں سے بعض ان کی روانگی کے وقت تک مکمل ہو چکی تھیں اور بعض زیر تصنیف تھیں یہ کارنامے کالج سے متعلق اور غیر متعلق ۲۶ مصنفین نے انجام دیئے تھے۔ خود گل کرسٹ نے اپنے چار سالہ دور میں تیرہ کتابیں تصنیف کیں، جو اس تعداد کے علاوہ ہیں۔

جیمس موئٹ ہندوستانی شعبے کے صدر اور پروفیسر:

(جنوری ۱۸۰۶ء تا فروری ۱۸۰۸ء)

گل کرسٹ کی انگلینڈ مراجعت کے بعد ان کے کام کی ذمہ داری سنیر اسسٹنٹ کی حیثیت سے موئٹ پر آپڑی۔ لیکن باضابطہ طور پر وہ یکم جنوری ۱۸۰۶ء سے ہندوستانی شعبے کے صدر اور پروفیسر مقرر ہوئے۔[۲] مولوی سید محمد[۳] نادم سیتاپوری[۴] اور محمد سلیم قریشی[۵] کا یہ بیان قابل قبول نہیں کہ گل کرسٹ کی انگلینڈ واپسی کے بعد تھامس روبک کو ہندوستانی شعبے کا پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ جاوید نہال نے سید محمد کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "سید صاحب کو شاید یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی کہ ۱۸۰۸ء میں تھامس روبک کی جتنی کتابیں دوبارہ

---

[۱] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۸۶

[۲] [illegible] فورٹ ولیم کالج ص ۷۲

[۳] ارباب نثر اردو [illegible] ۲۸

[۴] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ۶۷

[۵] مقدمہ "سکنتلا" ص ۱۳

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

شائع ہوئی تھیں ان میں روبک کو سابق پروفیسر فورٹ ولیم کالج لکھا گیا تھا جیمس موئٹ اور ٹیلر کے بعد وہ (روبک) پروفیسر ہو گیے تھے۔[1]

تعجب ہے کہ جاوید نہال نے سید صاحب کی جس غلط فہمی کی طرف اشارہ کیا ہے بالآخر وہ خود بھی اسی قسم کی غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سید صاحب کے مطابق روبک گل کرسٹ کے فوراً بعد پروفیسر مقرر ہوئے اور جاوید نہال صاحب کے بیان کے بموجب انھیں جیمس موئٹ اور ٹیلر کے بعد پروفیسری کے منصب پر مامور کیا گیا۔ ہمارے نزدیک اس غلط فہمی کا سرچشمہ بھی روبک کی دوبارہ شائع شدہ کتابوں کا وہی اندراج ہے جس میں انھیں سابق پروفیسر فورٹ ولیم کالج لکھا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ روبک ہندوستانی شعبے کے پروفیسر کبھی مقرر نہیں ہوئے۔ وہ اس شعبے کے نائب ممتحن، نائب پروفیسر اور کالج کونسل کے نائب سکریٹری ہی رہے اپنی کتاب "Annals of the Fort William College" میں انھوں نے خود اپنی حیثیت اسسٹنٹ پروفیسر ہی کی لکھی ہے جس کا اعتراف جاوید نہال نے کیا ہے۔ بقول ان کے "اس تاریخی کتاب میں روبک اپنا عہدہ نائب پروفیسر کا بتایا ہے"[2]

کالج میں تبدیلیوں کا دوسرا دور:

گورنمنٹ سکریٹری ٹامس براؤن نے کالج کونسل کو ۱۶ مئی ۱۸۰۵ء کو ایک خط لکھا اس خط کے ساتھ انھوں نے گورنر جنرل کی کونسل کی کاروائی کی جس میں کالج کے انتظام میں کچھ تبدیلیوں کا ذکر تھا، ایک نقل بھی منسلک کی تھی۔ خط میں براؤن نے یکم جون ۱۸۰۵ء سے ان تبدیلیوں کو عملی جامہ پہنانے کا حکم دیا تھا جس کے مطابق سنسکرت، بنگلہ اور ہٹی کے شعبوں کو باہم ضم کرکے ایک شعبہ بنا دیا گیا تھا اور ہندوستانی شعبے میں صرف سند یافتہ

---

[1] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۱۰۰۰۰
[2] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۱۰۰

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

منشیوں کی تعداد کم کردی گئی تھی۔ ۱۶ اکتمبر ۱۸۰۵ء کو کالج کونسل کی میٹنگ میں ہندوستانی اور فارسی شعبے کے ملازمین کی تعداد، ان کی تنخواہ وغیرہ کے متعلق غور و خوض کیا گیا اور یہ طے پایا کہ ہیڈ منشی اور نائب منشی کی تنخواہ بالترتیب دو سو روپیے اور سو روپیے ماہانہ قرار دی جائے۔ دو منشی اسّی اسّی، دو منشی ساٹھ ساٹھ اور بارہ منشی چالیس چالیس روپیے ماہانہ پر رکھے جائیں۔ تیس روپیے ماہوار کے بھی کچھ منشی عارضی طور پر رکھے گئے۔ ان کی تعداد طلبہ کی تعداد پر منحصر تھی۔

ان تجاویز کی اطلاع دونوں شعبوں کو دے دی گئی اور ان سے منشیوں کی تفصیل طلب کی گئی۔ موئٹ نے ہندوستانی شعبے کی مدرسین اور منشیوں کی جو تفصیل ارسال کی تھی، وہ حسب ذیل ہے۔

نام	مشاہرہ (سکہ روپیہ)	کام کی تفصیل
میر شیر علی میر منشی	۲۰۰	تواریخ الخلاصۃ الہند وغیرہ کا ترجمہ
تارنی چرن متر نائب منشی	۱۰۰	ہندوستانی پریس میں
میر بہادر علی	۸۰	مترجم
مرزا کاظم علی	۸۰	〃
مظہر علی خاں	۸۰	〃
مرزا فطرت	۸۰	〃
میر امن	۸۰	ڈورن
محمد واجد	۸۰	موکٹن
مرتضیٰ خان	۶۰	میک ڈیوگل
یوسف علی	۶۰	سررشتہ دار
مہانند پنڈت	۵۰	ناگری خوش نویس
سری لال کوی	۵۰	ہندوستانی پریس، وغیرہ

ان کے علاوہ محمد صادق، میر منصور علی، بشر الدین، خلیل علی خاں، محمد تقی، غلام غوث،

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

غلام علی، نذر اللہ، محب علی، غلام نقش بند، غلام سبحان، مولوی کمال الدین جو کالج کے باضابطہ ملازم تھے چالیس روپیے ماہانہ پاتے تھے۔ دلوی پرساد اور دوسرے چھبیس [۲۶] سرٹیفکیٹ منشی عارضی تھے۔ ہندوستانی شعبے پر کل خرچ دو ہزار دو سو ساٹھ روپیے ماہوار ہوتے تھے۔ کونسل نے یہ نظم منظور کرلیا۔ البتہ فارسی شعبے کے منشی واپس بلا لیے گئے[1]

میرامن کی سبکدوشی:

۴ جون ۱۸۰۶ء کی نشست میں کالج کونسل نے ہندوستانی اور فارسی زبانوں کی تعلیم دینے والے عدیم اللیاقت منشیوں کی تنخواہ کم کرنے کی تجویز کی۔ اسی نشست میں میرامن کو ان کے ایما سے چار مہینے کی پیشگی تنخواہ دے کر کالج کی خدمت سے سبکدوش کر دیا۔ کیونکہ انھوں نے ایک طالب علم کو پڑھانے سے انکار کیا تھا۔

ایسٹ انڈیا کالج ہیل بری کا قیام اور فورٹ ولیم کالج کا چھوٹا روپ:

۲۰ مئی ۱۸۰۶ء کو کورٹ آف ڈائرکٹرز نے گورنمنٹ سکریٹری کو مطلع کیا کہ ہم انگلینڈ میں ایک عظیم ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انگلینڈ کے ایک نواحی علاقے ہرٹ فورڈ شائر میں اسی سال ہیل بری کالج (Hailbary College) قائم کردیا گیا[2] اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ جو ملازمین ہندوستان بھیجے جائیں انھیں مشرقی زبان و ادب کی تعلیم اسی ادارے میں دی جائے۔ جو لوگ یہاں کما حقہ طور پر ہندوستانی زبان کی تعلیم حاصل نہ کرسکیں گے ان کے لیے ہندوستان میں ایک ادارے کی ضرورت ہوگی اور کلکتہ کالج اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بنے گا۔ اس لیے اس کالج کو برقرار رکھا جا سکتا ہے[3] لیکن اب اس پر زیادہ اخراجات کی ضرورت

---

[1] وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۶۹-۶۸

[2] نادم سیتاپوری کی یہ اطلاع درست نہیں کہ ہیل بری کالج کا قیام ۱۸۰۵ء میں عمل میں آیا۔ (فورٹ ولیم کالج از اکرام علی ص ۱۱۲)

[3] Selections from Educational Records Vol. 1, P30

نہیں۔ بلکہ انعام، کرایہ مکان اور مطبخ وغیرہ جیسی مدوں پر مصارف میں کافی کمی کی جا سکتی ہے۔ ان مدات کے ساتھ کورٹ نے تمام شعبوں کے پروفیسروں، منشیوں اور دیگر ملازمین کی تعداد ان کی تنخواہ اور دوسرے اخراجات سے متعلق تفصیلات بھی اپنے طور پر تیار کر دی تھیں۔

گورنمنٹ سکریٹری ٹامس براؤن نے ۴ ردسمبر ۱۸۰۶ء کو کورٹ کا یہ خط کونسل کو ارسال کیا اور کونسل نے اس منصوبے کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد کالج کا نیا ریگولیشن اور ریگولیشن کے مطابق دستور مرتب کر کے ۳۱ رجنوری ۱۸۰۷ء کو گورنر جنرل اِن کونسل کے پاس منظوری کے لیے بھیج دیا۔ ۱۲ رفروری ۱۸۰۷ء کو گورنر جنرل نے اس کو اپنی منظوری عطا کر دی۔

گل کرسٹ کی روانگی کے بعد تقریباً دو سال تک کالج محض چند تبدیلیوں کے ساتھ پہلے کی طرح چلتا رہا۔ لیکن ایسٹ انڈیا کالج ہیلی بری کے قیام کے بعد نہ صرف اس کے مقاصد اور نظم و نسق میں تبدیلیاں رونما ہوئیں بلکہ اس کا دائرہ اثر بہت محدود ہو گیا جس کے نتیجے میں اس کی اہمیت و عظمت روز بروز کم ہوتی گئی۔

موئٹ کا استعفا:

۳ رفروری ۱۸۰۸ء کو موئٹ نے کالج کونسل کے سکریٹری ولیم ہنٹر کو ایک خط لکھا جس میں اس نے خرابی صحت کی بنا پر یورپ کی واپسی کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے کسی آمادۂ سفر جہاز کی روانگی کی تاریخ سے اپنا استعفا منظور کیے جانے کی درخواست کی تھی۔ گل کرسٹ نے بھی سبکدوشی حاصل کرنے کے لیے یہی طریقۂ کار اپنایا تھا۔ لیکن دونوں کے ترکِ ملازمت کے حقیقی اسباب و محرکات بالکل مختلف تھے۔ گل کرسٹ کے استعفے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس کی تجاویز بار بار مسترد کی گئی تھیں۔ اس کے برخلاف موئٹ نے محض تنخواہ کے معاملے کو لے کر استعفا دیا تھا۔ اس نے کالج کونسل کے سکریٹری کو لکھا تھا کہ

"ہندوستانی زبان کے پروفیسر گل کرسٹ کے فروری ۱۸۰۴ء میں سبکدوش ہو جانے کے بعد ان کے کام کی تمام تر ذمہ داری سینئر اسسٹنٹ کی حیثیت سے میرے اوپر آ پڑی اور میں یہ کام یکم جنوری ۱۸۰۶ء تک جب

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کہ مجھے پروفیسر مقرر کیا گیا، تنخواہ میں کسی اضافے کے بغیر انجام دیتا رہا۔ عربی و
فارسی کے پروفیسر جس زمانے میں کام کی وجہ سے باہر گیے ہوئے تھے ان شعبوں
کے سینئر اسسٹنٹس کو پروفیسر کی تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن مجھے اس طرح کی کوئی تنخواہ
نہیں ملی، . . . . پروفیسر مقرر ہونے پر مجھ سے کہا گیا تھا کہ میرا پہلے کا مالی نقصان
پورا کر دیا جائے گا مگر یہ اضافہ شدہ مشاہرہ مجھے صرف سال بھر ہی مل پایا تھا
کہ کورٹ کے حکم سے ہندوستانی پروفیسر کی تنخواہ کم کر کے فرسٹ اسسٹنٹ
کے برابر کر دی گئی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میرے سابقہ نقصان کی تلافی
ہونا چاہیے۔"[1]

کالج کونسل نے موسٹ کا یہ مطالبہ قبول نہیں کیا۔ ۵ فروری ۱۸۰۸ء کو کالج کے سکریٹری نے ان کی خدمات سے متعلق ایک تعریفی نوٹ کے ساتھ یہ خط گورنمنٹ سکریٹری ٹی۔ براؤن کی وساطت سے گورنر جنرل کے پاس بھیج دیا۔ ٹی براؤن نے اسی روز موسٹ کی درخواست منظور کرتے ہوئے ان کی خدمات کے اعتراف میں اسے ایک سرٹیفکیٹ عطا کیا۔ ۲۰ فروری ۱۸۰۸ء کو موسٹ نے لیڈی کیسل ری (Lady castlereagh) نامی جہاز کے کپتان بارتھولیٹ کے سرٹیفکیٹ کے ساتھ اپنا استعفا کونسل کے سکریٹری ولیم ہنٹر کے پاس روانہ کیا، جسے انھوں نے ۲۲ فروری ۱۸۰۸ء کو گورنر جنرل ان کونسل تک پہنچا دیا۔[2]

ولیم ٹیلر ہندوستانی شعبے کے صدر اور پروفیسر: (فروری ۱۸۰۸ء تا مئی ۱۸۲۲ء)

موسٹ کی روانگی کے بعد ۱۲ فروری ۱۸۰۸ء کو گورنر جنرل ان کونسل نے ولیم ٹیلر کو ہندوستانی شعبے کا صدر اور پروفیسر مقرر کیا۔ ۱۸۰۶ء میں ایسٹ انڈیا کالج ہیلی بری کے قیام کے بعد کمپنی کے ملازمین کے لیے ہندوستان آنے سے قبل اس کالج میں تعلیم حاصل کرنا ضروری

---

[1] داستانِ فورٹ ولیم کالج ص . . . . .

[2] ایضاً ۷۸

قرار دے دیا گیا تھا اس لیے فورٹ ولیم کالج میں تکمیل نصاب کی مدت تین سال سے گھٹ کر صرف ایک سال رہ گئی تھی۔ لیکن ہیلی بری سے جو طلبہ آتے تھے وہ ہندوستانی کے مبادیات سے بھی ناواقف ہوتے تھے اور ٹیلر کو انھیں سب کچھ ابتدا سے سکھانا پڑتا تھا۔ چوں کہ محدود وقت کے اندر اس کام کو تن تنہا انجام دینے میں انھیں سخت دشواریاں پیش آتی تھیں اس لیے چند برسوں کے تجربے کے بعد انھوں نے اپنے شعبے میں ایک اور پروفیسر کے تقرر کا مطالبہ کیا۔ کالج کونسل نے ٹیلر کی یہ درخواست اپنی سفارش کے ساتھ گورنمنٹ؛ سکریٹری رک ٹس کے پاس بھیج دی۔ سکریٹری موصوف کے خط مورخہ ۱۹ر نومبر ۱۸۱۲ء کے مطابق یہ مطالبہ منظور کر لیا گیا، اور لفٹننٹ آر۔ مارٹن اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کر دیے گئے۔ اس سے قبل، اکتوبر ۱۸۱۲ء میں، کیپٹن ویسٹن کو عربی و فارسی کا اور ولیم پرایس کو سنسکرت، بنگلہ اور ہندوستانی کا اکسٹرا اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیا جا چکا تھا۔

اُردو ھندی میں تفریق:

جہاں تک کالج کے نظم اور دیگر اُمور کا تعلق ہے ٹیلر کے عہد پروفیسری میں کئی اہم تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ لیکن جو سب سے زیادہ قابل مذمت اور افسوس ناک مسئلہ رونما ہوا۔ وہ اُردو اور ہندی کی تفریق تھی۔ اُردو اور ہندی کو دو الگ الگ زبانیں گردانے کی تحریک بھی ٹیلر ہی نے شروع کی تھی۔ ۱۸۱۲ء میں کالج کی تعلیم کا معیار گرتا ہوا دیکھ کر کالج کونسل نے گورنر جنرل کے ایما سے کالج کے پروفیسر دل اور ممتحنوں سے اس کی وجہ دریافت کی۔ اس پر ٹیلر نے جو جواب دیا تھا وہ "ہندوستانی" کے تجزیے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس کے مطالعہ سے ٹیلر کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ

> آپ نے کالج کے معیار تعلیم میں انحطاط کی وجہ دریافت کی ہے۔ اس کے متعلق میری گزارش ہے اور میں پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہندوستانی کی تعلیم میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن میں صرف ہندوستانی یا ریختہ کا ذکر کر رہا ہوں جو فارسی رسم خط میں لکھی جاتی

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ہے اور جسے پڑھانے کی میری ذمہ داری ہے۔ میں ہندی کا ذکر نہیں کر رہا ہوں، جس کا اپنا رسم خط ہے یا اس زبان کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جس میں سے عربی فارسی لفظوں کا استعمال نہیں ہوتا، اور جو مسلمانوں کی یورش و یلغار سے قبل ہندوستان کے پورے شمال مشرقی حصے یا صوبے کی زبان تھی اور اب بھی وہاں کے قدیم ہندو باشندوں میں رائج و مستعمل ہے۔ اس عریض و وسیع صوبے میں جہاں اب تک بولی جاتی ہے، اس کے دیرینہ وجود کی خاص اہمیت ہے۔ میں نے کالج میں اس (ہندوستانی) کی تعلیم کی توسیع و ترقی میں مقدور بھر کوشش کی ہے، جس کی وجہ سے میری صحت خراب ہو گئی.... آخیر میں میں نے اس بات کا احساس کیا کہ مجھے اپنے محدود ذرائع اور درجہ میں طلبہ کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے صرف ہندوستانی کی تعلیم اور درس و تدریس تک ہی محدود رہنا چاہیے۔ ہندی اور ہندوستانی میں ہندوستانی کی ہی زیادہ اہمیت ہے، اس نقطۂ نظر سے تعلیم کا زوال ضرور ہوا ہے۔[1]

یہی مسٹر ٹیلر کا وہ شرانگیز جواب تھا جس سے ہندی اُردو تنازعے کی بنیاد پڑی۔ حالاں کہ اس سے قبل ان دنوں کے لیے صرف "ہندوستانی" کا استعمال ہوتا تھا، اور رسم خط کی حیثیت محض ثانوی تھی۔ مثلاً مسکین کے مرثیے" "اخلاق ہندی" "شکنتلا ناٹک" وغیرہ پہلے ناگری رسم خط ہی میں شائع کی گئی تھیں جب کی ان سب کی زبان ہندی نہیں، اُردو اور صرف اُردو ہے۔

کالج کونسل کے سکریٹری کی حیثیت سے لاکٹ کا تقرر:

کالج کونسل کے سکریٹری ولیم ہنٹر یکم نومبر ۱۸۱۱ء کو اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ ...ئی ۱۸۱۲ء کو ابراہم لاکٹ کونسل کے سکریٹری اور ممتحن مقرر ہوئے[2] چونکہ لاکٹ عربی زبان کی

---

[1] بہ حوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۹۶

[2] کونسل کے سکریٹری کا یہ مشترکہ عہدہ ہوتا تھا۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

یلم حاصل کرنے کے لیے عرب گیے ہوئے تھے اس لیے ا سے ۔گیلوٹی کو قائم مقام سکریٹری سے
مقرر کیا گیا ۔ اور جب جولائی ۱۸۱۲ء میں ابراہیم لاکٹ عرب سے لوٹے تو گیلوٹی کو نائب سکریٹری
اور ممتحن مقرر کیا گیا، اس سے قبل قائم مقام نائب سکریٹری اور ممتحن مسٹر روبک تھے[1]

ہندوستانی شعبے میں اہم تبدیلیاں :

اخراجات میں کمی کے نقطۂ نظر سے ۱۸۱۶ء کے شروع میں ایک بار پھر شعبۂ ہندوستانی
میں کچھ اہم تبدیلیاں کی گیئں ۔جن سے انیس ہزار چار سو روپیے سالانہ کی بچت ہوئی ۔لیکن ڈائرکٹرز
اس پر بھی مطمئن نہیں ہوئے ۔چناں چہ انھوں نے ۲۸ رجون ۱۸۲۰ء کو گورنر جنرل کے نام ایک
خط لکھا ،جس میں فوجی طلبہ کے داخلے ،اسسٹنٹ پروفیسروں کے عہدے اور دیگر امور
پر متعدد اعتراضات کیے گیے ۔گورنر جنرل نے اس خط کی روشنی میں امتحانات ،تعلیم کی مدت اور
اخراجات وغیرہ کے متعلق کونسل سے اس کی رائے طلب کی ۔کونسل نے اپنی ۲ رمارچ ۱۸۲۱ء
کی رپورٹ میں یہ اطلاع دی کہ کونسل اسسٹنٹ پروفیسروں کے عہدے ختم کرنے ، صرف دو
ممتحن رکھنے ،ممتحن کے عہدے کو سکریٹری کے عہدے سے الگ رکھنے ، قائم مقام ممتحن کو ہٹانے
اور ہندوستانی مدرسین کی تعداد کم کرنے کے لیے تیار ہے ۔لیکن فوجی طلبہ کے متعلق کونسل کے
ارکان مختلف الرائے تھے ۔کونسل کی ایک نئی تجویز یہ تھی کہ ہندوستانی اور فارسی میں چھ چھ منشی
بنگلہ میں چار مدرس اور ایک ہندوستانی مترجم رکھے جائیں ۔اس طرح تیس ہزار نو سو چوالیس
روپیے سالانہ کی بچت کی جا سکے گی ۔

گورنمنٹ سکریٹری لاشنگٹن نے ۱۳ر مارچ ۱۸۲۱ء کے مراسلے میں کونسل کو مطلع کیا
کہ (۱) گورنر جنرل نے فوجی طلبہ کا داخلہ بند کر دیا ہے لیکن فی الحال جو طلبہ زیر تعلیم ہیں انھیں
اپنا نصاب تعلیم مکمل کرنے کی اجازت دی جاتی ہے (۲) اسسٹنٹ پروفیسروں کو برطرف
کرنے کے لیے اگلے مہینے کی پہلی تاریخ متعین ہوئی ہے اور (۳) ممتحن کی مجوزہ جگہوں کے لیے

---

[1] وارشنے فورٹ ولیم کالج ص ۸۵

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

پرائس، لفٹننٹ ڈی رڈیل (Ruddell) اور جیمس الکزنڈر آٹن (Ayton) درخواست دی تھی، گورنر جنرل نے ان میں سے پرائس اور رڈیل کے انتخاب کی منظوری دے دی ہے۔

کالج کے دستور میں تبدیلی:

کالج کا نظم و نسق کالج کے دستور کے مطابق چلتا تھا۔ اس لیے جب کبھی نظم و نسق میں کوئی تبدیلی لائی جاتی تھی تو اس کے مطابق دستور میں ترمیم ناگزیر ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اتنی بڑی تبدیلی کے بعد کالج کے دستور میں ایک بار پھر ترمیم کی گئی۔ اس سے قبل جولائی ۱۸۱۴ء میں کالج کا چوتھا دستور نافذ کیا گیا تھا، جس میں کافی کاٹ چھانٹ ہوئی تھی۔ اس پانچویں دستور میں چوتھے دستور کی قریب قریب سبھی دفعات شامل تھیں صرف مالی انعام کو کوئی جگہ نہیں دی گئی تھی۔

ٹیلر کی کالج سے سبکدوشی:

فورٹ ولیم کالج میں آنے سے قبل ٹیلر فوج میں کیپٹن تھے۔ کالج کی ملازمت کے دوران انھیں تنخواہ کے ساتھ ساتھ فوجی بھتہ بھی ملتا رہا۔ ۲۳ مئی ۱۸۲۳ء کو انھیں لفٹنٹ کرنل کے عہدے پر ترقی ملی۔ اس کے بعد ان کی فوجی ذمہ داریوں میں کافی اضافہ ہو گیا۔ نتیجے کے طور پر وہ کالج کی پروفیسری سے دست بردار ہو گیے۔

کالج کے زوال کا زمانہ

ولیم پرائس ہندوستانی شعبے کے صدر اور پروفیسر (از [illegible])

ٹیلر کی سبکدوشی کے بعد گورنر جنرل ان کونسل نے ولیم پرائس کو ہندوستانی شعبے کا پروفیسر

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

در صدر مقرر کیا۔ اس سے پہلے وہ اس شعبے کے ممتحن تھے۔ انھوں نے ۲۰ر نومبر ۱۸۲۲ء سے آٹھ سو روپیے ماہانہ مشاہرے پر صدر شعبہ اور پروفیسر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں[1] پرائس کی جگہ بحیثیت ممتحن جے۔ ڈبلیو۔ جے۔ آوزلے کا تقرر عمل میں آیا۔ دریں اثنا ابراہیم لاکٹ ریزیڈنٹ ہو کر لکھنؤ چلے گئے۔ کچھ دنوں تک آوزلے نے ان کی جگہ پر کام کیا۔ اس کے بعد یکم جون ۱۸۲۴ء کو رڈیل باقاعدہ کالج کونسل کے سکریٹری اور لائبریرین مقرر ہوئے جس کے لیے انھیں آٹھ سو روپیے ماہانہ مشاہرہ ملتا تھا۔

اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کا قیام:

فورٹ ولیم کالج کی ہنگامہ خیز زندگی کا دور زیادہ سے زیادہ اس کے قیام سے دو دہائی تک محدود رہا۔ ڈائرکٹر اپنے اختیار و اقتدار سے نت نئے منصوبوں اور تبدیلیوں کو روبہ عمل لاکر اس کے دائرۂ اثر کو محدود سے محدود تر کرتے جا رہے تھے۔ ایسٹ انڈیا کالج ہیلی بری کے قیام سے جب ان کی مراد بر نہ آئی تو انھوں نے ۱۸۱۸ء میں اورینٹل انسٹی ٹیوٹ (ادارۂ شرقیہ) کے نام سے ایک ادارہ لیسٹر اسکوائر (Liecister square) انگلینڈ میں قائم کیا[2] اسے شہرت و عظمت بخشنے کے لیے ڈائرکٹروں نے اسی سال گل کرسٹ کے لیے پروفیسری کی ایک جگہ منظور کی[3]۔ گل کرسٹ کمپنی کی مالی پالسی سے بد دل تھے لیکن انھیں مجبور کیا گیا کہ وہ اس ادارے کے لیے اپنی خدمات وقف کریں۔ ایسٹ انڈیا کالج کی طرح یہ انسٹی ٹیوٹ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی میں بھرتی ہونے والے ملازمین کو مشرقی زبان و ادب کی تعلیم دینے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اور ان دونوں اداروں کے قیام کا بنیادی مقصد فورٹ

---

[1] دارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۱۱۳

[2] سید محمد ارباب نثر اردو ص ۲۵ اور نادم سیتا پوری، فورٹ ولیم کالج اور اکرم علی ص ۸۱

[3] Qidwai 'Gilchrist and the language of Hindustan P. 58

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ولیم کالج کی اہمیت وافادیت کو کم کرکے اسے ختم کرنے کی راہ ہموار کرنا تھا۔ کالج اگرچہ اس کے بعد بھی کسی نہ کسی طرح چلتا رہا لیکن اس کی تصنیفی وتالیفی سرگرمیاں تقریبًا بالکل ختم ہوگئیں، اور وہ علمی سطوت وعظمت جو کسی زمانے میں اس کا طرۂ امتیاز تھی، رفتہ رفتہ ایک داستان پارینہ بن گئی۔

اردو ہندی تنازعے کا عروج :

کالج میں اُردو ہندی کا مسئلہ سب سے پہلے ٹیلر نے کھڑا کیا تھا جس کا مختصر ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ ان کے بعد کونسل کے سکریٹری رڈیل اور ہندوستانی شعبے کے پروفیسر پرائس نے اسے ہوا دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان ہی دونوں کی ریشہ دوانیوں سے تنازعے کی جڑیں مضبوط ہوئیں جس کا سلسلہ کالج کے آخری زمانے تک برقرار رہا اور آج بھی باقی ہے۔ ۲۴ ستمبر ۱۸۲۴ء کو رڈیل نے گورنمنٹ سکریٹری لاشنگٹن کو ایک خط لکھا جس میں انھوں نے ہندوستانی زبانوں سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا تھا کہ

> "ہندوستانی جس شکل میں کالج میں پڑھائی جاتی ہے اور جو اُردو، دہلوی زبان، یا دلی درباری زبان کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ اسے ہندوستان کے سربر آوردہ لوگ اور بالخصوص مسلمان بول چال کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ چوں کہ اسے مغلوں نے رائج کیا تھا اور عربی فارسی اور دوسری شمال مغربی زبانیں اس کا اصل منبع ہیں۔ اس لیے آج بھی یہ ایک غیر ملکی زبان سمجھی جاتی ہے"[1]

رڈیل نے اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اردو کی ضروری تعلیم حاصل کر لینے کے بعد

---

[1] بہ حوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۱۵ F.W. ... June, 1822 - 15 December, 1824, ... Vol ... ...

بھی ہندوستان کی کم سے کم تین چوتھائی آبادی اس کے عربی فارسی الفاظ کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ رائے بھی دی تھی کہ اس زبان کی بہ نسبت سنسکرت سے نکلی ہوئی کسی بھی دیسی زبانوں کو جس کا اثر ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اثر صوبہ جات میں ہے، فروغ دینا زیادہ مفید ہوگا۔ اس کے بعد کالج کونسل نے گورنر جنرل سے کمپنی میں بھرتی ہونے والے ملازمین کے لیے فارسی کے علاوہ ہندوستانی کی جگہ پر برج بھاشا کی، جسے ہندی اور ہندوئی کہا جاتا ہے مناسب تعلیم کی سفارش کی اور یہ درخواست کی کہ دستور میں مناسب ترمیم کی جائے تاکہ اس زبان کی تعلیم کو فروغ حاصل ہو سکے۔ گورنر جنرل نے اس تجویز پر صاد کر دیا۔ چنانچہ کالج کا ساتواں دستور مرتب ہوا جسے فوراً گورنر جنرل کی منظوری مل گئی۔

کونسل نے اس ترمیم شدہ دستور کو کورٹ آف ڈائرکٹرس کے پاس روانہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ولیم پرائس کا ایک طویل خط بھی منسلک تھا جس میں اس نے ہندی کو اردو پر ترجیح دی تھی۔ اور برج بھاشا، کھڑی بولی، ہندوئی یا ٹھیٹ ہندی کی جگہ پر صرف "ہندی" نام رکھنے کی سفارش کی تھی۔ نیز اپنے نام کے ساتھ ہندوستانی پروفیسر کی جگہ پر "ہندی پروفیسر" لکھا تھا، حالانکہ دیگر سرکاری کاغذات میں ہندوستانی پروفیسر ہی لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد ہندی اور اردو کے اس خود ساختہ تنازعے کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے اعلا افسر برابر ہوا دیتے رہے۔ جولائی ۱۸۲۵ء میں کالج کے سالانہ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے گورنر جنرل ولیم پٹ اور کالج کے وزیٹر لارڈ ایم ہرسٹ نے اپنے مشترکہ بیان میں اردو سے متعلق بڑی تعصب آمیز اور اشتعال انگیز باتیں کہی تھیں، مثلاً یہ کہ

"ہندی اور بنگلہ زبانیں اب تک غفلت اور بے اعتنائی کا شکار ہوتی رہی ہیں۔ ہر سالانہ جلسے کے موقع پر اس کرسی سے ان کی تعلیم کی طرف توجہ مبذول کرائی جاتی تھی، لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اب نئے دستور کے تحت ان کی تعلیم کو رواج دینے کا اب ایک بہتر موقع نکل آیا ہے۔ ہندی کے دائرے میں لفظ کے تمام مفہوم کے مطابق وہ بولیاں آتی ہیں جو معمولی

مقامی تبدیلیوں کے ساتھ بنارس، بہار اور مقبوضہ صوبوں کے اکثر و بیش تر ہندو طبقات میں رائج ہیں۔ اس شعبے کے ماہرین سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئی ہے اس کی بنا پر میں ان زبانوں کی طرف، جنھیں میں اس ملک کی زبانیں کہتا ہوں آپ کی توجہ زور دار طریقے پر مبذول کرانا چاہتا ہوں۔[1]

منشیوں کو ہندی پڑھانے کے لیے سیتا رام کا تقرر:

اس نئی تبدیلی کے ساتھ کالج کے منشیوں کے لیے ہندی زبان کی تعلیم کی ضرورت محسوس کی گئی، کیوں کہ وہ منشی جو کالج میں ملازم تھے ہندی سے بالکل ناواقف تھے۔ اس کام کے لیے سیتا رام پنڈت کا تقرر کیا گیا جنھوں نے کالج کے ۲۶ مستقل اور عارضی منشیوں کو ناگری رسم خط اور مبینہ ہندی کی تعلیم دینا شروع کر دی۔ بعد میں ان منشیوں کا ہندی میں امتحان بھی ہوا۔

کالج کا برائے نام وجود:

جس وقت ہندوستان میں کالج کے اعلیٰ عہدہ دار ہندی کی برتری اور بالادستی قائم کرنے میں مصروف و منہمک تھے اس وقت انگلینڈ میں کالج کو ختم کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔ ۱۹ دسمبر ۱۸۲۰ء کو کورٹ نے کالج کے عہدہ داروں کی تعداد اور اس کے مجموعی اخراجات وغیرہ سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی غرض سے کونسل کے نام ایک خط روانہ کیا۔ اس خط سے ایسا مترشح ہوتا تھا کہ ڈائرکٹرز کالج کا وجود برقرار رکھنے کے حق میں نہیں ہیں۔ لیکن کمپنی کے ہندوستانی ملازمین یہ نہیں چاہتے تھے کہ کالج توڑ دیا جائے۔ اس لئے ۲۴ جنوری ۱۸۲۸ء کو قائم مقام گورنمنٹ سکریٹری ای۔ مولوئی نے کالج کونسل کو لکھا کہ کالج کا خرچ جہاں تک ممکن ہو کم کر دیا جائے۔ اور ٹی۔ اے۔ پرنسپ نے کالج کونسل سے دریافت

---

[1] بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۲۵

کیا کہ کالج میں آپ کس طرح کی تعلیم چاہتے ہیں، ۱۔ نجی طور پر منشیوں کے ذریعے یا ۲۔ سرکاری طور پر۔ اس پر کالج کے سکریٹری رٹڈیل نے آوز لے، پرائس، کیرے، ٹوڈ اور ٹی۔ پرائکٹر کو خط لکھ کر ان کی رائیں دریافت کیں۔ اور ۷۔ اگست ۱۸۲۸ء کو کونسل نے گورنر جنرل ولیم بٹینگ کو اپنی رپورٹ بھیج دی کہ کالج ایک مفید ادارہ ہے، جسے ختم کرنا کسی بھی حالت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے حق میں مفید نہیں ہوسکتا۔

اس رپورٹ کے جواب میں گورنمنٹ سکریٹری ایچ۔ پرنسپ نے کونسل کو مطلع کیا کہ کورٹ ابھی تک کسی آخری فیصلے پر نہیں پہنچا ہے۔ ایسی حالت میں ہندوستان کی گورنمنٹ کا کسی فیصلے پر پہنچنا مشکل ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے کونسل کے صدر سے کالج کی اصلاح سے متعلق ان کی رائے بھی طلب کی۔ کونسل کے ارکان نے اس سلسلے میں اپنے اپنے مشورے ۲۔ فروری ۱۸۲۹ء تک ان کے پاس بھیج دیے۔ ۲۔ جون ۱۸۲۹ء کو پرنسپ کے توسط سے کونسل کو کورٹ آف ڈائرکٹرز کا یہ حکم موصول ہوا کہ کالج کو علیٰ حالہٖ برقرار رکھا جائے۔

کالج میں پروفیسروں اور منشیوں کے عہدے ختم:

۲۳۔ فروری ۱۸۳۰ء کو قائم مقام گورنمنٹ سکریٹری ایچ۔ ام۔ پارکر نے کونسل کے صدر شیکسپیر اور دوسرے اراکین کو ایک خط کے ذریعے مطلع کیا کہ فائی ننس کمیٹی نے فورٹ ولیم کالج اور اسسٹنٹ جارج کالج میں سرکاری خرچ میں کمی کرنے کی غرض سے کچھ مشورے دیے ہیں، جن کی اہمیت اور موجودہ مالی بحران کو مدنظر رکھتے ہوئے گورنر جنرل ان کونسل نے سرکاری مفاد کے خیال سے فورٹ ولیم کالج کے پروفیسروں، اسسٹنٹ پروفیسروں، منشیوں اور پنڈتوں کے عہدے ختم کرنے اور مستقبل میں صرف ایک سکریٹری اور دو ممتحنوں کی مدد سے موجودہ نظم برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلے کے بموجب یکم جون ۱۸۳۰ء کو پروفیسروں اور منشیوں کے عہدے ختم کر دیے گئے۔ لیکن طلبہ کی مدد اور رہنمائی کے لیے تیس روپئے[1] ماہوار پر

---

[1] لیکن اس کے بعد جن منشیوں نے کالج میں کام کیا انھیں چالیس روپیے ماہوار سے کم نہیں ملتے تھے۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کچھ سرٹیفکیٹ منشی بدستور کام کرتے رہے[۱]۔

کالج میں جدید طریقۂ تعلیم

اس نئے نظم ونسق کے مطابق طلبہ کو مہینے میں دو بار اپنے ممتحن کے یہاں جاکر نوشت وخواند کی مشق کرنا ہوتی تھی اور ممتحن وہیں ان کی لکھی ہوئی مشقوں کی غلطیاں درست کر دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مقررہ امتحانات کی رپورٹ بھی ممتحن ہی کو بھیجنا پڑتی تھی۔ رڈیل کی ان تھک کوششوں سے اس طریقۂ تعلیم میں کچھ تبدیلیاں بھی ہوئیں لیکن چوں کہ ڈائرکٹرز فورٹ ولیم کالج کے وجود ہی کو دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے بہ حیثیت مجموعی ان سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

پروفیسروں اور منشیوں کو پنشن:

کونسل نے گورنمنٹ کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ جن پروفیسروں اور منشیوں نے خاصی طویل مدت تک کالج کی خدمت کی ہے ان کی پنشن مقرر ہونا چاہیے۔ چناں چہ سبکدوش ملازمین کے لیے پنشن کی مجوزہ رقوم، ان کے حلیے اور دوسری متعلقہ تفصیلات ضابطہ تحریر میں لائی گئیں۔ ہندوستانی شعبے کے جن لوگوں کو پنشن کے لیے منتخب کیا گیا تھا، ان کے نام اور دیگر تفصیلات حسب ذیل ہیں۔

"۱۔ تارنی چرن متر۔ سو روپے پنشن، عمر اٹھاون سال، پستہ قد۔ دور کی چیز نہیں دیکھ سکتے، کچھ جھک کر چلتے ہیں، اوپر کے ہونٹ پر ایک تل ہے۔

۲۔ میر بخشش علی۔ پچاس روپے پنشن، عمر اڑتالیس سال، اوسط قد، رنگ [illegible] گورا، دائیں گال پر چیچک کا ایک داغ۔

۳۔ مرتضیٰ خاں۔ چالیس روپے پنشن، ۶۵ برس، دور کی چیز نہیں دیکھ سکتے، رنگ

---

[۱] فورٹ ولیم کالج ص ۱۲۷

پکھ گورا، موٹی اور توتلی آواز، بلے اور لحیم شحیم"۔[1]

پرائس اور رڈیل کی کالج سے کنارہ کشی:

کالج کے نئے طریقۂ تعلیم سے نہ صرف ہندوستانی منشی ہی ناراض تھے بلکہ بعض انگریز بھی چیں بجبیں تھے۔ چنانچہ پرائس نے ۲۱ دسمبر ۱۸۳۱ء کو کالج کی خدمات سے علاحدگی اختیار کرلی۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد ۱۱ جنوری ۱۸۳۲ء کو رڈیل بھی ملازمت سے کنارہ کش ہوکر یورپ چلے گئے۔

کالج کا خاتمہ

گذشتہ اوراق میں پیش کردہ تفصیلات سے یہ امر بالکل واضح ہے کہ گل کرسٹ اور ولزلی کی انگلینڈ مراجعت اور ہیلی بری کالج کے قیام (۱۸۰۶ء) کے بعد سے فورٹ ولیم کالج برابر روبہ زوال رہا۔ اس کے باوصف تقریباً بیس سال تک اس نے کسی نہ کسی طرح اپنا وقار قائم رکھا۔ لیکن ۱۸۱۹ء میں اورینٹل انسٹی ٹیوٹ لیسٹرا اسکوائر کے قیام اور پھر ۱۸۳۱ء میں پروفیسروں اور منشیوں کے عہدے ختم کرکے ڈائرکٹروں نے اس کے ہاتھ پیر ہی کاٹ دیے جس کے نتیجے میں کالج اس مرغ نیم بسمل کی طرح جس کے شہ پر نوچ دیے گئے ہوں زندگی کی آخری سانسیں پوری کرنے لگا تھا۔ ۱۸۳۱ء سے ۱۸۵۴ء تک اس پر نزع وجاں کنی کی یہی کیفیت طاری رہی۔ بالآخر گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کے ترکش کے تیر نے اس کا وجود ہی صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ اس نے ۱۱۔ اکتوبر ۱۸۵۲ء کو اپنی یادداشت میں کہا تھا۔

"کالج کا موجودہ نظام محض ایک مکروفریب اور استہزا کے سوا کچھ نہیں

---

[1] دارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۱۳۰

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

اس سے کسی مقصد کی تکمیل کی بجائے افواہیں پھیلنے کا خدشہ ہے۔ درحقیقت اس وقت کوئی کالج نہیں ہے۔ پہلے کی طرح طلبہ کے لیے کمرے نہیں ہیں، کوئی پرووسٹ نہیں، کوئی پروفیسر نہیں اور نہ کوئی لکچرر ہے۔ کچھ منشی اور پنڈت ضرور ہیں، گورنمنٹ انہیں تنخواہ دیتی ہے لیکن ان سے کوئی کام نہیں لیتا۔ کالج کا وجود نہ ہونے پر بھی کالج کا ایک سکریٹری ہے۔ ہڈیوں کے اس زندہ ڈھانچے سے کسی قسم کا فائدہ ممکن نہیں۔ لوگوں کے خیال کے مطابق یہ جتنی جلدی ختم کردیا جائے اتنا ہی بہتر ہے[1]

لہٰذا میں فورٹ ولیم کالج کا نام مکمل طور پر اور فوراً مٹا دینا چاہتا ہوں۔ اس کی جگہ میرا خیال ایک دوسرا ادارہ قائم کرنے کا ہے۔ سرکاری ملازمت ملنے سے پہلے ہر نوجوان سول ملازم کو ضروری امتحان پاس کرنے کے لیے جس کی مدد کی ضرورت ہوگی اس کے لیے یہ ادارہ فعال اور مفید ہوگا"[2]

۱۹ نومبر ۱۸۵۲ء کو کالج سے متعلق یہ تمام مسائل ہندوستانی گورنمنٹ کے ہوم ڈپارٹمنٹ کی سپریم کونسل کے اجلاس میں پیش ہوئے۔ ڈلہوزی بھی بہ حیثیت گورنر جنرل اس اجلاس میں موجود تھا۔ اس نے دوران بحث صرف اتنا کہا کہ میں نے اپنی یادداشت میں جو کچھ کہہ دیا ہے اس کے علاوہ اب مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرے معاونین مجھ سے متفق ہوں گے۔ اسی روز آنریبل جے۔ اے۔ ڈورین اور جے۔ لو نے ڈلہوزی کی رائے

---

[1] ۲۰ اگست ۱۸۵۰ء کو بنگال کے سکریٹری جے۔ پی۔ گرانٹ نے کالج سے متعلق ایک نوٹ لکھا جس میں اس نے کالج کے وجود کو بے کار محض بتایا تھا۔ گورنمنٹ سکریٹری جے۔ پی۔ [illegible] نے بھی ۲۱ اگست ۱۸۵۰ء کو اپنے نوٹ میں کالج کی اصلاح سے متعلق متعدد پہلو بتائے تھے۔

[2] Home Department, Government of India, O.C. No. 8, P. 80-82

بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۵۵

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے ذاتی تجربات بھی بیان کیے۔ لارڈ ڈلہوزی نے سمجھ لیا تھا کہ کالج ختم کرنے میں اب کسی قسم کی مخالفت نہیں ہوگی۔ لہذا ۲۴ جنوری ۱۸۵۴ء کو اس نے باقاعدہ کالج توڑنے کا حکم صادر کر دیا۔[۱] یہ حکم نامہ صرف ایک جملہ پر مشتمل تھا۔[۲]

"The College of Fort William is abolished." -

اس کے معاً بعد ایک نئے ادارے "بورڈ آف اکزامینیشنز" (Bord of Examinations) کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ڈلہوزی نے پہلے ہی اس نئے ادارے کے دستور اور دیگر امور سے متعلق اعلا افسروں سے تبادلہ خیال کر لیا تھا۔ بنگال سکریٹری بیڈن اور گورنمنٹ سکریٹری بلاؤ ڈن نے بھی اس سلسلے میں اسے کچھ مشورے دیے تھے۔

اس ادارے کا مقصد بنگال پریسیڈنسی کے نووارد سول ملازمین کا دیسی زبان سے متعلق امتحان لینا تھا۔ اس کے امتحانات ۱۸۵۸ء تک فورٹ ولیم کالج کے نصاب اور طریقے پر ہوتے رہے۔ اسی بنا پر اِل اوموے کو یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ فورٹ ولیم کالج ۱۸۵۸ء تک قائم رہا۔ اِل اوموے کی تصنیف "The history of Bengal Bihar and Urissa Under British Rule" سے جاوید نہال نے بھی فورٹ ولیم کالج کی مدت حیات ۵۸ سال قرار دی ہے۔[۳] محمد عتیق صدیقی کی تحریر کے مطابق کالج ۵۵ (پچپن) سال تک قائم رہا[۴] اور سید محمد اور محمد زبیر کے مطابق اس نے ۵۷ سال تک کام کیا۔[۵] فی الواقع کالج کی مجموعی عمر ۵۳ سال ۶ ماہ اور چودہ دن سے زیادہ نہ رہی۔

۱؎ Khwaja Ahmad Faruqi, "Foreword" Gilchrist and the Language of Hindoostan. P. VIII

۲؎ F.W., 24 January 1854, Public Receding, M.D. January 1854, Letter No 308 O.C. No 14, P. 24

بہ حوالہ فورٹ ولیم کالج ۱۵۸

۳؎ بنگال کا اردو ادب ص ۵۶۔ لیکن "نشان راہ" عنوان کے تحت اسی کتاب میں فورٹ ولیم کالج کی زندگی ۵۴ سال تسلیم کرتے ہیں (بنگال کا اردو ادب ص ۵)

۴؎ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۸

۵؎ ارباب نثر اردو ص ۵۶ اور اردو نثر کا تاریخی سفر ص ۱۳

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

فورٹ ولیم کالج ــــــ مالہ و ماعلیہ

یہ بات اب متحقق طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ کمپنی کے ارباب بست و کشاد نے فورٹ ولیم کالج محض اس غرض سے قائم کیا تھا کہ کمپنی کے نو وارد سول اور فوجی ملازمین دیسی زبانوں کی تعلیم حاصل کر سکیں، تاکہ وہ ہندوستان میں جہاں بھی تعینات کیے جائیں وہاں انھیں مقامی باشندوں سے تعلقات استوار کر کے بہتر نظم و نسق قائم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ بالفاظ دیگر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج محض برطانوی مفاد کے پیش نظر معرض وجود میں آیا تھا۔ اس کے قیام کو اگرچہ بظاہر ہندوستانی زبانوں کی سرپرستی کے اقدام سے تعبیر کیا جاتا تھا لیکن در پردہ اس کے توسط سے انقلاب فرانس کے اثرات کو زائل کرنا مقصود تھا۔

لیکن تمام بڑے ارادے ہمیشہ بڑے نتائج ہی پیدا نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات ان سے اتنے خوش گوار نتائج برآمد ہوتے ہیں کہ بد اندیش اپنے کیے پر خود پشیماں اور مبہوت ہو جاتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج جن ارادوں کے تحت قائم کیا گیا تھا وہ یقیناً ہمارے قومی وقار اور تمناؤں سے مطابقت نہیں رکھتے تھے لیکن حسن اتفاق سے کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے جو ہماری زبان اور ادب کے لیے نہایت سازگار ثابت ہوئے اور جو کالج کے موسسین کو ہرگز مطلوب نہ تھے۔ علمی و ادبی اور ثقافتی و سیاسی رجحان کی لہریں جب ایک بار حرکت میں آ جاتی ہیں تو وہ محض اسی سمت میں سفر نہیں کرتیں جو ان کے محرک متعین کر چکے ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات وہ اپنی مخالف لہریں خود بہ خود پیدا کر لیتی ہیں۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

جس طرح کسی مطلق العنان، جابر و ظالم بادشاہ کے دورِ حکومت میں صرف ظلم و تعدی اور بد اخلاقی ہی پروان نہیں چڑھتیں بلکہ کبھی کبھی اس طوفان میں شریفانہ جذبات و احساسات اور منصفانہ خیالات و نظریات بھی پرورش پاتے رہتے ہیں اور لوٹ کھسوٹ اور مختلف النوع سازشوں کے پہلو بہ پہلو انسان دوستی اور بے نفسی و بے تعصبی جیسی اعلا قدریں بھی اپنا وجود برقرار رکھتی ہیں، اسی طرح برطانوی فوج کے ساتھ جس نے پورے برصغیر کو پامال کر دیا تھا، کچھ ایسے افراد بھی ہندوستان آ گئے تھے جو نہایت دور اندیش و علم دوست اور زبان و ادب کی جولاں گاہ میں انفرادی شہرت کے متمنی تھے۔ اس زمرے میں وہ مستشرقین سرِفہرست ہیں جن کی علمی تشنگی اور ذوقِ تحقیق و تجسس نے انھیں ہندوستانی السنہ و ادبیات کے مختلف میدانوں میں کام کرنے پر آمادہ کیا۔ ان کاموں میں انھوں نے مختلف النوع دشواریوں کا مقابلہ کیا، نقصانات برداشت کیے اور بہ حیثیت مجموعی علم دوستی اور ادب شناسی کا ایک اعلا معیار اور درخشندہ روایات قائم کر کے خود ہمیں ہماری ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ اس قسم کی کوششیں اگرچہ اٹھارہویں صدی عیسوی ہی سے شروع ہو چکی تھیں، لیکن ان کی حیثیت محض انفرادی تھی اور ان میں اجتماعیت کی وہ روح اور وہ ارتباط و اتحاد موجود نہ تھا جو اس قسم کے کاموں کے لیے اشد ضروری ہوتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں ان کوششوں نے ایک باقاعدہ اور منظم تحریک کی شکل اختیار کی جس کے نہایت خوش آئند نتائج برآمد ہوئے اور کالج کے اندر اور باہر ہندوستانی زبان و ادب کو برگ و بار لانے اور ترقی کی نئی شاہراہوں پر گامزن ہونے کا موقع مل گیا۔

ہمیں معلوم ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر تک اردو شاعری نے ترقی کے اعلا مدارج طے کر لیے تھے لیکن اردو نثر گہوارہ طفلی سے باہر نہیں نکل پائی تھی اور اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ امرا و شرفا اور علما و فضلا اپنی تحریر و تقریر میں فارسی کے علاوہ کسی دوسری زبان کے استعمال کو کسرِ شان تصور کرتے تھے۔ ذریعۂ تعلیم بھی یہی زبان تھی اور سرکار دربار میں بھی اسی کا سکہ چلتا تھا، علاوہ بریں مذہبی مواعظ اور علمی مباحث میں بھی فارسی ہی کا استعمال ہوتا تھا۔ روزمرہ کے معمولات میں اس کا استعمال نہ صرف خط و کتابت کے لیے ناگزیر تھا بلکہ

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

حساب کتاب اور بہی کھاتے بھی بالعموم اسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ انسانی زندگی کے ہر شعبے پر فارسی کی حکمرانی تھی۔ اسی وجہ سے شعرائے اُردو کے بیش تر تذکرے بھی اسی زبان میں قلم بند کیے گئے۔ رواج عام کے برخلاف جن لوگوں نے اس زمانے میں اردو میں لکھنے کی کچھ کوشش بھی کی تو روایات سے مجبور ہو کر نہایت پر تکلف اور فارسی آمیز اسلوب اختیار کرنے پر مجبور ہوئے، اور یہ ایک بالکل فطری امر تھا۔ چنانچہ محمد حسین عطا خاں تحسین نے جو باقاعدہ اُردو نثر نگاری کے مدعی ہیں بالکل مصنوعی نثر کا ایک عجیب نمونہ پیش کیا ہے۔ اس سے قبل فضلی نے بھی ایسا ہی دعویٰ کیا تھا اور ان کی نثر کی بھی یہی کیفیت ہے۔

فورٹ ولیم کالج سے قبل اُردو نثر کی جتنی کتابیں تصنیف ہوئیں وہ بہ استثنائے چند بالعموم مذہبیات سے متعلق ہیں۔ یہ کتابیں کم پڑھے لکھے لوگوں کو مذہبی معلومات بہم پہنچانے اور تصوف کے رموز و نکات سمجھانے کی غرض سے لکھی گئی تھیں۔ اس کے باوجود وہ عربی فارسی کے ادق الفاظ سے گراں بار نظر آتی ہیں۔ ان میں صرف عربی فارسی کے مشکل الفاظ ہی استعمال نہیں کیے گئے ہیں بلکہ بہ حد امکان یہ کوشش کی گئی ہے کہ جملے قافیہ بند، مرجز اور مسجع ہوں۔ فارسی کے اتباع اور مشکل پسندی کی اس روایت نے اُردو نثر کو عوام سے کوسوں دور رکھا اور وہ اردو نظم کے شانہ بہ شانہ کوئی قابل ذکر ترقی نہ کر پائی۔

فورٹ ولیم کالج کا سب سے اہم کارنامہ یہی ہے کہ اس نے اُردو زبان کی پوشیدہ فنی صلاحیتوں کو نمود کے مواقع فراہم کیے اور اردو نثر کا ایک ایسا اسلوب وضع کیا جو ...کے مصنفین کے لیے چراغ راہ ثابت ہوا۔ یہ تحریک ہندوستان کی سب سے پہلی شعوری ...اجتماعی، ادبی و لسانی تحریک تھی جس نے اُردو نثر کی رفتار ترقی کے لئے مہمیز کا کام کیا اور ...ے وہ قوت و توانائی عطا کر دی کہ نصف صدی کی مختصر مدت میں اُردو زبان کے اندر ...تمام مضامین و مباحث کو کامیابی کے ساتھ ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ کالج کی ...یس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا جو کام شروع ہوا، اس کے لیے بطور خاص مشاہیر ...لم کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس کے علاوہ بہترین تصنیفات پر انعام کا اعلان کر کے ...سے غیر متعلق مصنفین کو بھی ان کوششوں میں عملی شرکت کی طرف راغب کیا گیا۔ نتیجے کے طور

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

پر متعدد ادبی شاہکار وجود میں آئے اور رفتہ رفتہ کالج کے اندر اور باہر ایک ایسی فضا تیار ہو گئی جس نے آئندہ ترقی کے تمام امکانات روشن کر دیے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر فورٹ ولیم کالج قائم نہ ہوا ہوتا تب بھی اردو نثر کا جو ہیولا بعد میں تیار ہوا اس میں کوئی فرق واقع نہ ہوتا۔ عبداللہ یوسف علی کا یہ قول کہ "فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر کی آئندہ ترقی کے لیے کوئی موثر کوشش نہیں کی"[1] اسی قسم کے غیر حقیقت پسندانہ بیانات کے ضمن میں آتا ہے۔ ہماری ادبی تاریخ شاہد ہے کہ کالج کے قیام سے قبل اردو نثر اپنی صحیح سمت کے عرفان سے یکسر محروم تھی بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا یہ زیادہ سے زیادہ عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔ اگر کالج کے موسسین و مصنفین نے اس کا رخ تبدیل نہ کیا ہوتا تو اسے وہ توانائی ہرگز نصیب نہ ہوتی جس کی بدولت اسے نصف صدی سے بھی کم کی مدت میں ایک امتیازی حیثیت اور علمی وقار حاصل ہو گیا۔

فورٹ ولیم کالج اردو نثر کی تاریخ میں اس اعتبار سے بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس نے اردو زبان و ادب کو عوام سے قریب تر کر دیا۔ کیونکہ اسی کی بدولت جس اسلوب نگارش کو فروغ حاصل ہوا، اس کی بنیاد عربی و فارسی کے ادق الفاظ کے بجائے ہندوستانی عوام کے روزمرہ اور محاورے پر استوار ہوئی تھی۔ اس تبدیلی کے جو دور رس نتائج برآمد ہوئے ان میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ زبان جو علمی حلقوں میں انتہائی پس ماندہ و کم مایہ سمجھی جاتی تھی صرف تیس پینتیس برس کی قلیل مدت میں فارسی کو مسند اقتدار سے ہٹا کر اس کی جانشیں بن گئی اور کاروباری زندگی میں شریک دنیا کی دوسری زبانوں سے آنکھ ملانے لگی۔ بعض حضرات کا یہ خیال کہ فورٹ ولیم کالج میں صرف قصوں اور کہانیوں کی کتابیں لکھی گئیں جنھیں بامقصد اور مفید لٹریچر میں شامل نہیں کیا جا سکتا، حقیقت سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ کالج کی زندگی میں کالج کے اندر اور باہر تقریباً

---

[1] ملاحظہ ہو "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ"

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ڈیڑھ سو کتابیں تصنیف، تالیف یا ترجمہ ہوئیں، جن میں قواعد و لغات اور قصص و داستانوں اور انتخابات و دواوین کے علاوہ تاریخ، تذکرہ اور اخلاق و معاشرت کے موضوعات سے متعلق کتابوں کی خاصی تعداد شامل ہے۔

کالج کا دوسرا اہم کارنامہ ہندوستانی زبانوں کو مشینی دور میں داخل کرنا ہے۔ ہندوستان کی ادبی فضا پر جن چیزوں کا براہ راست اثر ہوا ان میں اُردو چھاپے خانوں کا قیام اور ان کا استعمال غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ چھاپے خانے کے وجود میں آنے سے قبل کتابیں پیشہ ور کاتبوں سے نقل کرائی جاتی تھیں اور حسب ضرورت نقل در نقل کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ اس سے ایک طرف تو طلبہ اور عام شائقین علم کو کتابوں کے حصول میں کافی دقت پیش آتی تھی اور کسی خاص کتاب کی نقل حاصل کرنے میں وقت اور روپیہ دونوں کی قربانی دینا پڑتی تھی۔ دوسرے کاتبوں کی کم سوادی اور پیشہ ورانہ عجلت اور سہل پسندی کی وجہ سے ان کا متن اکثر ناقابل اعتبار ہوتا تھا۔ چھاپے خانے کی ایجاد اور رواج عام سے یہ مسئلہ بڑی حد تک حل ہو گیا۔ اس پیش رفت سے ضمناً ایک فایدہ یہ بھی ہوا کہ صحافت کے فروغ کی راہ کھل گئی جو عوام سے زیادہ سے زیادہ روابط استوار کر کے اصلاحی تحریکات اور ترقی پسندانہ خیالات کو عام کرنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوئی۔

یورپی مفکرین کو مشرقی علوم اور تہذیبی اقدار کی افادیت و اہمیت کا احساس دلانے میں بھی فورٹ ولیم کالج نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ مشرقی ادب اور فلسفہ کی کتابوں کے تراجم نے انگریزوں کے احساس کو تیز سے تیز کر دیا کہ علم کے مشرقی سرچشموں کو ٹھیک طور پر سمجھا جائے اور غیر متعصبانہ طور پر ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جائے۔ اس لیے عربی فارسی اور سنسکرت کی بعض کتابیں انگریزی میں ترجمہ کی گئیں، تاکہ ان کی وساطت سے یورپی مفکرین مشرقی ادب، فلسفہ اور تہذیب سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ ۱۸۱۳ء میں اس کالج میں مشرقی علوم و فنون کے مطالعہ کی روز افزوں ترقی کی رپورٹ دیتے ہوئے لارڈ منٹو نے دوسری کتابوں کی اشاعت کے علاوہ "میگھ دوت" کے انگریزی ترجمے کا بھی ذکر کیا ہے جو ایچ۔ ایچ۔ ولسن نے کیا تھا۔ سنسکرت کے اس لافانی شاہکار کے انگریزی ترجمے

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

نے لارڈ منٹو پر یہ واضح کر دیا کہ ہندوستانی قوم کا معیارِ فکر کس قدر بلند، ادبی مذاق کس قدر شستہ و شائستہ، نظر کتنی وسیع اور کردار کتنا ارفع و اعلا ہے۔ کالی داس ارضِ وطن سے بے پناہ محبت رکھنے اور فکری طور پر خالص ہندوستانی ہونے کے باوجود ساری دنیا کا ہمدرد اور بہی خواہ تھا۔ اس سے قبل اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں سر ولیم جونس نے کالی داس کی شکنتلا کے انگریزی ترجمے سے علمی و ادبی دنیا پر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ سنسکرت زبان یونانی سے زیادہ مکمل اور لیٹن سے زیادہ وسیع ہے اور ان دونوں زبانوں سے بلا کسی استثنا زیادہ فصیح بھی ہے۔

اس طرح یورپی فاتحین پر یہ حقیقت کسی حد تک آشکارا ہو گئی کہ ہم نے کسی ایسے ملک پر قبضہ نہیں کیا ہے، جس میں غیر مہذب لوگ بستے ہیں بلکہ ہمارا سابقہ ایک ایسی قوم اور ملک سے پڑا ہے جو نہایت مہذب و متمدن اور کئی اعتبار سے ہم سے بہتر اور اس کے بعض علاقے تہذیب و تمدن کے اعتبار سے معراج پر پہنچ چکے ہیں۔[1]

فورٹ ولیم کالج کی ایک اور خصوصیت جو اسے دوسرے تعلیمی اداروں سے ممتاز کرتی ہے، طلبہ کی اخلاقی تربیت اور کردار سازی کا خاص اہتمام ہے۔ کالج کے ذمہ دار اس پہلو کو جتنی اہمیت دیتے تھے۔ اس کا ذکر اجمالاً گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ کالج کے پہلے چار برسوں کی کارکردگی کی رپورٹ میں طلبہ کے اندر بداخلاقی کی ایک بھی مثال نہیں ملتی۔ اس دوران بعض طالب علموں کا کالج سے اخراج ضرور ہوا۔ لیکن ان کے خلاف یہ کارروائی کسی بداخلاقی کی پاداش میں نہیں بلکہ مطالعہ میں عدم دلچسپی کی بنا پر کی گئی تھی۔ کیمبرج یونیورسٹی میں نگرانی کی انتہائی سختی کا اعتراف کرتے ہوئے اس رپورٹ میں کالج کی قائم کی ہوئی کچھ ایسی مثالیں پر اظہارِ فخر کیا گیا ہے۔ جیسے دن میں سولہ گھنٹے کی پڑھائی اور اس کے بعد کشتی رانی (Swimming) کی مشق، تاکہ صحت بحال رہے۔ رپورٹ کے مطابق

لہ College of Fort William in Bengal P. 164

بحوالہ Gilchrist and the Language of Hindustan P. 24

ان چار سالوں میں کوئی باہمی تصادم نہیں ہوا جبکہ انگلینڈ کی یونیورسٹیوں میں اکثر ہوتا ہے۔

اُردو کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی دوسری جدید زبانیں خاص طور سے ہندی اور بنگلہ کی توسیع و ترقی میں بھی کالج نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں بہت ہی نازک دور سمجھا جاتا رہا ہے۔ لیکن کالج کی سرپرستی میں ہندوستان کی جدید زبانیں اس پرآشوب دور میں خوب پھولیں پھلیں اور پروان چڑھیں۔ چنانچہ پیارنجن سین نے بنگلہ زبان و ادب کی ترقی میں فورٹ ولیم کالج کے احسانات کا واضح طور پر اعتراف کیا ہے۔ اسی طرح کھڑی بولی ہندی کی ترویج و ترقی کے باب میں آچاریہ رام چندر شکل، شاردا دیوی ویدالانکر اور لکشمی ساگر وارشنے ارباب کالج کے ممنون مشکور نظر آتے ہیں۔

اُردو نثر کی ترقی کے پہلو بہ پہلو بنگال اور خاص طور پر کلکتہ میں اردو شاعری کا مذاق عام کرنے میں کالج نے اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ہر سال غالباً ۲۵ رجون کو کالج میں نہایت اہتمام کے ساتھ مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں نہ صرف کالج کے ملازم شعرا اپنا کلام پیش کرتے بلکہ شہر کے دیگر شعرا بھی اپنے اشعار سے سامعین کو محظوظ کرتے تھے۔ ان مشاعروں کی بدولت طلبہ اور حاضرین محفل میں اشعار کے حسن و قبح کی پرکھ اور روزمرہ و محاوروں کی صحت کا شعور بیدار ہوا۔ جس کے خوشگوار نتائج سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ رائے بینی نارائن دہلوی نے "دیوان جہاں" کے آخر میں غالباً اس سلسلے کے ایک مشاعرے کی طرحی غزلیں نقل کی ہیں۔ یہ مشاعرہ ۲۵ر جولائی ۱۸۱۲ء کو منعقد ہوا تھا۔

فورٹ ولیم کالج کی سالانہ تقریبات کلکتہ کی تہذیبی زندگی میں خاص اہمیت کی حامل ہوا کرتی تھیں۔ گورنمنٹ کے اعلا افسروں، ممتاز علماء فضلا اور ہندوستانی و یورپی شہریوں کے سامنے گورنر جنرل کا خطاب اور کالج کے طلبہ کی تقریریں جن کی زبان خالص اُردو ہوتی تھی پورے سال تک شرکا کے ذہنوں پر اپنی تاثیر باقی رکھتی تھیں۔ ان جلسوں میں کلکتہ کے ممتاز شہری اور یورپی دانشور اپنے بہترین لباس میں رونق افروز ہوتے تھے۔

اُردو زبان و ادب کی ان گراں قدر اور ناقابل فراموش خدمات کے پہلو بہ پہلو

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

فورٹ ولیم کالج سے کچھ ایسے لسانی تنازعوں کی بھی ابتدا ہوئی جنھوں نے اُردو کے عوامی کردار پر ناخوش گوار اثرات مرتب کیے اور اس کی مقبولیت و ہر دل عزیزی کو نقصان پہنچایا۔ ان اختلافات کی بنیاد اردو اور ہندی کی تفریق کی وہ سوچی سمجھی سازش تھی جس کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں کیا جاچکا ہے۔ اس سازش کے تحت جس تعصب کو ہوا دی گئی اور جو شر انگیز بیانات جاری کیے گیے وہ آج بھی مخالفین اُردو کے لیے سرچشمۂ فیضان اور سامان تقویت بنے ہوئے ہیں۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

فورٹ ولیم کالج کی تالیفات

ابھی تک کسی نے فورٹ ولیم کالج کی تالیفات کی فہرست مرتب نہیں کی ہے اور نہ تو صحیح طور پر یہ معلوم ہو سکا کہ کالج کے زیر اہتمام کتنی کتابیں تصنیف، تالیف یا ترجمہ ہوئیں لاکٹ نے ۹۔ مارچ ۱۸۱۳ء کو کتابوں کی جو تفصیل کالج کونسل کو بھیجی تھی اس سے معلوم[1] ہوتا ہے کہ اس وقت تک نواسی (۸۹) کتابیں[2] طبع ہو چکی تھیں اور ان کی طباعت پر ۲۶۴۱۰۶-۶-۱ دو لاکھ چوسٹھ ہزار ایک سو چھ روپیہ، چھ آنہ اور ایک پائی یا ایک پیسہ خرچ ہوا تھا۔ راقم السطور نے جو فہرست مرتب کی ہے اس میں کتابوں کی مجموعی تعداد ۱۴۷ ہے، جن میں مطبوعہ (۹۴) اور غیر مطبوعہ (۵۳) کتابیں شامل ہیں۔ لیکن اس فہرست کے بھی مکمل ہونے کا دعوا نہیں کیا جا سکتا۔

فہرست نمبر ۱

مطبوعہ :-

نمبر شمار	نام کتاب	مولف	سال اشاعت	رسم خط	کیفیت
۱	مسکین کے مرثیے	میر جعفر	۱۸۰۱ء	ناگری	یہ عبداللہ مسکین کے مرثیے کا ناگری ترجمہ ہے
۲	ہندی مشقیں (Hindee Exercises)	گل کرسٹ	۱۸۰۲ء	اردو، ناگری، رومن	یہ کالج کے نصاب کے لیے بنائی گئی
۳	باغ اردو	شیر علی افسوس	"	اردو	
۴	The Strangers East India Guide to the Hindoostanee	گل کرسٹ	"	رومن	اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۸ء میں بھی شائع ہوا۔

[1] ان کتابوں میں مراٹھی اور ایشیا زبانوں سے متعلق بھی کتابیں شامل تھیں

[2] بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص۲۰۱

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

۵	Hindoostanee Principles (مبادیات ہندوستانی)	گل کرسٹ	۱۸۰۲ء	رومن	
۶	Practical Outlines (ہندوستانی علم الہجا کا خاکہ)	"	"	رومن	اس کی ترتیب میں تارنی چرن بھی شامل تھے
۷	Hindee Manual Vol. I (بیاض ہندی)	"	"	اردو، ناگری، رومن	یہ کتاب متعدد منشیوں کے تعاون سے ترتیب دی گئی تھی۔ اس میں باغ و بہار، شکنتلا، مرثیہ مسکیں، مادھونل کام کندلا، باغ اردو وغیرہ کے اقتباسات شامل ہیں۔
۸	Hindee Arabic Mirror	"		رومن اردو	یہ ۱۸۰۴ء میں دوبارہ شائع ہوئی تھی۔
۹	رسالہ گل کرسٹ	بہادر علی حسینی	"	اردو	گل کرسٹ کی قواعد کا خلاصہ
۱۰	The Hindee Story Teller Vol. 1 (نقلیات یا نقلیات ہندی)	بہادر علی حسینی اور متعدد منشی	۱۸۰۲ء	رومن، اردو ناگری	اس کا دیباچہ اور اختتامیہ گل کرسٹ نے انگریزی میں لکھا ہے۔
۱۱	اخلاق ہندی	بہادر علی حسینی	"	ناگری	یہ ۱۸۰۳ء میں اردو رسم الخط میں بھی شائع ہوئی۔
۱۲	رسالہ کائنات جو	خلیل علی خاں اشک	"	اردو	
۱۳	توتا کہانی	حیدر بخش حیدری	"	ناگری	۱۸۰۴ء میں اسے اردو رسم خط میں بھی طبع کیا گیا۔
۱۴	ترجمہ پند نامہ منظوم	مظہر علی خاں ولا	۱۸۰۲ء	اردو	سعدی کی "پند نامہ" کا منظوم ترجمہ
۱۵	The Hindee Story Teller Vol. II (نقلیات یا نقلیات ہندی)	بہادر علی حسینی اور متعدد منشی			

[1] اس کا دوسرا نام A Sketch of Hindoostanee Orthoepy in the Roman character بھی ہے۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۱۶	نثر بے نظیر	بہادر علی حسینی	۱۸۰۳ء	اُردو	اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا۔
۱۷	The Oriental Fabulist (نقلیات لقمانی)	متعدد منشی	〃	رومن	یہ تارنی چرن کے نام سے منسوب کی جاتی ہے۔
۱۸	گلدستۂ حیدری	حیدر بخش حیدری	،	اردو	سن ترتیب ۱۸۰۱ء۔ اس میں "گلشن ہند" بھی شامل ہے۔
۱۹	The Hindu Moral Preceptor (اتالیق ہندی)	گل کرسٹ	〃	رومن اُردو	یہ سعدی کی پند نامہ کا منظوم انگریزی ترجمہ ہے۔ گلیڈون کا کیا ہوا پندنامہ کا انگریزی نثر میں ترجمہ اور ولا کا منظوم اردو ترجمہ بھی اس میں شامل ہے۔
۲۰	The Oriental Linguist (مشرقی زبان داں)	〃	،	رومن	
۲۱	The Anti Jargonist	〃	〃	،	۱۸۰۰ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا۔
۲۲	باغ و بہار[1]	میر امن	〃	اردو	اس کے دوسرے ایڈیشنز صرف کلکتہ سے ۱۸۰۴ء، ۱۸۰۹ء، ۱۸۱۳ء، ۱۸۱۱ء، ۱۸۱۲ء، ۱۸۲۸ء، ۱۸۵۲ء، ۱۸۶۳ء، اور ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئے تھے۔
۲۳	قصۂ فیروز شاہ	شیخ محمد بخش	،	اردو	
۲۴	قصۂ دل آرام ودل بار	توتا رام	〃	اردو	

[1] باغ و بہار کے بارے میں شانتی رنجن بھٹاچاریہ لکھتے ہیں کہ "یہ ۱۸۰۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی... کلکتے کے کسی کتب خانے میں اس ایڈیشن کی کوئی کاپی مجھے نہیں ملی۔ اس ایڈیشن کی ایک جلد کیٹلاگ کے مطابق برٹش میوزیم لائبریری لندن میں ہے۔ (تذکرۂ تصانیف بنگال ص ۶۸، غیر مطبوعہ) لیکن میری تحقیق کے مطابق یہ مکمل طور پر ۱۸۰۳ء ہی میں طبع ہوئی تھی۔ ۱۸۰۲ء میں اس کے کچھ حصے ضرور طبع ہوئے جنھیں بیاض ہندی میں شامل کیے گئے

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

۲۵	چندراوتی	سدل مسر	۱۸۰۳ء	ناگری	
۲۶	حسن اختلاط	میر ابوالقاسم	″	اردو	
۲۷	کلا کام	کندن لعل	″	اردو	اس کتاب کے مصنف کو سو روپیے بطور انعام ملے تھے۔
۲۸	خوان نعمت	سید حمید الدین بہاری	″	″	یہ "خوان الوان" (فارسی) کا ترجمہ ہے، جو بیس خوانوں پر مشتمل ہے کالج کی کاروائیوں میں اس کا نام "خوان الوان" ہی لکھا گیا ہے۔
۲۹	بحری و طبی ہندستانی لغت	تھامس روبک	″	رومن اردو	
۳۰	سری بھاگوت	للولال کوی	″	ناگری	یہ پریم ساگر کا نامکمل ایڈیشن ہے۔
۳۱	ہندستانی کہاوتیں	ولیم ہنٹر	″	اردو	
۳۲	ہندستانی میں مستعمل عربی و فارسی الفاظ کا انتخاب	---	″	اردو	
۳۳	داستان امیر حمزہ	خلیل علی خاں اشک	″	اردو	
۳۴	حکایات متفرقات	----	″	نامعلوم	
۳۵	مثنوی (میر حسن)	میر حسن	″	اردو	یہ ۱۸۰۵ء میں دوبارہ شائع ہوئی۔
۳۶	The Hindee Orthoepigraphical Ultimatum (شکنتلا)	کاظم علی جواں	۱۸۰۴ء	رومن	اس کے کچھ حصے ۱۸۰۲ء میں "ہندی مینول" میں شامل تھے۔ پوری کتاب گل کرسٹ نے رومن خط میں اسی نام سے شائع کی۔
۳۷	مذہب عشق (گل بکاولی)	نہال چند لاہوری	″	اردو	اس کا چوتھا ایڈیشن غلام اکبر نے مرتب کیا تھا جسے ۱۸۱۵ء میں شائع کیا گیا۔ دوسرا اور تیسرا ایڈیشن افسوس اور روبک کی نظر ثانی کے بعد شائع ہوا

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۳۸	ہدایت الاسلام (پہلی جلد)	امانت اللہ شیدا	۱۸۰۴ء	اُردو	۔
۳۹	A New Theory and Prospectus of Persian Verbs	گل کرسٹ	"	رومن	گل کرسٹ نے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۱ء میں نجی طور پر شائع کیا تھا۔
۴۰	آرائش محفل (قصہ حاتم طائی)	حیدر بخش حیدری	"	اردو	یہ ۱۸۴۵ء، ۱۸۴۷ء، ۱۸۶۳ء اور ۱۸۷۰ء میں بھی شائع ہوئی۔
۴۱	سنگھاسن بتیسی	کاظم علی جواں	۱۸۰۵ء	ناگری	ترجمے میں للولال نے مدد کی تھی چنانچہ سرورق پر ان کا نام بھی درج تھا لیکن کی (F.E. Keay) نے صرف للو لال ہی کو اس کا مصنف قرار دیا ہے[1] جو کسی طرح بھی درست نہیں۔
۴۲	بے تال پچیسی	مظہر علی خاں ولا	۱۸۰۵ء	ناگری اُردو	اس کی ترتیب میں بھی للولال نے ولا کی معاونت کی تھی چنانچہ بہ حیثیت مرتب ان کا نام بھی سرورق پر درج تھا لیکن کی (F.E. Keay) نے اس کا واحد مصنف للولال کو قرار دیا ہے[2]۔
۴۳	خرد افروز	حفیظ الدین		اردو	اس کا دوسرا ایڈیشن روبک نے ۱۸۱۵ء میں تصحیح اور مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔
۴۴	عہد نامۂ جدید	مرزا محمد فطرت	"	"	یہ "New Testament" کا ترجمہ ہے، جسے ہنٹر نے تصحیح کے بعد شائع کیا تھا۔

---

۱ History of Hindi Literature P. 81

۲ History of Hindi Literature P. 81

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

۴۵	گنج خوبی یا اخلاقِ محسنی	میر امن	۱۸۰۵ء	ناگری	دوسری ایڈیشن اردو رسم الخط میں بمبئی سے ۱۸۷۵ء میں شائع ہوا۔
۴۶	Dictionary	مارکن نوش	۱۸۰۸ء	رومن اُردو	
۴۷	آرائش محفل	شیر علی افسوس	"	اردو	سال تکمیل ۱۸۰۵ء
۴۸	Hindoostanee Dictionary	ولیم ٹیلر	"	رومن اُردو	
۴۹	گرامر کے سوالات	- - -	"	رومن اُردو	یہ بطور خاص کالج کے نصاب کے پیش نظر لکھی گئی تھی۔
۵۰	Hindoostanee English Dictionary	ولیم ہنٹر	"	اردو رومن	
۵۱	دل چسپ کہانیاں	گلیڈون	"	رومن	اسے بعد میں ناگری رسم خط میں بھی شائع کیا گیا۔
۵۲	راج نیتی	للو لال	۱۸۰۹ء	ناگری	
۵۳	بہاری ست سئی یا لال چندریکا	"	"	ناگری	بہاری ست سئی کی تشریح
۵۴	Hindi Persian Vocabulary (ہندی فارسی لفظوں کا ترجمہ)	سدل مسر	"	اردو ناگری	اس پر سدل مسر کو پچاس روپیے کا انعام ملا تھا۔
۵۵	پریم ساگر	للو لال	۱۸۱۰ء	ناگری	اس کے کچھ حصے ۱۸۰۳ء میں سری بھاگوت کے نام سے شائع ہوئے تھے۔
۵۶	The English and Hindoostanee Dictionary with grammar Prefixed	تھامس رؤبک	۱۸۱۰ء	رومن	یہ پہلی مرتبہ ۱۸۰۹ء میں ایڈنبرا سے شائع ہوئی تھی۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۵۷	دیوان میر سوز	میر سوز	۱۸۱۰ء	اردو	
۵۸	لطائف ہندی (بزبان ہندی)	للو لال	"	ناگری	
۵۹	لطائف ہندی (بزبان اردو)	"	"	اردو	
۶۰	صرف اردو (منظوم)	امانت اللہ شیدا	"	اردو	سال تصنیف ۱۸۰۶ء
۶۱	کلیات سودا کا انتخاب	کاظم علی جوان، ڈ مولوی محمد اسلم	۱۸۱۰ء	اردو	
۶۲	انتخاب اخوان الصفا	مولوی اکرام علی	۱۸۱۱ء	اردو	
۶۳	رام چرت	سدل مسر	"	ناگری	تالیف ۱۹۰۶ء۔ یہ ادھیاتم راماین کا ترجمہ ہے
۶۴	کلیات میر (چار جلدوں میں)	مرتبہ جوان، تارنی چرن، طپش، غلام اکبر اور مولوی محمد اکبر	"	اردو	یہ ٹیلر کے زیر نگرانی مرتب ہوا تھا۔
۶۵	English and Hindoostanee Naval Dictionary of Technical Words and Phrases	تھامس رو بک	"	رومن اردو	اردو ادب کے مورخین نے اس کا نام "لغت جہاز رانی" لکھا ہے۔
۶۶	خلاصۃ الحساب	تارنی چرن متر	"	اردو	
۶۷	برج بھاشا کے قواعد	للو لال	"	اردو ناگری	یہ انڈیا گزٹ پریس میں طبع ہوئی تھی
۶۸	کثیر الفواید	- - -	۱۸۱۲ء	اردو	ہندوستانی، فارسی اور پنجابی گرامر
۶۹	English and Hindoostani Exercises	تھامس رو بک	"	رومن اردو	دو جلدوں میں
۷۰	ترجمۂ گلستاں	لالہ کاشی راج	"	گرمکھی	بہ زبان پنجابی

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

۷۱	ہندی کہاوتیں	- - -	۱۸۱۲ء	اردو	
۷۲	گل مغفرت	حیدر بخش حیدری	"	اردو	
۷۳	بارہ ماسا (دستور ہند)	کاظم علی جواں	"	اردو	یہ ۱۸۰۳ء میں مکمل ہو چکی تھی۔
۷۴	A Panjabi Dictionary	لالہ کاشی راج	۱۸۱۲ء	گرمکھی	لفظوں کا تلفظ ناگری میں ہے
۷۵	پورش پریکھیا	تارنی چرن	"	ناگری	
۷۶	پریم ساگر کا لغت	ولیم پرائس	۱۸۱۴ء	ناگری	
۷۷	کھڑی بولی اور انگلش کا لغت	"	۱۸۱۵ء	ناگری رومن	
۷۸	Collection of Oriental Proverbs	تھامس روبک	۱۸۱۶-۲۴ء	اردو	
۷۹	سبھا بلاس	للو لال	۱۸۱۷ء	ناگری	پرائس نے ۱۸۲۸ء میں اسے دوبارہ مرتب کیا تھا۔
۸۰	Annals of the Fort William College	تھامس روبک	۱۸۱۹ء	رومن	
۸۱	نیتی کتھا یا حکایت نصیحت آموز (حصہ اول)	تارنی چرن	۱۸۱۹ء	اردو	
۸۲	نیتی کتھا یا حکایت نصیحت آموز (حصہ دوم)	"	۱۸۲۰ء	"	
۸۳	چھتر سال	للو لال	۱۸۲۱ء	ناگری	پرائس نے اسے دوبارہ مرتب کرکے ۱۸۰۲ء میں شائع کیا تھا۔
۸۴	افعال فارسی و اردو	تھامس رُبک	۱۸۲۴ء	رومن اردو	اس کی ترتیب کی ابتدا ہنٹر نے کی تھی۔
۸۵	Hindee English Dictionary	گنگا پرشاد شکل	۱۸۲۶ء	ناگری رومن	اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۲۰ء میں بھی طبع ہوا تھا۔
۸۶	Hindoostanee Grammer	ڈبلیو ٹیٹس	۱۸۲۷ء	رومن اردو	

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۸۷	An Introduction of The Hindoostanee Language	ڈبلیو۔ ٹیس	۱۸۲۷ء	رومن	۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۲ء میں بھی اسے شائع کیا گیا
۸۸	Hindee and Hindoostanee Selections (دو جلدوں میں)	ولیم پرایس اور تارنی چرن مشر	"	اردو	
۸۹	چھتر پرکاش	للولال	۱۸۲۹ء	ناگری	اسے ۱۹۰۳ء میں بنارس سے بھی شائع کیا گیا۔
۹۰	Polyglot Munshi	دیوی پرشاد رائے	۱۸۴۱ء	رومن	
۹۱	ہندی مثنوی	للولال	نامعلوم	ناگری	شعرائے ہندی کی نظموں کا انتخاب
۹۲	ہندی اسٹوری کا ترجمہ پنجابی (دو جلدوں میں)	لالہ کاشی راج	نامعلوم	گرمکھی	سال ترجمہ ۱۸۱۱ء
۹۳	A Persian Dictionary (برہان قاطن)[۱]	تھامس روبک	نامعلوم	اردو رومن	
۹۴	A Complete Hindoostanee and English Dictionary	"	نامعلوم	رومن اردو	

---

[۱] وارشنے نے اسی طرح لکھا ہے۔ "برہان قاطع" ہونا چاہیئے۔ (فورٹ ولیم کالج ص ۱۰۰ اور ۱۰۹)

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

فہرست نمبر ۲

غیر مطبوعہ:۔

حسب ذیل کتابیں کالج کی جانب سے شائع نہیں ہو سکیں۔ لیکن ان میں بعض کتابیں کسی ادارے کی طرف سے یا ذاتی طور پر شائع ہو چکی ہیں، جن کی نشاندہی کیفیت کے خانے میں کر دی گئی ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	مولف	سال تصنیف	رسم خط	کیفیت
۱	مہر و ماہ	حیدر بخش حیدری	۱۸۰۰ء	اردو	
۲	قصہ لیلیٰ مجنوں	"	۱۸۰۱ء	اردو	
۳	گلشن ہند	مرزا علی لطف	"	اردو	اسے انجمن ترقی اردو ہند حیدر آباد نے پہلی مرتبہ ۱۹۰۵ء شائع کیا تھا۔
۴	مادھونل اور کام کندلا	مظہر علی خاں ولا	"	اردو	ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ۱۹۶۵ء میں اردو دنیا کراچی سے اسے شائع کر دیا ہے
۵	ہفت گلشن	"	"	اردو	اسے بھی عبادت بریلوی نے ۱۹۶۴ء میں کراچی سے شائع کیا ہے۔
۶	بہار دانش	مرزا جان طپش			یہ پہلی مرتبہ ۱۸۳۹ء میں اور دوسری بار ۱۸۴۵ء میں شائع ہو چکی ہے، لیکن کالج کی طرف سے یہ شائع نہیں ہوئی تھی۔
۷	قصہ فرعون	محمد بخش	۱۸۰۳ء	اردو	
۸	جامع القوانین	حیدر بخش حیدری	"	اردو	
۹	باغ سخن	مرزا مغل نشاں	"	اردو	

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۱۰	حسن و عشق (گل و ہرمز)	غلام حیدر عزت	۱۸۰۳ء	اردو	
۱۱	بحر عشق یا سیف الملوک	منصور علی	″	اردو	
۱۲	کلیات سودا (تین جلدوں میں)	مرتبہ شیر علی افسوس	″	اردو	
۱۳	گلشن ہند	اِسطا خاں	″	اردو	اس میں "گل و صنوبر" بھی شامل ہے۔
۱۴	الف لیلہ	شاکر علی	″	اردو	چنانچہ کالج کی کارروائیوں میں اس کا
۱۵	تواریخ بنگالہ	غلام اکبر	″	اردو	نام گل و صنوبر ہی لکھا ہے
۱۶	تواریخ عالم گیری	محمد عمر	″	اردو	
۱۷	تواریخ تیموری	تصدق حسین	″	اردو	
۱۸	تواریخ سلاطین	غلام شاہ بھیک	۱۸۰۲ء	اردو	
۱۹	قصۂ دل و حسن	″	″	اردو	
۲۰	اخلاق النبی	غلام اشرف	″	اردو	
۲۱	کلیات ولی	مرتب نامعلوم	″	اردو	
۲۲	دہ مجلس	شیخ محمد بخش		اردو	
۲۳	درِ مجالس	غلام سبحان	″	اردو	
۲۴	مثنوی کلکتہ معہ قصہ بلند اختر[1]	نور خاں	۱۸۰۴ء	اردو	
۲۵	قصۂ زنوان شاہ (نگار خانۂ چین)	خلیل علی خاں اشک		اردو	ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے بھی پاکستان سے شائع کر دیا ہے۔
۲۶	گلزار دانش	حیدر بخش حیدری		اردو	ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے بھی شائع کر دیا

[1] جاوید نہال "مثنوی کلکتہ" اور "قصۂ بلند اختر" کو دو الگ الگ تصنیف قرار دیتے ہیں (انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۱۴۲-۲۱۳) یہ صحیح نہیں ہے۔ نور خاں نے بطرز مثنوی پہلے قصۂ بلند اختر لکھا بعد میں اس مثنوی کو نثر میں منتقل کیا اور اس کا نام "مثنوی کلکتہ" رکھا اور قصۂ بلند اختر کو بھی اس میں شامل کیا (فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۲۹۲)

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

۲۷	چشمۂ فیض	معین الدین فیض	۱۸۰۴ء	اردو	منظوم
۲۸	(پند نامۂ فرید الدین عطا)				
۲۸	ہدایت الاسلام (جلد دوم)	امانت اللہ شیدا	〃	اردو	
۲۹	ترجمۂ قرآن شریف[1] (دو جلدوں میں)	بہادر علی، شیدا، غوث علی، کاظم علی جواں اور فضل اللہ	〃	اردو	اس کے کچھ حصے ۱۸۰۴ء میں طبع ہو چکے تھے لیکن ارباب کالج نے اس کی اشاعت کو مناسب نہ سمجھتے ہوئے طبع شدہ اجزا ضبط کر لیے۔
۳۰	جامع الاخلاق	امانت اللہ شیدا	۱۸۰۵ء	اردو	غلام اکبر نے اسے دوبارہ مرتب کر کے ۱۸۴۸ء میں کلکتہ سے شائع کیا۔
۳۱	انتخاب سلطانیہ	خلیل علی خاں اشک	〃	اردو	
۳۲	ترجمہ تاریخ شیر شاہی	مظہر علی خاں ولا	〃	اردو	یہ عباس خاں کلبور سروانی کی فارسی تصنیف "تحفۂ اکبر شاہی" کے بیشتر حصے کا ترجمہ ہے
۳۳	تاریخ آشام (آسام)	بہادر علی حسینی	〃	اردو	ولی احمد شہاب الدین طالش کی تاریخ کا ترجمہ
۳۴	تاریخ بہمنی (تاریخ فرشتہ)	کاظم علی جواں	۱۸۰۷ء	اردو	
۳۵	اقبال نامہ	سید بخشش علی	۱۸۰۹ء	اردو	
۳۶	افسانۂ جان و دل (چہار باغ)	کھیم نراین رند	۱۸۰۹ء	اردو	
۳۷	تاریخ نادری	حیدر بخش حیدری	〃	اردو	
۳۸	ہفت پیکر (منظوم)	〃	〃	اردو	
۳۹	گلشن اخلاق	سید علی جعفری	〃	اردو	
۴۰	جہاں گیر شاہی	مظہر علی خاں ولا	〃	اردو	

[1] اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں محفوظ ہے، جس کا دیباچہ کاظم علی جواں کا لکھا ہوا ہے۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۴۱	کتاب واقعات اکبر[1]	خلیل علی خاں اشک	۱۸۰۹ء	اردو	
۴۲	بہار عشق	مولوی نور علی	۱۸۱۰ء	اردو	یہ نل دمن کا ترجمہ ہے۔
۴۳	منتخب الفوائد	خلیل علی خاں اشک	۱۸۱۱ء	اردو	
۴۴	دیوان طپش	مرزا جان طپش	"	اردو	
۴۵	شاہنامۂ ہند (شہنامۂ ہندی)	محمد علی	"	اردو	یہ توکل بیگ کی فارسی تصنیف "شمشیر خانی" کا اردو ترجمہ ہے۔
۴۶	چار گلشن	بینی نارائن	"	اردو	ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے ۱۹۶۹ء میں زیور طباعت سے آراستہ کر دیا ہے۔
۴۷	دیوان جہاں	"	۱۸۱۲ء	اردو	۱۹۵۹ء میں کلیم الدین احمد نے اسے پٹنہ سے شائع کر دیا ہے
۴۸	بدیا درپن	مرزائی بیگ	۱۸۱۴ء	ناگری	
۴۹	تفریح طبع	بینی نارائن	۱۸۱۷ء	اردو	مملوکہ ڈاکٹر حنیف نقوی
۵۰	مادھو بلاس (منظوم)	للو لال کوی	"	ناگری	
۵۱	نوبہار	بینی نارائن	۱۸۲۴ء	اردو	
۵۲	ضرب الامثال	نامعلوم	نامعلوم	اردو	
۵۳	گل بکاؤلی	غلام اکبر	نامعلوم	اردو	

[1] کالج کی کاروائیوں میں اس کا نام "اکبرنامہ" لکھا گیا ہے۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کالج کے ملازم مصنفین اور ان کے کارنامے

انگریز مصنفین

(۱) جان بارتھ وِک گل کرسٹ

(John Borthwick Gilchrist)

گل کرسٹ کا شمار بجا طور پر اُردو کے محسنین میں کیا جاتا ہے۔ یہ اسی کی جگر کاوی و عرق ریزی کا نتیجہ ہے کہ اردو نثر جو صدیوں سے جمود و تعطل کا شکار تھی ترقی کی راہ پر گامزن ہوئی۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھا اس کے علاوہ زراعت و تجارت سے بھی اسے غیر معمولی دلچسپی تھی چنانچہ اگر وہ چاہتا تو کاشتکاری، تجارت اور پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے ذریعے کافی دولت کما کر عیش و عشرت اور طرب و نشاط کی زندگی بسر کر سکتا تھا لیکن ان تمام مفادات کو پس پشت ڈال کر اس نے جس لگن کے ساتھ ہندوستانی زبان و ادب کی خدمات اور ترویج و ترقی کے لئے خود کو وقف کر رکھا وہ اس کا ایک انتہائی قابل ستائش کارنامہ ہے۔

محمد یحییٰ تنہا، رام بابو سکسینہ، سید محمد، لکشمی ساگر وارشنے، محمد عتیق صدیقی، جاوید نہال، صدیق الرحمٰن قدوائی اور شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے گل کرسٹ کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں خاص طور پر عتیق صدیقی اور صدیق الرحمٰن نے اس موضوع سے متعلق کافی معلومات فراہم کی ہیں تاہم اس کی زندگی کے گوشے اب بھی پوری طرح روشنی میں نہیں آسکے ہیں۔

گل کرسٹ کی ولادت ۱۷۵۹ء میں اسکاٹ لینڈ کے مشہور شہر ایڈنبرا میں ہوئی۔ اس نے ابتدائی تعلیم کس درسگاہ میں حاصل کی اس کا پتا نہیں چل سکا۔ البتہ اس قدر معلوم ہے کہ عنفوان شباب میں اسے فن طب سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ چنانچہ اس نے اپنے شہر کی مشہور طبی درسگاہ "جارج ہیریٹس ہوسپٹل" (George Heriot's Hospital) میں داخلہ لیا۔ یہاں سے فراغت کے بعد شروع میں اس نے کیا کیا یہ بات اب تک نامعلوم ہے۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ہندوستان آنے سے پہلے وہ ڈاکٹر کی حیثیت سے ولیسٹ انڈیز (مغربی مجمع الجزائر) گیا تھا۔ لیکن جوانی کے جوشس، حوصلے کی بلندی اور دولت جمع کرنے کی خواہش نے اسے اس پیشے کو ترک کر کے نیل کی کھیتی کی طرف راغب کیا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس نے اُس کاروبار میں کافی مہارت حاصل کرلی تھی۔ وہ ولیسٹ انڈیز کب اور کس طرح گیا اور وہاں کتنے دن مقیم رہا ان امور کی اب تک تحقیق نہیں ہو سکی ہے اور ہندوستان آنے کی وجوہات بھی ہنوز نامعلوم ہیں چونکہ اس زمانے میں فرنگی نوجوانوں کی نگاہ میں ہندوستان میں عشرت دینے اور دولت وثروت حاصل کرنے کے بہترین مواقع موجود تھے۔ اس لیے گمان غالب یہ ہے کہ گل کرسٹ بھی محض قسمت آزمائی کے لیے ہندوستان آیا ہوگا۔

گل کرسٹ ۱۷۸۲ء میں ہندوستان میں وارد ہوا[1] چند دنوں کی بیکاری کے بعد نومبر ۱۷۸۲ء میں بمبی ڈی ٹیچ منٹ (Bombay Detach mant.) میں اسسٹنٹ سرجن کے عہدے پر اس کا تقرر ہوا۔ الیسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت اُس فوجی طبی عہدے پر اس کی پہلی پوسٹنگ سورت میں ہوئی تھی[2]۔ سرزمین ہند پر قدم رکھتے ہی اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ مقامی باشندوں کی زبانوں سے واقفیت کے بغیر نہ تو اس کے لیے کماحقہ اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری ممکن ہو گی اور نہ وہ اپنے مالکوں کے مفاد میں کوئی قابل قدر کارنامہ انجام دے سکے گا۔ چنانچہ اس نے "Appendix" میں لکھا ہے کہ

"۱۷۸۲ء میں بمبی وارد ہوتے ہی میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں میرا قیام، خواہ اس کی نوعیت جو بھی ہو، اس وقت تک نہ تو میرے لیے خوش گوار ہو سکتا ہے، اور نہ میرے آقاؤں ہی کے حق میں مفید ثابت ہو سکتا ہے، جب تک کہ ملک کی مروجہ زبان میں پوری دست گاہ نہ حاصل کر لوں، جہاں عارضی طور پر مجھے قیام کرنا ہے۔ چنانچہ اس زبان کو جسے اس زمانے میں مورس (Moors) کہتے تھے، سیکھنے کیلئے میں کمر بستہ ہو گیا۔"[2]

اپنے اس احساس کے تحت گل کرسٹ نے پوری طالب علمانہ سنجیدگی کے ساتھ ہندوستانی زبان کا

---

[1] ممتاز منگلوری، تاریخ ادبیات مسلمان پاکستان و ہند، جلد آٹھویں ص ۷۶

[2] بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۶۷ - ۶۶ Appendix P. VI

مطالعہ شروع کیا۔ چنانچہ جیسے جیسے اس پر اس زبان کے اسرار کھلتے گئے۔ اس کی دلچسپیاں بھی بڑھتی گئیں اور وہ اس میدان میں ترقی کرتا گیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اس کی حیثیت طالب علم سے بڑھ کر استاد اور پھر محقق کی ہو گئی۔ شروع میں اس نے ہیڈلے کی گرامر سے رجوع کیا جو ۱۷۷۲ء میں لکھی گئی تھی[1] اور اس زبان کے مبادیات پر مشتمل تھی۔ ایک دو ہفتے کے بعد اسے ایک منشی مل گیا جس نے اصرار کیا کہ اس نے ہیڈلے کی کتاب سے جو کچھ سیکھا ہے اسے بھلا دے[2]۔ یہ فوج کے جس دستے میں گل کرسٹ کا تقرر ہوا تھا اس نے یکم نومبر ۱۷۸۳ء کو فتح گڈھ (فرخ آباد) کے لیے کوچ کیا۔ یہ سفر گل کرسٹ کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔ کیوں کہ مختلف مقامات سے گزرتے ہوئے اسے ہندوستانی کی مختلف شاخوں سے براہ راست تعارف کا موقع ملا۔ سفر کے دوران اسے یہ بھی احساس ہوا کہ اردو برصغیر ہند میں ملک گیر زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تجربے نے اس کی اس زبان کو مکمل طور پر سیکھنے کی خواہش کو مزید تقویت بخشی اور اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اسے طب کا پیشہ چھوڑ کر زبان و ادب کی علمی تحقیق کا پیشہ اختیار کر لینا چاہیے۔ چنانچہ فتح گڈھ کے زمانۂ قیام ہی میں اس نے ذاتی مطالعے سے اس زبان کے متعلق کافی معلومات حاصل کر لی۔

ہندوستانی زبان کے مطالعے کے ابتدائی زمانے ہی میں گل کرسٹ کو اس زبان کی قواعد اور لغت سے متعلق کتابوں کی کمی شدت کے ساتھ محسوس ہوئی۔ چنانچہ فتح گڈھ کے قیام کے دوران ہی اس نے ان موضوعات پر کام کرنے اور کتابیں لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا، تاکہ اس کے ہم وطن بھائیوں کو ہندوستانی زبان کے مطالعے میں وہ پریشانیاں نہ اٹھانا پڑیں جن سے وہ خود دوچار ہو چکا تھا۔ علاوہ بریں اس کا خیال تھا کہ کمپنی اور برطانوی حکومت کا حقیقی مفاد اس میں مضمر ہے کہ ہندوستانی زبان کی اعلا قابلیت حاصل کی جائے۔ اس کام کی انجام دہی کے لیے اس نے ۲ رجنوری ۱۷۸۵ء کو بورڈ سے ایک سال کی چھٹی کی درخواست کی۔ کمپنی کی فوج کے کمانڈر ان چیف میجر جنرل اسٹبرٹ (Stuart) اور فرانسس بالفور (Balfour) کی سفارش

---

[1] مولوی عبدالحق، قواعد اردو ص ۱۱

[2] بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۶۷

Appendix p. VI

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

سے کمپنی نے ایک سال کی چھٹی کی منظوری دے دی، جسے اس نے لکھنؤ، فیض آباد، الہ آباد، جون پور، بنارس اور بہت سے علمی مقامات کے سفر میں گزارا، تاکہ زبان کے مختلف پہلوؤں سے واقفیت حاصل ہو جائے اور قواعد اور لغت کے لیے مواد جمع کیا جا سکے[1]

اپریل ۱۷۸۵ء میں گل کرسٹ فتح گڑھ سے فیض آباد پہنچا، اس نے رخصت کا بیشتر حصہ یہیں گزارا۔ یہاں جب اس نے لوگوں سے ہندوستانی زبان کی قواعد اور لغت سے متعلق کتابوں کے بارے میں دریافت کیا تو اس کے سامنے صرف "خالق باری" پیش کی گئی جو بچوں کو یاد کرانے کے لئے الفاظ کی ایک مختصر منظوم فہرست سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ گل کرسٹ نے اسے لغت قرار دے کر اس کی عزت افزائی کی۔ وہ نہایت خلوص اور حوصلے کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول کی کوشش میں منہمک رہا۔ محدود ذاتی صلاحیتوں کے احساس کے ساتھ ارادے کی پختگی، ذرائع و وسائل کی کمیابی کے باوجود علمی تحقیق کی لگن اور اپنے مقاصد کی کامیابی کی تمنا کے ساتھ عاجزی وانکساری کے مظاہرے نے اس کے اندر ایک زبردست تاریخی کام کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔ اس نے از خود وہ سارے حالات پیدا کرنے کا انتظام کر لیا جو اس کام میں آسانیاں بہم پہنچا سکتے تھے۔ مثلاً ہندوستانی ملبوسات اختیار کر لیے اور لمبی سیاہ داڑھی بڑھالی، تاکہ ہندوستانیوں کو اس سے بیگانگی اور غیریت کا احساس نہ ہو۔ اس نے پورے طالب علمانہ ذوق وشوق کے ساتھ ارباب علم سے استفادہ کیا اور اس بات کی کوشش کی کہ اس زبان کے تقریباً سارے معروف الفاظ زبان پر چڑھ جائیں۔

گل کرسٹ کو ایک نئے چیلنج کا سامنا تھا۔ جو کام یورپ میں متعدد ارباب علم کی مشترکہ کوششوں سے انجام پا رہا تھا اس نے اسے تن تنہا کر گزرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ کافی محنت اور جگر کاوی کے بعد جب اس نے اپنی لغت مکمل کر لی تو کلکتے کے ایک دوست نے اسے بتایا کہ میجر کرک پیٹرک نے جو کمانڈر ان چیف کا سکریٹری اور فارسی کا ترجمان ہے ہندوستانی لغت کا کچھ حصہ تیار کر کے شائع کر دیا ہے اور باقی حصہ کسی بھی وقت منظر عام پر آسکتا ہے۔ اس خبر کو سنتے ہی گل کرسٹ کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے اور وہ سخت پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا۔ اس کی ذہنی

---

[1] Siddiq ur Rehman Qidwai, Gilchrist and the language of Hindoostan P.39

قلبی کیفیت کا اندازہ خود اس کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے :

"ہمارے دل کی چوٹ کا اندازہ وہی بدبخت شخص لگا سکتا ہے جو ترقی کی معراج پر پہنچ کر مصیبتوں کی گھاٹی میں گر جائے ۔" [۱]

سخت محنت اور اس حوصلہ شکن خبر نے گل کرسٹ کو بیمار ڈال دیا اور ایسا بیمار کہ جان کے لالے پڑ گئے ۔ چنانچہ آب وہوا کی تبدیلی اور آرام وعلاج کی غرض سے وہ سخت بارش اور سیلاب کے زمانے میں فیض آباد سے بنارس آیا ۔ یہاں اس کے ایک دوست ڈاکٹر پیٹر وڈ (Dr. Peterwade) نے اس کا علاج کیا جس سے اس کی صحت بحال ہوئی ۔ بنارس کے خوشگوار موسم اور فرحت بخش آب وہوا کے اثر سے اس کے مزاج میں ایک لطیف تغیر رونما ہوا اور اس نے دوبارہ اسی ولولے اور جذبے کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا ۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی دوسری دو لسانی لغت (اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو) اتنے بڑے پیمانے پر اور اس طرح مرتب کرے گا کہ اس میدان میں آئندہ بھی کوئی اس کی ہمسری وہم چشمی کا دعویٰ نہ کر سکے ۔

۱۷۸۵ء کے آخر میں جب گل کرسٹ کلکتہ پہنچا تو اس کی ملاقات کرک پیٹرک سے ہوئی ۔ اس ملاقات کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا ۔ چونکہ کرک پیٹرک کی کتاب ابھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچی تھی اس لیے اب دونوں نے اپنی صلاحیتوں کو مجتمع اور اپنی کوششوں کو ہم آہنگ کر کے ایک جامع اور مکمل لغت کی تیاری کا منصوبہ بنایا ۔ گل کرسٹ کی لغت کی پہلی جلد ۱۷۸۶ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی ۔ [۲] اس نے گورنر جنرل سے درخواست کی کہ وہ لغت کی اشاعت کے سلسلے میں اس کی سرپرستی کریں اور کلکتے سے باہر کے جو لوگ اس سے خط وکتابت کرنا چاہیں ان سے ڈاک ٹکٹ کے پیسے نہ لیے جائیں ۔ گورنر جنرل نے اس کی یہ دونوں خواہشات منظور کر لیں ۔ لیکن حالات نے گل کرسٹ کے ساتھ مساعدت نہ کی ۔ ایجنٹوں کی خرد برد ، بازار پر بدمعاملہ لوگوں کے تسلط سے اسے بہت صدمہ پہنچا ، اور صرف اس کی عزت

---

۱ بحوالہ Gilchrist and The Language of Hindoostan p. 41

M.A. Siddiqi, Origin of Modern Hindustani Literature p. 192

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

وشہرت ہی خطرے میں نہیں پڑی بلکہ وہ کافی مقروض بھی ہوگیا۔ وہ خود لکھتا ہے:۔

"اس طرح دباؤ میں رہ کر زندگی گزارنا میرے لیے سخت سوہان روح تھا لیکن میں جب بھی غور کرتا تھا تو مجھے ان لوگوں کے سلوک سے زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوتی تھی۔ کیونکہ قرض بھی قرض خواہوں، پریس میں کام کرنے والوں اور دوسرے مختلف لوگوں کے تقاضے جن کے ہمارے اوپر واجبات تھے، بھولے نہیں جا سکتے۔" [1]

اس دوران سرجان شور، لارڈ ولزلی اور میجر کرک پیٹرک نے گل کرسٹ کی کتابوں کی اشاعت میں حتی المقدور اس کی مدد کی۔ اس کے باوجود ۱۷۹۱ء میں بارہ ہزار روپے کے قرض کی ادائیگی کے لئے اسے کمپنی کی مدد حاصل کرنا پڑی۔ اس کے بعد اس نے واجبات کے بارے پوری طرح سبکدوش ہونے کے لیے مزید دو سال کی رخصت حاصل کر کے اپنی تمام تر توجہ اپنے شریک کار چارٹرس (charters) کے ساتھ نیل کی کاشت اور شکر وافیوں کی تجارت پر مرکوز کر دی۔ ان تجارتی مشغولیات کا براہ راست اثر اس کی تصنیفی وتالیفی سرگرمیوں پر پڑا۔ چنانچہ قواعد کی تصنیف کا کام وقتی طور پر التوا میں پڑ گیا۔ ۱۷۹۵ء کے ابتدائی مہینوں میں اس نے اپنے دو نمائندوں کو غازی پور میں اس غرض سے متعین کیا کہ وہ اس کی کاشت اور تجارت کی نگرانی کریں اور وہ خود کلکتے کے قریب رسا پوگالا میں سکونت اختیار کر کے یکسوئی کے ساتھ دوبارہ اپنے علمی کاموں کی تکمیل میں منہمک ہوگیا۔ [2] چنانچہ چند مہینوں کی سخت محنت کے بعد اس نے اپنی شہرہ آفاق قواعد مکمل کر لی، جو دوسرے ہی سال یعنی ۱۷۹۶ء میں طباعت کے مراحل طے کر کے منظر عام پر آگئی۔ [3]

لغت کی اشاعت، نیل کی کھیتی اور شکر وافیون کے کاروبار کے منافعے سے وہ اتنا زیادہ خوش ہوا کہ خود کو ایک مالدار آدمی سمجھنے لگا۔ اس خوشی کے اظہار کے لئے اس نے ایک لغت معقد

---

[1] Appendix. P. IX - X

بحوالہ Gilchrist and The Language of Hindoostan P. 44

[2] Gilchrist and The Language of Hindoostan P. 44

[3] M. A. Siddiqi, Origin of Modern Hindustani Literature P. 20

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کی جس میں اپنے قرض خواہوں سے اپنے خرچ اور ذمہ داری پر ایک نئی کتاب کی طباعت کا وعدہ کیا۔ لیکن بعد میں اسے معلوم ہوا کہ اتنے بڑے کام کے لیے ایک دولت مند آدمی کی جمع کی ہوئی دولت ناکافی ہے۔ وہ محض تین سو روپے ماہانہ کماتا تھا، جن میں سے ڈیڑھ سو روپے منشیوں اور کاتبوں کی تنخواہ پر صرف ہو جاتے تھے۔ لیکن چونکہ اس نے وعدہ کر لیا تھا اس لیے لگ بھگ اٹھارہ مہینے تک اسے روزانہ بارہ سے چودہ گھنٹے تک کام کرنا پڑا، جس کے نتیجے میں اس کی عام صحت اور بینائی بری طرح متاثر ہوئیں۔ لیکن اس نے اپنی کتاب کا مطالعہ کرنے والوں کو لغت و قواعد کی ترتیب کے دوران جمع کی ہوئی نئی معلومات بہم پہنچانے کا عزم مصمم کر رکھا تھا۔ چنانچہ ۱۷۹۸ء میں لغت و قواعد کا ضمیمہ Appendix شائع کیا اور اسی سال ایک اور کتاب۔ "Oriental Linguist" (مشرقی زبان داں) بھی شائع کی[1]۔ یہ مبتدیوں کو ایک نظم کے ساتھ ہندوستانی کی تعلیم دینے کی غرض سے لکھی گئی تھی۔

۱۷۹۷ء میں گل کرسٹ نے انگلینڈ جانے کا ارادہ کر لیا تھا، لیکن بعد میں روانگی کی یہ تاریخ ملتوی کر کے اس نے دوسری تاریخ ۱۷۹۹ء کی متعین کی اور اپنے اس ارادے سے گورنمنٹ کو بھی مطلع کر دیا۔ مراجعت کی پہلی تاریخ کے التوا کی وجہ یہ تھی کہ اسے غازی پور میں اپنی جائداد کی علاحدگی اور کتاب کی اشاعت دونوں کے لیے مزید وقت درکار تھا۔ "مشرقی زبان داں" کی سرپرستی کی درخواست اس نے ۲۲ اگست ۱۷۹۸ء کو پیش کی اور نیل کے کارخانے اور اس کی عمارتوں کے نیلام کا اشتہار ۴ ستمبر ۱۷۹۸ء کو جاری کیا[2]۔ اس کے معاً بعد ہی ۲۱ ستمبر ۱۷۹۸ء کی یادداشت کے بموجب اس کی خدمات سول ملازمین کو پڑھانے کے لیے "Oriental Seminary" کو منتقل کر دی گئیں۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اسے ہندوستانی شعبے کا صدر اور پروفیسر مقرر کیا گیا۔ کالج میں گل کرسٹ کی کارکردگی اور اس زمانے کے حالات کا

---

[1] Siddiqi. Gilchrist and The Language of Hindoostan P. 45
جاوید نہال کا یہ خیال خلاف واقعہ ہے کہ "مشرقی زبان داں" گل کرسٹ کی واپسی کے بعد ۱۸۰۲ء میں کلکتے سے شائع ہوئی۔ (انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۱۷)

[2] Gilchrist and The Language of Hindoostan. P 46

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

مفصل ذکر "فورٹ ولیم کالج کی تاریخ" کے ضمن میں آچکا ہے اس لیے یہاں ان تفصیلات کا اعادہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۱۸۰۴ء میں جب گل کرسٹ نے کالج کی ملازمت سے استعفا دے کر انگلینڈ روانہ ہونے کا فیصلہ کیا تو گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے اسے مسٹر ایڈنگٹن (Addington) کے نام جو بعد میں لارڈ سڈمتھ کے نام سے مشہور ہوئے، ایک خط لکھ کر دیا۔ ولزلی نے اس خط میں لکھا تھا کہ "مجھے امید ہے کہ انگلینڈ میں آپ گل کرسٹ کا شایان شان استقبال کریں گے، مجھے اجازت دیجئے تاکہ میں آپ سے سفارش کروں کہ اس قابلِ احترام شخص کا جس نے محض اپنے حوصلے اور جوش سے مشرقی زبانوں میں امتیاز حاصل کیا ہے، مناسب خیال رکھیں اور پبلک سروس کے کسی شعبے میں معقول عہدے سے سرفراز کریں۔"[۱] گورنر جنرل کی اس سفارش کے بموجب ایڈنگٹن نے گل کرسٹ کی کس حد تک مدد کی، اس کی کوئی شہادت دریافت نہیں۔

انگلینڈ واپسی کے بعد گل کرسٹ کچھ دنوں تک ایڈنبرا میں مقیم رہا۔ اس زمانے میں اس نے کسی معاوضے کے بغیر ہندوستانی زبان سے متعلق کئی لکچر دیے اور اپنی پرانی کتابوں پر نظر ثانی کی۔ ۳۰ اکتوبر ۱۸۰۴ء کو ایڈنبرا یونیورسٹی نے اسے ایل۔ایل۔ڈی کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا۔[۲] اب اس کے نام کے ساتھ ڈاکٹر بھی لکھا جانے لگا۔ اس کے بعد وہ نکلسن اسکوائر (Nicholson Square) کے شمالی حصے میں ایک مکان لے کر رہنے لگا۔ ۲۷ برس کی شاندار خدمت کے بعد ۶ جنوری ۱۸۰۹ء کو وہ تین سو پاؤنڈ سالانہ پنشن پر کمپنی کی ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔[۳]

انگلینڈ آنے کے بعد گل کرسٹ نے ملکی سیاست میں حصہ لینا اور جمہوریت کی حمایت میں تقریریں کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں کبھی کبھی اس کا یہ رویہ بہت سخت ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے وہ کئی جھگڑوں میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ تاہم وارشنے کا یہ خیال صحیح نہیں کہ

۱۔ Vide Anderson Scottish Nation, Vol. II P 299, بحوالہ Origin of Modern Hindustani Literature, P. 52

۲۔ Leslie Stephen and Sidney 'Dictionary of National Biography Vol. VII P. 122

۳۔ وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۲۰۵

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

انگلستان واپس پہنچنے کے بعد اس نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی۔[1] سیاسیات کے موضوع پر "پارلیمنٹری ریفارم آن کانسٹی ٹیوشنل پرنسپل" یا "برٹش لائی بلٹی اگینسٹ کانٹی ننٹل لائی بلٹی" نامی کتاب جو ۱۸۱۵ء میں گلیسگو (Glasgow) سے شائع ہوئی۔[2] اس زمانے کی تصنیف ہے۔
اس سلسلے کی ایک اور کتاب The oriental occident Tuitionary Pioneer کے نام سے ۲۶ - ۱۸۲۵ء کے درمیان شائع کی، جس میں اس نے وہ رپورٹیں درج کی ہیں جو اس کے افسروں اور ساتھیوں کی شکایتوں پر مشتمل تھیں۔[3]

انگلینڈ میں اس نے ایک oriental zoo (مشرقی چڑیا گھر) بھی قائم کیا تھا اور جیمس انگلس (James Inglis) کے اشتراک و تعاون سے ایڈنبرا میں ایک بینک کی بھی بنیاد ڈالی تھی، جس کا ایک ضمنی مقصد اپنی کتابوں کی طباعت اور اشاعت بھی تھا۔ لیکن کتابوں کی طباعت پر اس نے ضرورت سے زیادہ خرچ کر دیا جس کی وجہ سے روپیہ جمع کرنے والوں نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور وہ بینک فیل ہو گیا۔ بینک فیل ہونے کی دوسری وجہ بینکنگ سے اس کی ناواقفیت بھی تھی۔

۱۸۱۶ء میں گل کرسٹ لندن منتقل ہو گیا، اور کمپنی کے ملازمین کو نجی طور پر ہندوستانی زبان کی تعلیم دینے لگا۔ اس کے دو سال بعد ۱۸۱۸ء میں لیسٹر اسکوائر میں اورینٹل انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا تو گل کرسٹ کو اس میں پروفیسر مقرر کیا گیا۔ اب وہ دونوں جگہ کلاسیں لینے لگا۔ یہاں اسے دو سو پاؤنڈ سالانہ تنخواہ اور ڈیڑھ سو پاؤنڈ سالانہ لکچر روم کے کرائے کے لیے دیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اسے ہر طالب علم سے تین گنی[4] (Guinea) بطور فیس کے وصول کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی، جسے اس نے منظور نہیں کیا، البتہ ہر طالب علم کے لیے اس نے اپنی کتابوں کا خریدنا لازمی قرار دیا، جن کی قیمت دس سے پندرہ پاؤنڈ تھی۔ گل کرسٹ چاہتا تھا کہ کمپنی کے سبھی ملازمین اس ادارے میں تعلیم حاصل کریں، لیکن کمپنی صرف ان ہی لوگوں کو

---

[1] فورٹ ولیم کالج ۶۴
[2] Siddiqur Rahman Qidwai, Gilchrist and the Language of Hindoostan P.57
[3] Qidwai, Gilchrist and the Language of Hindoostan P. 58
[4] سونے کا ایک انگریزی سکہ جو ۲۱ شلنگ کا ہوتا ہے۔ شاید اب یہ رائج نہیں۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

اس کی اجازت دی تھی جو اسسٹنٹ سرجن کے لیے منتخب کیے جاتے تھے۔ گل کرسٹ ایسٹ انڈیا کمپنی سے پہلے ہی ناخوش تھا اس پابندی نے اسے اور برداشتہ خاطر کر دیا۔ باہمی اختلاف کی خلیج کے اس طرح وسیع ہونے پر کمپنی نے ۱۸۲۵ء میں اپنی امداد بند کر دی[1] اور انسٹی ٹیوٹ سے اس کا تعلق منقطع ہو گیا۔ اس صورت حال کے پیش نظر جارج اسمتھ کا یہ بیان کہ گل کرسٹ ۱۸۲۶ء تک اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کا پروفیسر رہا خلاف واقعہ قرار پایا ہے[2]، البتہ ۱۸۲۶ء تک وہ رضاکارانہ طور پر اپنا نجی کلاس لیتا رہا۔ اس کے بعد یہ ذمہ داری ڈنکن فوربس (Duncan Forbes) اور سنفورٹ ارناٹ (Sandford Arnot) کے سپرد کر کے اس نے اسی ادارے کے قریب ہی ہفتے میں صرف ایک بار الگ سے کلاس لینا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ ۲۹-۱۸۲۸ء تک قائم رہا جس کی وجہ سے فوربس اور ارناٹ کو پریشانی لاحق ہوئی۔ کیونکہ طلبہ روزانہ کی بجائے ہفتہ میں ایک ہی دن پڑھنا پسند کرنے لگے۔ بالآخر ان دونوں کے تعلقات بھی گل کرسٹ ختم ہو گئے۔ اس کے بعد آرام و علاج کی غرض سے کچھ دنوں کے لیے اسکاٹ لینڈ چلا گیا۔ اسکاٹ لینڈ کے بعد اس نے پیرس کا رخ کیا۔ اگرچہ یہ سفر بھی تبدیلی آب و ہوا اور آرام و علاج کے مقصد سے کیا تھا۔ تاہم گمان غالب یہ ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے اپنی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں بھی کچھ کام کیا ہو گا کیونکہ ڈی ٹسی کی مساعی جمیلہ سے پیرس میں ہندوستانی زبان کی تعلیم شروع ہو چکی تھی۔ ۹ جنوری ۱۸۴۱ء کو پیرس ہی میں گل کرسٹ کا انتقال ہوا۔ پیرس میں اس کی مصروفیات کی تفصیلات قعر گمنامی میں ہیں۔

گل کرسٹ کے کوئی اولاد نہیں تھی چنانچہ اس کی بیوی میری آرن کوکرٹی (Merry Arn Cokertry) نے اگست ۱۹۵۰ء میں پیرس کے پوپ گگ ہینو (Gughen o) سے دوسری شادی کر لی۔[3] ۱۸۶۵ء میں کوکرٹی کا بھی انتقال ہو گیا۔ وفات سے قبل موصوفہ نے ایک وصیت کے ذریعے ساڑھے سات ہزار فرانک سالانہ کی آمدنی ایڈنبرا یونیورسٹی کے نام اس شرط کے ساتھ وقف کر دی تھی کہ اس رقم سے تین ہندوستانی طلبہ کو اعلا تعلیم کے وظائف دیے جائیں۔ یہ تینوں طالب علم بنگال، مدراس اور

---

[1] مولوی سید محمد، ارباب نثر اردو ص ۲۵

[2] Concise Dictionary of National Biography P.495

[3] Siddiqi, Gilchrist and Language of Hindoostan P.58

اور بمبئی صوبوں کے باشندے ہوں اور ان صوبوں میں جتنے مشہور کالج ہیں ان کے طلبہ میں سے مقابلہ کے ذریعے منتخب کیے جائیں[1]

اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں جن لوگوں نے اردو زبان خاص طور سے اردو نثر کی بیش بہا خدمات انجام دیں ان میں گل کرسٹ کا نام سر فہرست ہے۔ وہ اردو زبان کا سب سے پہلا سنجیدہ طالب علم تھا۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ وہ اردو نثر کا حقیقی موجد تھا اس سے پہلے یورپ والے اس زبان کو بازاری زبان سمجھتے تھے اور اسے بگاڑ کر لکھتے تھے اور خود ہندوستانی جن کی یہ مادری زبان سمجھی جاتی تھی، اسے فارسی کے مقابلے میں حقیر و کم تر حیثیت قرار دے کر تصنیف و تالیف کے لیے استعمال کرنا کسر شان سمجھتے تھے۔ گل کرسٹ نے نہ صرف اس تصور کی تردید کی بلکہ یہ کہہ کر اس کی اہمیت کا احساس پیدا کیا کہ ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں میں یہ سب سے زیادہ مقبول اور ہر دل عزیز زبان ہے اور اس کے اندر وہ جاذبیت و کشش اور قوت پوشیدہ ہے کہ مستقبل میں یہ دفتری کاروبار اور تصنیفی و تالیفی مشاغل میں فارسی کی بہترین جانشین بن سکتی ہے۔

گل کرسٹ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کے دوسرے درجے کے قلم کاروں کو اپنے گرد جمع کر کے ان سے ایسے لافانی شاہکار تصنیف کرائے جن کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل اسی کی کوششوں اور کاوشوں سے اردو نثر کی نشاۃ الثانیہ کی ابتدا ہوئی۔ کیوں کہ اس نے اسے روزمرہ اور عام محاوروں کی بنیاد پر ترقی دینے کی کوشش کی۔ رام بابو سکسینہ کے بقول "گل کرسٹ نثر اردو کے مربی (باپ) کہلائے جانے کے فی الحقیقت مستحق ہیں"[2]

اگرچہ گل کرسٹ کو محدود ذرائع و وسائل کی بنیاد پر اور انتہائی ناموافق حالات میں کام کرنا پڑا اور ہندوستانیوں اور خود اس کے ملک والوں سے بھی اسے کماحقہٗ تعاون حاصل نہیں ہوا، تاہم اس نے اپنی محنت اور لگن سے اس زبان کا مطالعہ کیا اور اس میں ایسی کتابیں تصنیف کیں جو اولین اور بنیادی نصابی کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں اور آج بھی غیر ملکی طلبہ کے لیے خضر راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شیکسپیئر، گارسن ڈی ٹاسی، فوربس، روبک اور دیگر یورپی مستشرقین جنھوں نے اردو زبان

---

[1] ڈی ٹاسی، خطبات گارساں دتاسی ص ۴۶۸

[2] تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص ۵

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اپنی کامیابی کے لئے گل کرسٹ کی تصانیف کے رہین منت ہیں گل کرسٹ کا دامن اردو کے دامن سے اور اردو کا دامن قیامت کے دامن سے وابستہ رہے گا۔

تصانیف: (1) (انگریزی ہندوستانی لغت)۔ A Dictionary, English and Hindoostanee.

اس کی پہلی جلد ۱۷۸۶ء میں اور دوسری جلد ۱۷۹۰ء میں طبع ہوئی۔ اس میں الفاظ کے معنی رومن اور فارسی دونوں خطوں میں لکھے گئے ہیں۔

(۲) (ہندوستانی زبان کی قواعد): A Grammar of The Hindoostanee Language

یہ کتاب ۱۷۹۶ء میں انگریزی لپی میں شائع ہوئی۔ بعد میں بہادر علی حسینی نے "رسالہ گل کرسٹ" کے نام سے اس کا خلاصہ اردو میں مرتب کیا جو ۱۸۰۲ء میں شائع ہوا۔

(۳) ضمیمہ (لغت و قواعد) سنہ اشاعت ۱۷۹۸ء رومن رسم الخط میں۔ :- Appendix

(۴) (مشرقی زبان داں) سنہ اشاعت ۱۷۹۸ء :- The Oriental Linguist

اس میں ہندوستانی زبان سے متعلق بحث کی گئی ہے اور ہندوستانی و انگریزی کے متبادل الفاظ کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ یہ مبتدیوں کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس کا دوسرا ترمیم شدہ ایڈیشن ۱۸۰۲ء میں کالج کے خرچ سے شائع ہوا تھا۔

(۵) (1800) The Antijargonist :-

اس کتاب میں ہندوستانی کا مختصر تعارف اور اس کے بیشتر الفاظ کی فرہنگ پیش کی گئی ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن کالج کی جانب سے ۱۸۰۲ء میں شائع ہوا تھا۔

(۶) (1801). A New Theory and Prospectus of Persian Verbs

(نوایجاد یعنی نقشۂ افعال فارسی مع مصدرات آں و مترادفات ہندوستانی [illegible])

(۷) (ہندی مشتقین) (1801) :- Hindee Directories [illegible]

کالج کے پہلے اور دوسرے امتحان کے لیے [illegible]

(۸) The Stranger's East India Guide to The Hindoostanee or The Grand Popular Language of India :- (1802)

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۸ء میں ہندوستانی پریس نے شائع ہوا۔ ۱۸۲۰ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن لندن سے شائع ہوا جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ اس ایڈیشن پر کتاب کا نام اس طرح لکھا گیا ہے۔

The stranger's Infallible
East Indian guide
or
Hindoastanee Multum in Prove

اس کے سرورق پر رومن رسم خط میں سوداؔ کا مندرجہ شعر بھی لکھا ہوا ہے

نطق کہتا ہے میرا آج یہ ہر ناطق سے
کر نیند میں کرنے کو خلل جاگوں گا

اس کتاب کا موضوع ہندوستانی قواعد ہے۔ ابتدا میں گل کرسٹ نے ایک بسیط مقدمہ بھی لکھا ہے، جس میں ہندوستانی زبان کی ایجاد اور اس کے ناموں پر مفصل بحث کی ہے۔

(۹) The Hindoostanee Dictionary or student's Introductor To The Hindoostanee Language :- 1809

اس میں گل کرسٹ نے ہندوستانی رسم خط کی اصلاح سے متعلق اپنے خیالات کی وضاحت کی ہے اور ہندوستانی زبان کے قواعد پر ایک مضمون بھی شامل کیا ہے۔

(۱۰) (مبادیات ہندوستانی) (1802) :- The Hindoostanee Principles

یہ حذف و اضافہ کے ساتھ کتاب نمبر ۲ دو کا اردو ترجمہ ہے۔

(۱۱) Practical outlines or A Sketch of Hindoostanee or Theory in The Roman characters (1802)

(ہندوستانی علم الہجا کا خاکہ) اس کی ترتیب میں تارنی چرن کی مدد بھی شامل تھی۔

(۱۲) The Hindee Arabic Mirror :- (1802)

اس میں ہندوستانی زبان میں مستعمل عربی الفاظ سے بحث کی گئی ہے۔

(۱۳) بیاض ہندی (دو جلدوں میں) The Hindi Manual or casket of India 1802 :-

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

یہ کتاب فارسی رومن اور ناگری خطوں میں لکھی گئی تھی۔ گل کرسٹ اس کا مصنف نہیں بلکہ مرتب ہے۔ یہ جو منشی کالج سے وابستہ تھے یہ ان کی بعض کتابوں کا انتخاب ہے۔ گریرسن کا خیال صحیح نہیں کہ گل کرسٹ اور عبداللہ مسکین "ہندی مینول" کے مصنف ہیں[1]۔ اس میں باغ و بہار، شکنتلا، مادھونل کام کندلا، مرثیہ مسکین، سنگھاسن بتیسی، بیتال پچیسی، توتا کہانی، نثر بے نظیر، اخلاق ہندی اور باغ اردو کے اقتباسات شامل ہیں۔

(۱۴) (اتالیق ہندی) (1803) The Hindi Moral Preceptor :-

یہ سعدی کی پندنامہ کا ترجمہ ہے۔ منظوم انگریزی ترجمہ گل کرسٹ کا کیا ہوا ہے۔ گلیڈون کا ترجمہ انگریزی نثر میں اور ولا کا ترجمہ اردو نظم میں ہے گویا یہ پندنامہ کے انگریزی اور اردو مترجم کا مجموعہ ہے۔ اسے گل کرسٹ نے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔

(۱۵) The Hindi Roman orthoepigraphical ultimatum: (1804)

یہ "شکنتلا" کے رومن رسم خط کا ایڈیشن ہے۔

(۱۶) (1815) Parliamentary Reform on constitutional Principle

(۱۷) The General East India Guide and vade Mecum (1825)

یہ کتاب کیپٹن ولیم سن نے لکھی تھی۔ گل کرسٹ نے اسے تصحیح و توسیع کے بعد شائع کیا۔

(۱۸) The oriental occidental Tuitionary Pioneer: (1825-26)

(۱۹) (انگریزی ہندوستانی مکالمے) :- Dialogues, English and Hindoostanee

اس میں انگریزی کے روزمرہ مکالمات کا ترجمہ اردو میں دیا گیا ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۸۰۹ء میں ایڈنبرا شائع ہوئی۔ اس کا چوتھا ایڈیشن 1896ء میں لندن سے شائع ہوا۔ تھامس روبک کی معاونت اس کی ترتیب میں شامل تھی۔

(۲) تھامس روبک : (Thomas Roebuck)

روبک کی ولادت لنلتھ گوشائر (Linlithgowshire) میں ۱۷۸۴ء میں ہوئی تھی[2]۔ ۱۸۰۱ء

---

[1] بہ حوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۴۲ Linguistic Survey of India Vol. IX

[2] شانتی رنجن بھٹاچاریہ، بنگال میں اردو زبان و ادب ص ۲۴

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

میں وہ ہندوستان آیا اور مدراس کے قریب وِلور میں قائم مقام ٹاؤن میجر کے عہدے پر اس کا تقرر ہوا۔
اس کے تین چار سال بعد ۱۸۰۵ء میں صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ انگلینڈ واپس چلا گیا، جہاں اس
کی ملاقات گل کرسٹ سے ہوئی۔ ہندوستان میں قیام کے دوران اسے اردو سے خاص شغف ہو گیا تھا۔
گل کرسٹ کی ملاقات نے اس کی اس دل چسپی کے سلسلے میں سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ چنانچہ
اس کی صحبت میں اس نے اردو میں اچھی خاصی استعداد حاصل کرلی۔ اس نے ۱۸۰۶ء سے ۱۸۱۰ء
تک اس کے ساتھ کام کیا اور اس درمیان پانچ کتابیں تصنیف کیں۔ روبک ۱۸۱۰ء میں دوبارہ
ہندوستان آیا اور ۱۸۱۱ء میں فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہو گیا، لیکن یہ ملازمت عارضی تھی۔ ۱۸۱۱ء
میں وہ مستقل طور پر نائب ممتحن مقرر ہوا[۱]۔ ۳۰ رمئی ۱۸۱۲ء کو ابراہم لاکٹ کالج کونسل کے سکریٹری
اور ممتحن مقرر ہوئے، لیکن اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد وہ عربی زبان کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے عرب
چلے گئے۔ ان کی واپسی تک کونسل کے نائب سکریٹری گیلووے نے سکریٹری کے فرائض انجام
دیے اور گیلووے کی جگہ پر روبک قائم مقام نائب سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے[۲]۔
اس وقت اسے بارہ سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ ۱۸۱۶ء کے اوائل میں اس کی خدمات قائم
مقام اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کالج کے ہندوستانی شعبے میں منتقل کر دی گئیں۔
اس عہدے پر کام کرتے ہوئے ابھی چار سال کی مدت بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ ۸ر دسمبر ۱۸۱۹ء
کو صرف ۳۵ برس کی عمر میں دستِ بیدادِ اجل نے اس نوخیز مستشرق کا چراغِ زندگی ہمیشہ کے
لیے خاموش کر دیا[۳]۔ کلکتہ کے پارک اسٹریٹ کے عیسائی قبرستان میں آج بھی اس کی قبر موجود ہے۔
اس کی موت کے بعد اس کی کتابوں کی اشاعت کے لیے کورٹ نے پانچ سو گنی کی رقم بطور امداد
منظور کی تھی۔

کالج میں روبک کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب کورٹ
کے حکم سے سکریٹری اور ممتحن کے عہدے ختم کر دیے گئے تب بھی وہ ممتحن کے عہدے پر متمکن رہے اور ۱۸۱۲ء کے بعد جب

---

[۱] لکشمی ساگر وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۹۴

[۲] ایضاً " ۸۵

[۳] شانتی رنجن بھٹاچاریہ، بنگال میں اردو زبان و ادب ص ۲۴

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

پروفیسروں اور اسسٹنٹ پروفیسروں کے اپنے مضامین کے ممتحن بننے پہ پابندی عائد کی گئی تو انھیں اس حکم سے مستثنیٰ رکھا گیا۔

تصانیف:۔

(۱) (فورٹ ولیم کالج کی روداد) Annals of The Fort William college.
اس میں کالج کی ابتدا سے ۱۸۱۶ء تک کے حالات درج ہیں۔ یہ ۱۸۱۹ء میں شائع ہوئی۔

(۲) (اردو لغت) Hindoostanee and English Dictionary.
اس کی ترتیب میں ولیم ہنٹر نے بھی مدد کی تھی۔

(۳) قواعد ہندی۔ یہ کتاب اسکولی نصاب کے پیش نظر لکھی گئی تھی۔ اسے کلکتہ بک سوسائٹی نے ۱۸۱۸ء میں دو ہزار کی تعداد میں شائع کیا تھا۔

(۴) افعال فارسی و اردو۔ اسے ولیم ہنٹر نے لکھنا شروع کیا تھا لیکن مکمل روبک نے کیا۔ یہ پہلی بار ۱۸۲۴ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی۔

(۵) (ہندوستانی ترجمان) Hindoostanee Interpreter.
ہندوستانی زبان کے اصولی مسایل سے متعلق روبک کی یہ کتاب رومن رسم الخط میں لندن اور پیرس سے شائع ہوئی۔

(۶) برٹش انڈین مونیٹر (تین جلدیں) British Indian Monitor
یہ ایڈنبرا کے قیام کے زمانے میں ۱۸۰۶ء سے ۱۸۰۹ء کے درمیان لکھی گئی۔ اس کی ترتیب میں گل کرسٹ نے بھی مدد کی تھی۔ اس کی دو جلدیں ۱۸۰۹ء میں ایڈنبرا سے شائع ہوئیں تو بہ حیثیت مصنف روبک کے ساتھ گل کرسٹ کا بھی نام درج تھا۔ تیسری جلد کب شائع ہوئی اس کا پتا نہیں چل سکا۔

(۷) (ہندستانی انگریزی مکالمے) Hindoostanee and English Dialogues
۱۸۰۹ء میں یہ ایڈنبرا سے شائع ہوئی۔ اس کی ترتیب میں بھی گل کرسٹ کی معاونت شامل تھی۔

(۸) An English And Hindoostanee Dictionary with Grammer
Prefixed. (دو جلدیں)

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

اس کی دونوں جلدیں ایڈنبرا سے ۱۸۰۹ء میں شائع ہوئیں۔

(۹) English And Hindoostanee Naval Dictionary of Technical Words and Phrases.

اس میں جہاز رانی سے متعلق انگریزی الفاظ و اصطلاحات اور میدان جنگ اور فوجی بارکوں میں استعمال ہونے والے انگریزی الفاظ کے متبادل الفاظ و اصطلاحات اردو میں دیے گئے ہیں۔ یہ ۱۸۱۱ء میں کالج کی طرف سے اور ۱۸۱۲ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ کچھ لوگوں نے اس کا نام "لغت جہاز رانی" یا "لشکری لغت" بھی لکھا ہے۔

(۱۰) An English And Hindoostanee Exercises

یہ دو جلدوں میں ۱۸۱۲ء میں شائع ہوئی۔

(۱۱) Medical Dictionary

یہ شاہ جہاں کے طبیب خاص حکیم محمد عبداللہ کی کتاب "الفاظ الادویہ" کا اردو ترجمہ ہے۔

(۱۲) Dictionary of Muhammadan Law.

یہ شرع محمدی کی ایک کامیاب لغت ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ روبک نے ۱۸۱۵ء میں مولوی حفیظ الدین بردوانی کی "خرد افروز" کو اور "باغ و بہار" اور گل بکاولی" کو علی الترتیب ۱۸۱۳ء میں اپنے بسیط مقدموں کے ساتھ شائع کیا تھا جو کتابیں اس کے زیر نگرانی تصنیف یا ترتیب ہوئیں، ان میں "کنز الفوائد" (ہندوستانی، فارسی اور پنجابی گردانیں) گلستاں کا پنجابی ترجمہ (مترجم کاشی راج) بدیا دزین، دیوان جہاں اور پنجابی لغت (گورمکھی رسم الخط میں) کے نام شامل ہیں[1] روبک نے فارسی لغت "برہان قاطع" کی تصحیح کر کے اسے شائع کیا تھا۔

۳۔ فرانسس گلیڈون (Francis Gladwin)

فرانسس گلیڈون نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت بنگال آرمی سے شروع کی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد ۱۸ اگست ۱۸۰۰ء کو وہ شعبۂ فارسی کا صدر اور پروفیسر مقرر ہوا۔

---

[1] وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۱۰۹-۱۰۸

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

اسے فارسی کے علاوہ ہندوستانی زبان و ادب سے بھی بڑی دل چسپی تھی۔ چناں چہ اس نے اردو میں متعدد مفید کتابیں تصنیف کیں۔ بارلو بارنٹ نے ۱۸۰۷ء میں فورٹ ولیم کالج کے سالانہ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے اس کی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا تھا۔

"مسٹر فرانسس گلیڈون نے ہندوستانی لسانیات پر عمدہ کام کیا ہے۔ انھوں نے فارسی اور اردو (ہندوستانی) اور انگریزی میں لغت کی مفید کتاب ترتیب دی ہے، جس کی تین جلدیں ہیں۔"[1]

گلیڈون کے حالات زندگی کے بارے میں تمام ذرائع تقریباً خاموش ہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کس سنہ میں ولایت واپس ہوا۔ جارج اسمتھ کے بیان سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ اس نے ۱۸۱۲ء میں وفات پائی۔[2]

تصانیف:

(۱) اسلامی قوانین فقہ کی ڈکشنری۔ اس میں بنگال ریونیو کی اصطلاحات فارسی اور اردو میں دی گئی ہیں اور آخر میں فارسی اور انگریزی کے متبادل الفاظ کی ایک طویل فہرست بھی شامل ہے، اسی بنا پر کچھ لوگوں نے اس کا نام فارسی انگریزی لغت بھی لکھا ہے۔ یہ ۱۷۹۶ء میں مرتب ہوئی اور ۱۷۹۷ء میں انڈیا آفس پریس کلکتہ سے شائع ہوئی۔

(۲) فارسی ہندوستانی اور انگریزی لغت۔ یہ لغت ۱۸۰۱ء میں لکھی گئی تھی لیکن شائع نہیں ہو سکی۔

(۳) فارسی و بنگلہ لغت۔ یہ لغت بھی زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکی۔ اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے۔

(۴) (دل چسپ کہانیاں) Entertaining Stories۔

یہ کتاب فارسی کہانیوں کے انگریزی تراجم پر مشتمل ہے۔ یہ انگریز سیاحوں اور سوداگروں کے لیے لکھی گئی تھی اور ۱۸۰۹ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کا بنگلہ ترجمہ ایلوے نے کیا تھا۔ بعد میں اس کا ترجمہ ہندوستانی میں بھی ہوا اور ناگری رسم خط میں شائع کیا گیا۔

---

[1] بحوالہ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۸۳ ـ ۸۲

[2] Concise Dictionary of National Biography P. 500

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

۴۔ ولیم ٹیلر : (William Tylor)

ٹیلر فروری ۱۸۰۸ء سے مئی ۱۸۲۳ء تک فورٹ ولیم کالج میں شعبۂ ہندوستانی کے پروفیسر اور صدر رہے۔ اس دوران ناسازیِ صحت کی بنا پر انھیں کالج سے دو بار چھٹی لینا پڑی تھی۔ پہلی مرتبہ انھوں ۱۸۰۹ء میں اور دوسری بار ۱۸۱۱ء میں محض ایک ماہ کی رخصت لی تھی۔ گل کرسٹ اور روبک کی طرح انھیں بھی ہندوستانی زبان وادب سے خاص شغف تھا۔ ٹیلر کے دوران پروفیسری کالج میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں، جن کا ذکر پچھلے اوراق میں کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی زبان میں ایک لغت ترتیب دی جو ہندوستانی پریس کلکتہ سے ۱۸۰۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ولیم کارمائکل اور اسمتھ نے اس پر نظر ثانی کر کے ۱۸۲۰ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ یہ لغت انگریز طلبہ کے لیے بڑی مفید اور کارآمد ثابت ہوئی۔

۵۔ ولیم ہنٹر

ہنٹر ۱۷۵۵ء میں اسکاٹ لینڈ میں بمقام منٹروس (Maintrase) پیدا ہوئے۔[۱] ۱۷۸۱ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے میڈیکل افسر کی حیثیت سے وہ ہندوستان آئے۔ مئی ۱۷۹۹ء سے مارچ ۱۸۰۲ء اور اپریل ۱۸۰۴ء سے اپریل ۱۸۱۱ء تک دوبارہ وہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے سکریٹری رہے۔[۲] ۱۸۰۰ء میں وہ کالج کونسل کے پہلے سکریٹری اور ممتحن مقرر ہوئے۔ ۲۶ ستمبر ۱۸۰۵ء سے ۳۱ دسمبر ۱۸۰۵ء تک وہ عارضی طور پر شعبۂ ہندوستانی کے اسسٹنٹ پروفیسر بھی رہے۔ انھیں ۱۸۰۵ء میں کالج کے کتب خانے کا نگراں مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۸۱۱ء میں سکریٹری کے عہدے سے استعفا دے کر وہ جاوا چلے گیے اور وہیں بٹاوی (Batavia) میں ۱۸۱۲ء میں ان کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔[۳]

ہنٹر کو ہندوستانی زبان وادب سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس کی توسیع وترقی کے لیے انھوں نے ۱۸۰۲ء میں کلکتہ میں ہندوستانی پریس کے نام سے ایک مطبع قائم کیا تھا۔

---

[۱] شانتی رنجن بھٹاچاریہ، بنگال میں اردو زبان وادب ص ۳۰

[۲] ایضاً ۳۰

[۳] شانتی رنجن بھٹاچاریہ، بنگال میں اردو زبان وادب ص ۳۱

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ہندوستانی پریس کے بارے میں مورخین مختلف الرائے ہیں۔ ڈاکٹر عتیق صدیقی گل کرسٹ کو اس کا مالک قرار دیتے ہیں[1] جبکہ پیری چند مسرا نے ہنٹر کو اس کا مالک تسلیم کیا ہے، وہ رقم طراز ہیں کہ

"رام کنول سین اپنی تقدیر کا آپ معمار تھا اور اس نے اپنی زندگی ڈاکٹر ہنٹر کے ہندوستانی پریس میں آٹھ روپے ماہوار پر کمپوزیٹر کی حیثیت سے شروع کی تھی۔"[2]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی پریس کا نہ تو گل کرسٹ تنہا مالک تھا اور نہ ہنٹر۔ بلکہ یہ کئی لوگوں کی مشترکہ ملکیت تھا۔ "لائف آف دیوان رام کنول سین" میں شائع ڈاکٹر ولسن کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ہنٹر ہندوستانی پریس کا سب سے بڑا حصہ دار تھا۔ خط میں لکھا ہے کہ

"(رام کنول سین) دوسرے فرائض کے علاوہ ہندوستانی پریس کے منتظم کے فرائض بھی انجام دیتا تھا جس کا ڈاکٹر ہنٹر سب سے بڑا شریک تھا۔"[3]

بہرحال گل کرسٹ اور ہنٹر کی کوششوں سے ہندوستانی پریس قائم ہوا تھا۔ گلیڈون نے ٹائپ کا اور دیگر سامان کالج کو دیا تھا۔ گل کرسٹ نے کالج کونسل سے یہ سامان عاریتاً لے کر پریس قائم کیا اور شراکت میں ہنٹر کو بھی شامل کیا جب تک گل کرسٹ کالج میں رہا وہی پریس کا کرتا دھرتا رہا اور جب وہ انگلینڈ جانے لگا تو حصہ دار کی حیثیت سے پریس ہنٹر کے سپرد کر گیا شاید اس کے بعد سے ہنٹر اس کا سب سے بڑا شریک بنا ہوگا۔

ہندوستانی پریس قائم ہونے کے بعد کالج کی بیشتر کتابیں اس میں شائع ہوئیں۔ حسب ذیل کتابیں ہنٹر کی یادگار ہیں۔

(۱) ہندوستانی لغت ۔ اس کی ترتیب میں ہنٹر نے بڑی دیدہ ریزی اور جاں کاہی سے کام لیا ہے۔ انگریزوں کی لغات کے علاوہ انھوں نے ممتاز شعرائے اردو کے دواوین و کلیات اور داستانوں سے الفاظ اخذ کیے ہیں۔ اس کی ترتیب میں جن کتابوں سے مدد حاصل کی گئی ہے ان کی مجموعی تعداد ۲۴ ہے[4]

---

[1] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲ ۔ ۱۵۱

[2] بحوالہ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۹۹ Life of Dewan Ram comul sen, P. 40

[3] ایضاً " ص ۹۸ P. 43, 44

[4] کتابوں کے لیے ملاحظہ ہو فورٹ ولیم کالج ص ۹۰۔۱۹۶

۱۸۰۸ء میں طبع ہوئی۔

(۲) ہندوستانی، عربی، فارسی اور پنجابی کہاوتوں کا انتخاب۔

(۳) عہد نامۂ جدید۔ مرزا محمد فطرت نے انجیل کا ترجمہ کیا تھا۔ ہنٹر نے اس کا مقابلہ گریک ترجمے سے کیا اور اس کی تصحیح کر کے "عہد نامۂ جدید" کے نام سے ۱۸۰۵ء میں اپنے پریس سے شائع کیا۔

۶۔ ولیم پرائس : (William Price)

پرائس کی ولادت ۱۷۸۰ء میں ہوئی۔[۱] اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ ہندوستان آنے کے بعد یکم فروری ۱۸۰۷ء کو اس کا پہلا تقرر بنگال کی پانچویں رجمنٹ میں لفٹنٹ کے عہدے پر ہوا۔ ۱۱ر جولائی ۱۸۲۳ء کو اسے کیپٹن کے عہدے پر ترقی ملی۔ ۲۳ر اپریل ۱۸۳۱ء کو وہ میجر ہوگیا۔[۲] فورٹ ولیم کالج میں اس کا تقرر اکتوبر ۱۸۱۳ء میں آٹھ سو روپے ماہوار پر سنسکرت، بنگلہ اور ہندوستانی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ہوا تھا۔ اپریل ۱۸۲۱ء میں وہ فارسی کا ممتحن اور ۲۰ر اکتوبر ۱۸۲۳ء کو شعبۂ ہندوستانی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ کالج کی ملازمت کے دوران اسے فوجی بھتہ بھی ملتا تھا۔ جارج اسمتھ کا یہ بیان خلاف واقعہ ہے کہ پرائس نے ۱۸۳۰ء میں وفات پائی[۳] کیونکہ وہ ۱۸۳۱ء تک ہندوستانی شعبے سے وابستہ رہا ہے۔[۴] اس نے دسمبر ۱۸۳۱ء میں کمپنی کی ملازمت سے علاحدگی کے لیے درخواست دی، جسے منظور کر لیا گیا۔ گمان غالب ہے کہ اس کے بعد وہ لندن [illegible] چلا گیا، جہ[illegible] [illegible] ہو گیا۔

تصانیف :

(۱) کھڑی بولی اور انگلش کا لغت۔ یہ ۱۸۱۵ء میں طبع ہوئی۔ اس کی افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی سو جلدیں فورٹ ولیم کالج کی لائبریری میں رکھی گئی تھیں۔

(۲) Hindee And Hindoostanee Selections Which Are

---

[۱] G. Smith, Concise Dictionary of National Biography P. 1070

[۲] وارشتے، فورٹ ولیم کالج ص ۱۴۴

[۳] Concise Dictionary of National Biography P. 1070

[۴] لکشمی ساگر وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۱۴۴

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

Prefixed, The Rudiments of Hindoostanee And Bruj Bhakha Grammar.

اس کی ترتیب وتدوین میں تارنی چرن مترنے بھی مدد کی تھی۔ یہ دو حصوں پر مشتمل تھی، جو ۱۸۱۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ ہندی اور اردو کے نثر پاروں کا ایک عمدہ انتخاب ہے۔

(۳) پریم ساگر کا لغت۔ یہ ۱۸۱۴ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔

(۴) سبھا بلاس کی ترتیب۔ ۱۸۲۸ء

(۵) چھتر سال کی ترتیب ۱۸۲۹ء

اس کے علاوہ پرایس نے محمد صالح کے قواعد کا انگریزی میں ترجمہ کرکے اسے ۱۸۲۳ء میں شائع کیا تھا۔

(ب) ممتاز ہندوستانی مصنفین

۱۔ میر بہادر علی حسینی:

فورٹ ولیم کالج کے دوسرے مصنفوں کی طرح بہادر علی نے اپنی کتابوں کے دیباچوں میں اپنے حالات پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔ محمد یحییٰ تنہا، رام بابو سکسینہ، اور مولوی سید محمد کے علاوہ جاوید نہال اور وحید قریشی نے بہادر علی کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن ان کی تحریروں سے بھی ان کے حالات زندگی پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑتی۔ واقعات کی کڑیاں ملانے سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا آبائی وطن سبزوار (ایران) تھا۔ مغل شہنشاہوں کے جاہ وجلال اور داد ودہش کے قصے سن سن کر ایران اور افغانستان کے ارباب کمال وصاحبان علم جوق در جوق ہندوستان آتے تھے۔ حسینی کا خاندان بھی اسی سلسلے سے ترک وطن کرکے دلی یا مضافات دلی میں آباد ہوگیا تھا۔ ان کے آباد اجداد حصول معاش کی خاطر بہار اور بنگال کی خاک چھاننے پر مجبور ہوئے۔

حسینی دہلی ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم وتربیت حاصل کی۔ فورٹ ولیم کالج میں ان کا تقرر ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو عمل میں آیا تھا[۱]۔ محمد عتیق صدیقی نے گلکرسٹ اور اس کے عہد میں کالج کونسل کی

---

[۱] وارثنے، فورٹ ولیم کالج ص ۲۲

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کارروائی مورخہ ۲۹ اپریل ۱۸۰۱ء کے حوالے سے ہندوستانی شعبے میں چودہ منشیوں کا ذکر کرتے ہوئے حسینی کا نام سرِفہرست درج کیا ہے[1] لیکن اسی کتاب کے صفحے ۲۰۰۔ ۱۹۸ پر موصوف نے ۴۲ منشیوں کی جو فہرست پیش کی ہے اس میں ان کے تقرر کی تاریخ ۴ مئی ۱۸۰۱ء ہی لکھی ہے، اور لطف یہ کہ ان دونوں مقامات پر ان کی تنخواہ بھی الگ الگ درج ہے۔ صفحہ ۱۴۳ پر ان کے ماہانہ مشاہرے کی رقم دو سو روپے اور صفحہ ۱۹۸ پر محض اسّی روپیے بتائی گئی ہے۔ عتیق صاحب کے بیانات کا یہ اختلاف نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ کالج کونسل نے ۱۷ اکتوبر ۱۸۰۴ء کو انکی منصبی حیثیت گھٹا کر ان کی خدمات چیف منشی کے عہدے سے مترجم کے عہدے پر منتقل کر دی تھی[2] لیکن جون ۱۸۰۵ء تک ان کی تنخواہ میں کوئی کمی نہیں کی گئی[3] اسکے بعد ان کی تنخواہ اسّی روپئے ماہوار کر دی گئی تھی۔

ڈاکٹر وحید قریشی کا یہ خیال خلافِ واقعہ ہے کہ "فروری ۱۸۰۴ء میں گل کرسٹ کے جانے کے بعد یا تو بہادر علی حسینی ملازمت سے الگ ہو گئے یا ان کا انتقال ہو گیا[4]" کیونکہ کیپٹن موئٹ نے ۱۶ ستمبر ۱۸۰۵ء کو اپنے شعبے کے منشیوں کی جو تفصیل کالج کونسل کو بھیجی تھی اس میں بہادر علی کا نام بھی شامل ہے[5] جاوید نہال نے روبک کے حوالے سے لکھا ہے کہ بہادر علی دسمبر ۱۸۰۸ء تک کالج سے سبکدوش ہو گئے لیکن ریٹائر ہونے کے باوجود ۱۸۱۶ء تک غیر سرکاری طور پر کالج سے وابستہ رہے اور ترجموں پر نظرِ ثانی کا کام کرتے رہے[6] اس کے بعد وہ کہاں گیے اور کب انتقال کیا اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

میر امن اور سید منصور علی میر بہادر علی ہی کی وساطت سے کالج میں ملازم ہوئے تھے۔ میر امن سے ان کا یارانہ تھا اور منصور علی ان کے قرابت داروں میں تھے۔

---

[1] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۴۳ [2] وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۶۵

[3] ایضاً ص ۶۶

[4] مقدمہ اخلاق ہندی ص ۹

[5] بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۶۹ - ۶۸

[6] Roebuck, Annals of The Fort William college Appendix P. 51
بحوالہ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۸۸

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

تصانیف :

(۱) نثر بے نظیر۔ یہ سحر البیان کا نثری خلاصہ ہے، جو ۱۸۰۲ء میں مکمل ہوا۔ یہ ۱۸۰۳ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن کلکتے ہی سے ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا تھا۔

(۲) اخلاق ہندی۔ ہتوپدیش (سنسکرت) کا ترجمہ تاج الدین نے فارسی میں "مفرح القلوب" کے نام سے کیا تھا۔ گل کرسٹ کی فرمائش پر حسینی نے ۱۸۰۲ء میں اسے اردو کا جامہ پہنایا۔ یہ اخلاقیات کی بہترین کتاب ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ناگری رسم الخط میں ۱۸۰۲ء میں اور ۱۸۰۳ء میں دوسرا ایڈیشن فارسی خط میں شائع ہوا تھا۔ اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(۳) تاریخ آشنام (آسام)۔ یہ شہاب الدین طالش کی اسی نام کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ ۱۸۰۵ء میں مکمل ہوا۔ یہ ابھی تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکا ہے۔ اس میں ۱۶۶۲ء میں آسام پر اورنگ زیب کے مشہور جنرل میر جملہ کی یلغار آسام کے واقعات بیان کیے گیے ہیں۔

(۴) رسالہ گل کرسٹ۔ حسینی نے گل کرسٹ کی قواعد کا خلاصہ اردو میں تیار کیا، جو رسالہ گل کرسٹ کے نام سے بہت مشہور ہوا۔ یہ پہلی بار ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی۔ بعد میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

(۵) نقلیات یا نقلیات ہندی (دو جلدوں میں) یہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۰۲ء میں رومن، فارسی اور ناگری خطوں میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں ۱۰۰ نقلیں ہیں۔ اس کی دوسری جلد صرف فارسی اور ناگری میں ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ۱۹۲ نقلیں درج ہیں۔

اس کے علاوہ بہادر علی حسینی نے قرآن کے ترجمے اور نقلیات لقمانی کی ترتیب میں بھی مدد کی تھی۔ ان کتابوں کے سلسلے میں ان کی بہتر کارکردگی پر ان کے لیے انعام کی بھی سفارش کی گئی تھی۔

۲۔ میر شیر علی افسوس :

میر شیر علی نام، تخلص افسوس۔ ان کے خاندان کا سلسلہ حضرت جعفر صادق سے ملتا ہے اسی نسبت سے وہ اپنے نام کے ساتھ جعفری بھی لکھا کرتے تھے۔ ان کے بزرگوں کا وطن خاف تھا، ان میں ایک بزرگ عالم الدین خافی ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور آگرہ کے قریب قصبہ نارنول

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کو اپنا مستقر بنایا۔ لیکن افسوس کے دادا سید غلام مصطفٰے[1] اپنے اہل و عیال کے ساتھ محمد شاہ کے عہد میں دلی آئے اور یہیں کے ہو رہے۔

ڈاکٹر جاوید نہال نے انڈیا آفس لائبریری کے ہندوستانی مخطوطات کی فہرست کے حوالے سے افسوس کا سال ولادت ۱۷۳۶ء درج کیا ہے[1]۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر قلب علی خاں فائق نے خود افسوس کے بیان اور دوسرے باوثوق ذرائع سے ان کا سال پیدائش ۱۷۴۷ء متعین کیا ہے[2]۔
افسوس کے دادا سید غلام مصطفٰے[1] اور والد و چچا سید علی مظفر خاں اور سید غلام علی خاں عمدۃ الملک امیر خاں انجام کی سرکار سے وابستہ تھے۔ اُن کے چچا نے اپنی عمدہ کارکردگی اور معاملہ فہمی کی بدولت بڑی عزت و توقیر حاصل کر لی تھی۔ یہاں تک کہ جب عمدۃ الملک کا انتقال ہوا تو ۱۷۴۶ء میں انھیں صوبہ الہ آباد کا نائب مقرر کیا گیا۔ سید غلام علی خاں کی موت کے بعد افسوس اور ان کے والد تلاش معاش کی غرض سے ۱۷۵۷ء میں عظیم آباد پہنچے۔ یہاں میر محمد جعفر خاں نے ان کے والد کو توپ خانے کا داروغہ مقرر کیا۔ اس وقت افسوس کی عمر غالباً دس برس کی تھی۔ میر محمد جعفر کی شہادت کے بعد یہ ملازمت ختم ہو گئی اور وہ پٹنہ ہی میں کسی کے یہاں ملازم ہو گئے۔ البتہ ۱۷۶۳ء میں علی مظفر خاں نے روزانہ کی لڑائیوں سے تنگ آکر افسوس کو لکھنؤ روانہ کر دیا[3]۔ اس کے بعد نواب بقاء اللہ خاں نے انھیں لکھنؤ بلا کر شجاع الدولہ کی سرکار میں تین سو روپئے ماہانہ مشاہرے پر ان کا تقرر کرا دیا[4]۔ افسوس کے لکھنؤ پہنچنے کے دو سال بعد وہ وہاں پہنچے تھے۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد سید علی مظفر خاں دکن چلے گئے جہاں ان کا انتقال ہو گیا۔

لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں افسوس نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اور تفنن طبع کے لیے کبھی کبھی وہ شعر بھی کہنے لگے۔ خدا نے شاعرانہ طبیعت ودیعت کی تھی اس لیے جلد ہی اچھے شاعروں میں شمار ہونے لگے۔ یہ زمانہ لکھنؤ میں شعر و شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ میر۔ سودا

---

[1] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۱۰۰

[2] ملاحظہ ہو مقدمہ آرائش محفل ص ص ۱۸-۴

[3] کلب علی خاں ایضاً ص ۲۱

[4] مرزا علی لطف، گلشن ہند ص ۵۷-۵۶

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

جرأتؔ اور انشاءؔ جیسے مسلم الثبوت اساتذہ ادبی محفلوں کی رونق بنے ہوئے تھے۔ افسوسؔ نے کچھ دنوں تک میرؔ اور سوداؔ سے بھی اصلاح لی تھی۔ لیکن میر حیدر علی حیرانؔ اور میر سوزؔ کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ۱۷۷۴ء میں شجاع الدولہ کے بھتیجے سالار جنگ کی اتالیقی اختیار کی۔ ۱۷۷۴ء سے ۱۷۸۴ء تک سالار جنگ کی سرکار سے وابستہ رہے۔ اس دوران ان کے بڑے بیٹے مرزا نوازش علی خاں کے مصاحب بھی رہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس دوران افسوسؔ نے اپنا دیوان بھی مرتب کر لیا تھا۔[۱] لیکن اس دیوان میں چونکہ گل کرسٹ، کرنل اسکاٹ، بارلو اور کالج کے دوسرے افسر کی مدح میں قصیدے شامل ہیں اس لیے زیادہ امکان اس امر کا ہے کہ اس کی ترتیب کا کام کالج کی ملازمت کے ابتدائی زمانے میں انجام پذیر ہوا ہوگا۔

۱۷۶۳ء سے ۱۷۸۵ء تک افسوسؔ کا قیام فیض آباد و لکھنؤ میں رہا۔ ۱۷۸۴ء میں شاہزادہ جواں بخت جہاں دار شاہ لکھنؤ آیا۔ اس نے افسوس کا کلام سنا اور بہت پسند کیا چنانچہ شہزادہ نے افسوسؔ کو اپنی سرکار سے وابستہ کر کے "بہ عہدۂ شاعری" سرفراز کیا۔ ۱۷۸۶ء میں جب شاہ زادہ بنارس جانے لگا تو افسوسؔ کو بھی اپنے ساتھ رکھا ۱۷۸۶ء سے ۱۷۸۸ء تک افسوسؔ بنارس ہی میں رہے۔ جواں بخت جہاں دار شاہ کی موت (۱۷۸۸ء) کے بعد افسوسؔ بنارس سے لکھنؤ واپس چلے آئے اور یہاں آ کر انھوں نے حسن رضا خاں کی مصاحبت اختیار کی اور فکر معاش سے بے نیاز ہو گیے۔ اس بے فکری نے انھیں درس و تدریس کی طرف مائل کیا۔

حسن رضا خاں کی موت کے بعد فخر الدین احمد خاں نے افسوسؔ کا تعارف کرنل اسکاٹ سے کرایا۔ اس نے ان کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے لیے منتخب کر کے کلکتہ بھیج دیا۔ کالج میں ان کی تقرری، ۱۱ اکتوبر ۱۸۰۰ء کو بحیثیت مترجم کے دو سو روپیہ ماہانہ تنخواہ پر ہوئی تھی۔[۲] کلکتہ آتے وقت انھوں نے کچھ دنوں تک پٹنہ میں مرزا علی لطفؔ کے یہاں بھی قیام کیا تھا۔ یہ بات بعید از امکان نہیں کہ افسوسؔ نے انھیں بھی کلکتہ آنے کی دعوت دی ہو اور وہ ان ہی

---

[۱] سید محمد، ارباب نثر اردو ص ۱۰۶، اور عبیدہ بیگم، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۱۲

[۲] کلب علی خاں فائق، مقدمہ آرائش محفل ص ۲۶

[۳] عبیدہ بیگم، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۱۴ کا تحشیہ

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کی ترغیب پر کلکتہ آئے ہوں۔ کیونکہ لطف نے "گلشن ہند" میں ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ افسوس دسمبر ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد گل کرسٹ نے "گلستاں" کے ترجمے کا کام ان کے سپرد کیا۔ اس کا اردو ترجمہ "باغ اردو" کے نام سے ۱۸۰۲ء میں مکمل ہوا اور اسی سال شائع ہوا۔ اس کے بعد تصحیح کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔ عبیدہ بیگم نے ان ہی کے حوالے سے ان کی تصحیح شدہ کتابوں میں نثر بے نظیر، قصۂ گل بکاولی، مادھونل، توتا کہانی، آرائش محفل اور باغ و بہار کو شامل کیا ہے۔[1]

۱۷ اکتوبر ۱۸۰۴ء[2] کو کونسل نے بہادر علی کو میر منشی کے عہدے سے ہٹا کر مترجم کے منصب پر مامور کر دیا اور اسی تاریخ کو افسوس ان کی جگہ ہیڈ منشی مقرر ہوئے۔[2] بیل[3] اور نظامی بدایونی[4] کا یہ خیال درست نہیں کہ افسوس کا انتقال ۱۹۰۶ء میں ہوا، اور نہ اکبر حیدری کاشمیری کی یہ اطلاع درست ہے کردہ ۱۸۰۸ء میں فوت ہوئے۔[5] ان کے انتقال کی صحیح تاریخ ۱۹ر دسمبر ۱۸۰۹ء ہے۔[6]

کہا جاتا ہے کہ افسوس جتنے اچھے نثار تھے اس سے کہیں اچھے شاعر تھے لیکن بہ حیثیت شاعر انھیں کوئی مقام حاصل نہیں ہوسکا۔ ان کی شہرت و اہمیت کا تمام تر دار و مدار ان کی نثری تصانیف پر ہے، جن کی تفصیلات سطور ذیل میں پیش کی جارہی ہیں:-

(۱) باغ اردو - یہ سعدی کی شہرہ آفاق کتاب "گلستاں" کا نثری ترجمہ ہے جو کالج کے نصاب تعلیم میں بھی شامل تھا۔ "احوال رسم خط" کے عنوان سے افسوس نے اس میں گل کرسٹ کے رسالے "رسم خط اور اعراب کا خلاصہ" بھی شامل کیا ہے۔ مقدمے میں سعدی کے اور اپنے حالات لکھنے کے علاوہ دلزلی

---

[1] دیباچہ آرائش محفل (ق ن ص ۳) بحوالہ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۱۴ لیکن کلب علی خان فائق نے محض بہار دانش، قصۂ گل بکاولی (مذہب عشق) نثر بے نظیر اور نقلیات لقمانی کے نام ہی تصحیح شدہ کتابوں میں شامل کیے ہیں۔ (مقدمہ آرائش محفل ص ۳۵)

[2] دارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۶۵

[3] An oriental Biographical Dictionary P. 35

[4] قاموس المشاہیر ص ۸۷

[5] تحقیق نوادر ص ۲۴۵

[6] بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۸۴

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

اور گل کرسٹ کی مدح سرائی بھی کی ہے۔ یہ ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی۔

(۲) آرائش محفل ۔ یہ منشی سجان رائے بھنڈاری کی تصنیف ،،خلاصۃ التواریخ" فارسی) کے ایک حصے کا آزاد اردو ترجمہ ہے، افسوس نے اسے ۱۸۰۵ء میں مکمل کر لیا تھا۔ لیکن ۱۸۰۸ء تک اس میں اضافے کرتے رہے۔ اس کتاب میں ہندوستان کے مختلف ریاستوں کے حالات بیان کیے گیے ہیں۔ تاریخ وجغرافیہ جیسے خشک موضوع سے متعلق ہونے کی وجہ سے بعض جگہ اس کی عبارتیں بے کیف ہو گئی ہیں۔ اسے ۱۸۰۸ء میں شائع کیا گیا۔

ان کتابوں کے علاوہ افسوس نے ایک اردو دیوان بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے، جس میں ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اس کے آخری حصے میں ارباب کالج کی مدح میں متعدد قصیدے بھی شامل ہیں۔ انھوں نے "نقلیات لقمانی" کی ترتیب میں بھی مدد کی تھی اور مرزا رفیع سودا کا کلیات بھی مرتب کیا تھا جو ہندوستانی پریس سے شائع ہوا۔

(۳) تارنی چرن متر:

رام بابو سکسینہ، سید محمد اور نادم سیتاپوری نے فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں کے ضمن میں تارنی چرن کا ذکر نہیں کیا ہے، حالانکہ کالج کے منشیوں میں وہ چھوتھے نمبر پر تھے اور ۱۸۰۶ء کے اواخر میں چیف منشی مقرر ہو کر پہلے نمبر پر آ گیے تھے۔ تارنی چرن اس عہدے پر اس وقت تک برقرار رہے جب تک کہ کالج میں منشیوں کے عہدے قائم تھے۔ اس اعتبار سے انھوں نے کالج کی سب سے زیادہ خدمات انجام دیں۔

تارنی چرن کی ولادت ۱۷۷۲ء میں ضلع ہوگلی کے ایک گاؤں میں ہوئی تھی[1] ان کے بزرگ دربار مغلیہ سے وابستہ تھے اس لیے ان کے خاندان میں عربی وفارسی کی تعلیم کا رواج تھا۔ اسی روایت کے تحت تارنی چرن کی تعلیم کی ابتدا بھی فارسی سے ہوئی تھی۔ انھیں فارسی، اردو، بنگلہ اور سنسکرت زبانوں پر کامل عبور حاصل تھا۔ اپنے اس تبحر علمی کی بدولت وہ ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو کالج کے ہندستانی شعبے میں سو روپے ماہوار مشاہرے پر نائب منشی مقرر ہوئے۔ اس عہدے پر تقرر کے لیے تارنی چرن کے نام کی سفارش شعبۂ بنگلہ کے معلم ولیم کیری نے کی تھی۔ شیر علی افسوس کے

---

[1] جاوید نہال، انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۸۰

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

انتقال کے بعد ۱۲ دسمبر ۱۸۰۹ء کو انھوں نے چیف منشی کا عہدہ سنبھالا[1] اور لگ بھگ اکیس برس تک اس عہدے پر برقرار رہے۔ فروری ۱۸۳۰ء میں جب کالج کے پروفیسروں اور منشیوں کے عہدے ختم کر دیے گئے تو سو روپے ماہوار ان کی پنشن مقرر ہو گئی۔ پنشن کے کاغذات میں ان کا جو حلیہ درج کیا گیا تھا اس کا ذکر فورٹ ولیم کالج کی تاریخ کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔

تارنی چرن فورٹ ولیم کالج کے علاوہ دوسرے علمی و ادبی اداروں سے بھی متعلق رہے مثلاً "اسکول بک سوسائٹی" کلکتہ کے قیام کے بعد وہ اس کے سکریٹری منتخب ہوئے اور جب تک کلکتہ میں ان کا قیام رہا وہ برابر اس عہدے پر متمکن رہے۔ وہ "دھرم سبھا" کے بھی نہ صرف رکن بلکہ روح رواں تھے[2]

پنشن کے بعد تارنی چرن مہاراجہ کاشی کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ ڈی ٹسی کی اطلاع کے مطابق ۱۸۳۴ء میں وہ اسکول بک سوسائٹی کے سکریٹری تھے[3] لیکن شانتی رنجن بھٹاچاریہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۳۴ء میں وہ کاشی کے کشنر تھے[4]۔ ظاہر ہے کہ ۱۸۳۰ء میں کاشی آتے وقت انھوں نے اسکول بک سوسائٹی سے استعفا دے دیا ہوگا، کیوں کہ اس زمانے میں کسی انجمن یا سوسائٹی کے سکریٹری کے لیے اس شہر میں مستقل سکونت اشد ضروری تھی، جہاں اس کا دفتر ہوتا تھا۔ ۱۸۳۷ء میں کاشی ہی میں تارنی چرن کا انتقال ہو گیا[5]۔

تصانیف :

(۱) پورش پرکچھا۔ یہ کتاب جو اخلاقی کہانیوں پر مشتمل ہے، سنسکرت سے آسان اردو میں ترجمہ کی گئی ہے اور ۱۸۱۳ء میں کلکتہ سے شائع بھی ہو چکی ہے۔ اس کا بنگلہ ترجمہ ہری پرشاد نے کیا تھا

---

[1] وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۸۳

[2] یہ انجمن ۱۷ جنوری ۱۸۳۰ء کو وجود میں آئی تھی۔ اس کا مقصد "ستی پرتھا" کو قانونی حیثیت دلانا تھا۔ بالفاظ دیگر یہ انجمن راجا رام موہن رائے اور ان کے ساتھیوں کے خلاف ایک مورچے کے طور پر قائم کی گئی تھی۔

[3] گارساں ہندوئی ساہتیہ کا اتہاس، مترجم لکشمی ساگر وارشنے ص ۹۲

[4] بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات ص ۱۸۶

[5] ایضاً ص ۱۹۳

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

(۲) **نقلیات لقمانی** ۔ یہ کتاب Hindoostanee Fables اور دوسرے قدیم قصوں کا انگریزی سے ہندستانی، فارسی، عربی، برج بھاشا، بنگلہ اور سنسکرت زبانوں میں ترجمہ کی ہوئی چھوٹی چھوٹی حکایتوں کا مجموعہ ہے جو گل کرسٹ کے حسب فرمائش اور ان ہی کی رہنمائی میں مرتب کیا گیا تھا۔ یہ قصے رومن رسم خط میں لکھے گیے ہیں۔ اس کے مرتبین میں تارنی چرن کے علاوہ مولوی امانت اللہ، پنڈت سدل مسر، بہادر علی حسینی، شیر علی افسوس، للو لال کوی اور غلام اشرف شامل تھے۔ گل کرسٹ نے ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کو کالج کونسل کے سامنے انعام کے لیے شعبہ ہندوستانی کی تصانیف کی جو فہرست پیش کی تھی اس میں "نقلیات لقمانی" کے مترجمین کے متعلق لکھا تھا کہ "ان میں شروع کے تین اشخاص (تارنی چرن، امانت اللہ اور سدل مسر) خاص طور سے صلے کے مستحق ہیں، کیوں کہ بنگالی، عربی اور سنسکرت ترجمے کا باران ہی کے کاندھوں پر تھا اور زیادہ بوجھ تارنی چرن مسر اپر پڑا"[۱] اس بیان سے ان حکایات کے ترجمے کے سلسلے میں تارنی چرن کی کارکردگی کی نوعیت اور اہمیت دونوں کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر جاوید نہال نے "نقلیات ہندی" کو غلطی سے "نقلیات لقمانی" سمجھ کر اس کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ فارسی دیوناگری اور رومن لپیوں میں شائع ہوئی"[۲] حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب ۱۸۰۳ء میں صرف رومن رسم الخط میں شائع ہوئی تھی۔ فارسی یا دیوناگری رسم خط میں اس کی اشاعت کا کوئی ثبوت موجود نہیں ۱۸۰۳ء کی متذکرہ بالا اشاعت کے شروع میں گل کرسٹ کا لکھا ہوا ایک بسیط مقدمہ بھی شامل ہے۔ اس کا انگریزی نام "The oriental Fabulist" ہے۔

(۳) **خلاصۃ الحساب** ۔ اس کی اشاعت کے لیے کالج کونسل نے ۷، نومبر ۱۸۱۰ء کو ۱۲۲۵ روپے کی منظوری دی تھی[۳] یہ روشن علی انصاری جونپوری کے اسی نام کی فارسی تصنیف کا ترجمہ ہے۔ اس کی تصحیح و نظر ثانی میں جان علی اور غلام اکبر بھی شامل تھے۔

---

[۱] Proceedings of The college of Fort William P. 97
بحوالہ ہماری زبان دہلی مورخہ یکم مارچ ۱۹۸۱ء اور گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۷۰۔

[۲] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۶۱

[۳] عبیدہ بیگم کا یہ خیال خلاف واقعہ ہے کہ ۱۲۲۵ روپیے تارنی چرن کو دیے گئے۔ (فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص۱۱)

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

(۴) گولا ادھیائے ۔ یہ ہندی کی ایک نصابی کتاب ہے جو درجہ پنجم کی ضروریات کے پیش نظر ترتیب دی گئی تھی اور ۱۸۲۷ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہو چکی ہے ۔

(۵) کھڑی بولی کی کہانیاں ۔ کہانیوں کے اس مجموعے کو روبک نے ترتیب دینا شروع کیا تھا لیکن ان کے انتقال کے بعد اسے مسٹر نے مکمل کیا ۔

علاوہ بریں تارنی چرن نے کالج کی جن دوسری کتابوں کی ترتیب و تدوین میں مدد دی تھی ان میں بے تال پچیسی، اور ولیم ہنٹر کی لغت بطور خاص قابل ذکر ہیں ۔ ان کی تصنیفات میں ڈاکٹر گیان چند نے "حکایات نصیحت آموز" کو بھی شامل ہے ۔ یہ دو جلدوں میں ہے ۔ پہلی جلد ۱۸۱۹ء میں اور دوسری جلد ۱۸۲۰ء میں شائع ہوئی ۔

۴ ۔ مرزا کاظم علی جواںؔ

جواںؔ بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن میر شیر علی افسوسؔ کی طرح انھیں بھی شاعری کے میدان میں کوئی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جبکہ نثار کی حیثیت سے وہ کافی مشہور رہے ۔ ان کا اصل نام حسن علی خاں تھا ۔ ان کی زندگی کے بیشتر حالات ابھی تک صیغۂ راز میں ہیں ۔

کاظم علی دلی کے رہنے والے تھے لیکن احمد شاہ ابدالی کے حملوں میں دلی کی تباہی کے بعد جب ہر روز ارباب فضل و کمال کا ایک نیا قافلہ پورب کی طرف روانہ ہونے لگا تو یہ بھی ترک وطن کر کے فیض آباد چلے آئے تھے ۔ یہاں آکر انھوں نے شجاع الدولہ کے بیٹے نواب سیف الدولہ کی مصاحبت اختیار کی[۱] اس کے بعد وہ لکھنؤ پہنچے ۔ اس سفر کا سال نامعلوم ہے ۔ البتہ مولوی کریم الدین کے بیان سے جنھوں نے ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء میں انھیں لکھنؤ میں دیکھا تھا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے قبل یہاں پہنچ چکے تھے[۲] اسلم قریشی کے بیان کے مطابق فورٹ ولیم کالج کے لیے جواںؔ اور مظہر علی خاں ولاؔ دونوں کا انتخاب ایک ساتھ ۱۰ نومبر ۱۸۰۰ء کو لکھنؤ ہی میں ہوا تھا[۳] ان دونوں کا تقرر کرنل اسکاٹ ریزیڈنٹ لکھنؤ نے اسّی روپیے ماہوار پر کیا تھا ۔ جواںؔ جنوری ۱۸۰۱ء میں کلکتہ

---

[۱] مصحفی، تذکرۂ ہندی ص ۷۱ اور سعادت خاں ناصر تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا ص ۱۹۲

[۲] بحوالہ ارباب نثر اردو ص ۲۲۳

[۳] مقدمہ شکنتلا ص ۱۸

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

پہنچے[۱] اور اپنی تقرری کا پروانہ پیش کیا۔ اس کے دوسرے ہی دن "شکنتلا" کی تحریر کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔ وہ حین حیات کالج سے وابستہ رہے۔ پروفیسر جاوید نہال کا یہ خیال سراسر خلاف واقعہ ہے کہ جواںؔ کا انتقال ۱۸۴۰ء سے ۱۸۴۵ء کے درمیان ہوا[۲]۔ وارثنے نے فورٹ ولیم کالج کے کاغذات کے حوالے سے ان کے انتقال کی تاریخ ۳ جولائی ۱۸۱۶ء متعین کی ہے[۳]۔ ٹیلر (ہندوستانی شعبے کے پروفیسر و صدر) نے ان کی بیوہ اور اولاد کے لیے پنشن کی سفارش کی تھی لیکن کونسل نے اسے منظور نہیں کیا۔

جواںؔ کو شکنتلا اور قرآن کے ترجمے پر سو سو روپے اور سنگھاسن بتیسی اور بارہ ماسا کی تصنیف پر دو دو سو روپے کا انعام ملا تھا۔

ان کے دو بیٹے مرزا قاسم علی ممتازؔ اور ہاشم علی عیاںؔ اچھے شاعر تھے لیکن وہ دونوں باپ کے مرتبے کو نہ پہنچ سکے۔ رائے بینی نارائن نے "دیوان جہان" میں جواںؔ اور ان کے دونوں بیٹوں کی غزلیں شامل کی ہیں۔

تصانیف :-

(۱) شکنتلا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جواںؔ کی شکنتلا کالی داس کے مشہور سنسکرت ناٹک "شکنتلا" کا اردو ترجمہ ہے، جسے ان سے پہلے نوازؔ بھاشا (ہندی) میں ترجمہ کر چکے تھے۔ سید محمد نے بھی اسے ڈراما کہا ہے[۴] اردو ڈراما نویسی میں اسے اولیت کا درجہ دیا ہے[۵] لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو جواںؔ کا یہ ترجمہ ناٹک کی تعریف میں آتا ہے اور نہ تو نوازؔ کی "شکنتلا" ہی جس کی مدد سے اس قصے کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے، ڈرامے کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ نوازؔ کی کتاب کے بارے میں ڈی ٹسی کا بیان ہے کہ "یہ کالی داس کے ڈرامے کی نقل نہیں ہے بلکہ مہابھارت کی طرز پہ لکھی گئی ہے"[۵]۔

---

[۱] عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۶۰

[۲] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۱۰۸

[۳] فورٹ ولیم کالج ص ۹۳

[۴] ارباب نثر اردو ص ۲۰۸

[۵] بحوالہ شکنتلا، مرتبہ ڈاکٹر اسلم قریشی ص ۷

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

۱۸۰۲ء میں ناگری لپی میں اس کے ۲۴ صفحات چھپ چکے تھے، جنھیں ہندی مینول میں شامل کر دیے گیے۔ دوسری بار ۱۸۰۴ء میں رومن رسم الخط میں گل کرسٹ نے "The Hindu orthaepi graphical ultimatum" کے نام سے اسے شائع کیا۔ اور یہ تیسری مرتبہ ۱۸۲۶ء میں اردو خط میں لندن سے شائع ہوئی۔

(۲) سنگھاسن بتیسی ۔ اس کی اصل سنسکرت ہے، جسے سندر کبیشور نے شاہجہاں کے عہد میں برج بھاشا میں ترجمہ کیا تھا۔ گل کرسٹ کے ایما پر جواں نے ۱۸۰۱ء میں اسے اردو کا جامہ پہنایا۔ اس کے ترجمے میں للولال نے بھی ان کی مدد کی تھی اس میں کل ۳۲ کہانیاں درج ہیں۔ یہ ۱۸۰۵ء میں ناگری لپی میں کلکتے سے شائع ہوئی، جس کے سرورق پر جواں کے ساتھ للولال کا نام بھی شامل ہے۔

(۳) بارہ ماسا ۔ اس کا دوسرا نام "دستورِ ہند" بھی ہے۔ یہ نظم میں ہے۔ جواں نے اسے ۱۸۰۲ء میں مکمل کیا تھا، اس کے نو برس کے بعد ۱۸۱۲ء میں ہندوستانی پریس سے چھپ کر شائع ہوا۔

(۴) تاریخ بہمنی : "تاریخ فرشتہ" نام کی فارسی تصنیف کے سلاطین بہمنیہ سے متعلق ایک بڑے حصے کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۸۰۷ء ہے۔ یہ طبع نہیں ہو سکی۔ بعض مورخوں نے اس کا نام تاریخ فرشتہ ہی لکھا ہے۔

اس کے علاوہ جواں نے میر اور سودا کے کلام کا انتخاب بھی مرتب کیا تھا اور قرآن کے ترجمے میں بھی اپنے رفقائے کار کی مدد کی تھی۔ ڈاکٹر اسلم قریشی نے ان کی تصانیف میں "خرد افروز" کو بھی شامل کیا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔

(۵) مظہر علی خاں ولا :-

ولا کا اصل نام مرزا علی لطف تھا لیکن انھیں شہرت اپنے قلمی نام مظہر علی خاں سے حاصل ہوئی۔ ولا کے جدِ امجد آقا محمد صادق ترک نژاد تھے۔ وہ اصفہان (ایران) سے ہندوستان آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ان کے بیٹے آقا محمد حسین ولا کے دادا تھے۔ نواب سعید الدین خاں بہادر کے توسل سے آقا محمد حسین کو محمد شاہ کے دربار میں رسالہ داری اور دارو غگی کا منصب مل گیا۔ اسی زمانے میں وہ علی قلی خاں کے لقب سے ملقب ہوئے ان کے بڑے صاحب

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

زادے اور ولاؔ کے والد سلیمان علی خاں ودادؔ نے اپنے علم و کمال کی بدولت دلی کے شرفا میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا تھا۔ ودادؔ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ مرزا رفیع سوداؔ نے پہلے ودادؔ ہی کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا تھا اور دردؔ بھی پہلے ان ہی کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ بقول ولاؔ ان کا انتقال ۱۵ جمادی الاول ۱۱۸۱ھ کو ہوا[1]

ولاؔ کی تاریخ پیدائش ہنوز نامعلوم ہے۔ جاوید نہال نے لکھا ہے کہ "کوائف سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۱۷۵ھ کے قریب دلی میں پیدا ہوئے"[2] اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "باپ کی وفات پر ولاؔ نے سیف الدولہ بخشی الملک نجف قلی خاں بہادر مظفر جنگ کی رفاقت اختیار کی[3] اور بہت دنوں تک ان سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد وہ مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کی سرکار سے وابستہ ہو گیے۔ خانگی چشمکوں سے تنگ آ کر جب مرزا جواں بخت دلی سے مئی ۱۷۸۴ء میں لکھنؤ آیا تو ولاؔ بھی اس کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے۔ اس کے بعد مرزا جواں بخت بنارس چلا گیا لیکن ولاؔ لکھنؤ ہی میں رہ گیے۔ ان کی ملاقات کسی طرح نواب آصف الدولہ کے مشیر راجہ ٹکیت رائے سے ہو گئی۔ انھوں نے نواب آصف الدولہ کی سرکار میں ملازمت دلوا کر اپنی مصاحبت میں انھیں لے لیا۔ اس طرح ولاؔ سات سال گزارے۔ لیکن جب مہاراجہ کا زوال ہوا تو ولاؔ کے ایام غربت میں گزرے۔ لیکن بخت نے یاوری کی اور نظام الدین احمد خاں کے توسل سے ان کی رسائی کرنل اسکاٹ تک ہو گئی جنھوں نے انھیں فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے لیے منتخب کر کے کلکتہ بھیج دیا۔ ولاؔ اپنے بیان کے مطابق ۱ مارچ ۱۸۰۰ء کو ملازم ہو کر کلکتہ آئے تھے[4] دوسرے تاریخ نویسوں نے فورٹ ولیم کالج میں ان کے تقرر کی تاریخ ۱ نومبر ۱۸۰۰ء لکھی ہے، خود اسکاٹ نے کالج کونسل کے نام ان کے تقرر سے متعلق جو خط لکھا تھا اس میں تحریر تھا کہ میں نے انھیں ماہ رواں (نومبر ۱۸۰۰ء) کی دسویں تاریخ سے

---

[1] بحوالہ نواے ادب، اکتوبر ۱۹۶۵ء ص ۔

[2] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۱۶۱

[3] ایضاً ” ” ص ۱۶۱ عجیب بات ہے کہ نوعمری میں یہ رفاقت قرین قیاس نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ولاؔ کی ولادت ۱۱۷۵ھ سے پہلے ہوئی ہوگی۔ [4] جہاں گیر شاہی بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ۲۰۰

بھرتی کیا ہے[۱] بہر حال اس سے نقہ کوئی دوسری روایت نہیں ہو سکتی۔ ولاؔ کا بیان اس لیے بھی قابل اعتبار نہیں کہ مارچ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا وجود ہی نہیں تھا۔

کاظم علی جواںؔ اور ولاؔ دونوں کا تقرر ایک ہی دن ہوا تھا اور دونوں اپنی تقرری کا پروانہ لیے جنوری ۱۸۰۱ء میں کلکتہ پہنچے تھے۔ کالج کی ملازمت سے قبل ولاؔ قصیدے، سلام، قطعات اور رباعیات وغیرہ کے شاعر تھے اور مشق سخن میں انھوں نے ایک عمر گزاری تھی۔ خود ان کا بیان ہے کہ "احقر مدتہا عمر عزیز را در فن ریختہ گوئی صرف نمود"[۲] لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی علمی زندگی کا باقاعدہ آغاز فورٹ ولیم کالج سے ہوا۔

کالج میں آئے انھیں پورے دو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ ۳۰ اگست ۱۸۰۲ء کی کاروائی میں ولاؔ کو زائد از ضرورت قرار دے کر ۳۰ ستمبر ۱۸۰۲ء سے انھیں کالج سے علاحدہ کر دیا گیا[۳] ستمبر کی تنخواہ کے علاوہ لکھنؤ تک جانے کا انھیں زاد راہ بھی دیا گیا۔ برطرفی کی اس خبر نے ولاؔ کو فطری طور پر ذہنی اذیت اور تشویش میں مبتلا کر دیا ہوگا۔ انھوں نے وطن کی مفارقت خدمت ادب سے زیادہ سکون قلب اور خوش حالی و فارغ البالی کی امید میں گوارا کی تھی۔ چنانچہ اپنے سنہرے خوابوں کو بکھرتے اور امیدوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھ کر انھوں نے کونسل سے درخواست کی کہ ان کے معاملے پر دوبارہ غور کیا جائے اور ان کی ملازمت بحال رکھی جائے۔ ۴ اکتوبر کی کاروائی میں کونسل نے ان کی یہ درخواست منظور کر لی اور ان کی برطرفی کا فیصلہ منسوخ کر دیا گیا۔[۴]

جاوید نہال ولاؔ کو ۱۸۲۹ء تک بقید حیات قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے

"بلا شبہ ۱۸۲۹ء تک وہ کلکتہ ہی میں تھے کیوں کہ ان کے معاون بینی نراین جہاںؔ نے "دیوان جہاں" میں ولاؔ کو بقید حیات بنایا ہے"[۵]

---

[۱] بحوالہ نوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۵ء ص ۱۲ ــ ۱۱۔ لیکن لکشمی ساگر وارشنے نے ایشیاٹک اینول رجسٹر ۱۸۰۱ء لندن (۱۸۰۲) کے حوالے سے ولاؔ کے تقرر کی تاریخ ۲۷ نومبر ۱۸۰۱ء درج کی ہے (فورٹ ولیم کالج ص ۱۹)

[۲] نوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۵ء ص ۱۵

[۳] وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۵۳۔ اور عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۶۱

[۴] بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۶۱ [۵] بنگال کا اردو ادب ص ۱۸۶۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

دیوان جہاں کی بنیاد پر جاوید نہال کا یہ استنباط درست نہیں۔ بینی نراین کے اس انتخاب کا سال ترتیب ۱۸۲۹ء نہیں، ۱۸۱۳ء مطابق ۱۲۲۷ھ ہے۔ اس وقت ولا یقیناً بقید حیات تھے لیکن ۱۸۲۹ء سے برسوں قبل ان کی وفات ہو چکی تھی۔ ہندوستانی شعبے کے پروفیسر ولیم ٹیلر نے کالج کونسل کو ان کی موت کی اطلاع ۱۲؍ اگست ۱۸۱۶ء کو دی تھی[1]۔ اس بنیاد پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۰ یا ۱۱؍ اگست ۱۸۱۶ء کو فوت ہوئے ہوں گے۔

تصانیف :-

(۱) ہفت گلشن ۔ یہ ناصر علی بلگرامی کی اسی نام کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے جو سات نصیحتوں پر مشتمل ہے۔ سال تصنیف ۱۸۰۱ء یہ کالج کے زمانے میں طبع نہیں ہو سکی تھی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے ۱۹۶۴ء میں پاکستان سے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ اس ترجمے کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن میں اور دوسرا نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں محفوظ ہے۔

(۲) مادھونل اور کام کندلا ۔ یہ کتاب برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہے۔ یہ ترجمہ ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا۔ ۱۸۰۳ء میں گل کرسٹ نے اس کا ایک حصہ "بیاض ہندی" میں چھاپا تھا۔ یہ ۱۹۶۵ء میں کراچی سے پہلی بار مکمل شائع ہوئی ہے۔

(۳) بے تال پچیسی ۔ یہ قصہ راجا بکرماجیت کے زمانے میں سنسکرت میں لکھا گیا تھا۔ محمد شاہ کے دورِ حکومت میں اس کا برج بھاشا میں ترجمہ ہوا۔ ولا نے برج بھاشا کے اس ترجمے کی بنیاد پر اسے ۱۸۰۱ء میں اردو میں منتقل کیا۔ ۱۸۰۵ء میں اس کا پہلا ایڈیشن اردو اور ناگری خطوں میں شائع ہوا۔ چونکہ للو لال نے اس ترجمے میں ولا کی کافی مدد کی تھی اس لیے سرورق پر ولا کے ساتھ ان کا نام بھی درج ہے۔

(۴) جہاں گیر شاہی ۔ یہ "اقبال نامہ جہاں گیری" (فارسی) کا ترجمہ ہے۔ ولا نے [illegible] کی فرمائش پر ۱۸۰۹ء میں کیا تھا۔ یہ کتاب بھی شائع نہیں ہو سکی۔

(۵) ترجمۂ پند نامہ منظوم ۔ یہ شیخ سعدی کی شہرۂ آفاق تصنیف "پند نامہ" کا منظوم اردو ترجمہ ہے، جسے ۱۸۰۲ء میں "باغ اردو" جلد دوم کے ساتھ اور ۱۸۰۴ء میں "اتالیق ہندی" میں شائع کیا گیا۔

---

[1] بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۰۳

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

اور ۱۸۰۳ء ہی میں یہ علاحدہ بھی شائع ہوا۔

(۶) تاریخ شیر شاہی ۔ یہ فارسی تصنیف "تحفۂ اکبر شاہی" کے تیسرے طبقے کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۸۰۵ء میں تیار ہوا۔ اس میں شیر شاہ اور ہمایوں کے زمانے کے واقعات درج ہیں۔ یہ ہنوز شائع نہ ہو سکی۔

(۷) دیوان ولاؔ ۔ یہ ولاؔ کے اردو کلام کا مکمل مجموعہ ہے جس میں مختلف اصناف سخن میں ان کی طبع آزمائی کے نمونے شامل ہیں۔ سال تدوین ۱۸۱۰ء۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔ ولاؔ کی زندگی میں یہ شائع نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے لکھا ہے کہ "اسے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مرتب کر کے پاکستان سے شائع کر دیا ہے"۔[1]

۶۔ میر امن :-

میر امن کے سنین ولادت و وفات کا تعین اور ان کے مکمل حالات زندگی کی دریافت ابھی تک اہل علم کے لیے ایک تحقیق طلب مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ معلومات کے فقدان کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے میں اس طرح سے روشناس خلق نہیں تھے جس طرح کہ اپنی موت کے بعد مشہور ہوئے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تذکروں میں جو اس قسم کی معلومات کے اہم ترین ماخذ ہیں، صرف شاعروں کے حالات قلم بند کیے جاتے تھے اور میر امن شاعر نہیں تھے۔ اگر وہ شاعر تھے تو مشہور نہیں ہوئے کیونکہ انھوں نے کبھی باقاعدگی کے ساتھ طبع آزمائی نہیں کی۔ البتہ اگر اتفاقیہ طور پر کبھی کوئی خیال دل میں آ ہی جاتا تھا تو رسمی طور پر اسے نظم کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ گنج خوبی کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ

"اگرچہ فکر سخن کہنے کی ساری عمر نہیں کی، ہاں مگر خود بخود کوئی مضمون دل میں آیا تو اسے باندھ ڈالا۔ نہ کسو کا استاد، نہ کسو کا شاگرد۔

نہ شاعر ہوں میں اور نہ شاعر کا بھائی   فقط میں نے کی اپنی طبع آزمائی[2]

ڈی ٹاسی، کریم الدین، عنایت اللہ، نورلس، مولوی عبدالحق، مولوی یحییٰ تنہاؔ، رام بابو سکسینہ

---

[1] فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۴۵

[2] گنج خوبی مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ص ۵

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

سید محمد اور جاوید نہال کے علاوہ اور دوسرے کئی مصنفین و مورخین نے اپنی تحریروں میں میر امن کا تذکرہ کیا ہے، لیکن ان میں سے کوئی بھی ان کے خود نوشت حالات پر اضافہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ البتہ شجاعت علی سندیلوی نے اندازاً ان کا سال ولادت ۱۷۴۶ء قرار دیا ہے[1]۔ اس کے برخلاف ممتاز منگلوری کا قیاس ہے کہ وہ محمد شاہی عہد کے بالکل آخری دور میں یا اس کے بعد احمد شاہی دور میں ۱۷۴۷ء۔۱۷۵۲ء کے درمیان پیدا ہوئے[2]۔

ممتاز حسین نے ۱۹۵۱ء میں کراچی سے "باغ و بہار" کا ایک ایڈیشن شائع کیا ہے۔ اس میں مفتی انتظام اللہ شہابی کے حوالے سے لکھا ہے کہ نصراللہ خاں خورجوی نے میر امن کا سال وفات ۱۸۰۸ء یا ۱۸۰۹ء قرار دیا ہے[3] یہ بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ ان کا یہ خیال محض اندازہ و قیاس پر مبنی ہے۔

میر امن کی اپنی تحریروں سے ان کے متعلق جو معلومات حاصل ہوتی ہے اس کے مطابق ان کا اصل نام میر امن تھا[5] اور وہ لطف[6] تخلص کرتے تھے۔ وہ دلی میں پیدا ہوئے۔ وہیں پلے بڑھے اور تعلیم حاصل کی۔ ان کے مورث اعلیٰ ہمایوں کے عہد میں دلی آئے اور دربار شاہی سے وابستہ ہو گئے۔ جب دلی غارت ہوئی تو ان کے خاندان پر بھی تباہی کے بادل منڈلانے لگے چار و ناچار میر امن کو دلی چھوڑنا پڑی۔ ۱۷۶۱ء کے آس پاس وہ مع اہل و عیال کے عظیم آباد آئے اور کچھ دنوں تک وہاں قیام کیا۔ لیکن جب وہاں بھی نباہ کی صورت نہ دیکھی تو ۱۷۹۰ء کے اوائل میں بیوی بچوں کو وہیں چھوڑ کر کلکتہ چلے آئے[7] کچھ دنوں کی بیکاری کے بعد نواب دلاور جنگ نے انہیں اپنے چھوٹے بھائی

---

۱ نیا دور لکھنؤ اپریل ۱۹۶۰ء ص ۶۔ ۲ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، آٹھویں جلد ص ۱۰۔

۳ ملاحظہ ہو مقدمہ گنج خوبی ص ۔ ۴ ملاحظہ ہو فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۲۲

۵ میر امن کے بعض سوانح نگاروں نے ان کا نام میر امان اور تخلص امن لکھا ہے۔

۶ باغ و بہار کے خاتمے پر میر امن نے جو اشعار لکھے ہیں ان میں آخری شعر میں اپنا تخلص لطف ہی نظم کیا ہے:

تو کونین میں لطف پر لطف رکھ ۔۔۔ نبی اور آل نبی کے طفیل[illegible]

(باغ و بہار مرتبہ رشید حسن خاں ص ۲۲۶)

۷ ممتاز منگلوری، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، آٹھویں جلد ص ۱۰۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

میر محمد کاظم خاں کا اتالیق مقرر کیا، لیکن وہاں بھی ان کا دل نہ لگا۔ اس کے دو سال کے بعد میر بہادر علی کی وساطت سے گل کرسٹ تک ان کی رسائی ہو گئی، جس کی جوہر شناس نگاہ نے انھیں کالج کی ملازمت کے لیے منتخب کر لیا۔

کالج کے ہندوستانی شعبے میں میر امن کا تقرر چالیس روپیہ ماہوار پر ماتحت منشی کی حیثیت سے ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو عمل میں آیا تھا۔[۱] اس کے بعد گل کرسٹ نے "چار درویش" کے ترجمے کا کام ان کے سپرد کیا۔ اس کے قبل تحسین "نو طرز مرصع" کے نام سے اس کا ترجمہ کر چکے تھے چنانچہ میر امن نے اپنے ترجمے کے وقت فارسی تصنیف "چہار درویش" کے علاوہ "نو طرز مرصع" کو بھی پیش نظر رکھا تھا۔ انھوں نے اپنے ترجمے میں حسب ضرورت حذف و اضافہ سے بھی کام لیا ہے۔ عتیق صدیقی نے بلوم ہارٹ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "چار درویش" ۱۸۰۱ء میں مکمل ہو چکی تھی اور چھاپے خانے کے سپرد بھی کی جا چکی تھی لیکن بعض وجوہ کی بنا پر دوسری کتابوں کے ساتھ اس کی اشاعت بھی رک گئی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میر امن نے اس کے مسودے پر نظر ثانی کر کے اس کو "باغ و بہار" بنایا اور اس مناسبت سے اس کا سنہ تالیف ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء قرار پایا۔[۲] ۱۸۰۲ء میں اس کے کچھ حصے کا ترجمہ گل کرسٹ نے "ہندی مینول" میں چار درویش کے نام سے شائع کیا تھا۔ پوری کتاب باغ و بہار کے نام سے ہندوستانی پریس کلکتہ سے ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی۔[۳] باغ و بہار کی تکمیل کے بعد میر امن نے اپنی اس کوشش پر مناسب صلہ و انعام کا مطالبہ کرتے ہوئے کالج کونسل کو لکھا تھا کہ

> "صاحبان والا نجیبوں کے قدر دانوں کو خدا سلامت رکھے! اس بے وطن نے حکم اشتہار کا سن کر چار درویش کے قصے کو ہزار جدو کد سے اردوئے معلیٰ کی زبان میں باغ و بہار بنایا۔ فضل الٰہی سے سب صاحبوں کے سیر کرنے کے باعث سرسبز ہوا۔ اب امیدوار ہوں کہ اس کا پھل مجھے بھی ملے، تو میرا گنجینۂ دل مانند گل کے کھلے۔"[۴]

---

[۱] دارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۲۲

[۲] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۵۴ [۳] خواجہ احمد فاروقی، مقدمہ گنج خوبی ص ۱۱۱/۱

[۴] بحوالہ باغ و بہار، مرتبہ رشید حسن خاں ص

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

گل کرسٹ نے ان کی یہ درخواست اپنی سفارش کے ساتھ ۶ جون ۱۸۰۲ء کو کالج کونسل کی خدمت میں پیش کی جس نے ۱۴ جون کے اجلاس میں ان کے لیے پانچ سو روپے بطور انعام منظور کیے۔[1] "باغ و بہار" کی تکمیل کے بعد میر امن نے مشہور فارسی تصنیف "اخلاق محسنی" کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ اس ترجمے کا نام انھوں نے "گنج خوبی" رکھا۔ یہ کام ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء سے قبل مکمل ہو چکا تھا کیونکہ ۱۹ اگست کو گل کرسٹ نے کالج کونسل کے سامنے ہندوستانی مصنفین کی تصانیف کی جو فہرست پیش کی تھی اور ان میں جن کتابوں کو انعام کا مستحق قرار دیا گیا تھا ان میں میر امن کی "گنج خوبی" کا نام چار سو روپیے کی سفارش کے ساتھ موجود ہے[2] یہ زمانہ گل کرسٹ اور کالج کونسل کے درمیان تصادم کا زمانہ تھا، چنانچہ اس پر کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔ لیکن ۳۱ اگست ۱۸۰۴ء کی کارروائی کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ کونسل نے اس کتاب پر ڈھائی سو روپیے انعام دینا منظور کیا تھا۔[3]

میر امن ۴ جون ۱۸۰۶ء کو اس بنا پر ملازمت سے برطرف کر دیے گئے کہ انھوں نے ایک طالب علم کو پڑھانے سے انکار کر دیا تھا۔ برطرفی کے وقت ان کو چار مہینے کی پیشگی تنخواہ بھی دی گئی تھی۔ اس سلسلے کی وضاحت ڈاکٹر شجاعت علی کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے۔

> "۴ جون ۱۸۰۶ء کو فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے کے پروفیسر کی شکایت پہ کہ میر امن نے ایک طالب علم کو پڑھانے سے انکار کیا ہے۔ میر امن کالج کونسل کے سامنے پیش کیے گئے۔ الزام کو تسلیم کرتے ہوئے پیرانہ سالی اور جسمانی معذوری کا انھوں نے عذر پیش کیا تھا۔ بیان سننے کے بعد کالج کونسل اس نتیجے پر پہنچی کہ میر امن کالج کی خدمات سے سبکدوش ہونے کے خواہش مند معلوم ہوتے ہیں۔ طے پایا کہ اس مہینے کی تنخواہ کے علاوہ اور چار مہینے کی تنخواہ دے کر کالج کی خدمات سے ان کو سبکدوش کر دیا جائے۔"[4]

---

[1] دارشتے، فورٹ ولیم کالج ص ۵۳ – ۵۲

[2] ایضاً ص ۱۰۸

[3] خواجہ احمد فاروقی، مقدمہ گنج خوبی ص ۲۱[4] بحوالہ نیا دور، اپریل ۱۹۸۰ء ص ۶

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

اس طرح میر امن کالج سے پانچ سال ایک مہینہ وابستہ رہے۔ اس کے بعد وہ کلکتہ ہی میں رہے یا کہیں اور چلے گئے اس سلسلے میں تمام ذرائع معلومات خاموش ہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ اس وقت ان کے متعلقین کلکتہ میں تھے یا پٹنہ میں؟ گمان غالب یہ ہے کہ ملازمت ملنے کے بعد انھوں نے اپنے اہل و عیال کو بھی پٹنہ سے کلکتہ بلا لیا ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ پیرانہ سالی کے باعث انھوں نے زندگی کے باقی ایام وہیں گزار دیے ہوں۔ ان کے کثیر الاولاد ہونے کا ذکر ملتا ہے لیکن ان کے کسی لڑکے کا کوئی کارنامہ تو درکنار نام بھی سننے میں نہیں آیا۔

تاریخ ادب اردو میں میر امن کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انھیں اگر اردو کی نئی نثر کا موجد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اردو شاعری پر جو احسان میر اور غالب نے کیا ہے، اتنا ہی بڑا احسان میر امن کا اردو نثر پر ہے۔

میر امن دلی کے رہنے والے تھے۔ وہ اپنے وطن ہی میں پیدا ہوئے، تعلیم و تربیت بھی وہیں پائی اور عمر کا بڑا حصہ بھی وہیں گزارا۔ اس لیے زبان کی سلاست و سادگی اور صفائی و شستگی جو دہلوی ادیبوں اور شاعروں کا طرۂ امتیاز ہے، میر امن کے یہاں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انھوں نے صرف دلی کی شان و شوکت ہی نہیں دیکھی تھی، اس کی تباہی و بربادی کے مناظر بھی ان کی نگاہوں سے گزرے تھے۔ دلی کو خیرباد کہنے کے بعد انھیں عظیم آباد اور کلکتہ کی خاک چھاننا پڑی۔ ظاہر ہے کہ اس سفر میں انھیں ہر کس و ناکس سے گفت و شنید کا موقع ملا ہوگا۔ اپنے اسی وسیع تجربے اور مشاہدے کی بنا پر ہندوستان کی عوامی زبان کے نشیب و فراز سے واقف ہوئے اور انھیں ایک ایسے اسلوب کے اختراع میں کامیابی ہوئی جو سادگی و پرکاری کے امتزاج کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ ہر واقعے کو نہایت نپے تلے انداز اور عام فہم زبان میں بیان کرتے ہیں، جس سے عبارت میں روانی، ترنم اور توازن پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی روانی و ترنم کو برقرار رکھنے کے لئے انھوں نے کبھی کبھی قواعد کے مسلم اصولوں کو بھی نظرانداز کر دیا ہے۔ چنانچہ تقریباً دو صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی "باغ و بہار" کی زبان اس باغ و بہار کی کیفیت کی حامل ہے کہ اس کے پڑھنے والے سر دھننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی کے بقول "میر امن نے بلاشبہہ وہ نئی نثر ایجاد کی جن کے جملے آج بھی مصری کی ڈلیاں اور شربت کے گھونٹ (معلوم ہوتے) ہیں"۔ [1]

[1] ذوق و جستجو ص ۴۸

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

تصانیف :-

(۱) باغ وبہار۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے اس خیال سے ہمیں اتفاق نہیں کہ "میر امن اپنی تصانیف نثر "باغ و بہار" اور "گنج خوبی" کی وجہ سے مشہور ہیں۔" [۱] ہمارے خیال میں اگر میر امن "گنج خوبی" نہ بھی تصنیف کرتے تب بھی ان کی مقبولیت میں کوئی فرق واقع نہ ہوتا۔ ڈاکٹر گیان چند جین کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ "باغ وبہار" مسلم طور پر اردو نثر کی بہترین داستان ہے۔ متوسط حجم کے اس قصے میں دلچسپی کی کمی نہیں (اور) میر امن کا سہل ممتنع اسلوب اس کے حیات ابدی کا ضامن ہے۔" [۲] ۱۸۰۳ء سے اب تک باغ وبہار کے تقریباً سینکڑوں ایڈیشن اردو، ناگری اور رومن رسم خط میں شائع ہو چکے ہیں ۔ہندوستان تو خیر اردو کا مولد و منشا ہے انگلینڈ اور پیرس میں یہ کئی بار زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے۔

"باغ وبہار" تنقید کے مختلف مرحلوں سے گزر چکی ہے۔ سب سے پہلے مرزا رجب علی بیگ سرورؔ نے فسانۂ عجائب میں اس کی زبان کا مذاق اڑایا [۳] بعد کے زمانے میں خلیل اللہ یوسف علی نے بھی اس کے بارے میں کسی اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنے دلکش اسلوب، سحر آفریں انداز بیان اور زبان کے چٹخارے کی بدولت یہ ہر دور میں عوام و خواص دونوں سے داد تحسین حاصل کرتی رہی ہے۔

"باغ وبہار" ملک یمن کے بادشاہ جواں بخت اور چار درویشوں کی فرضی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس کے باوصف جیتی جاگتی اور رواں دواں کہانیوں کا ایک مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔ گویا یہ سچ مچ کسی بادشاہ اور چار درویشوں کی سچی سرگزشت ہے۔ میر امن بقول خود دلی کے روڑے تھے اور وہ بھی انیسویں صدی کی دلی کے اور دہلوی ہونے پر انہیں بجا طور پر فخر بھی تھا۔ چنانچہ انہوں نے "باغ وبہار" میں اپنے زمانے کی دلی کی تہذیب و تمدن کا نقش اس انداز سے پیش کیا ہے کہ داستان ہونے کے باوجود اس کے تمام کردار، محلات کا ٹھاٹ باٹ، مکان، خلوت •

---

[۱] مقدمہ گنج خوبی ص 1

[۲] اردو کی نثری داستانیں ص ۱۸۰

[۳] ملاحظہ ہو فسانۂ عجائب مرتبہ سید محمد رضوی ص ۲۲

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

اور جاہ و حشم اور پھر میزبانی اور ضیافت کے سلیقے وغیرہ بالکل دہلوی معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ تمام افراد جن سے اس داستان میں ہمارا سابقہ پڑتا ہے اپنی وضع قطع اور ناموں کے اعتبار سے سراسر افسانوی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، لیکن داستان میں لباس اور ناموں کی اجنبیت چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ تو میر امن کا اعجاز ہے کہ انھوں نے دلی کے افراد کو دوسرے ناموں سے موسوم اور دوسرے لباسوں میں ملبوس کر کے ان سے نہایت ہی کامیاب رول ادا کرایا ہے۔ پرفیسر گیان چند جین رقم طراز ہیں۔

"چار درویش عہدِ مغلیہ میں لکھا گیا۔ اردو ترجمہ دلی کے روڑے میر امن نے کیا۔ انھوں نے بھی دلی کا دربار دیکھا تھا، اس لیے یہ (دلی کے) عمائد کی تہذیب کے ہر شعبے سے واقف تھے چنانچہ اس کی بھرپور مرقع کشی کی گئی ہے۔ قصوں کا وقوع ایران میں ہو یا قسطنطنیہ میں معاشرت مغلیہ دلی کی ہے۔"[1]

باغ و بہار کی ایک اور خصوصیت جو اسے دوسری معاصر تصانیف سے ممتاز کرتی ہے محاورے کا برمحل استعمال ہے۔ اس کا دعوا خود میر امن نے بھی کیا ہے۔ نثر جب بلوغ کے درجے کو پہنچ جاتی ہے تو اس میں محاورے کے استعمال کی قدرت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے، لیکن محاورے کا باسلیقہ استعمال محاورات کی بھرمار کا نام نہیں۔ حقیقتاً یہ لفظی کفایت شعاری کا ایک فنکارانہ عمل ہے جو بات میں وزن اور عبارت میں جان پیدا کر دیتا ہے۔ اجتماعی یا انفرادی زندگی کا کوئی واقعہ اگر کم لفظوں میں پیش کرنا ہو تو اس کے لیے محاورے سے بہتر کوئی ذریعۂ اظہار نہیں ہو سکتا۔ "باغ و بہار" اس کی ایک زندہ مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔

میر امن نے مسجع و مقفی جملوں سے دامن بچانے کی کوشش کی ہے، لیکن ان کا یہ احتراز قطعی اور حتمی نہیں، چنانچہ باغ و بہار میں کہیں کہیں مسجع کاری کے نمونے بھی موجود ہیں۔ اس مسجع کاری سے ان کے اس دعوے کی تردید ہوتی ہے کہ "میں نے بھی ایسے محاورے میں لکھنا شروع کیا، جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔"[2] ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی یہ کہہ کر ان کے اس دعوے کی تائید کی ہے کہ اس (باغ و بہار) میں باتیں کرنے (یا کہنے) کا انداز بالکل فطری اور قدرتی

---

[1] اردو کی نثری داستانیں ص ۸۶-۸۷ [2] باغ و بہار، مرتبہ رشید حسن خاں ص ۱۲

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ہے"[1] لیکن گفتگو میں ہم قافیہ الفاظ کا استعمال عموماً بالکل غیر فطری اور غیر قدرتی معلوم ہوتا ہے۔ یہ تحریری تکلف و تصنع تو ہو سکتا ہے بول چال کی زبان نہیں۔

اس کے باوجود باغ و بہار کی زبان نہ صرف اپنے زمانے کے عوام کی زبان تھی بلکہ آج کی زبان سے بھی بہت زیادہ قریب ہے۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ "باغ و بہار" کے مقبول انام ہونے میں زبان و بیان کی ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس قصے کو بھی بڑا دخل ہے کیونکہ باغ و بہار اگر صرف میر امن کی سحر بیانی کی وجہ سے مشہور ہوئی ہوتی تو "گنج خوبی" کو بھی اتنی ہی مقبولیت حاصل ہونا چاہیے تھی بلکہ اس اعتبار سے کہ "باغ و بہار" میر امن کے رشحات قلم کا ابتدائی نمونہ ہے اور گنج خوبی ایک کامیاب تجربے کے بعد وجود میں آئی ہے، اسے اور زیادہ مقبول و مشہور ہونا چاہیے تھا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ باغ و بہار کو عوام و خواص نے جس قدر پسند کیا اس کی عشر عشیر مقبولیت بھی گنج خوبی حاصل نہیں کر سکی۔

(۲) گنج خوبی ۔ یہ میر امن کا دوسرا اور آخری بڑا کارنامہ ہے، جو ملا حسین واعظ کاشفی کی مشہور فارسی تصنیف "اخلاق محسنی" کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ۱۸۰۵ء میں پہلی بار ناگری لپی میں کلکتے سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد اس کی حکایتیں ۱۸۵۲ء تک اخبار "تعلیم الخلائق" اور رسالہ "قران السعدین" میں شائع ہوتی رہیں۔ ۱۸۷۵ء میں مطبع محبوب بمبئی نے اس کا دوسرا ایڈیشن اردو رسم الخط میں شائع کیا تھا۔ اردو رسم خط میں دوسرا اور باعتبار سلسلہ تیسرا مکمل ایڈیشن ۱۹۶۶ء میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے بسیط مقدمے کے ساتھ دلی یونیورسٹی کی جانب سے شائع ہوا ہے۔

گنج خوبی چالیس ابواب پر منقسم ہے جو عبادت، اخلاق، شکر، صبر و توکل، عدالت، عفو، حلم، خیرات، امانت و دیانت، صدق و راستی اور اس قسم کے دوسرے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ [illegible] کے لحاظ سے یہ کتاب بھی باغ و بہار سے کم نہیں کیونکہ باغ و بہار کی طرح اس کتاب [illegible] نے بقول خود "فقط فارسی کے ہو بہو معنی کہنے میں کچھ لطف اور مزہ نہ دیکھا، اس لیے اصل مطلب لے کر اپنے محاورے میں سارا احوال بیان کیا ہے"[2] اس کے باوجود داستان کی خوبیہ خبری اور

---

[1] میر امن سے عبدالحق تک ص ۳۰

[2] گنج خوبی مرتبہ خواجہ احمد فاروقی ص ۴

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کیف وسرور نے "باغ وبہار" میں دل کشی اور اثر آفرینی کی جو کیفیت پیدا کر دی ہے "گنج خوبی" اس سے یکسر محروم ہے۔ باغ وبہار کے برخلاف اس میں اشعار کی بھی بھرمار ہے جو بعض جگہ بالکل بے محل معلوم ہوتے ہیں۔

۷۔ حیدر بخش حیدری

حیدری ایک اچھے شاعر اور نثر نگار تھے، لیکن شاعری کو انھوں نے اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ صرف تفننِ طبع کے لیے وہ کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنا دیوان بھی مرتب نہیں کیا، لیکن اپنی تصنیف "گلدستۂ حیدری" میں جو ان کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے، اپنے مراثی، غزلیات اور قصائد شامل کیے ہیں۔ علاوہ بریں ان کے اشعار ان کی دیگر کتابوں میں جہاں تہاں بکھرے ہوئے ہیں۔ نثر میں ان کی دو داستانیں "توتا کہانی" اور "آرائشِ محفل" عرف "قصۂ حاتم طائی"، باغ وبہار کی طرح خوب مقبول ہوئیں۔

فورٹ ولیم کالج کے بعض مصنفین کی طرح حیدری کی زندگی کے بیشتر حالات بھی ابھی پردۂ خفا میں ہیں۔ مختلف ذرائع سے جو کچھ معلوم ہو سکا ہے اس کے مطابق ان کے مورثِ اعلیٰ نجف اشرف سے نقل مکانی کر کے دلی میں آبسے تھے۔ حیدری ۸۳-۱۱۸۲ھ (۶۹-۱۷۶۸ء) کے لگ بھگ دلی ہی میں پیدا ہوئے [۱]۔ اس وقت سلطنتِ مغلیہ کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا اور دلی بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ ان حالات میں اربابِ کمال کے لیے نئی پناہ گاہوں کی تلاش کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا تھا۔ جس کے جہاں سینگ سماتے وہ ادھر ہی چلا جاتا۔ چنانچہ حیدری کے والد سید ابوالحسن بھی مع اہل وعیال کے بنارس چلے آئے۔ اس وقت حیدری بقول خود "نہایت خورد سال" تھے [۲]۔

سید ابوالحسن لالہ سکھ دلو رائے کے ساتھ بنارس آئے تھے اور کئی سال تک ان ہی کے ساتھ بسر بھی کیے [۳] لیکن جب ۱۷۸۱ء میں "تذکرۂ گلزار ابراہیم" کے مولف نواب علی ابراہیم

---

[۱] وحید قریشی، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ ص ۱۸۱
بحوالہ سہ ماہی اردو، کراچی جولائی ۱۹۶۶ء ص ۶۷

[۲] ایضاً ص ۶۷

[۳] مختار الدین، تمہید گلشن ہند ص ۱۳

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

خاں خلیلؔ بنارس کے ناظم عدالت مقرر ہوئے تو انھوں نے سید ابوالحسن کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیا، اسی تعلق کی بنا پر حیدری بھی نواب صاحب کے یہاں آنے جانے لگے۔ کچھ دنوں بعد ابوالحسن نے تعلیم و تربیت کی غرض سے حیدری کو نواب صاحب کے سپرد کر دیا۔ نواب صاحب نے غلام حسین شہیدؔ کو جو ان کے یہاں بچوں کی تعلیم کے لیے مامور تھے، حیدری کا بھی اتالیق مقرر کر دیا۔ اس کے علاوہ قاضی عبدالرشید جون پوری بھی حیدری کو درس دیا کرتے تھے۔ اس سلسلۂ تعلیم کے دوران انھوں نے سید جمیعت علی رضوی سے بھی کسب فیض کیا تھا حیدری نے اپنے ان اساتذہ میں مولوی غلام حسین شہید کی بڑی تعریف کی ہے لکھا ہے "۔۔۔ احقر نے یہ گویائی جناب فیض مآب مولوی (غلام حسین) صاحب موصوف کے فیض سے پائی ہے"[1] لیکن سب سے زیادہ جس نے حیدری کے ذہن کو صیقل کیا وہ نواب ابراہیم خاں خلیلؔ کی ذات تھی حیدری نے اپنے کو "تعلیم یافتہ مجلس نواب ابراہیم علی خاں مرحوم"[2] کہا ہے۔

مولوی سید محمد[3] اور ڈاکٹر جاوید نہال[4] کے خیال کے مطابق نواب صاحب نے حیدری کو کسی معقول خدمت پر مامور کر دیا تھا، لیکن ان لوگوں کے بیانات مشتبہ معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اگر حیدری کسی سرکاری عہدے پر مامور ہو گیے ہوتے تو وہ تلاش معاش میں، وطن چھوڑ کر کلکتہ کا سفر گوارا نہیں کرتے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ فورٹ ولیم کالج کی داغ بیل پڑ چکی تھی اور ہندوستان کے گوشے گوشے سے شعرا و ادبا کا انتخاب کر کے انھیں کالج میں ملازم رکھا جاتا تھا حیدری بھی ایک مختصر داستان "مہر و ماہ" لکھ کر ۲۱ رجب ۱۲۱۴ھ کو دریا کی راہ سے بنارس سے کلکتہ کے لئے روانہ ہوئے[5] جب

---

[1] گلشن ہند ص ۰۰

[2] ایضاً ص ۲۱ [3] ارباب نثر اردو ص ۴۲-۴۳ - [4] بنگال کا اردو ادب ص ۱۱۰

[5] حیدری، گلشن ہند ص ۲۰ اور دیباچہ "مہر و ماہ" بحوالہ رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۶ء ص ۶۰۱ حیدری نے بنارس سے کلکتہ کے سفر میں، روانگی کی تاریخ ۲۱ رجب ۱۲۱۴ھ ۱۹ دسمبر ۱۷۹۹ء) لکھی ہے لیکن یہ مرجا سہو قلم معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس وقت تک نہ تو فورٹ ولیم کالج ہی وجود میں آیا تھا اور نہ کوئی امکان تھا کہ ارسٹ یا کسی دوسرے یورپین قدر دانوں کی خدمت میں پیش کر کے حصول مقصد کا کوئی روشن امکان موجود تھا۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

غازی پور پہنچے تو مرزا محمد علی مرشدآباد تک کے لیے ان کے ساتھ ہو لیے۔ دوران سفر انھوں نے حیدری کو کچھ نسخے دیے اور کہا کر شعرائے اردو کا ایک تذکرہ ترتیب دیں۔ چنانچہ حیدری نے ان ہی کی تشویق پر تذکرہ گلشن ہند تالیف کیا۔ کلکتہ پہنچ کر حیدری نے "مہر وماہ" گل کرسٹ کی نذر کی، جسے اس نے بہت پسند کیا، اور ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو وہ ہندوستانی شعبے میں ملازم رکھ لیے گئے۔ دوران ملازمت حیدری نے دس کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے ہفت پیکر، گلزار دانش اور تاریخ نادری کے ترجمے پر انھیں بالترتیب دو سو روپے اور تین تین سو روپے کے انعامات بھی ملے تھے[1]۔ وہ کالج سے کب تک وابستہ رہے اس کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا، لیکن ۱۸۱۲ء تک کلکتہ میں ان کی موجودگی اور کالج سے وابستگی کے شواہد موجود ہیں۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد آب وہوا کی ناموافقت کی وجہ سے وہ بنارس چلے آئے۔ اشپرنگر نے اودھ کیٹلاگ میں مولوی غلام حیدر کی روایت سے حیدری کا سال وفات ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۳ء درج کیا ہے لیکن ڈی تسی نے اپنی تصنیف "تاریخ ادبیات ہندوی" سال وفات ۱۸۲۸ء/ ۱۲۴۴ھ نقل کیا ہے اور حوالہ اشپرنگر ہی کا دیا ہے[2]۔ حیدری کی وفات بنارس ہی میں ہوئی۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) آرائش محفل عرف قصۂ حاتم طائی۔ یہ فارسی داستان "حاتم نامہ" مصنفہ عبداللہ کا نہایت آسان اور عام فہم اردو ترجمہ ہے جسے حیدری نے ۱۸۰۱ء میں مکمل کیا اور ۱۸۰۴ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ یہ عوام میں بے حد مقبول ہوئی۔ چنانچہ اشاعت اول کے بعد سے اب تک اس کے ہند اور بیرون ہند میں تقریباً سیکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں

(۲) توتا کہانی۔ "شک سپ تتی" نامی سنسکرت کتاب کا فارسی ترجمہ مولانا ضیاء الدین نخشبی نے "طوطی نامہ" کے نام سے ۷۳۰ھ/ ۱۳۲۹ء میں کیا تھا۔ بعد میں مولوی محمد قادری نے دکنی زبان میں اس کا خلاصہ تحریر کیا۔ حیدری کی "توتا کہانی" اسی خلاصے کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۸۰۱ء میں مکمل

---

[1] وار شنے، فورٹ ولیم کالج ص ص ص ۷۵، ۱۰۰، ۱۰۴

[2] مختار الدین، تمہید گلشن ہند ص ۱۵

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ہوا۔ یہ پہلی بار ناگری لپی میں ۱۸۰۲ء میں اور دوسری مرتبہ اور رسم خط میں ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد دونوں ہی خطوں میں یہ کئی بار شائع ہو چکی ہے۔

(۳) گلدستۂ حیدری۔ حیدری کی یہ ضخیم کتاب ان کی مختصر کہانیوں اور غزلوں کا مجموعہ ہے، جس میں "گلشن ہند" اور "لیلیٰ مجنوں" کا دیباچہ بھی شامل ہے۔ یہ ۱۸۰۱ء میں مرتب ہوئی۔ سال اشاعت ۱۸۰۳ء[1]۔

(۴) گلشن ہند۔ یہ شعرائے اردو کا ایک بیاض نما تذکرہ ہے جسے حیدری نے بقول خود بنارس سے کلکتہ کے سفر کے دوران یعنی ۱۲۱۴ھ میں مرتب کیا تھا۔ لیکن درحقیقت یہ علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرے "گلزار ابراہیم" کی ایک ناقص تلخیص ہے۔

چونکہ لطف نے "گلشن ہند" کے نام سے اسی تذکرے کے بعض حصوں کا اردو ترجمہ کیا ہے جو اپنے اضافوں کی وجہ سے اصل سے بھی زیادہ جامع اور مکمل ہے، اس لیے قوی امکان ہے کہ حیدری نے لطف کے تذکرے کو دیکھنے کے بعد اسے علاحدہ سے قابل اشاعت نہیں سمجھا اور اسے "گلدستۂ حیدری" میں شامل کر دیا[2]۔

(۵) گلزار دانش۔ یہ شیخ عنایت اللہ کی مشہور فارسی تصنیف "بہار دانش" کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ نیم تاریخی داستان ہے، جس میں جہاں دار شاہ اور مہرور کی داستان اثر آفریں انداز میں بیان کی گئی ہے۔ یہ ۱۸۰۴ء میں مکمل ہوئی۔ یہ کالج کے زمانے میں شائع نہ ہو سکی۔ البتہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے شائع کر دیا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے۔

(۶) ہفت پیکر۔ یہ نظامی گنجوی کی اسی نام کی فارسی مثنوی کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ اس

---

[1] عبادت بریلوی نے گلدستۂ حیدری میں شامل کہانیوں کے انتخاب کو "مختصر کہانیاں" [illegible] سے، اور "گلشن ہند" کو "تذکرۂ حیدری" کے نام اور غزلوں کو دیوان [illegible] کے نام سے علاحدہ علاحدہ شائع کر دیا ہے

[2] ڈاکٹر اقتدا حسن کا بیان ہے کہ "گلدستۂ حیدری" کے دو قلمی نسخوں، پہلا بوڈلین لائبریری آکسفورڈ (نمبر [illegible]) اور دوسرا برٹش میوزیم لندن (نمبر [illegible]) میں "گلشن ہند" بھی اس کی زینت ہے۔ اس کا کوئی علاحدہ مخطوطہ نہیں ہے۔ (رسالہ اردو جولائی ۱۹۶۶ء ص ۱۷)

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

ترجمے سے پتا چلتا ہے کہ حیدری ایک کامیاب اور خوش فکر شاعر تھے۔ اس میں سات داستانیں ہیں جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں، اور ان میں محیر العقول اور مافوق الفطرت عناصر کی فراوانی ہے۔ یہ ۱۸۰۹ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ لیکن اب تک شرمندۂ اشاعت نہیں ہو سکی۔ اس کا بھی ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

(۷) تاریخ نادری ۔ یہ نادر شاہ کے وقائع نویس منشی محمد مہدی کی "تاریخ نادری" (فارسی) کا آسان اردو ترجمہ ہے۔ حیدری نے یہ ترجمہ ٹیلر اور ہنٹر کی ترغیب پر ۱۸۰۹ء میں کیا تھا۔ یہ بھی طبع نہیں ہو سکی۔ اس کا ایک خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔ عابدہ بیگم کے بیان کے مطابق اس کے ۱۱۴ سے ۲۰۹ تک کے صفحات غائب ہیں۔ کل صفحوں کی تعداد ۴۵۹ ہے[1]

(۸) گل مغفرت یا گلشن شہیداں ۔ ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف "روضۃ الشہداء" کا آسان اردو ترجمہ حیدری نے ۱۸۱۰ء میں "گلشن شہیداں" کے نام سے کیا تھا۔ بعد میں مولوی سید حسین علی جونپوری کی فرمائش پر اس کا خلاصہ "گل مغفرت" کے نام سے ۱۸۱۲ء میں تیار کیا۔ یہ اسی سال ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی۔ لیکن "گلشن شہیداں" کا اب کہیں پتا نہیں چلتا۔

(۹) قصۂ لیلیٰ المجنوں ۔ یہ امیر خسرو کی فارسی مثنوی کا اردو ترجمہ ہے، جو ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا۔ یہ ترجمہ شائع نہیں ہو سکا اور نہ تو اس کے کسی خطی نسخے کا کہیں سراغ ہی ملتا ہے۔

(۱۰) مہر و ماہ ۔ سال تصنیف ۱۸۰۰ء۔ یہ شائع نہیں ہو سکی۔ اسی تصنیف کی بدولت حیدری کو کالج میں ملازمت ملی تھی۔

(۱۱) جامع القوانین ۔ یہ ۱۸۰۲ء کی تصنیف ہے۔ یہ بھی شائع نہیں ہو سکی۔

۸ ۔ خلیل علی خاں اشک

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ کسی تصنیف کی شہرت و مقبولیت کے ساتھ ساتھ اس کے مصنف کا نام بھی روشن ہوتا ہے لیکن خلیل علی خاں اشک کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ ان کی تصنیف "داستان امیر حمزہ" جس قدر معروف و مقبول ہے وہ اتنے ہی گمنام ہیں۔ سید محمد کا یہ دعوا کہ "شاید یہ پہلی مرتبہ ہے کہ ان (خلیل علی خاں) کا نام ان کے اپنے کارناموں کے

[1] فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۵۲۴

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ساتھ اردو داں پبلک سے متعارف کرایا جا رہا ہے[۱]، بڑی حد تک صحیح ہے۔ اگرچہ ان سے پہلے مولوی یحییٰ تنہا ان کا ذکر کر چکے تھے۔ لیکن اس کی حیثیت ایک سرسری تعارف سے زیادہ نہیں تھی۔ تنہا نے ان کا نام خلیل اللہ[۲] اور نادم سیتاپوری نے خلیل الدین[۳] لکھا ہے، جو خلاف واقعہ ہے۔ خلیل علی خاں کا تخلص اشک ان کے شاعر ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ ی کریم الدین کے علاوہ کسی تذکرہ نگار نے ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ نادم سیتاپوری نے اشک کو مولوی اکرام علی کا ہم وطن اور عزیز دار بتایا ہے[۴]، جس کی تردید ڈاکٹر جاوید نہال کر چکے ہیں[۵]۔ اشک بقول خود دلی میں پیدا ہوئے[۶] لیکن سن شعور کو پہنچے تو وہ فیض آباد چلے آئے، اس لیے فیض آبادی کہلائے۔ دوران قیام فیض آباد انھیں شہزادوں کی محفلوں میں شرکت اور مرزا جہاں دار شاہ کی مصاحبت کا موقع ملا۔

۱۷۹۴ء میں اشک مرشد آباد چلے گئے۔ وہاں انھیں ناظمان بنگالہ کی ملازمت مل گئی چونکہ یہ معمولی قسم کی ملازمت تھی اس لیے اس سے دست کش ہو کر ۱۸۰۱ء میں وہ کلکتہ پہنچ گیے۔ وہاں وہ گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے کہ مولوی سعید الدین نے انھیں بتایا کہ لکھنؤ سے کچھ شاعر فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہو کر آئے ہیں، جن میں کاظم علی خاں جواں بھی شامل ہیں۔ جواں اشک کے استاد تھے۔ چنانچہ انھوں نے پہلے اپنے استاد سے ملاقات کر کے شرف قدم بوسی حاصل کیا۔ اس ملاقات کے درمیان جواں نے ان سے کہا "تعجب ہے کہ تم اس شہر میں ہو اور گل کرسٹ صاحب سے ملاقات نہ کرو کہ جوہر شناس گوہر لفظ و معانی ہیں اور فن نکتہ دانی میں لاثانی"[۷] ـــــ اس کے بعد انھوں نے اشک کو اپنے ہم راہ لے جا کر ان کا تعارف گل کرسٹ سے کرایا۔

اس وقت کالج کے لیے ایک قصہ خواں کی ضرورت تھی اور کوشش بسیار کے باوجود

---

[۱] ارباب نثر اردو ص ۲۴۹ [۲] سیر المصنفین حصہ اول ص ۱۳۶

[۳] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۲۵۷

[۴] ایضاً " ص ۲۵۸ [۵] ملاحظہ ہو انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۱۷

[۶] انتخاب سلطانیہ، بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۳۰۱

[۷] ایضاً " ص ۳۰۱

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

لکھنؤ میں اس کام کے لیے کوئی مناسب شخص نہیں مل سکا تھا چنانچہ فروری ۱۸۰۲ء میں اس جگہ پر اشک کا تقرر ہو گیا۔ اس تقرر کے بعد گل کرسٹ نے ان سے "داستان امیر حمزہ" کا اردو میں ترجمہ کرنے کی فرمائش کی۔ انھوں نے ترجمہ شروع کر دیا تھا۔ لیکن ستمبر ۱۸۰۲ء میں منظہر علی خاں ولا کو کالج کی خدمت سے برطرف کر دیا گیا۔ قصہ خواں کے عہدے پر تقرری کے وقت گل کرسٹ نے اشک سے یہ کہا تھا کہ "تم خاطر جمع رکھو ہم تمہارے واسطے حتی المقدور سعی میں کوتاہی نہ کریں گے" لیکن ابھی تک ان کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی تھی۔ اس بے اعتنائی اور ولا کی برطرفی جیسے واقعات سے اشک ملول ہو کر کالج کی ملازمت سے دست بردار ہو گیے۔ چنانچہ "داستان امیر حمزہ" کے ترجمے کا کام بھی کھٹائی میں پڑ گیا، اور انھوں نے دوبارہ گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

جب مولوی سعید الدین کو اشک کی دست کشی کا علم ہوا تو وہ انھیں ساتھ لے کر وائسرائے کے سکریٹری مسٹر ہارنگٹن[1] سے ملے۔ انھوں نے اشک کو دلاسا دیا۔ اس کے بعد گل کرسٹ نے بھی ان کی طرف توجہ فرمائی اور انگریز افسروں کو پڑھانے کے لئے انھیں مقرر کیا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس ملازمت کی نوعیت کیا تھی۔ دستیاب شواہد سے صرف اس قدر پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں وہ رات کا کھانا کھانے کے بعد گل کرسٹ کے ساتھ رائی ٹرس بلڈنگ جایا کرتے تھے اور وہاں اردو میں تقریر کرتے تھے، جسے گل کرسٹ انگریزی میں سمجھاتے تھے۔ بظاہر یہ بھی قصہ خواں کا کام معلوم پڑتا ہے لیکن جب گل کرسٹ نے رات کو رائی ٹرس بلڈنگ جانا ترک کر دیا تو اشک کی یہ ملازمت بھی ختم ہو گئی۔ لیکن اس کے معاً بعد انھوں نے تیس روپے ماہوار پر انھیں کالج میں منشی رکھ لیا، جس کی توثیق ۱۹ر اگست ۱۸۰۳ء کی میٹنگ میں کر دی گئی۔ اشک بقول خود پہلے درجے کے منشی بنائے گئے تھے[2] لیکن ۲۰ستمبر ۱۸۰۵ء کو ہندوستانی شعبے کے عملے کی جو تفصیل کالج کونسل کو پیش کی گئی تھی۔ اس کے مطابق اشک کو محض چالیس روپے ماہوار ملتے تھے[3] یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ پہلے درجے کے نہیں بلکہ تیسرے درجے کے منشی تھے۔ اس وقت

---

[1] مولوی سعید الدین سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے کیونکہ وہ ان کے والد مفتی نجم الدین خاں کے شاگردوں میں تھے۔ (مشاہیر کاکوروی ص ۲۴۳)

[2] انتخاب سلطانیہ بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۳۰۲

[3] فورٹ ولیم کالج ص ۶۹

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

پہلے درجے کے منشیوں کا مشاہرہ اسی روپیے ماہوار تھا۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے منشیوں کو علی الترتیب ساٹھ اور چالیس روپیے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔

مئی ۱۸۰۶ء میں "ایسٹ انڈیا کالج" کے نام سے ہیل بری میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ اس کالج کے لیے ہندوستان سے بھی کچھ اساتذہ بھیجے گئے تھے۔ ان لوگوں کو تنخواہ کے علاوہ سفر بھتہ بھی دیا جاتا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے جن لوگوں کو انگلینڈ بھیجا گیا تھا ان میں مرزا ابوطالب، میر عبدالعلی اور خلیل علی خان اشکؔ کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مرزا عبدالعلی کو ۱۸۰۶ء میں چھ سو پونڈ سالانہ تنخواہ پر بھیجا گیا تھا۔ دوران قیام انگلینڈ وہ فورٹ ولیم کالج کے ملازم تصور کیے جاتے تھے۔ شواہد کی عدم دستیابی کی بنا پر اس امر کا پتا نہیں چل سکا کہ اشکؔ کو انگلینڈ کب بھیجا گیا اور وہ وہاں سے کب واپس آئے۔ لیکن یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ وہ ۱۸۱۲ء تک کالج سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد وہ کلکتہ ہی میں رہے یا اپنے وطن واپس چلے آئے۔ ان کا انتقال کب اور کہاں ہوا۔ یہ سب حالات نامعلوم ہیں۔ البتہ نادم سیتاپوری اشکؔ کا زمانۂ انتقال ۱۲۲۷ھ (۱۸۲۱ء) کے آس پاس قرار دیتے ہیں[۱]

ان کی تصانیف کی تفصیل حسب ذیل ہے

(۱) داستان امیر حمزہ:- یہ اردو زبان کی مقبول ترین اور سب سے طویل و عریض داستان ہے جو محیر العقول حادثات، خارق العادات واقعات اور طلسمات کی نو بہ نو حیرت آفرینیوں سے معمور ہے۔ اس کا ہیرو امیر حمزہ ایک بے باک، جانباز، اور مہم جو قسم کا فرد ہے، جو تمام مشکلات کو سر کرتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے اور خدا کی مدد و نصرت ہر آڑے وقت میں اس کے شامل حال رہتی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن کالج کی طرف سے ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا۔ عابدہ بیگم نے اس کا سال تصنیف ۱۸۰۱ء لکھا ہے[۲] یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ ۱۸۰۲ء کے اوائل میں تو انھیں اس کام پر مامور ہی کیا گیا تھا۔

(۲) منتخب الفوائد:- منتخب الفوائد اس کا تاریخی نام ہے اس کے مطابق یہ کتاب ۱۸۱۱ء میں مکمل

[۱] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۲۶۰

[۲] فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۳۰۲

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

ہوئی۔ یہ محمد منصور سعید ابوالفرح خلیل کی فارسی تصنیف "اوصاف الملوک وطرق خردہم" کا اردو ترجمہ ہے جس میں بادشاہوں کے اوصاف اور طرز حکومت سے متعلق سبق آموز کہانیاں درج ہیں۔ اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ اس کا ایک خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے۔

(۳) قصۂ رضوان شاہ:۔ اس کا دوسرا نام "نگارخانۂ چین" بھی ہے۔ اس میں شہزادۂ چین رضوان شاہ اور پری زاد روح افزا کے معاشقے کی کہانی دل نشین انداز میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں طلسم کی حیرت سامانیوں کی فراوانی ہے۔ اس کا ایک تیسرا نام "گلزار چین" بھی بتایا جاتا ہے۔ یہ ۱۸۰۴ء میں مکمل ہوئی لیکن کالج کے زمانے میں شائع نہ ہوسکی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے پاکستان سے شائع کردیا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں بھی محفوظ ہے۔

(۴) کتاب واقعات اکبر:۔ یہ ابوالفضل کی فارسی تصنیف "اکبرنامہ" کا اردو ترجمہ ہے، جس میں اکبر اعظم کے دور کی جامع تاریخی درج کی گئی ہے۔ کتاب کی ابتدا اکبر کی ولادت کے بیان سے اور اختتام بیرم خاں کے دلی سے کوچ کے ذکر پر ہوتا ہے۔ سال تصنیف ۱۸۰۹ء۔ یہ ابھی تک طبع نہیں ہوسکی۔

(۵) انتخاب سلطانیہ:۔ یہ اشکؔ کی طبع زاد تصنیف ہے جس میں انھوں نے دلی کے بادشاہوں کے احوال وکوائف درج کیے ہیں۔ انتخاب سلطانیہ اس کا تاریخی نام ہے۔ جس سے اس کا سال تصنیف ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۵ء) برآمد ہوتا ہے۔ اس کے دیباچے میں انھوں نے اپنے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ بھی زیور طباعت سے آراستہ نہ ہوسکی۔ البتہ عتیق صدیقی نے اس کے دیباچے کا وہ حصہ جو اشکؔ کے حالات پر مشتمل ہے، اپنی تصنیف "گل کرسٹ اور اس کا عہد" میں شائع کیا ہے۔

(۶) رسالہ کائنات جو:۔ یہ سائنس کے موضوع پر شاید اردو میں پہلی تصنیف ہے جسے اشکؔ نے ۱۸۰۲ء میں لکھا تھا۔ "جو" لفظ کے متعلق اشکؔ لکھتے ہیں "جو نام ہے بیچ کا زمین اور آسمان کے یعنی جو زمین سے آسمان تک وسعت ہے، اس کو "جو" کہتے ہیں۔"[۱] یہ ۱۸۰۲ء میں کالج کی جانب سے طبع ہوچکی ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن عبادت بریلوی نے بھی شائع کیا ہے۔

---

[۱] رسالہ کائنات جو، بحوالہ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۵۰۸

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

اشک کو "اکبر نامہ" کے ترجمے پر دو سو روپے اور "قصۂ رضوان شاہ" اور "انتخاب سلطانیہ" کی تصنیف پر ستر روپے ملے تھے۔

(۹) امانت اللہ شیدا:

امانت اللہ نہ صرف عربی و فارسی کے جید عالم تھے بلکہ اردو کے کامیاب شاعر بھی تھے۔ وہ شیدا تخلص کرتے تھے۔ ان کا خاندان بھی اجڑی ہوئی دلی سے ہجرت کر کے کلکتہ میں آباد ہو گیا تھا۔ شیدا کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے وجود میں آنے سے قبل ان کے علم و فضل کی شہرت کلکتہ میں عام ہو چکی تھی اور شاید اسی شہرت کی بنا پر کالج کی ملازمت کے لئے ان کا انتخاب ۱۸۰۲ء میں عمل میں آیا۔ وہ گل کرسٹ کے زمانے میں شعبۂ ہندوستانی سے وابستہ ہوئے اور ۱۸۱۲ء تک مترجم کے عہدے پر برقرار رہے۔ ۱۲۶۱ھ (۴۶-۱۸۴۵ء) میں کلکتہ ہی میں ان کا انتقال ہوا

امانت اللہ پر گل کرسٹ کی خاص نظر عنایت تھی۔ وہ ان کے تبحر علمی سے بخوبی واقف تھے، چنانچہ قرآن کے ترجمے کا کام سب سے پہلے ان ہی کے سپرد کیا تھا۔ حسب ذیل مفید اور پر از معلومات تصانیف ان ہی کی رہین منت ہیں۔

۱- **ہدایت الاسلام (دو جلدیں)**۔ یہ خود امانت اللہ کی اسی نام سے عربی میں لکھی ہوئی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں اسلام کے احکام و قوانین بڑے اچھے انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ ۱۸۰۴ء میں اس کی پہلی جلد ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ لیکن دوسری جلد ہنوز شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکی۔

۲- **جامع الاخلاق**۔ یہ عربی کے جید عالم اور انشا پرداز مولانا جلال الدین محقق دوانی کی معرکۃ الآرا کتاب "لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق" عرف اخلاق جلالی کا اردو ترجمہ اور تلخیص ہے۔ امانت اللہ نے اس کی تکمیل جولائی ۱۸۰۵ء میں کی تھی اور اس کام کے صلے میں انھیں دو سو روپے کا انعام بھی ملا تھا۔ یہ کالج کے زمانے میں طبع نہیں ہو سکی۔ لیکن اب تے غلام حید نے ۱۸۴۸ء میں کلکتے سے شائع کر دیا ہے۔

۳- **صرفِ اردو**۔ یہ ایک منظوم رسالہ ہے جس میں قواعد صرف و نحو نہایت دلکش انداز میں

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

بیان کیے گیے ہیں۔ قواعد جیسے خشک موضوع سے متعلق مسائل کو نظم کا جامہ پہنانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ لیکن شیدا نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ انھوں نے رسالہ ۱۸۰۶ء میں تصنیف کیا تھا لیکن بعض دشواریوں کے باعث اس کی اشاعت ۱۸۱۰ء میں عمل میں آئی۔

ان کتابوں کی تصنیف کے علاوہ شیدا نے "نقلیات لقمانی" کے لیے کہانیوں کے ترجمے اور ترتیب میں بھی معاونت کی تھی اور اس کام کے سلسلے میں وہ انعام کے مستحق قرار پائے تھے۔

(۱۰) للولال کوی:

ان کا پورا نام للوجی لال کوی تھا۔ کالج کے سکریٹری لاکٹ نے ۱۹ر دسمبر ۱۸۱۶ء کو اے پچ۔ وڈ کے پاس کالج کی جو تفصیل ارسال کی تھی اس میں للولال کی عمر ۵۵ سال درج ہے، اس حساب سے ان کا سن ولادت ۱۷۶۲ء کے قریب قرار پاتا ہے[۱] لیکن لکشمی ساگر وارشنے نے اسی تفصیل کی روشنی میں للولال کا سال پیدائش ۱۷۴۷ء متعین کیا ہے[۲] شاید یہ سہو قلم ہو۔ یہ ذات کے گجراتی برہمن تھے۔ جن کا خاندان گجرات سے ترک سکونت کرکے آگرے میں آباد ہو گیا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ للولال کب اور کس سلسلے سے کلکتے پہنچے۔ جاوید نہال نے لکھا ہے کہ للولال جی فورٹ ولیم کالج کے شعبہ بھاکا کے میر منشی تھے[۳] لیکن کالج میں بھاکا یا ہندی کا کوئی علاحدہ شعبہ نہیں تھا۔ اردو اور ہندی کا مشترک ایک ہی شعبہ تھا جسے ہندوستانی شعبہ کہا جاتا تھا۔ اس شعبے میں ناگری خوش نویسی اور بھاکا منشی کے مشترک عہدے پر ان کا تقرر ۲۵ر فروری ۱۸۰۲ء کو عمل میں آیا تھا[۴] اور اسی روز کی کارروائی میں کونسل نے یکم اگست ۱۸۰۱ء سے جنوری ۱۸۰۲ء تک کی ان کی بقایا تنخواہ بھی منظور کی تھی[۵]۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اگست ۱۸۰۱ء سے سندی منشی کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

کالج کونسل کے ۱۱ر جون ۱۸۰۴ء کے اجلاس کی کارروائی سے معلوم ہوتا ہے کہ کونسل نے

۱؎ رام چندر شکل کے مطابق للولال سمبت ۱۸۲۰ (۱۷۶۳ء) میں پیدا ہوئے تھے (ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۲۸۶)

۲؎ فورٹ ولیم کالج ص ۹۳-۹۲

۳؎ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۷، ۴؎ وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۵۰
لیکن عتیق صدیقی نے تقرر کی تاریخ ۲ر جون ۱۸۰۲ء لکھی ہے (گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۹۹) جو درست نہیں ہے۔

۵؎ وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۵۱-۵۰

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

للولال اور سدل مسر کی خدمات کو غیر ضروری قرار دے کر انھیں جولائی سے علاحدہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن ۷؍ اکتوبر ۱۸۰۴ء کی میٹنگ میں اس فیصلے پر نظر ثانی کر کے ان دونوں کو نہ صرف بحال رکھا گیا بلکہ جولائی سے اکتوبر تک کی تنخواہ بھی ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔[1] ڈاکٹر وارشنے کی تحقیق کے مطابق للولال مئی ۱۸۲۳ء تک کالج سے وابستہ رہے۔ محقق موصوف کا خیال ہے کہ انھوں نے مئی ۱۸۲۴ء میں وفات پائی۔[2] ہندی ادب کے تاریخ نویسوں نے للولال کے ایک سنسکرت پریس کا بھی ذکر کیا ہے، جسے انھوں نے کلکتہ میں قائم کیا تھا۔ بعد میں اس پریس کو انھوں نے آگرہ میں منتقل کر لیا تھا۔

جدید ہندی نثر کی ترقی میں للولال کی ہندی کتابیں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج سے پہلے ہندی نثر کی کوئی قابل قدر تصنیف موجود نہیں تھی۔ انھوں نے سب سے پہلے "پریم ساگر" اور دوسری کئی کتابیں تصنیف کر کے ہندی نثر کے اعلا اور وقیع نمونے پیش کیے، جو بعد کے ہندی مصنفین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔ ٹیلر نے ان کے کارناموں کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ خالص ہندی نثر لکھنے والوں میں للولال سے قابل کوئی دوسرا شخص نہیں۔

اردو میں ان کی صرف دو کتابیں ملتی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) لطائف ہندی ــ یہ چھوٹی چھوٹی ایک سو حکایتوں کا مجموعہ ہے جو نقل کے عنوان سے تحریر کی گئی ہیں۔ ۱۸۱۰ء میں یہ کتاب اردو اور ہندی دونوں خطوں میں ایک ساتھ شائع ہوئی تھی۔ اردو رسم الخط والی کتاب کی زبان ریختہ یعنی اردو اور ہندی لپی والی کی زبان برج بھاشا ہے۔ ان حکایتوں کے موضوعات مزاحیہ اور سبق آموز ہیں۔ اس ایڈیشن کے آخر میں مشکل الفاظ کی ایک فرہنگ بھی شامل ہے، جس میں الفاظ کے معنی انگریزی اور ہندی میں لکھے گئے ہیں۔

(۲) برج بھاشا کے قواعد ــ یہ کالج کے طلبہ کی ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی تھی، نیز نصاب میں شامل تھی۔ اس کی زبان اردو ہے۔ یہ ۱۸۱۱ء میں شائع کی گئی۔

---

[1] فورٹ ولیم کالج ص ۹۷

[2] ایضاً ص ۹۷، رام چندر شکل کے مطابق للولال کا انتقال سمبت ۱۸۸۲ (۱۸۲۵ء) میں ہوا تھا (ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۲۹۶)

پریم ساگر، لال چندریکا، راج نیتی، سبھا بلاس، مادھو بلاس اور چھتر پرکاش للوجی لال کی ہندی تصانیف ہیں، جو فورٹ ولیم کالج کی طرف سے شائع ہوئیں۔ علاوہ بریں بیتال پچیسی، شکنتلا، سنگھاسن بتیسی، مادھونل اور نقلیات لقمانی کے ترجمے میں انھوں نے معاونت کی تھی۔

۱۱۔ مولوی اکرام علی :

اکرام علی کے مورث اعلا کابل کے متوطن تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب بقول نادم سیتاپوری حضرت عمر فاروق سے ملتا ہے۔ ان میں شیخ کمال الدین سلیمان نے ۱۱۹۱ھ اور ۱۲۰۵ھ کے درمیان ترک وطن کر کے قصبہ نارنول کو اپنا مستقر بنالیا۔ انکے خاندان کے ایک فرد شیخ جمال الدین سلیمان گاؤں کے قاضی مقرر ہوئے، جو بابا فرید الدین کے والد ماجد تھے[۱] بعد میں اسی خاندان کے ایک فرد، جن کا نام شیخ محمد رئیس تھا، سیتاپور میں آکر آباد ہو گئے۔ اکرام علی کا سلسلۂ نسب اسی خاندان سے ملتا ہے۔ اکرام علی کے والد شیخ احسان علی سیتاپور ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے خاندان کے لوگ تصوف کی طرف مائل تھے۔

مولوی اکرام علی کی ولادت ۱۷۸۲ء یا ۱۷۸۳ء میں ہوئی تھی[۲] ان کی تعلیم کی ابتدا والد ہی کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ اکرام علی ابھی اپنی عمر کے نو برس بھی پورے نہیں کیے تھے کہ ان کے والد شوریدہ سری کے سبب مفقود الخبر ہو گیے۔ چنانچہ حصول علم کے لیے انھیں اپنے چچا شیخ مردان علی کے ہمراہ دلی جانا پڑا۔ وہاں کچھ روز قیام کے بعد وہ دوبارہ سیتاپور واپس چلے آئے۔ تعلیم کے سلسلے میں انھیں لکھنؤ کا بھی سفر کرنا پڑا تھا۔

علامہ تراب علی نامی جو اکرام علی کے بھائی تھے، اس وقت کلکتہ کے مدرسہ عالیہ میں مدرسی کی خدمت پر مامور تھے۔ چنانچہ اکرام علی نے تعلیم و تربیت کے باقی مراحل نامی ہی کے زیر سرپرستی طے کیے، اور جب طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوئی تو نامی ہی کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔

---

[۱] نفیس احمد صدیقی، نیا دور۔ جنوری فروری مارچ ۱۹۸۶ء ص ۷۷

[۲] عبیدہ بیگم، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۹۹ جبکہ نادم سیتاپوری کے مطابق ان کی ولادت ۱۱۹۷ھ (۱۷۸۳ء) یا ۱۱۹۸ھ (۱۷۸۵ء) میں ہوئی تھی۔ (فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۱۰)

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

تعلیم سے فراغت کے بعد نامیؔ ہی کی سفارش پر اکرام علی ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم ہوئے۔ ہنوز اس ملازمت کی نوعیت کا پتا نہیں چل سکا ہے۔ اس بارے میں مورخین کے بیانات قیاس و گمان پر مبنی ہیں، چنانچہ بعض اوقات وہ آپس میں متضاد و متصادم ہو جاتے ہیں۔ نادم سیتاپوری رقم طراز ہیں کہ "۱۸۰۰ء میں جب کالج قائم ہوا تو ان (اکرام علی) کی خدمات ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے کالج میں منتقل کر دی گئی تھی[1]۔ اس کے برخلاف سید محمد کا بیان یہ ہے کہ مولوی اکرام علی گل کرسٹ کے وطن جانے کے بعد فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے تھے[2]۔ جاوید نہال کتب خانے میں ان کی ملازمت کا زمانہ ۱۸۰۶ء قرار دیتے ہیں[3]، جبکہ رام بابو سکسینہ اور سید محمد کے خیال کے مطابق اکرام علی ۱۸۱۴ء میں لائبریرین مقرر ہوئے تھے[4]۔ بہرحال ان بیانات کی توثیق کسی مستند ماخذ سے نہیں ہوتی۔ خود اکرام علی کے بقول مسٹر لاکٹ نے انھیں اپنے پاس متعین کیا تھا۔ لیکن اس تقرر کا زمانہ بھی تحقیق طلب ہے۔ اس زمانے میں انگریزوں کے وہ اعلا افسر جنھیں مشرقی زبانوں سے دلچسپی ہوتی تو وہ ان زبانوں کی تعلیم کے لیے ذاتی طور پر منشی مقرر کرتے تھے، جن کی تنخواہ وہ اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ اس غرض سے ابراہم لاکٹ نے انھیں اپنا منشی مقرر کیا۔ غالباً اکرام علی کا یہ تقرر ۱۸۱۰ء کے اواخر میں عمل میں آیا ہوگا۔ کیونکہ جون ۱۸۱۰ء تک تراب علی نامیؔ ان کے منشی رہے تھے[5]۔ اس کے بعد وہ مدراس چلے گئے۔ مدراس جاتے وقت نامی نے اپنی سفارش سے اکرام علی کو لاکٹ کا منشی مقرر کروا دیا تھا۔

اکرام علی کے بارے میں نادم سیتاپوری کا ایک بیان یہ بھی ہے کہ انھوں نے ۱۸۱۰ء میں "اردو اخبار" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا تھا۔ اس کی تائید حامد حسن قادری نے بھی کی ہے[6]۔ لیکن میری معلومات کی حد تک اب تک اردو کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" ہی کو تسلیم

---

[1] فورٹ ولیم کالج اور اکرم علی ص ۱۲۵ [2] ارباب نثر اردو ص ۲۶۹

[3] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۴۶ ۳

[4] تاریخ ادب اردو حصۂ نثر ۱۴۰، اور ارباب نثر اردو ص ۲۷۳

[5] فورٹ ولیم کالج ص ۱۰۱

[6] داستان تاریخ اردو ص ۹۲ کا حاشیہ

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کیا جاتا ہے، جو ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے جاری ہوا تھا۔[1] کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اکرام علی نے ۱۸۱۰ء میں کلکتہ میں ایک مطبع بھی قائم کیا تھا، جس کے وہ خود مالک بھی تھے۔ لیکن اس خیال کی تردید ڈاکٹر عتیق صدیقی کر چکے ہیں۔[2]

مولوی اکرام علی کی کالج میں باقاعدہ تقرری اکتوبر ۱۸۱۶ء میں کتب خانے کے نگراں کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ اس عہدے سے وہ تقریباً ۱۸۱۹ء یا ۱۸۲۰ء تک وابستہ رہے۔[3]

کالج کی ملازمت کے بعد نامی ہی کی سفارش پر مولوی اکرام علی کلکتہ کے صدر الصدور بنائے گئے۔ لیکن جلد ہی دنیاوی جاہ و حشم سے بیزاری اور روحانیت کی طرف میلان طبیعت کی بنا پر وہ اس ملازمت کو چھوڑ کر اپنے وطن سیتاپور چلے گئے۔ سیتاپور میں انھوں نے ۱۸۲۷ء میں ایک جامع مسجد تعمیر کرائی جو آج تک اپنے کتبے کے ساتھ قائم اور ان کے نام سے منسوب ہے۔ اس کے بعد ان ہی کے ایما سے اجمیر میں دارالافتاء کا قیام عمل میں آیا اور وہ تین سو روپے ماہوار پر اس کے پہلے مفتی مقرر ہوئے۔[4] اجمیر میں اکرام علی کو روحانی سکون حاصل ہوا۔ وہاں انھوں نے فتویٰ نویسی کے ساتھ ساتھ طبابت بھی شروع کر دی تھی۔ ان کے والد شیخ احسان علی جن کو مفقود الخبر ہوئے ایک زمانہ گزر چکا تھا، حیدرآباد میں مقیم تھے۔ انھوں نے بیٹے کی شہرت سن کر ان سے ملاقات کے لیے آمد کی اطلاع دی، لیکن ان کے متبنیٰ بیٹے نے دولت کی لالچ میں انھیں زہر دے دیا اور وہ جاں بحق ہو گئے۔ اس خبر سے اکرام علی کو شدید صدمہ پہنچا جسے وہ برداشت نہ کر سکے۔ چنانچہ اس حادثے کے کچھ ہی دنوں کے بعد ۱۲۵۳ھ (۱۸۲۷-۲۸ء) میں اجمیر ہی میں ان کا انتقال ہو گیا اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔[5]

---

[1] "جام جہاں نما" کا پہلا شمارہ ۲۸ مارچ ۱۸۲۲ء کو منظر عام پر آیا۔ یہ ہفتہ میں ایک بار نکلتا تھا۔ اس کی ادارت کی ذمہ داری لالہ سدا سکھ کے سپرد تھی اور اس کے مالک منشی ہری ہر دیو تھے۔ اس کے آٹھویں شمارے (۱۶ مئی ۱۸۲۲ء) میں کچھ مضامین فارسی میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد مارچ ۱۸۲۸ء تک فارسی نے اردو کو بے دخل کر دیا۔ ۲۸ مارچ ۱۸۲۳ء سے یہ اردو اور فارسی دونوں میں شائع ہونے لگا۔ فارسی کے لیے چار صفحے اور اردو کے لیے ۲ صفحے مختص ہوتے تھے۔ (P.T. Nair, "RADIANCE" Delhi, 13-19 Sep. 1987, P. 9)

[2] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۳۶-۳۵ [3] عبیدہ بیگم، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۲۰۲-۲۰۱

[4] نادم سیتاپوری، فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۱۵۲

[5] 〃 〃 〃 ص ۱۵۵

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

اردو زبان وادب میں اکرام علی کی قدر منزلت محتاج بیان نہیں۔ محض اپنی ایک ہی تصنیف "اخوان الصفاء" کی وجہ سے ان کا نام اردو کے افق پر روشن ستارہ کی طرح چمکتا رہے گا۔ "اخوان الصفا" عربی کی مشہور تصانیف میں شمار ہوتی ہے۔ یہ اکیاون رسائل پر مشتمل ہے اور چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر (۹۶۲ء تا ۱۰۱۰ء) کی تصنیف ہے۔ یہ رسائل اسماعیلی فرقے اخوان الصفا کے عالموں ابوسلیمان محمد بن مشیر البستی المقلسی، ابوالحسن علی بن فاروق النجابی، محمد بن نوجوری العوفی اور زید بن رفاع وغیرہ نے تصنیف کیے تھے۔ فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی، فرنچ اور جرمن زبانوں میں بھی اس کتاب کے مختلف رسالوں کے ترجمے ہوئے۔ اکرام علی کا کیا ہوا ترجمہ پہلی بار ۱۸۱۱ء میں "اخوان الصفاء" کے نام سے شائع ہوا۔ انھوں نے "اخوان الصفاء" کے اس رسالے کا ترجمہ کیا ہے جو انسانوں اور بہائم (جانوروں) کے مناظرے میں ہے۔ یہ کالج کے نصاب میں شامل تھا اور انگریزی عہد حکومت میں مدت تک یہ آئی۔ سی۔ ایس اور پی۔ سی۔ ایس کے امتحانات میں بھی داخل نصاب رہا۔ اس کی زبان نہایت آسان اور آج کے روزمرہ سے بہت قریب ہے، یہی وجہ ہے کہ "باغ وبہار" کے بعد انگریزوں نے جس اردو تصنیف کو اپنے گلے کا ہار بنایا وہ "اخوان الصفا" ہی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ "اخوان الصفا" کے بیشتر حصے کا ترجمہ نامی ہی نے کیا تھا، جس پر انھیں سو روپے بطور انعام ملے تھے۔[1]

(۲) **مصنفین اسلام**۔ قاضی الیاس حسین اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ "مصنفین اسلام (قلمی) مولوی اکرام علی . . . مفتی اجمیر شریف کی کتاب تھی اولاد کی غفلت سے یہ کتاب ان کی اولاد سے جاتی رہی[2] اس کتاب میں بارہ سو سال کے مصنفین اسلام کے حالات اور ان کے کارنامے تحقیقی طور پر بیان کیے گئے تھے۔

نادم سیتاپوری کے بیان کے مطابق اکرم علی کا جو سامان کلکتہ اور اجمیر سے سیتاپور آیا تھا اس میں فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات کے علاوہ ان کی تصنیف کی ہوئی متعدد کتابیں، درجنوں بیاضیں اور کئی کشکول تھے[3] لیکن خاندان والوں کی بے اعتنائی اور غفلت کی وجہ سے یہ سب دست

---

[1] فورٹ ولیم کالج از دارشنے ص ۱۰۲ [2] سہ ماہی مصنف علی گڑھ اکتوبر ۱۹۴۲ء تا جنوری ۱۹۴۰ء۔ بحوالہ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۱۵۳ [3] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۱۵۲

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

بردِ زمانہ کی نذر ہوگئیں۔

۱۲۔ مولوی حفیظ الدین احمد:

حفیظ الدین کے والد کا نام شیخ ہلال الدین اور دادا کا نام محمد ذاکر تھا۔ ان کے جدِ اعلیٰ عرب سے ترکِ وطن کرکے حیدرآباد میں آباد ہوگیے تھے بعد میں ان کے پردادا شیخ حسن حیدرآباد کو خیرباد کہہ کر بنگال کو اپنا مسکن بنایا۔ حفیظ الدین کے والد شیخ ہلال الدین مدرسہ عالیہ میں مدرس تھے۔ حفیظ الدین نے اسی مدرسے میں تعلیم پائی تھی وہ عربی و فارسی میں دست گاہ کامل رکھتے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد تلاشِ معاش میں سرگرداں تھے کہ فورٹ ولیم کالج قائم ہوا، اور ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو شعبۂ فارسی میں مدرس کی حیثیت سے چالیس روپے ماہوار پر ان کا تقرر ہوگیا جب کالج کی طرف سے عمدہ تصانیف پر انعامات کا اعلان کیا گیا تو انھوں نے ابوالفضل کی تصنیف "عیارِ دانش" کا اردو میں ترجمہ کرکے اسے گلکرسٹ کی نذر کیا۔ گل کرسٹ نے ۱۲ مئی ۱۸۰۳ء کو کالج کونسل کے سکریٹری کو لکھا کہ

> "میں انتہائی مسرت کے ساتھ ایک مفید ترین اور مشہور کتاب عیارِ دانش کا ہندوستانی ترجمہ کالج کونسل کے ملاحظہ کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ فارسی شعبے کے مولوی حفیظ الدین نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ مترجم کی درخواست اظہارِ احوال کے لیے کافی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اتنے اچھے کام کے لیے کونسل انھیں انعام ضرور دے گی۔[1] "

گل کرسٹ نے اپنے سفارشی خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر مترجم کی ہمت افزائی کی گئی تو وہ الف لیلہ کا بھی ترجمہ ہندوستانی زبان میں کرے گا۔ اس سفارش کے نتیجے میں "عیارِ دانش" کے اس ترجمے پر چھ سو روپے کا انعام ملا[2] لیکن وہ الف لیلہ کا ترجمہ نہیں کرسکے۔

یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ حفیظ الدین کالج سے کب تک وابستہ رہے۔ سید محمد نے لکھا ہے کہ حفیظ الدین فورٹ ولیم کالج کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد دہلی کے رزیڈنٹ مٹکاف کے منشی مقرر ہوگیے تھے اور ۱۸۱۵ء میں دہلی میں موجود تھے۔[3] اس بیان سے پتا چلتا ہے کہ کالج سے

---

[1] بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۶۵

[2] ایضاً ص ۱۶۶ [3] اربابِ نثرِ اردو ص ۲۴۰

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ان کا تعلق ۱۸۱۵ء سے قبل منقطع ہو چکا تھا۔

"عیار دانش" کا اردو ترجمہ جس کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے حفیظ الدین کی واحد یادگار ہے جس نے ان کے نام کو ہمیشہ کے لیے تاریخ ادب میں محفوظ کر دیا ہے۔ یہ ترجمہ ۱۸۰۳ء میں مکمل ہوا اور ۱۸۰۵ء میں "خرد افروز" کے نام سے طبع ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد روبک تے غلام اکبر، مرزا ئی بیگ، غلام قادر اور مولوی سید کاظم علی کی مدد سے اسے از سر نو ترتیب دیا اور ایک بسیط مقدمے کے ساتھ ۱۸۱۵ء میں دوبارہ شائع کیا۔ اس ترجمے کی عبارت نہایت صاف اور شستہ ہے۔

۱۳۔ لالہ کاشی راج :

لالہ کاشی راج کھتری لاہور کے باشندے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی میں ان کا تقرر ۴، مئی ۱۸۰۱ء کو ہوا تھا[1]۔ ۲، نومبر ۱۸۰۱ء کی کالج کونسل کی کاروائی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے قبل استعفا دے کر کالج کی ملازمت سے علاحدہ ہو چکے تھے۔ اس کے بعد کالج میں ان کے دوبارہ تقرر کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ملتا، لیکن قراین و کوائف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد میں کالج کے شعبۂ پنجابی سے وابستہ ہو گئے تھے۔ کیوں کہ اسی شعبے کے لیے انھوں نے پنجابی میں کئی مفید کتابیں تصنیف کی ہیں۔ دوسرے یہ کہ کالج کی کاروائیوں میں ان کے نام کے پہلے منشی لکھا گیا ہے۔ ان کے سنین ولادت و وفات کا پتا نہیں چل سکا۔

تصانیف :

(۱) **پنجابی لغت** ــ یہ ایک مفید کتاب ہے، جو کالج کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے گلستاں اور ہندی اسٹوری ٹیلر کا پنجابی میں ترجمہ کیا تھا۔ ہندی اسٹوری ٹیلر کے ترجمے پر انھیں سو روپے کا انعام بھی ملا تھا۔

۱۴۔ منصور علی۔

منصور علی کے مورث اعلیٰ سبزوار سے ترک وطن کر کے ہندوستان آئے تھے اور دلی میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے والد امام بخش نے دلی کو چھوڑ کر پٹنہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ منصور علی کی تعلیم و تربیت پٹنہ ہی میں ہوئی تھی۔ وہ پٹنہ سے کلکتہ کب گئے اس کا پتا نہیں چل سکا۔ البتہ اس قد

---

[1] لکشمی ساگر وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۲۲

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

معلوم ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی میں ان کا تقرر فروری ۱۸۰۲ء میں بہادر علی کی سفارش پر ہوا تھا۔ چونکہ انھیں درس و تدریس کی ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں اس لیے تالیف و تصنیف پر زیادہ توجہ نہیں دے سکے۔ ستمبر ۱۸۰۵ء تک قطعی طور پر ان کی کالج میں موجودگی کا پتا چلتا ہے۔[۱] لیکن اس کے بعد کے حالات نامعلوم ہیں۔

"بحر عشق" (قصۂ سیف الملوک) ان کی واحد تصنیف ہے جس کی بدولت ان کا نام مصنفین اردو میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہ اسی نام کی ایک فارسی مثنوی کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۸۰۳ء میں مکمل ہوا تھا لیکن شائع ہو سکا۔ اس قصے میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو قدیم داستانوں میں پائی جاتی ہیں۔

۱۵۔ مرزا محمد فطرت:

فطرت لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ سر جان مرے ہیڈلے کی گرامر کی تصحیح کے لیے ۱۷۹۸ء میں انھیں اپنے ساتھ لندن لے گیے۔ لندن کے زمانۂ قیام میں انھوں نے صرف ہیڈلے کی قواعد کی تصحیح ہی نہیں کی بلکہ اس میں متعدد اہم اضافے بھی کیے۔ اس کے علاوہ جارج ہیڈلے کی قواعد کا ایک ترمیم شدہ ایڈیشن بھی تیار کیا[۲] جو ۱۸۰۲ء میں لندن سے شائع ہوا تھا۔ اس کے سرورق پر ہیڈلے کے ساتھ فطرت کا بھی نام درج تھا۔

اس کے بعد فطرت ہندوستان واپس آئے اور مسٹر کول بروک کے ایما پر انجیل کا فارسی ترجمہ شروع کیا۔ بعد میں بروک کی سفارش پر گل کرسٹ نے ۷ رنومبر ۱۸۰۳ء کو انھیں اسی روپیے ماہوار پر فورٹ ولیم کالج میں ملازم مقرر کر دیا،[۳] جہاں انجیل کے ہندوستانی و فارسی ترجمے کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔ اس ترجمے پر انھیں پانچ سو روپیے نقد ملے تھے۔[۴] فطرت کے اس ترجمے کو ہنٹر نے گریک سے مقابلہ کرنے کے بعد "عہد نامۂ جدید" کے نام سے ۱۸۰۵ء میں ہندوستانی پریس سے شائع کیا تھا۔ فطرت کالج سے کب تک کالج سے وابستہ رہے اس کا علم نہیں ہو سکا۔

تعجب ہے کہ عبیدہ بیگم نے کالج کے مصنفین کے ضمن میں فطرت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

---

[۱] فورٹ ولیم کالج ص ۷۹

[۲] محمد یحییٰ تنہا، سیر المصنفین حصہ اول ص ۲۰۴

[۳] عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۰۰ [۴] فورٹ ولیم کالج ص ۴۷

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۱۶۔ میر بخشش علی:

میر بخشش علی کا وطن فیض آباد تھا۔ وہ ۱۷۸۲ء کے آس پاس پیدا ہوئے تھے[1] کالج کے دوسرے منشیوں کی طرح بخشش علی بھی ارباب کالج کی داد و دہش اور اکرام و نوازش کی شہرت سن کر کلکتہ گیے ہوں گے۔ ڈاکٹر جاوید نہال بخشش علی کی کالج سے وابستگی تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے کہ "ان کو کالج کی ملازمت نہ مل سکی تھی"[2] لیکن امر واقعہ ہے کہ نومبر ۱۸۰۳ء میں شعبۂ ہندوستانی میں بخشش علی کا تقرر عمل میں آیا تھا۔[3] عتیق صدیقی ان کا مشاہرہ اسّی روپیے بتاتے ہیں[4] جبکہ وارشنے نے سو روپے درج کیے ہیں[5]

معلوم پڑتا ہے کہ شروع میں جب منشی کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا تھا اس وقت انھیں ۸۰ روپیے ملتے تھے۔ لیکن ۱۸۱۵ء کے قریب زمانے میں ولیم ٹیلر اور آر۔ مارٹن نے بخشش علی کا فارسی اور ہندوستانی میں امتحان لیا اور جب وہ اس امتحان میں کامیاب ہو گیے تو ان کو ترقی دے کر سکنڈ منشی کے منصب پر فائز کیا گیا اور ان کی تنخواہ ۸۰ روپیے سے بڑھا کر سو روپیے کر دی گئی۔ اس امتحان میں کامیابی کے بعد انھیں مستقبل میں میر منشی کے لائق قرار دیا گیا تھا۔ لیکن وہ کبھی اس عہدے پر مامور نہیں ہو سکے بلکہ آخر تک سکنڈ منشی ہی کے منصب پر کام کرتے رہے۔

تارنی چرن مسر اور مرتضیٰ خاں کے بعد بخشش علی کو زیادہ مدت تک کالج کی ملازمت کا شرف حاصل رہا۔ انھوں نے تقریباً ۲۷ سال تک کالج کی خدمات انجام دیں۔ درمیان ملازمت وہ اپنے اخلاق و عادات سے ارباب کالج کو خوش و مطمئن رکھنے میں کامیاب رہے۔ چنانچہ ان کے عہدے کی ضرورت باقی نہ رہنے پر بھی نہ صرف انھیں بحال رکھا گیا بلکہ ان کی تنخواہ میں بھی تخفیف نہیں کی گئی۔ ہمارے اس خیال کی توثیق ولیم پرائس کے ۱۹ اگست ۱۸۲۹ء کے خط سے ہوتا ہے، جس میں انھوں

---

[1] چونکہ سن ۱۸۳۰ء میں ان کی پنشن کے لیے جو تفصیلات درج کی گئی تھیں، ان میں ان کی عمر ۴۸ سال بتائی گئی تھی (فورٹ ولیم کالج از وارشنے ص ۱۲۰)

[2] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۶۸

[3] عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۰۰، اور وارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۱۲۱

[4] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۰۰ [5] فورٹ ولیم کالج ص ۱۲۱ اور ۱۲۲

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

نے شعبۂ ہندوستانی کی تفصیل کالج کونسل کو ارسال کی تھی۔ انھوں نے بخشش علی کے متعلق لکھا تھا کہ دو کالج میں ہندوستانی کی جگہ پر ہندی ہو جانے سے بخشش علی کا کام بہت معمولی رہ گیا ہے۔ لیکن تارنی چرن کی طرح وہ بھی یہاں شروع ہی سے ہیں، اس لیے انھیں برطرف کر دینا یا ان کا مشاہرہ کم کر دینا شاید مبنی برانصاف نہ ہوگا۔ ان کی وفات ہو جانے یا سبکدوش ہونے پر ان کا جانشیں مقرر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔[۱]

بخشش علی مئی ۱۸۳۰ء تک کالج سے وابستہ رہے۔ جب کالج کے پروفیسروں اور منشیوں کے عہدے ختم کر دیے گیے تو انھیں بھی کالج سے علاحدہ کر کے پچاس روپیے ماہانہ پنشن دینا منظور کیا گیا۔[۲]

کالج کی ملازمت سے علاحدگی کے بعد بخشش علی کہاں گیے اور ان کا انتقال کب اور کہاں ہوا۔ ان امور کی تحقیق نہیں ہو سکی ہے۔

"اقبال نامہ" شاید ان کا واحد کارنامہ ہے، جو ابھی تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکا۔ یہ منشی غلام حسین کی فارسی تخلیق "سیر المتاخرین" کے صرف ایک حصے کا ترجمہ ہے۔ بخشش علی نے ولیم ٹیلر کے زمانۂ پروفیسری (۱۸۰۹ء) میں اس کو تیار کیا تھا۔ لیکن انھوں نے اسے ۱۸۲۵ء میں ارباب کالج کے حوالے کیا۔ سکریٹری رڈیل نے "اقبال نامہ" کو جب ولیم پرائس کے پاس تبصرے کے لئے بھیجا تو اس نے ۲۵ مارچ ۱۸۲۵ء کو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ

"اگر ہندوستانی کی تعلیم اردو شکل میں جاری رہتی تو میر بخشش علی کا ترجمہ بہت کارآمد ثابت ہوتا۔ لیکن حال ہی میں میرے شعبے میں اردو کی جگہ ہندی کی تعلیم شروع ہو جانے سے اس طرح کے ترجموں کی ضرورت نہیں ہے۔ اب ایسی تصنیف کی بجائے نئی قسم کی کتابوں کی ضرورت ہوگی"[۳]

۱۷۔ سدل مسر پنڈت :

سدل مسر دھرو ڈیہا گاؤں ضلع آرا یا شاہ آباد (بہار) کے باشندے تھے۔ لگ بھگ ۱۷۶۷ء

[۱] بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۳۲ [۲] وارثِ سنے، فورٹ ولیم کالج ص ۱۲۷

[۳] بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۳۲

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۱۷۶۸ء میں ان کی ولادت ہوئی۔ بندمنی مسر ان کے والد کا نام تھا[1]۔
سدل مسر تلاش معاش میں کلکتہ گئے اور انھیں فورٹ ولیم کالج میں ملازمت مل گئی۔ عتیق صدیقی کی اطلاع کے مطابق ۲۵ نومبر ۱۸۰۲ء کو محض تیس روپیہ ماہوار پر شعبۂ ہندوستانی میں ماتحت منشی کے منصب پر ان کا تقرر عمل میں آیا تھا[2]۔ جیمس موئٹ نے ۹ مئی ۱۸۰۴ء کے اپنے مراسلے میں للولال اور سدل مسر کو غیر ضروری قرار دے کر شعبہ سے علاحدہ کرنے کی سفارش کی تھی چنانچہ کونسل نے اپنے ۱۱ جون ۱۸۰۴ء کے اجلاس میں دونوں کو شعبہ سے برطرف کر دیا۔ جولائی ۱۸۰۴ء سے ان لوگوں کو تنخواہ ملنا بند ہو گئی۔ لیکن ہندوستانی شعبے میں بھاکھا منشیوں کی کمی کے پیش نظر ۱۴ اکتوبر ۱۸۰۴ء کی کاروائی میں کونسل نے نہ صرف یہ کہ ان لوگوں کو دوبارہ واپس بلالیا بلکہ گزشتہ تین مہینوں کا مشاہرہ دینا بھی منظور کیا[3]۔

سدل مسر شعبۂ ہندوستانی سے کب تک منسلک رہے اس کا صحیح علم تو نہیں ہو سکا البتہ کالج کونسل کی کاروائیوں سے ۱۸۰۹ء تک ان کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔ ۲۷ مئی ۱۸۰۹ء کی کاروائی میں "ہندی اور فارسی لفظوں کی فہرست" کے ترجمے پر پچاس روپیے سے ان کی حوصلہ افزائی کی گئی تھی[4]۔
کالج سے علاحدگی کے بعد کے حالات قعر گمنامی میں ہیں۔ انھوں نے ۴۸-۱۸۴۷ء کے قریب وفات پائی۔

تصانیف :

(۱) **چندراوتی**۔ سدل مسر نے "ناسکے تا پاکھیان" (سنسکرت) کا ترجمہ بزبان ہندی ۱۸۰۳ء میں کیا تھا جسے کالج کی جانب سے اسی سال شائع کیا گیا۔ گل کرسٹ نے اس پر ساٹھ روپیے کی سفارش کی تھی۔ لیکن سدل مسر کو کچھ نہ مل سکا۔ شیام سندر داس نے اسے ناگری رسم خط میں مرتب کر کے ۱۹۰۱ء میں بنارس سے شائع کیا ہے۔

(۲) **رام چرت** ۔ یہ ادھیاتم راماین کا ترجمہ ہے۔ اس ترجمے پر انھیں تین سو روپیے بطور انعام ملے

---
[1] ہندی ساہتیہ کا برہت اتہاس حصہ ششم جلد دوم ص ۵۰۶، بحوالہ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۵۹
[2] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۹۹ [3] بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۶۵
[4] ایضاً " ص ۹۹

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

تھے۔ اس کے علاوہ رامائن کی نقل کرنے پر ان کو ۲۶ روپیے آٹھ آنے دیے گئے تھے[1] رام چرت ۱۸۰۶ء میں تیار ہوئی اور ۱۸۱۱ء میں شائع ہوئی۔

سدل مسر "نقلیات لقمانی" کے ترجمے میں بھی شریک تھے۔ گل کرسٹ نے اس کے جن تین مترجمین کے لیے انعام کی سفارش کی تھی ان میں وہ بھی شامل تھے[2]

۱۸۔ میر معین الدین فیض :

معین الدین کے بزرگوں کا آبائی وطن سمرقند تھا۔ ان کے بزرگوں نے سمرقند کو خیرباد کہہ کر دلی کو اپنا مسکن بنایا، جہاں انھیں بڑا عروج حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ انھوں نے ایک ریاست کی داغ بیل ڈالی۔ چونکہ وہ لوگ سادات تھے اس لیے جس محلے میں مقیم ہوئے اس کا نام سید واڑہ پڑ گیا۔ معین الدین کے بزرگوں نے بارہ پشتیں یہیں گزاریں۔ ان کے آبا و اجداد کو بادشاہ کی خصوصی قربت حاصل تھی۔ چنانچہ وہ حکومت کے اعلا مناصب پر فائز رہے۔

معین الدین کے والد کا نام سید فخر الدین اور دادا کا نام سید زین العابدین تھا۔ معین الدین دلی ہی میں پیدا ہوئے۔ یہیں پلے بڑھے اور تعلیم حاصل کی۔ جب دلی بیرونی حملہ آوروں آماج گاہ بنی تو معین الدین مع متعلقین غازی پور آیے۔ لیکن یہاں انھوں نے دلی کی طرح جاہ و حشمت اور شان و شوکت کی زندگی نہیں بلکہ گوشۂ عزلت کی زندگی اختیار کی۔

ایک زمانہ تھا جب گل کرسٹ نیل کی کاشت اور اپنے تعلیمی پروگرام کے تحت غازی پور میں مقیم تھا۔ جب اسے معین الدین کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے انھیں بلاکر ملازم رکھ لیا۔ اس دوران معین الدین ہندوستانی شعرا کے محاورات سے گل کرسٹ کو آگاہ کرتے تھے۔ اس طرح غازی پور کے زمانۂ قیام میں گل کرسٹ کے علم میں کافی اضافہ ہوا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ معین الدین نے بھی گل کرسٹ کی معیت سے فیض حاصل کیا ہوگا۔

گل کرسٹ کی غازی پور سے مراجعت کے بعد معین الدین اپنے کو بے یار و مددگار اور بے مونس و غم خوار سمجھنے لگے۔ چنانچہ وہ سیدھے کلکتہ پہنچے، جہاں بہادر علی حسینی نے ان کی پذیرائی کی۔ چند دنوں

---

[1] بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۷۵

[2] ایضاً ص ۱۸۵

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کے بعد معین الدین کو ۹/ اگست ۱۸۰۲ء کو تیس روپے ماہانہ مشاہرے پر منشی کے عہدے پر بحال کیا گیا۔[1] دوران ملازمت "چشمۂ فیض" کے نام سے انھوں نے ایک کتاب ترتیب دی۔

"چشمۂ فیض" شیخ فریدالدین عطار کی فارسی تصنیف "پند نامہ" کا منظوم ترجمہ ہے[2] جاوید نہال نے اس کے دیباچے کی عبارت سے اسے ۱۸۰۳ء کی تصنیف قرار دیا ہے[3] لیکن دیباچے کی اس عبارت "ستائیسویں جمادی الاول ۱۲۱۹ھ ہجری مطابق ۱۸۰۴ء عیسوی کو کلکتے میں دستخط سے میر معین الدین فیض کے یہ رسالہ ختم ہوا" سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۸۰۴ء میں تکمیل کو پہنچی تھی۔ یہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکی۔ اس کا ۱۳۶ اوراق کو محیط خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے کی زینت بنا ہوا ہے۔

۱۹۔ سید علی جعفری:

ڈاکٹر جاوید نہال کا یہ خیال درست نہیں کہ "سید علی کو کالج کی باضابطہ ملازمت مل نہ سکی تھی"[4] سید علی جعفری میر شیر علی افسوس کے فرزند ارجمند تھے۔ افسوس نے ان سے "گلشن اخلاق" کے نام سے ایک کتاب لکھوا کر مسٹر ٹیلر کی خدمت میں پیش کرائی، تاکہ وہ انھیں کالج میں ملازمت دلوا سکیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے وہ اپنی زندگی میں بیٹے کو کالج میں بہ حیثیت ملازم دیکھ نہیں سکے۔ کیونکہ اس کے کچھ دنوں کے بعد ۱۹/ دسمبر ۱۸۰۹ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ۲۱/ دسمبر ۱۸۰۹ء کو ان کی جگہ پرتارنی چرن مترکو ترقی ملی، اور اسی روز افسوس کی خدمات اور ان کے پس ماندگان کی پرورش اور دل جوئی کے پیش نظر ان کے بیٹے سید علی کو بھی چالیس روپے ماہوار پر شعبۂ ہندوستانی میں ملازم رکھ لیا گیا۔[5]

---

[1] عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۰

[2] عتیق صدیقی نے اس کا نام "پندنامہ فریدالدین عطار (نظم)" لکھا ہے۔ (گل کرسٹ اور [illegible] ص ۱۶۴) ہوسکتا ہے کالج کی کاروائیوں میں یہی نام ہو۔ لیکن قوسین میں "نظم" کا اضافہ خلاف واقعہ معلوم پڑتا ہے۔

[3] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۹۱

[4] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۹۲

[5] دارشنے، فورٹ ولیم کالج ص ۸۴

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

ٹیلر اور مارٹن نے ۱۸۱۶ء میں جب شعبے کے منشیوں کا ہندوستانی اور فارسی میں امتحان لیا تو اس میں سید علی بھی شامل تھے[۱]

پرائس کے عہد پروفیسری میں کالج میں ہندی زبان کی تعلیم پر بہت زیادہ توجہ دی جانے لگی تھی۔ چنانچہ اپنی ملازمت برقرار رکھنے کے لیے منشیوں اور بنگالی پنڈتوں نے ہندی کی تعلیم پر توجہ مبذول کی۔ انھیں ہندی پڑھانے کے لیے سیتارام پنڈت کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد منشیوں اور بنگالی پنڈتوں نے ہندی امتحان دینے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ سکریٹری رڈیل نے ۱۸ر مئی ۱۸۲۵ء کو پرائس کو مطلع کیا کہ ۲۴ر مئی ۱۸۲۵ء کے بعد انھیں جب موقع ملے منشیوں کا ہندی میں امتحان لیں[۲] اس کے بعد ہندوستانی اور بنگلہ شعبے کے اکتیس [۳۱] منشیوں نے ہندی کا امتحان دیا، جن میں سید علی بھی شامل تھے۔ اس امتحان کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان منشیوں میں زیادہ تر "پریم ساگر" اور "راج نیتی" بخوبی پڑھ سکتے تھے۔ لیکن وہ دیوناگری رسم خط نہیں لکھ سکتے تھے۔

مئی ۱۸۳۰ء میں منشیوں کے عہدے لگ بھگ ختم کر دیے گئے تھے، تاہم ہندوستانی اور فارسی شعبے میں چھ چھ اور بنگلہ میں صرف چار منشی جون ۱۸۳۰ میں موجود تھے[۳] سید علی کا نام یہاں فارسی شعبے کے ذیل میں شامل ہے اور تنخواہ محض چالیس روپیے درج ہے۔ حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کالج سے کب تک منسلک رہے۔ قراین سے معلوم ہوتا ہے کہ کالج سے ان کا تعلق ۱۸۳۲ء تک برقرار رہا ہوگا۔

"گلشن اخلاق" سید علی کی واحد تصنیف ہے، جسے انھوں نے ۱۸۰۹ء میں ملازمت سے قبل ترتیب دیا تھا۔ اس پر انھیں بیس روپے ملے تھے۔ یہ ابھی تک شرمندۂ اشاعت نہیں ہو سکی۔ اس کا ۱۴۰ اوراق پر مشتمل قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں محفوظ ہے۔

---

[۱] فورٹ ولیم کالج ص ۹۲

[۲] ایضاً ص ۱۲۳

[۳] ایضاً ص ۳۰ - ۱۲۹

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

(ج) غیر معروف مصنفین

	نام	تاریخ تقرر	عہدہ	ماہانہ تنخواہ	علاحدگی	تصنیف	سال اشاعت تالیف
۱-	میر جعفر	۲ نومبر ۱۸۰۱ء	منشی	۴۰ روپے	نامعلوم	مسکین کے مرثیے (نثر میں) (مطبوعہ)	۱۸۰۱ء
۲-	سید حمید الدین بہاری	۱۸۰۳ء	منشی	۳۰ روپے	نامعلوم	خوانِ نعمت (مطبوعہ)	۱۸۰۳ء
۳-	کندن لعل[1]	۴ مئی ۱۸۰۱ء	″	۴۰ ″	۲۸ مارچ ۱۸۰۴ء	کلا کام (مطبوعہ)	۱۸۰۳ء
۴-	غلام حیدر عزت[2]	ستمبر ۱۸۰۱ء	لائبریرین	- -	نامعلوم	حسن و عشق (گل و صنوبر) (غیر مطبوعہ)	۱۸۰۳ء
۵-	غلام اشرف	۴ مئی ۱۸۰۱ء	منشی	۴۰ روپے	نامعلوم	اخلاق النبی (غیر مطبوعہ)	۱۸۰۳ء
۶-	غلام شاہ بھیک	۴ مئی ۱۸۰۱ء	″ (شعبۂ فارسی)	″ ″	۲ نومبر ۱۸۰۱ء	تواریخ السلاطین (غیر مطبوعہ)	۱۸۰۳ء
۷-	غلام اکبر	۴ مئی ۱۸۰۱ء	منشی	″ ″	۲ نومبر ۱۸۰۱ء	قصۂ دل و حسن (غیر مطبوعہ) تواریخ بنگالہ (غیر مطبوعہ) گل بکاؤلی (غیر مطبوعہ)	۱۸۰۳ء ۱۸۰۳ء نامعلوم
۸-	محمد عمر	۹ اگست ۱۸۰۲ء	″	۳۰ روپے	نامعلوم	تواریخ عالمگیری (غیر مطبوعہ)	۱۸۰۳ء
۹-	میر تصدق حسین[3]	نومبر ۱۸۰۲ء	″	۴۰ روپے	۱۲ [illegible]	تواریخ تیموری (غیر مطبوعہ)	۱۸۰۳ء
۱۰-	غلام سبحان	۹ اگست ۱۸۰۲ء	″	۳۰ بعد میں ۴۰ روپے	نامعلوم	[illegible] (غیر مطبوعہ)	۱۸۰۳ء

[1] عتیق صدیقی نے کندن لعل کو غیر ملازم مصنفین کے زمرے میں شامل کیا ہے، جو صحیح نہیں ہے (گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۰۰)

[2] تھامس روبک کے بقول ستمبر ۱۸۰۱ء میں غلام حیدر لائبریرین مقرر کیے گئے (انالز آف فورٹ ولیم کالج فی ادبی خدمات ص ۴۴) ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے کے مطابق ۲۵ ۱۸۰۱ء میں کالج کے جن منشیوں نے ہندی کا امتحان دیا تھا ان میں غلام حیدر بھی شامل تھے اور ۱۸۰۴ء کی جو تفصیل درج کی ہے اس میں انھیں ہندوستانی و فارسی شعبے کا [illegible] ہے اور ان کی تنخواہ چالیس روپے درج کی ہے۔ (فورٹ ولیم کالج ص ۲۲، ص ۱۲۹) مئی ۱۸۰۵ء سے قبل غلام حیدر کالج سے علاحدہ ہو چکے تھے۔ عتیق صدیقی نے انھیں بھی غیر ملازم مصنفین کے ذیل میں شامل لیا ہے۔ (گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۰۱)

[3] میر تصدق حسین نے کچھ دنوں تک لائبریری میں بھی کام کیا۔ بعد میں ان کی خدمات شعبۂ فارسی میں منتقل کر دی گئیں۔ اسی شعبے سے انھوں نے استعفا دیا تھا۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کالج کے غیر ملازم مصنفین

اس ضمن میں ان مصنفین کا ذکر کیا جائے گا جو فورٹ ولیم کالج کے ملازم تو نہیں تھے لیکن کالج کے زیر اثر اردو نثر کی خدمت کرنے والوں کے سلسلۃ الذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کے کارنامے بجا طور پر اردو زبان وادب کا قابل قدر سرمایہ کہے جانے کے مستحق ہیں ان کا ذکر ذرا تفصیل سے اور باقی مصنفین کا ذکر نہایت اختصار وایجاز سے کیا جائے گا۔

رائے بینی نارائن دہلوی :

رام بابو سکسینہ سے لے کر جاوید نہال اور شجاعت علی سندیلوی تک تمام مصنفین نے بینی نارائن کو فورٹ ولیم کالج کے مستقل متوسلین میں شمار کیا ہے، لیکن یہ خیال سراسر خلاف واقعہ ہے، کیونکہ یہ بات متحقق طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ بینی نارائن کا کوئی تعلق فورٹ ولیم کالج سے نہیں تھا۔ ڈاکٹر حنیف نقوی لکھتے ہیں

"۔۔۔ کالج سے بہ حیثیت ملازم ان (بینی نارائن) کے تعلق کی کوئی ضعیف شہادت بھی موجود نہیں انھوں نے (اپنی) تصانیف میں جا بجا اپنے مشاغل علمی کے سلسلے میں ارباب کالج کی طرف سے دامے، درمے، سخنے حوصلہ افزائی اور قدر دانی کا فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے لیکن کالج سے باضابطہ توسل کی طرف کوئی مبہم اشارہ بھی نہیں کیا جو اس بات کی قوی دلیل ہے کہ وہ کسی وقت بھی کالج کے ملازمین کے زمرے میں شامل نہیں رہے۔"[۱]

ان کی مشہور تصنیف " دیوان جہاں " کی وجہ سے لوگوں میں یہ غلط فہمی بھی عام ہو گئی ہے کہ بینی نارائن ایک کامیاب شاعر تھے اور " جہاں " تخلص کرتے تھے لیکن معتبر روایات اور مستند ماخذ اس عام خیال کے خلاف ثبوت فراہم کرتے ہیں چنانچہ ڈاکٹر حنیف نقوی متذکرہ مفروضے کو

---

[۱] ششماہی " نوائے ادب " بمبئی، اپریل ۱۹۷۷ء ص ۱۲

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"ایک اور غلط فہمی جو ۔۔۔ زیادہ عام اور مقبول ہے، یہ ہے کہ بینی نراین شاعر بھی تھے اور جہاں تخلص کرتے تھے ۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بینی نراین نے "دیوان جہاں" کا دیباچہ نظم میں لکھا ہے اور دوسری تصانیف میں بھی موقع موقع طبع زاد اشعار شامل کیے ہیں، لیکن نہ تو انھوں نے "دیوان جہاں" میں خود کو بہ حیثیت شاعر متعارف کرا کے شعر گوئی سے اپنے شغف کی نشاندہی کی ہے اور نہ کسی دوسرے معتبر ذریعے سے ان کا باقاعدہ شعر کہنا ثابت ہے۔ اس طرح یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی کہ وہ جہاں تخلص کرتے تھے۔ "دیوان جہاں" کے دیباچے میں انھوں نے آخری سے پہلے شعر میں اپنے مکمل نام ہی کو بطور تخلص نظم کیا ہے۔ یہی مقطع بعینہٖ "باغ عشق" کے دیباچے میں بھی شامل ہے۔ کسی ناگزیر مجبوری کے بغیر تخلص کی موجودگی میں نام کے اس استعمال کی کوئی معقول توجیہ نہیں کی جا سکتی۔"[1]

بینی نارائن کے والد کا نام رائے شدشٹ نارائن اور دادا کا نام چھمی نارائن تھا۔ ان کا قدیم وطن لاہور تھا لیکن پانچ پشتوں سے ان کے آباو اجداد نے دلی کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ بینی نارائن دلی ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ شدشٹ نارائن کے انتقال کے بعد بینی نارائن اپنے بڑے بھائی کھیم نارائن زند[2] کے ساتھ ۱۷۹۵ء کے قریب لکھنؤ آئے، جہاں ان کو آصف الدولہ کے دربار میں ملازمت مل گئی۔ اس درباری توسل کے بعد دونوں بھائی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اس کے بعد ۱۸۰۲ء میں کھیم نراین زند نواب سعادت علی خاں کے وکیل کی حیثیت سے لارڈ ولزلی کے ساتھ لکھنؤ سے کلکتہ گئے۔ بینی نارائن بھی [illegible]

---

[1] نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۱۷-۱۶

[2] کھیم نارائن زند طبیب و صاحب دیوان شاعر تھے۔ دلی اور لکھنؤ [illegible] میر سوز سے ان کے دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے [illegible] کا بیان ہے [illegible] ذوق [illegible] ... ت گاہ رکھتے تھے اور مہاراجہ ٹکیت رائے دیوان آصف الدولہ کی رفاقت میں بسر اوقات کرتے تھے۔ [illegible]

کے ہم رکاب تھے۔ کلکتہ پہنچنے کے بعد رندؔ فورٹ ولیم میں قیام پذیر ہوئے، لیکن چار سال کے بعد انھوں نے ملازمت سے استعفا دے دیا جس کی وجہ سے انھیں فورٹ ولیم چھوڑنا پڑا اور وہ کلکتہ ہی میں ایک مکان لے کر رہنے لگے۔ کلکتہ کے زمانۂ قیام میں طبابت کے پیشے کو انھوں نے اپنا ذریعۂ معاش بنایا۔

گمان غالب یہ ہے کہ بینی نارائن بھی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ فورٹ ولیم ہی میں مقیم رہے ہوں گے اور انھیں کالج کے دورِ عروج میں اسے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہوا گا۔ کالج کے اربابِ حل و عقد کی طرف سے شاعروں اور ادیبوں کی پذیرائی اور قدر و منزلت دیکھ کر ممکن ہے ان کے دل میں بھی کالج کی ملازمت حاصل کرنے یا کم از کم انعام پانے والے مصنفین کی فہرست میں اپنا نام دیکھنے کی خواہش ہوئی ہو۔ بہر صورت اسی قسم کی کسی ترغیب کے تحت انھوں نے دو تین کتابیں لکھ کر "صاحبانِ عالی شان" کی نذر کیں۔ ان کتابوں کے دیباچوں میں بینی نارائن نے دل کھول کر اربابِ کالج کی علم دوستی اور معارف پروری کے گن گائے ہیں لیکن یہ تمام کوششیں ان کے لیے کالج کی ملازمت کے دروازے نہ کھول سکیں۔ البتہ حصولِ انعام میں انھیں ضرور کامیابی حاصل ہوئی۔

بین نارائن کے متعلق یہ غلط فہمی بھی پائی جاتی ہے کہ آخری عمر میں حضرت سید احمد شہید کی تحریک سے متاثر ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیے تھے لیکن دوسری کئی روایات کی طرح یہ خیال بھی

(باقی حاشیہ پچھلے صفحے کا) آخری عمر میں کلکتہ جا رہے تھے اور ہوگلی میں مکان بنا لیا تھا۔ مولوی حفیظ الدین شہید ان کے نامور شاگرد تھے (خمخانۂ جاوید جلد سوم ص ۵۱۲) رندؔ نے لکھنؤ کے قیام کے دوران اپنا دیوان جس میں ہر قسم کے شعر موجود تھے، مرتب کر لیا تھا۔ اسکے علاوہ وہ فارسی میں "قصۂ چہار درویش"، "افسانۂ حسن و عشق" اور "قصۂ سیر الجھا" کے ناموں سے تین داستانیں، "حسن آداب و اخلاق" سے متعلق دو رسالے اور "باغ و بہار" اور "گوہر شاہولہ" نامی دو مثنویاں بھی تصنیف کر چکے تھے۔ جب نواب سعادت علی خاں کے وکیل کی حیثیت سے وہ کلکتہ پہنچے تو شہر میں اردو کے رواج عام اور اربابِ کالج کی سرپرستی و فیض رسانی کو دیکھتے ہوئے انھوں نے ۱۸۰۹ء میں "افسانۂ جان و دل" یا "چہار باغ" کے نام سے ایک "حکایتِ رنگین" لکھ کر بہ نظر قدر دانی ڈاکٹر ولیم ہنٹر کی نذر کی۔ ان کی اس پیش کش سے انھیں کوئی فائدہ پہنچا یا نہیں، اس بارے میں تمام ذرائع معلومات خاموش ہیں۔ اس داستان کا ایک قلمی نسخہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ رندؔ کی دوسری کسی تصنیف کا کوئی نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہو سکا۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

قطعاً خلاف حقیقت ہے[1] ان کی زندگی کے دوسرے متعدد گوشے ابھی تک پردۂ تاریکی میں ہیں سید محمد کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا انتقال ۱۲۴۵ھ میں ہوا تھا۔

تصانیف :-

(۱) چار گلشن ۔ یہ بینی نارائن کی طبع زاد تصنیف ہے جسے انھوں نے ۱۲۲۵ھ (۱۱-۱۸۱۰ء) میں تصنیف کیا تھا۔ "چار گلشن" کے مرکزی کردار کیوان شاہ اور فرخندہ ہیں۔ کیوان شاہ یورپ دیش کا بادشاہ اور فرخندہ ہندوستانی بادشاہ بیدار بخت کی بیٹی ہے۔ قصہ آسان اور عام فہم زبان میں ہے جس میں کوئی تعقید نہیں۔ اس کے دو قلمی نسخے برٹش میوزیم لندن اور ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس کی تصنیف پر بینی نارائن کو ۶۰ روپے انعام ملے تھے[2]

(۲) بہار عشق ۔ بینی نارائن نے اس کتاب کا ذکر "نوبہار" کے دیباچے میں کیا ہے جس کے مطابق انھوں نے "چار گلشن" کی تصنیف کے بعد "قصہ دل آرام" کو بعبارت خوب و مرغوب تصنیف کر کے شہر میں رواج دیا تھا) اور نام اس کا "بہار عشق" رکھا تھا۔" اب تک ہندوستان یا بیرون ہند کے کسی کتب خانے میں اس داستان کا کوئی نسخہ دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی اسے بر بنائے قیاس ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۸۱۱ء کے قریب کی تصنیف قرار دیتے ہیں[3] عبیدہ بیگم نے اسے فورٹ ولیم کالج کی تصانیف میں شامل کیا ہے[4] لیکن بقول بینی نارائن اسے "شہر میں رواج دیا" یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اسے فورٹ ولیم کالج کے لیے نہیں لکھا تھا۔

(۳) گلزار حسن ۔ بینی نارائن کی اس داستان کا بھی کوئی نسخہ بظاہر محفوظ نہیں۔ اس میں یوسف و زلیخا کا قصہ بیان کیا گیا تھا جسے فارسی اور اردو کے کئی شاعر نظم کر چکے ہیں۔ بینی نارائن کے بقول ان سے پہلے کسی شخص نے اس قصے کو فارسی سے "ہندی" (اردو) میں ترجمہ کیا تھا لیکن عبارت اس کی مغلق اور بے محاورہ تھی۔ اس لیے انھوں نے اسے از سر نو نظم و نثر کا زیور پہنا کر زبان

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر سید حنیف نقوی کا مضمون "راے بینی نارائن جہاں" نوائے ادب اپریل ۱۹۷۰ء

[2] وارشف، فورٹ ولیم کالج ص ۱۰۴

[3] نوائے ادب، اپریل ۱۹۷۰ء ص ۲۵

[4] فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۴۲۶

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

اردوئے معلیٰ میں تصنیف کیا۔" ڈاکٹر حنیف نقوی نے مختلف شواہد کی بنا پر اس کا سال تصنیف ۱۲۲۷ھ مطابق ۱۸۱۲ء متعین کیا ہے[۱] اسے بھی عبیدہ بیگم نے کالج کی تصانیف میں شامل کیا ہے[۲]۔ جبکہ بینی نارائن نے اس کو بھی " شہر میں رواج دیا" لکھا ہے۔

(۴) **دیوان جہاں** ۔ بینی نارائن کی تصانیف میں سب سے زیادہ مقبولیت " دیوان جہاں" کو حاصل ہے۔" دیوان جہاں" کو عام طور پر تذکروں کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے لیکن دراصل یہ تذکرہ نہیں بلکہ بیاض منتخبات کی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ اس میں شعرا کے حالات بہت ہی اختصار وایجاز کے ساتھ لکھے گئے ہیں جبکہ کلام کے انتخاب میں بڑی فراخ دلی سے کام کیا گیا ہے۔ اس میں ۱۲۹ شعرا کا کلام شامل ہے۔ یہ ۱۸۱۲ء میں مرتب ہوا تھا۔ لکشمی ساگر وارشنے نے شاید اسی کے متعلق لکھا ہے کہ" ٹیلر کے کہنے پر بینی نارائن کو ان کے ہندوستانی ولیو دھ سنگرہ (miscellany) کے لیے اسی روپیے ملے تھے۔[۳] پروفیسر کلیم الدین احمد نے اسے ۱۹۵۹ء میں پٹنہ کالج کے تحقیقی رسالے" کرنٹ اسٹڈیز" کے ایک خاص نمبر کے طور پر شائع کر دیا ہے۔

(۵) **تفریح طبع** ۔ اس کا واحد قلمی نسخہ جواب تک دریافت ہوا ہے ڈاکٹر حنیف نقوی کی ملکیت ہے۔ اسے بینی نارائن نے ۱۸۱۷ء میں تصنیف کیا تھا۔ اس کے دیباچے کا ابتدائی حصّہ منظوم ہے اس کے بعد بینی نارائن نے اپنا مختصر حال اور سبب تالیف نثر میں لکھا ہے، لیکن دیباچے کا اختتام نظم ہی پر ہوا ہے۔ یہ مختلف نقلوں کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر انتہائی فحش اور مبتذل ہیں۔

(۶) **نو بہار** ۔ یہ کتاب " گل وصنوبر" (فارسی) کا ترجمہ ہے جسے بینی نارائن نے ۱۸۲۴ء میں مکمل کیا تھا۔ اس کا واحد قلمی نسخہ حکیم سید محمد تقی حسن بلخی متوطن فتوحہ ضلع پٹنہ کی ملکیت ہے۔ بینی نارائن نے اسے منشی امام بخش کی ترغیب پر کالج کے لیے لکھا تھا۔

(۷) **بارغ عشق** ۔ یہ عبدالرحمٰن جامی کی " لیلیٰ مجنوں" کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۸۲۴ء میں مکمل ہوا۔ اس کا

---

[۱] نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۷۷ء ص ۲۶

[۲] فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۴۲۹

[۳] فورٹ ولیم کالج ص ۱۰۵

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

واحد قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

(۸) **تنبیہۃ الغافلین۔** یہ کتاب حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے صاحب زادے مولانا شاہ رفیع الدین کی فارسی تصنیف "تنبیہۃ الغافلین" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی وجہ سے گارسن ڈی ٹسی کو یہ دھوکا ہوا کہ بینی نارائن مسلمان ہو گیے تھے۔ یہ ۱۸۳۸ء میں ترجمہ ہوئی ہے۔

مرزا علی لطف:

رام بابو سکسینہ، سید محمد اور جاوید نہال نے مرزا علی لطف کو کالج کے ملازمین کے زمرے میں شمار کیا ہے[1] لیکن جاوید نہال نے شبہہ ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "پتا چلتا ہے کہ لطف کو کالج کی ملازمت باضابطہ نہیں مل سکی تھی"[2] اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ کالج کے باقاعدہ متوسلین میں کبھی شامل نہیں رہے۔ چنانچہ عتیق صدیقی نے بھی انھیں کالج سے غیر متعلق مصنفین کی صف میں جگہ دی ہے[3] عبیدہ بیگم نے بھی ان کے حالات قلم بند کیے ہیں لیکن کالج کی ملازمت کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے[4]

لطف کے بزرگوں کا وطن استرآباد تھا۔ جب نادر شاہ ہندوستان میں فاتحانہ داخل ہوا تو ان کے والد مرزا کاظم بیگ خاں بھی اس کے ساتھ آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے انھیں دربار شاہی میں خاصا رسوخ حاصل ہو گیا تھا۔ وہ فارسی کے شاعر تھے اور ہجر تخلص کرتے تھے۔

لطف کی ولادت جاوید نہال کے اندازے کے مطابق ۱۷۶۰ء اور ۱۷۶۴ء کے درمیان دلی میں ہوئی تھی[5] جس زمانے میں دلی مرہٹوں کی تاخت و تاراج کا مرکز بنی ہوئی تھی وہ وہاں سے ترک سکونت کر کے لکھنؤ چلے آئے اور آصف الدولہ کے یہاں ملازمت اختیار کر لی۔

---

[1] تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص ۱۱۴، ارباب نثر اردو ص ۱۴۵ اور انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۱۲

[2] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۲۶

[3] گل کرسٹ اور اس کا ادب ص ۲۰۰

[4] فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۰۴-۲۰۴

[5] انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۲۳

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

آصف الدولہ کے انتقال (۱۷۹۷ء) کے بعد وہ پٹنہ پہنچے۔ ۱۸۰۰ء کے اواخر میں وہ پٹنہ سے مرشد آباد منتقل ہو گیے، اس کے بعد ۱۸۰۱ء کے اوائل میں وہ حیدر آباد کے لئے روانہ ہوئے لیکن افسوس سے ملنے کی غرض سے کلکتہ میں رک گیے۔ یہاں ان کی ملاقات گل کرسٹ سے ہوئی جس کے ایما پر انھوں نے "گلشن ہند" لکھا۔ اس تصنیف پر انھیں کالج کی طرف سے انعام بھی ملا تھا۔ ۱۸۰۱ء کے اواخر میں وہ حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں ان کی بڑی آؤبھگت ہوئی۔ چنانچہ چار سو روپے ماہوار کی ملازمت کے ساتھ انھیں ریاست کی طرف سے سواری کے لیے ایک پالکی بھی عطا ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ تا عمر حیدر آباد ہی میں مقیم رہے۔ ۱۸۲۲ء میں وہیں ان کا انتقال ہوا۔

لطف اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، فارسی میں وہ بقول خود اپنے والد سے اصلاح لیتے تھے اور ریختہ میں کسی کے شاگرد نہیں تھے۔ شیفتہ مولف "گلشن بے خار" نے انھیں میر کا شاگرد بتایا ہے لیکن "سخن شعرا" کے مولف نساخ اس کی تردید کر چکے ہیں[۱]

لطف نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ جس میں غزلوں کے علاوہ دوسری اصناف سخن کے نمونے بھی شامل تھے لیکن شاعر کی حیثیت سے انھیں کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہیں۔ "گلشن ہند" ان کی واحد تصنیف ہے جو علمی و ادبی نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتی ہے اور جس کی بدولت تاریخ ادب میں آج بھی ان کا وقار قایم ہے۔ یہ علی ابراہیم خاں کے مشہور تذکرے "گلزار ابراہیم" کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا۔ لطف نے بقول خود اس کام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پہلی جلد "سلاطین نامدار" و "امرائے عالی مقدار" اور "شعرائے صاحب وقار" کے لیے جو "نام آور اور صاحب دیوان" تھے، مخصوص کی گئی تھی اور دوسری جلد میں "شعرائے گمنام و غیر مشہور و نو مشق" کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب اس تذکرے کی صرف پہلی جلد دستیاب ہے۔ دوسری جلد کا تا حال کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔ یہ جلد اول صرف اڑسٹھ (۶۸) شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ لطف نے اس میں علی ابراہیم خاں کے فراہم کردہ حالات اور کلام دونوں پر اہم اضافے کیے ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۰۶ء میں انجمن ترقی اردو کی جانب

---

[۱] بحوالہ ارباب نثر اردو ص ۱۴۷ اور انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۳۲۴

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

سے مولانا شبلی کی تصحیح اور مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ لاہور سے شائع ہوا تھا۔ دوسری مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اسے "گلزار ابراہیم" کے ساتھ ۱۹۲۴ء میں علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

نہال چند لاہوری:

نہال چند لاہوری کے متعلق بھی رام بابو سکسینہ، سید محمد، سید رفیق مارہروی، جاوید نہال اور نادم سیتاپوری نے لکھا ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے[1] لیکن یہ خیال بھی سراسر خلاف واقعہ ہے۔ اس غلط فہمی کا منبع دراصل نہال چند کی تصنیف "مذہب عشق" کا دیباچہ ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ "یہ خاکسار ڈیوڈ روبرٹ سن (David Robertson) بہادر کی خدمت میں سابق سے بندگی رکھتا تھا، انھیں کی دست گیری سے صاحب خداوند نعمت حاتم زماں، دستگیر درماندگاں، منبع جود و عطا، سرچشمۂ فیض و سخا، دریائے عنایت و کرامت بحر احسان و شجاعت، جناب گل کرسٹ صاحب بہادر مدظلہ اللہ تعالیٰ کے دامن تک رسائی ہوئی۔"[2]

گل کرسٹ تک رسائی پانے اور کالج کی ملازمت میں بڑا فرق ہے۔ مذکورہ بالا حضرات نے اسی فرق کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے دھوکا کھایا ہے۔ گل کرسٹ بہت سے ایسے مصنفین کو اپنے گرد جمع کر کے ان سے تصنیف و تالیف کا کام لینے آرہے تھے جن کا کالج سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ نہال چند کا یہ جملہ کہ "غرض صاحب بہادر کے تفضلات سے اس ضعیف کی اوقات بسر ہونے لگی اور آگے کو بھی امید بندھی۔"[3] اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ گل کرسٹ تک رسائی کے بعد انھیں وقتی طور پر کچھ راحت مل گئی تھی اور وہ کالج میں ملازمت کے لیے ان کے چشم کرم کے امیدوار تھے۔ عتیق صدیقی نے بھی انھیں کالج کے غیر ملازم مصنفین کے زمرے میں شامل کیا ہے۔[4]

---

[1] تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص ۱۱۰، ارباب نثر اردو ص ۲۰۰، داستانوں میں ص ۱۹۰۴، انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۹۲ اور فورٹ ولیم کالج اور کلام علی ص ۲۷۱

[2] مذہب عشق بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۲۶

[3] ایضاً ص ۲۲۴ [4] گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۰۰

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

نہال چند نے "مذہب عشق" کے دیباچے میں اپنے جس قدر حالات لکھے ہیں ابھی تک ان پر کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ ان کے نام کے بعد لاہوری اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ وہ لاہور کے باشندے تھے۔ لیکن ۱۲ستمبر ۱۸۰۲ء کے مراسلے میں گل کرسٹ نے انھیں بارا سوت کا متوطن قرار دیا ہے۔[1] "مذہب عشق" کے علاوہ ان کی کسی اور تصنیف کا پتا نہیں چلتا۔

"مذہب عشق" اس کتاب کا تاریخی نام ہے جس کے مطابق اس کا سال تصنیف ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء۔ ۱۸۰۲ء) قرار پاتا ہے۔ اس میں تاج الملوک اور گل بکاولی کا مشہور قصہ بیان کیا گیا ہے۔ دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزار نسیم" کا ماخذ نہال چند کی لکھی ہوئی یہی داستان ہے۔[2] یہ ۱۸۰۴ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس ترجمے پر انھیں ۵۰۰ روپے کا انعام بھی ملا تھا۔ یہ کتاب کالج کے نصاب میں شامل تھی۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ دوسری اور تیسری بار (افسوس اور روبک کی نظر ثانی کے بعد) کالج کی طرف سے شائع کی گئی۔

مرزا جان طپش:۔

عبیدہ بیگم لکھتی ہیں کہ "طپش ۔۔۔ ۱۸۰۸ء یں ۔۔۔ کالج کے شعبۂ ہندوستانی سے وابستہ ہو گئے"[3] آگے لکھتی ہیں "طپش غالباً ۱۸۱۱ء تک شعبہ سے وابستہ رہے"[4] لیکن انھوں نے ان بیانات میں کسی کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ طپش نے کبھی کالج کی ملازمت اختیار نہیں کی۔ کالج کے غیر ملازم مصنفین میں طپش ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کا اصل نام محمد اسمٰعیل عرف مرزا جان تھا۔ ان کے آبا و اجداد بخارا کے رہنے والے تھے جہاں سے ان کے ایک بزرگ تیمور کے حملے کے وقت ترک وطن کر کے ہندوستان آئے اور دلی میں آباد

---

[1] فورٹ ولیم کالج ص ۱۹۰

[2] نسیم کے مندرجہ ذیل اشعار اس حقیقت کے اعتراف پر دلالت کرتے ہیں ؎

افسانہ گل بکاؤلی کا ۔۔۔ افسوں ہو بہار عاشقی کا

ہر چند سنا گیا ہے اس کو ۔۔۔ اردو کی زبان میں سخن گو

وہ نثر ہے، داد نظم دوں میں ۔۔۔ اس مے کو دو آتشہ کروں میں

[3][4] فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۸۴

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ہو گیے تھے۔ ڈاکٹر طفیلن کے بقول طپش ۱۱۸۲ھ (۶۹-۱۷۶۸ء) میں دلی میں پیدا ہوئے۔[1] انھوں نے نشوونما اور تعلیم و تربیت بھی وہیں حاصل کی۔ اس کے بعد وہ مرزا جہاندار شاہ جواں بخت کی سرکار سے منسلک ہو گیے۔ جب امیر الامرا افراسیاب خاں کے خوف سے شاہزادہ موصوف نے دلی کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ کی طرف کوچ کیا (۲۳ جمادی الاول ۱۱۹۸ھ/۱۴ اپریل ۱۷۸۴ء) تو طپش بھی ان کے ہم رکاب تھے۔ ڈھائی برس لکھنؤ میں قیام کر کے وہ شاہزادے کے ساتھ اکتوبر ۱۷۸۶ء میں بنارس آئے۔ شاہزادے کے انتقال (۲۵ شعبان ۱۲۰۲ھ/۳۱ مئی ۱۷۸۸ء کے بعد انھوں نے بنارس سے مرشدآباد کا رخ کیا، اور عشقی کے بقول وہاں نواب ببر جنگ کی سرکار سے توسل کی بدولت "فراخی حال" کے ساتھ ان کی گزر اوقات ہونے لگی۔[2] مرشدآباد کے بعد طپش کی اگلی منزل ڈھاکا تھی جہاں انھیں شمس الدولہ سید احمد علی خاں نواب ڈھاکا کی مصاحبت کا شرف حاصل ہوا۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد ایک مقدمے میں ماخوذ ہو کر "بحکم صاحبان عالی شان کونسل" شہر کلکتہ میں محبوس کر دیے گیے۔[3] اس "بلائے ناگہانی" سے انھیں کئی برس کے بعد نجات حاصل ہوئی اور وہ کلکتہ ہی میں رہنے لگے۔ ۱۸۱۲ء میں وہ کلکتہ سے دلی چلے آئے اور غالباً وہیں ان کا انتقال بھی ہوا۔ اشپرنگر کے بقول ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۸۱۴ء سے قبل ان کی وفات ہو چکی تھی۔[4] قاضی عبدالودود کے مطابق ان کا انتقال غالباً ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء میں ہوا تھا۔[5]

طپش خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ اس کے علاوہ انھیں ساحل اور ہدایت اللہ خاں کی شاگردی کا بھی شرف حاصل تھا۔ ان کا شمار اپنے دور کے خوش گو شعرا میں ہوتا تھا۔ لیکن ان کا کلام قدیم روایات کا آئینہ دار ہے اور آج کے قارئین و ناقدین کے لیے جدت و ندرت کا کوئی پہلو نہیں رکھتا۔ لکھنؤ کے

---

[1] بحوالہ ارباب نثر اردو ص ص ۱۰-۲۰۹ لیکن جاوید نہال ان کی پیدائش ۱۷۶۰ء اور ۱۷۶۲ء کے درمیان بتاتے ہیں (انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۳۳۳)

[2] کلیم الدین احمد، دو تذکرے جلد دوم ص ۵۵۔

[3] ایضاً ص ۵۵

[4] بحوالہ ارباب نثر اردو ص ۲۱۲

[5] نقوش لاہور، اکتوبر ۱۹۵۸ء

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

زمانۂ قیام میں انھوں نے "مرزا جہاندار شاہ کے حکم سے اپنے دیوان کو مرتب کرکے اس کا تاریخی نام "گلزار مضامین" رکھا تھا۔[1]

کلکتہ میں دوران اسیری طپش نے ۱۸۰۲ء میں عنایت اللہ کنبوہ کی فارسی مثنوی "بہار دانش" کا منظوم اردو ترجمہ کیا اور اس کا نام بھی "بہار دانش" ہی رکھا۔ قید سے رہا ہونے کے بعد انھوں نے ارباب کالج کی مدح میں کچھ اشعار شامل کرکے ان کی نذر کی۔ اس پر انھیں کالج کی طرف سے پانچ سو روپے کا انعام بھی ملا تھا۔ یہ اس زمانے میں شائع نہیں ہو سکی۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں مطبع محمدی کلکتہ میں زیور طباعت سے مزین ہوئی۔

"شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان" طپش کی دوسری مشہور تصنیف ہے، جو ۱۲۰۷ھ (۹۳-۱۷۹۲ء) میں مکمل ہوئی تھی۔ یہ فارسی زبان میں اردو محاورات اور ضرب الامثال کا ایک مختصر لغت ہے جس میں بہ کثرت اردو اشعار بطور سند پیش کیے گیے ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۹ء میں مطبع آفتاب عالم مرشدآباد میں چھپا تھا۔ حال ہی میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے خدا بخش لائبریری کے جرنل کے ایک شمارے میں اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔

باسط خاں باسط:

باسط خاں شاہ عالم کے عہد حکومت میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی پیشہ سپہ گیری تھا۔ جب یہ پانچ برس کے ہوئے تو ان کے والد مردان خاں نے حالات کی ناسازگاری کی بنا پر دلی سے ترک وطن کرکے عظیم آباد (پٹنہ) کو اپنا مسکن بنایا تھا۔ باسط کی تعلیم و تربیت عظیم آباد کے صوبے دار کلیان سنگھ کے بیٹے کے ساتھ ہوئی تھی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ کچھ دنوں تک نواب دلاور جنگ کی سرکار سے وابستہ رہے، بعد ازاں ولزلی کے زمانے میں پٹنہ سے کلکتہ چلے گئے۔

وہاں ارباب کالج کی سرپرستی اور قدر دانی نے ان کے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ "اگر تو بھی کوئی قصہ لکھ کر سرکار بہادر کی خدمت میں گزارے تو تو بھی فیض پاوے"۔ چنانچہ انھوں نے ایک مجموعہ "گلشن ہند" کے نام سے تصنیف کرکے گل کرسٹ کی خدمت میں پیش کی۔

"گلشن ہند" چھوٹی چھوٹی حکایتوں اور قصہ حسن ملوک کا مجموعہ ہے، جس میں "گل وصنوبر"

---

[1] عبدالغفور نساخ، قطعۂ منتخب ص ١٦، بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۰۳، ۱۰۲

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کا قصہ بھی شامل ہے۔حسن ملوک کا قصہ اور حکایتیں طبع زاد ہیں۔ لیکن "گل وصنوبر" فارسی قصے کا ترجمہ ہے۔ "گلشن ہند" ۱۸۰۳ء میں ترتیب دی گئی تھی۔ کالج کی کارروائیوں میں اس کا نام "گل وصنوبر" ہی درج ہے۔ گل کرسٹ کے ۱۹ر اگست ۱۸۰۳ء کے مراسلے میں کتابوں کی جو فہرست شامل تھی اس میں اسے مطبوعہ قرار دیا گیا ہے[1] لیکن اس نے ۹ر ستمبر ۱۸۰۳ء کو جو فہرست پیش کی تھی اس میں "مکمل اور پریس میں جانے کے لیے تیار" کے زمرے میں اسے درج کیا ہے[2]۔ ان دونوں فہرستوں میں "گلشن ہند" کے لیے ستر روپیے انعام کی سفارش کی گئی تھی لیکن کونسل نے اس پر انعام دینا منظور نہیں کیا۔ یہ ہنوز شائع نہیں ہو سکی ہے۔

(ب) غیر معروف مصنفین

	نام	تصنیف	ماخذ	سال تالیف یا سال اشاعت	کیفیت
۱-	میر ابوالقاسم خاں	حسن اختلاط (مطبوعہ)	---	۱۸۰۳ء	گل کرسٹ نے اس پر پچاس روپے انعام کی سفارش کی تھی لیکن انھیں انعام کی کوئی رقم نہ مل سکی موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب اخلاقی ہے۔
۲-	توتا رام	قصۂ دل آرام دل ربا (مطبوعہ)	طبع زاد	۱۸۰۳ء	اس کے مطبوعہ نسخے کا کہیں پتا نہیں چلتا، البتہ قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔
۳-	شیخ محمد بخش[3]	(۱) دہ مجلس (ترجمہ) (غیر مطبوعہ)	دہ مجلس	۱۸۰۳ء	مظہر علی خاں ولا نے اس کی اصلاح کی تھی اور جن نظموں کا ترجمہ نثر میں کیا گیا تھا انھیں نظم میں منتقل کیا۔ اصلاح کا کام ۱۸۰۴ء میں مکمل ہوا۔
		(۲) قصۂ فیروز شاہ (مطبوعہ)	---	۱۸۰۳ء	اس تصنیف پر محمد بخش کو پچاس روپے بطور انعام ملے تھے۔
		(۳) قصۂ فرعون (غیر مطبوعہ)	---	۱۸۰۳ء	

[1] بحوالہ فورٹ ولیم کالج ص ۱۸۶ [2] ایضاً ص ۱۹۱

[3] ڈاکٹر جالبی بہار کا یہ خیال خلاف واقعہ ہے کہ شیخ محمد بخش ... دواور نا بکشیعے کے ملازم تھے۔ (انیسویں صدی میں بنگال کا اردو

نمبر	نام	تصنیف	ماخذ	سال تالیف یا سال اشاعت	کیفیت
۴-	شاکر علی	الف لیلہ (ترجمہ) (غیر مطبوعہ)	الف لیلہ	۱۸۰۳ء	
۵-	مرزا مغل لشاں	باغ سخن (غیر مطبوعہ)	بوستان سعدی	۱۸۰۳ء	اس ترجمے پر لشاں کو چار سو روپیے دیے گیے تھے۔
۶-	نور خاں	مثنوی کلکتہ مع قصۂ بلند اختر (غیر مطبوعہ)	- - -	۱۸۰۴ء	یہ ۱۱۸۳ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔
۷-	نور علی[1]	بہار عشق (ترجمہ) (غیر مطبوعہ)	نل دمن	۱۸۱۰ء	نور علی کو اس ترجمے پر کالج کی طرف سے پچاس ۵۰ روپیے عطا کیے گیے تھے
۸-	محمد علی	شہنامۂ ہندی (ترجمہ) (غیر مطبوعہ)	شمشیر خانی	۱۸۱۱ء	
۹-	مرزا ئی بیگ	بدیا درپن (ترجمہ) (غیر مطبوعہ)	اودھ بلاس	۱۸۱۶ء	اس کی لپی ناگری اور زبان ہندی ہے۔

[1] ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے نور علی کو شعبۂ ہندوستانی کے منشیوں میں شامل کیا ہے، جو درست نہیں۔ (فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۸۶)

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

دوسرا باب

دلّی کالج

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

دلّی کالج

قیام کے محرکات اور اغراض و مقاصد

دلی کالج ہندوستان کا دوسرا عظیم و وقیع تعلیمی و تصنیفی اور اشاعتی ادارہ تھا جو انگریزوں کی فکر رسا کے نتیجے کے طور پر معرض وجود میں آیا۔ اس ادارے سے ہندوستانی زبانوں بالخصوص اردو کو وہ فروغ ملا جو فورٹ ولیم کالج سے بھی نہ ملا تھا۔ اس لئے کہ فورٹ ولیم کالج میں جو کتابیں تالیف یا ترجمہ ہوئیں ان میں معدودے چند کو چھوڑ کر باقی قصہ اور کہانیوں پر مشتمل تھیں لیکن دلی کالج میں مختلف موضوعات مثلاً ادبیات، اخلاقیات، سائنس اور علوم جدیدہ تاریخ اور جغرافیہ، ریاضیات قانون، طب زراعت وغیرہ پر کتابیں تالیف، تصنیف اور ترجمہ ہوئیں۔ اس طرح مختلف موضوعات اور شعبہ ہائے زندگی سے اردو کی شناسائی ہوئی۔ اس اعتبار سے دلی کالج کا پلہ فورٹ ولیم کالج سے کہیں بھاری ہے۔ دونوں کالجوں کے قیام میں کوئی زیادہ وقفہ بھی نہیں۔ یہی کوئی پچیس سال کا۔ لیکن اس مختصر مدت میں دونوں کالجوں کے مقاصد قیام میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ولایت سے نوارد انگریز سول اور فوجی ملازمین کو ہندوستانی زبان بالخصوص اردو سے واقف کرانا تھا تاکہ وہ آسانی سے ہندوستانی باشندوں سے انفرادی اور سرکاری معاملات میں گفت و شنید کے ذریعے نہ صرف یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کو فروغ دے سکیں، بلکہ اس کی حکومت کو مضبوط و مستحکم اور پائیدار بنا سکیں لیکن اس کے بالعکس دلی کالج کے قیام کا مقصد ہندوستانی نوجوانوں کو مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم و فنون اور انگریزی زبان سے واقفیت بہم پہنچانا تھا۔ دلی کالج میں روز اول سے مشرقی زبانوں عربی، فارسی، سنسکرت اور اردو و ہندی کی تعلیم کا انتظام کما حقہ طور پر تھا۔ اس کالج نے اردو زبان

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

وادب کی جو بیش بہا خدمات انجام دیں ان سے انکار سورج کی روشنی سے انکار کے مترادف ہے۔

دلی کالج کے قیام میں دو جماعتیں نمایاں طور پر سرگرم نظر آتی ہیں۔ پہلی جماعت وہ تھی جو عیسائی افکار و نظریات کی حامل تھی، اس کا خیال تھا کہ اگر ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم دی جائے تو وہ اس کی وساطت سے عیسائیت کا مطالعہ کریں گے جیسے وہ آسانی سے قبول بھی کر سکتے ہیں۔ ولبر فورس (Wilberforce) اور چارلس گرانٹ اسی گروہ کے نمائندے تھے۔ ولبر فورس انگلینڈ کی پارلیمنٹ کا ایک سرگرم رکن تھا، جو مذہبی خیالات و نظریات سے سرشار اور اس زمانے کے عیسائیوں کی مذہبی، اخلاقی اور نیم سیاسی جماعت فرقۂ کلاپہم (clapham) کا نفس ناطقہ اور روح رواں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کمپنی ولایت سے لیسے تجربہ کار اشخاص ہندوستان بلائے جو مدرسی کے علاوہ مشنری کے فرائض بھی انجام دے سکیں۔ دوسری شخصیت چارلس گرانٹ کی تھی۔ چارلس گرانٹ پہلی بار اکیس برس کی عمر میں ۱۷۶۷ء میں کلکتہ آیا[1] اور ۷۰-۱۷۶۹ء کے قحط میں خرابیٔ صحت کی وجہ سے ولایت واپس گیا۔ دوسری بار ۱۷۷۳ء میں وہ کمپنی کے ملازم کی حیثیت سے ہندوستان آیا لیکن عیش عشرت کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے جلد ہی کافی مقروض ہو گیا علاوہ بریں اس کی دو بچیاں چیچک کی شکار ہو گئیں جس سے اس کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔ اس نے اوباشی اور بد اطواری سے توبہ کر لی اور رفتہ رفتہ گذشتہ گناہوں کی تلافی کے لیے وہ عیسائی مشنوں کی تبلیغی سرگرمیوں میں بہت زیادہ حصہ لینے لگا۔ بالآخر ۱۷۹۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر ولایت چلا گیا۔ وہاں اس کی ملاقات ولبر فورس سے ہوئی۔ یہ ملاقات گرانٹ کے مذہبی افکار و خیالات پر بہت اثر انداز ہوئی۔ گرانٹ نے ایک کتابچہ آبزرویشنز[2] (Observations) لکھا، جس میں اس نے ہندوستانیوں کو تبلیغ کے ذریعے عیسائی بنانے کی تجویز پیش کی اور اس کی پہلی منزل یہ بنائی کہ ہندوستان

---

[1] مالک رام، قدیم دلی کالج ص ۱۹

[2] کتابچہ کا پورا نام تھا۔ Observations on the state of Society among the Asiatic subjects of Great Britain, particularly with respect to morals; and the means of improving it.

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

میں انگریزی زبان کی تعلیم کا عام رواج ہونا چاہیئے۔ سید نور اللہ اور نایک کے حسب تحریر۔

"اس سلسلے میں برطانوی رائے عامہ کو موافق بنانے اور پارلیمنٹ کو ہندوستانی عوام کی تعلیم کی فوری ضرورت کا احساس دلانے میں "آبزرویشنس" (گرانٹ کے کتابچے) نے بڑا اہم رول ادا کیا۔ یہ کتاب ۱۷۹۷ء میں شائع ہوئی اور اس کی بہت سی جلدیں تقسیم ہوئیں۔ مشنریوں کے دوستوں نے اسے اپنے احتجاج کی بنیاد بنایا۔"[1]

دوسری جماعت وہ تھی جو الیسٹ انڈیا کمپنی کے قدیم اور اعلا ملازمین و کارپردازوں پر مشتمل تھی اور ہندوستان کے قیام کے دوران مشرقی زبانوں خصوصاً عربی اور فارسی سے بڑی حد تک واقف ہوگئی تھی، اس گروہ کی تجویز تھی کہ مشرقی زبانوں کے قدیم علمی و ادبی ذخیرے کو طبع کرا کے محفوظ کر دینا چاہیئے اور آئندہ ہندوستانی کالجوں اور مدرسوں میں ان زبانوں کی تعلیم و ترویج کا باقاعدہ انتظام ہونا چاہیے۔ نور اللہ اور نایک نے کمپنی کے ملازمین کی اس تجویز کا مجمل نقشہ یوں کھینچا ہے۔

"جس وقت مشنری انگلستان میں کمپنی کی تعلیمی پالسی میں تبدیلی کے لیے احتجاج کرتے تھے، اس وقت ہندوستان میں کمپنی کے حکام مشرقی تعلیم کی توسیع کے لئے جرأتمندانہ اقدام کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کلکتہ مدرسہ اور بنارس سنسکرت کالج (۱۱) دو اداروں کی حیثیت سمندر میں ایک قطرے کی سی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے علوم کی تباہی دیکھ کر انھیں دکھ ہوتا تھا اور وہ اس قدیم ملک کے کلاسیکی علوم کے احیاء اور فروغ کے لئے زیادہ موثر اقدام اور زیادہ مالی وسائل کی مانگ کر رہے تھے"[2]

اس طرح دلی کالج اور اس عہد کے دوسرے تعلیمی اداروں کے قیام کے دو مقاصد بین طور پر سامنے آتے ہیں۔ اولاً ہندوستانی درس گاہوں میں انگریزی تعلیم جاری کر کے ہندوستانیوں کو عیسائیت سے قریب لانا، جیسا کہ بعض عیسائی مبلغوں خصوصاً ولبر فورس اور چارلس گرانٹ کے خیالات سے پتا چلتا ہے۔ ثانیاً مشرقی علوم وابستہ کی از سر نو تعلیم و ترقی اور ان زبانوں کے مخطوطات کی طباعت و اشاعت، جیسا کہ کمپنی کے بعض قدیم اور اعلا ملازمین کی سفارشات سے ظاہر ہوتا ہے۔

---

[1] تاریخ تعلیم ہند ص ۸۰

[2] تاریخ تعلیم ہند ص ۸۱

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

اب دیکھنا یہ ہے کہ کس جماعت کی تجویز اور سفارش پر کمپنی نے تعلیمی ذمہ داری اپنے سر لی اور یہاں دلی کالج اور دوسرے تعلیمی ادارے قائم کیے گیے۔ اس امر سے مزید واقفیت کے لیے کمپنی کے ۱۷۹۳ء اور ۱۸۱۳ء کے چارٹر کا سرسری مطالعہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔

۱۷۹۳ء میں جب کمپنی کا چارٹر برطانوی پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو ولبر فورس نے پرجوش الفاظ میں کہا تھا کہ "قانون میں یہ لکھا جائے کہ کمپنی کا یہ فرض ہوگا کہ وہ وقتاً فوقتاً ولایت سے ایسے تجربہ کار اور اہل علم لوگوں کو ہندوستان بھیجتی رہے، جو مدرس اور مشنری کے فرائض سرانجام دے سکیں"[۱] اس لیے کہ اس سے ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کا کام شروع کیا جا سکے۔ لیکن کمپنی کے ڈائرکٹروں کی مخالفت سے یہ قانون منظور نہ ہو سکا۔ لیکن ۱۸۱۳ء میں جب کمپنی کا چارٹر تجدید کے لئے پیش ہوا تو پارلیمنٹ میں کافی گرما گرم بحث ہوئی۔ ۱۷۹۳ء میں مسئلہ صرف ایک تھا۔ لیکن اس بار دو مسئلے تھے ایک تو وہی جس کا سطور بالا میں ابھی ذکر ہوا ہے۔ دوسرا مسئلہ مشرقی علوم والسنہ کے ان محبوں اور واقف کاروں کا تھا، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے قدیم ملازم تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ کمپنی مشرقی علوم کی ترقی و ترویج میں ہاتھ بٹائے، جس کی صورت یہ ہو کہ پرانے علمی و ادبی سرمائے کو طبع کرا کے اسے محفوظ کر دیا جائے اور آئندہ سے ہندوستان کی بھی درس گاہوں میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ فریقین کے ان دونوں مطالبات اور تجاویز پر کافی بحث و تمحیص کے بعد دونوں جماعتوں کے مطالبات کسی قدر ترمیم و تغیر کے ساتھ تسلیم کر لئے گیے۔ پہلی جماعت کی تجویز کے مطابق عیسائی مبلغوں کو ہندوستان آنے اور یہاں تبلیغ کرنے کی پوری آزادی مل گئی، لیکن کمپنی پر اس کے اخراجات کی ذمہ داری کا مطالبہ منظور نہیں ہوا۔

دوسرے گروہ کے مطالبات کے لیے مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی گئی۔ یہی قرارداد بعد میں چارٹر کا ۴۳ واں سکشن بنی۔

"گورنر جنرل اِن کاؤنسل کا یہ حکم آئینی ہوگا کہ ۔۔۔ ہر سال ایک معتدبہ رقم (جو ایک لاکھ سے کم نہیں ہو گی) الگ نکالی جائے اور اسے (۱) ادب کے احیاء اور اس کی ترقی کیلئے (۲) پڑھے لکھے لوگوں کی ہمت افزائی کے لئے اور (۳) ہندوستان کے برطانوی

---

[۱] بحوالہ قدیم دلی کالج ص ۱۹

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

مقبوضات میں رہنے والوں کو سائنس کے علم سے متعارف کرانے اور اس کی ترویج کے لئے صرف کیا جائے۔" [1]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ چارلس گرانٹ اور ولبرفورس کے بیس سالہ احتجاج پر برطانوی پارلیمنٹ نے پانی پھیر دیا۔ کیوں کہ ان کے مطالبات میں کافی کاٹ چھانٹ ہوئی۔ یا یوں سمجھئے کہ عیسائی مبلغ کو ہندوستان آنے کی اجازت کے علاوہ ان کی کسی بات کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ واضح رہے کہ ۱۷۶۵ء کے بعد کمپنی نے عیسائی مبلغوں کے ہندوستان آنے اور مذہبی تبلیغ پر پابند لگادی تھی۔ اس سے پہلے وہ بلا جھجھک ہندوستان کے گوشے گوشے میں دندناتے پھرتے تھے۔ اس قرارداد کے نتیجے میں کمپنی کو ۱۷۶۵ء کی یہ پابندی اٹھا لینا پڑی۔

اس کے برخلاف مشرقی جماعت کے سارے مطالبات من و عن قبول کر لیے گیے، بلکہ اس میں کچھ اضافہ بھی کر دیا گیا، اور وہ یہ کہ "ہندوستان کے برطانوی مقبوضات میں رہنے والوں کو سائنس کے علم سے متعارف کرایا جائے" اس میں یہ اشتباہ پیدا ہو سکتا ہے کہ تجویز کا یہ جزو عیسائی مبلغوں کے منشا کے عین مطابق تھا۔ لیکن یہ خیال درست نہیں کیونکہ برطانوی پارلیمنٹ میں بھی مشرقی مکتب خیال سے متاثر ارکان موجود تھے اور انھوں نے محض ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہی اس شق کا اضافہ کیا تھا۔ جیسا کہ نور اللہ اور جے۔ پی۔ نایک کا خیال ہے۔

"اس سیکشن کے تجویز کرنے والے حقیقتاً مشرقی مکتب خیال سے متاثر تھے کیوں کہ وہی لوگ ادب (جس سے ان کا مطلب عربی اور سنسکرت کا کلاسیکی ادب تھا) کے احیا، اور اس کی ترقی اور پڑھے لکھے ہندوستانیوں کی ہمت افزائی کی بات کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انھیں مغربی سائنس کی تعلیم کی بھی فکر تھی۔ کیوں کہ اس زمانہ کے ہندوستانی عوام اس معاملے میں بالکل کورے تھے۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے برطانوی مقبوضات میں رہنے والوں میں سائنس کی ترویج کے لیے کوشش ہونی چاہیں۔" [2]

---

[1] تاریخ تعلیم ہند ص ۱۴

[2] تاریخ تعلیم ہند ص ۱۴

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی رعایا کی فلاح و صلاح گورنمنٹ کو منظور تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستانی نوجوانوں کو مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ اگر مغربی علوم اور سائنس کی تعلیم بھی دی جائے تو ان کی بصارت و بصیرت میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گی۔

لیکن ہندوستان کے بعض ارباب علم اور دانشوروں نے برطانوی پارلیمنٹ کے اس اقدام کو شعبدہ کاری اور بازی گری کا نام دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق انگریزوں نے مغربی علوم فنون کی تعلیم کو اپنی سیاسی حکمت عملی کے پیش نظر رواج دیا تھا، تاکہ ہندوستانی نوجوان مغربی علوم و فنون کی تعلیم کے حصول کے بعد انگریزی تہذیب و تمدن سے قریب آسکیں اور اگر یہ نہ بھی ہو تو انگریزی تہذیب اور حکومت سے جو بغض و بُعد اور مغائرت ہے اس میں کسی حد تک کمی آجائے، اس طرح انگریزی حکومت کی برتری اور سرپرستی انھیں گوارا ہو جائے گی۔

ان ہی نظریات و خیالات کا اعادہ مالک رام نے بھی کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں

"انھوں (انگریزوں) نے اندازہ کر لیا کہ بہت جلد انھیں باقاعدہ نظم و نسق کی تنظیم کے لیے یہاں کے باشندوں کی پوری مدد اور عملی تعاون کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس لئے انھوں نے حفظ ما تقدم کے طور پر دلی کالج قائم کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ نئی نسل کو مغربی علوم و فنون سے روشناس کرایا جائے، تاکہ وہ یورپی تہذیب و تمدن سے قریب ہوسکے، اور اس طرح خود انگریزی سیاست اور حکومت بھی ان کے لئے قابل برداشت ہو جائے۔ اس لیے اس کالج میں نہ صرف انگریزی زبان کی درس و تدریس کا انتظام کیا گیا، بلکہ یہاں بہت سی انگریزی کی علمی اور فنی کتابوں کے ترجمے بھی ہوئے۔ لیکن یہ سیاسی "شر" اردو زبان کے لیے بہت بڑے "خیر" کا منبع بن گیا۔"[1]

اگر مالک رام ہندوستان کی نئی نسل کو مغربی علوم و فنون سے روشناس کرانے کو "شر" سمجھتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ مغربی علوم و فنون سے واقف ہندوستانی انگریزی تہذیب و تمدن سے قریب ہوسکیں گے اور اس طرح انگریزی حکومت ان کے لئے قابل برداشت ہو جائے گی۔ تو یہ محض ان کا ذاتی خیال ہے، جو سراسر خلاف واقعہ ہے۔ انگریزوں کے ہر اچھے برے کام کو شبہہ کی نظر سے دیکھنا سراسر ناانصافی ہے۔ احقاق حق اور ابطال باطل بہر حال ہمارا وطیرہ ہونا چاہیے۔

---

[1] قدیم دلی کالج ص ۱۰-۹

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

مغربی علوم وفنون کے گرویدہ ہم آج نہیں ہوئے ہیں، انیسویں صدی کے اوائل ہی میں ہمیں ان کی اہمیت وافادیت کا احساس ہوگیا تھا۔ تحقیقی انکشافات اس بات کے شاہد ہیں کہ ہمارے بعض دوراندیش بزرگوں نے مغربی علوم کی تعلیم کا مطالبہ دلی کالج قائم ہونے سے پہلے ہی کیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی مذہبی درس گاہوں کی جگہ ایسے کالجوں کی مانگ کر رہے تھے جن میں سائنس اور مغربی علوم اور دوسرے مفید مضامین کی تعلیم وتدریس کا انتظام ہو۔ مزید برآں یہ کہ ان میں یورپی مدرسین ہی درس وتدریس کے فرائض انجام دیں، ہندوستانی نہیں۔

راجا رام موہن رائے کی قیادت میں ہندوستانیوں کی طرف سے ۱۱ دسمبر ۱۸۲۳ء کو ایک یاد داشت گورنر جنرل کو پیش کی گئی تھی۔ جس میں یہ کہا گیا تھا کہ کلکتے میں سنسکرت کالج کے قیام کی تجویز کو ختم کرکے گورنمنٹ کو چاہیے کہ "ایک ایسے روشن خیال اور ترقی پذیر تدریسی نظام کی ترویج کرے جس میں فلسفہ، ریاضی، کیمیا، اناٹومی اور دوسرے مفید مضامین شامل ہوں۔ اس کے اخراجات منظور شدہ رقم سے پورے کیے جا سکتے ہیں جو یورپ سے تعلیم یافتہ قابل افراد کو ملازم رکھنے اور کتابوں اور دوسرے ضروری ساز وسامان سے لیس کالج قائم ہونے پر صرف ہونے چاہئیں"[۱]

راجا رام موہن رائے کا مجوزہ ومتخیلہ کالج دلی کالج سے کوئی مختلف چیز نہ تھا۔ اور پھر جدید اور مغربی علوم کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا یہ نظریہ کہ "مغربی علوم کو اپنی زبان کے ذریعے پھیلائیں --- جدید سے جدید علم کے پڑھانے اور تحقیق کرنے کا سامان بہم پہنچائیں --- نئی چیزوں اور نئے خیالات کے لئے ہمیشہ دروازہ کھلا رکھیں"[۲] کیا معنی رکھتا ہے؟

فورٹ ولیم کالج یقیناً انگریزوں نے محض اپنی سیاسی کامیابی کے پیش نظر قائم کیا تھا۔ اس کے قیام میں ہندوستانیوں کے مفاد کا سر مو بھی دخل نہ تھا لیکن دلی کالج صرف ہندوستانیوں کی فلاح وبہبود کی خاطر قائم کیا گیا تھا۔ کیوں کہ (۱) ۱۷۹۳ء کے چارٹر کی بحث کے دوران ولبرفورس کی یہ تجویز کہ کمپنی ہندوستان میں ایسے اشخاص کو بلائے جو یہاں مدرسی اور مشنری کی انجام دہی میں چاق وچوبند ہوں لیکن کمپنی کے ڈائرکٹروں کی مخالفت سے برطانوی پارلیمنٹ نے اس کے اس مطالبے

---

[۱] W.H Sharp's Selections from Educational Records, Pt. 1, P. 101

[۲] مرحوم دہلی کالج ص ۱۷۴

کو مسترد کر دیا اور اس کی اشک شوئی کے لیے ۱۸۱۳ء میں اسے صرف جزوی طور پر منظور کیا، جس کا گذشتہ اوراق میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں مشرقی جماعت کے مطالبات ڈائرکٹروں کی مخالفت کے باوجود پہلی ہی پیشی میں منظور کر لیے گیے۔ (۲) ۱۷۹۳ء سے پہلے عیسائی مبلغوں اور پادریوں کے ہندوستان آنے اور مذہبی تبلیغ پر پابندی لگادی تھی۔ لیکن مشرقی زبان و ادب کی ترویج و ترقی اور تشویق کے لیے ارباب کمپنی اپنا تعاون پیش کر رہے تھے، مثلاً" وارن ہیٹنگز نے ۱۷۸۰ء میں کلکتے میں مدرسہ عالیہ اور جوناتھن ڈنکن (Jonothan Duncam) نے ۱۷۹۱ء میں بنارس میں سنسکرت کالج قائم کیا تھا"[۱] (۳) دلی کالج کے پرنسپل وہ لوگ کبھی نہیں بنائے گیے جن کا تعلق مغربی جماعت سے تھا یا ولبرفورس اور چارلس گرانٹ کے ہم نوا تھے، بلکہ اس کے علی الرغم مشرقی ادب والسنہ کے واقف کار اور قدر شناس اور اس تحریک کے فعال اشخاص ہی اس کے پرنسپل بنائے گئے، جن کی گراں قدر خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ مسٹر ٹیلر، فلیکس بوترو اور ڈاکٹر اشپرنگر نے مشرقی زبان و ادب کی جو بے لوث اور مہتم بالشان خدمات انجام دی ہیں ان سے کون انکار کی جرأت کر سکتا ہے؟

اپنے اس موقف کی مزید توضیح کے لیے ہم چند ہندوستانی مورخوں اور دانشوروں کی رائیں پیش کریں گے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ دلی کالج کے قیام میں انگریزوں کا مطمح نظر کیا تھا۔ دورِ حاضر کے ممتاز مورخ ڈاکٹر ایشوری پرشاد جو مسلم فرماں رواؤں اور انگریز حکمرانوں سے متعلق منصفانہ تحقیق اور غیر جانب دارانہ انکشافات کے لیے مشہور ہیں، لکھتے ہیں۔

> "کمپنی نے سب سے اول تقریباً ایک لاکھ روپیہ ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے منظور کیا، رقم اگرچہ بڑی نہ تھی، لیکن اس سے اتنا تو ضرور ثابت ہو گیا کہ رعایا کی حالت کا بہتر بنانا گورنمنٹ کا فرض ہے۔"[۲]

سید نور اللہ اور نائیک معترف ہیں کہ۔

---

[۱] اس کے ایک سو سے زائد طلبہ کو تین تین روپے کا ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا

[۲] نور اللہ اور نائیک، تاریخ تعلیم ہند ص ۶۱

[۳] A New History of India Revised Edition (Urdu) P. 431-32

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

"۔۔۔ کمپنی کی تبدیلی مذہب کی ان سرگرمیوں کا ہندوستان کی تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اور پھر ہندوستان میں تعلیم کی جو جدید تحریک ۱۸۱۳ء کے چارٹر سے شروع ہوئی اس میں ان سرگرمیوں کا کوئی حصہ نہیں تھا۔"[1]

ڈبلیو۔ ایچ۔ شارپ نے بھی اس دفعہ کو ہندوستانیوں کے حق میں بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اس دفعہ (۴۳) کے معنی یہ تھے کہ کمپنی ایک لاکھ روپیے کی اس رقم کو صرف کرنے کے لئے خود اپنی ایک ایجنسی قائم کرے اور ہندوستانیوں کو مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیوں اور دوسری انقلابی تجویزوں کے برخلاف ایک غیر مذہبی اور پرانے مروجہ ڈھنگ سے تعلیم دینے کی کوشش کرے۔ اس تجویز کی تائید کرنے والوں کا خیال تھا کہ مشرق ومغرب دونوں کی سائنس کی پرورش اور آبیاری کے ذریعے مشنری تنظیموں کے طوفان کو روکنے کے لیے ایک قابل اعتماد اور مضبوط بند کی تعمیر ہو سکے گی۔"[2]

خواجہ احمد فاروقی تحریر فرماتے ہیں۔

"دلی کالج انگریزوں کی اس تعلیمی پالسی کی بدولت وجود میں آیا جس پر مشرقی علوم کے حامی (Orientalists) عمل پیرا تھے اور جو اس وقت جنرل تعلیمی کمیٹی پر چھائے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ یورپ میں ہندوستانی علم کی دید و دریافت کی بڑی قدر تھی۔۔۔ بعض برطانوی حکمراں ہندوستانی علوم کی سرد بازاری پر آزردہ تھے اور ان کا احیا چاہتے تھے۔"[3]

اس سلسلے کی آخری اور اہم ترین شہادت اس عہد کے گورنر جنرل لارڈ منٹو کی ۶ مارچ ۱۸۱۱ء کی لکھی ہوئی وہ سفارشی یادداشت ہے جس نے ۱۸۱۳ء کے چارٹر کی دفعہ (۴۳) کو منظور کرانے میں دم عیسیٰ اور ید بیضا کا کام کیا تھا۔ کمپنی کا یہ سب سے زیادہ بااختیار افسر مشرقی علوم کا لٹنا دل دادہ اور ان کے انحطاط و تنزل سے کس قدر آزردہ و رنجیدہ تھا اس کا اندازہ اس کے اس بیان سے کیا جا

---

[1] تاریخ تعلیم ہند ص ۵۸

[2] Selections from Educational Records Pt. 1 P. 22

[3] مقدمہ ماسٹر رام چندر ص ۴

سکتا ہے ۔

" یہ ایک عام خیال ہے کہ ہندوستان میں سائنس اور ادب روبہ زوال ہیں ۔ میں نے اس دل چسپ موضوع پر جتنی بھی تحقیقات کیں مجھے اس خیال کا بہت واضح اظہار ملا۔ صرف یہی نہیں کہ پڑھے لکھوں کی تعداد کم ہوگئی ہے بلکہ ان لوگوں کے لیے جواب بھی علمی کاموں میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں، علوم کا دائرہ محدود ہوتا جارہا ہے مجرد علوم (سائنسز) متروک ہوچکے ہیں ، ادب لطیف نظر انداز ہوتا جارہا ہے ۔ اور عوام کے مخصوص مذہبی نظریات سے متعلق علوم کے علاوہ علم کی تمام دوسری شاخیں بے توجہی کا شکار ہو رہی ہیں ۔ اس صورت حال کا فوری اثر یہ ہورہا ہے کہ بہت سی قابل قدر کتابیں بے مصرف ہوگئی ہیں یا سرے سے ضائع ہوچکی ہیں ۔ یہ سمجھنے اور محسوس کرنے کی بات ہے کہ اب اگر حکومت نے مشفقانہ دست گیری نہ کی تو علم و ادب کا احیا کتابوں کے فقدان یا کتابوں کے سمجھانے والوں کی کمی کی وجہ سے ناممکن ہوجائے گا۔

ہندوستانی ادب کی اتنی زبوں حالت کیوں ہوئی اس کا خاص سبب ادب کی اس ہمت افزائی کی کمی میں ملے گا جو پہلے دیسی حکومتوں کے حکمران راجوں مہاراجوں اور امیر افراد کی طرف سے ہوا کرتی تھی ۔ ایسی ہمت افزائی مطالعے اور دوسری ادبی کاوشوں کے لیے زبردست محرک ہوتی ہے ۔ خاص طور سے ہندوستان میں جہاں علمی کام کرتے والوں کو کوئی اور معقول سہارا نہیں ملتا ۔

یہ بات بہت قابل افسوس ہے کہ ایک قوم جو اپنی سلطنت کے دوسرے حصوں میں شعر و ادب سے محبت اور اس کی کامیاب پرورش کے لیے ممتاز ہو، وہ ہندوؤں کے ادب کی مشفقانہ خبر گیری اور یورپ کے علما کے سامنے اس ادب کے ذخائر کو کھولنے کے لیے امداد دینے میں ناکام ہو" [1]

لارڈ منٹو کی اس سفارش پر جو سراسر مشرقی علوم والسنہ کی حمایت میں تھی، کلکتہ ریویو کے ایک مقالہ

---

[1] بحوالہ تاریخ تعلیم ہند ص ۸۲-۸۱

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

نگار نے طنز کیا تھا کہ "لارڈ منٹو کی یادداشت تمام تر ہندوستانی علوم کا مرثیہ ہے، اس میں ہندوستان کے عیسائی وائسرائے نے مغربی علوم کی حمایت میں ایک اشارہ بھی نہیں کیا ہے[1]۔"

کمپنی پر ہندوستان کی تعلیمی ذمہ داری اس کے منشا کے خلاف زبردستی تھوپی گئی تھی۔ ریورنڈ ڈف (Rev. A Duff) کے بقول "تعلیمی پالیسی ہم نے شروع نہیں کی، دراصل یہ سر منڈھ دی گئی۔"[2] کیوں کہ ان دنوں تعلیم خود انگلستان میں بھی اسٹیٹ کی ذمہ داری نہیں تھی۔ اس لیے فطری طور پر کمپنی ہندوستان میں اس ذمہ داری کو قبول کرنا نہیں چاہتی تھی۔ دوسرے یہ کہ کمپنی کو رفاہ عام کے مقابلے میں مالی منفعت زیادہ عزیز تھی، اس لیے وہ ایسی ہر ذمہ داری سے کتراتی تھی جس سے اس کے منافع میں کمی کا اندیشہ ہو۔ تیسرے یہ کہ ہندوستانیوں نے خود اس سلسلے میں کمپنی سے کبھی کوئی مطالبہ بھی نہیں کیا تھا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہرج سے سب سراسیمہ حال اور پریشان تھے۔ ان کے پیش نظر اس وقت بہتر ملکی نظم و نسق کے سوا اور کچھ نہ تھا، حکمرانوں کے سامنے اپنی تعلیم و تہذیب کی بقا کے لیے لب کشائی ان کی ہمت اور جرأت سے بالاتر تھی۔

اس صورت حال کی بنا پر دس برس تک چارٹر کی دفعہ (۴۳) پر عمل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ پہلی بار ۱۷ جولائی ۱۸۲۳ء کو گورنر جنرل (لارڈ ہٹنگز) نے ایک قرارداد کے ذریعے اس تجویز کو عملی شکل دینے کے لیے اقدام کیا،[3] اور General committee of Public Instruction (مجلس تعلیمات عامہ) کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ اس کمیٹی کا سکریٹری ڈاکٹر ولسن (Dr. H. H. Wilson) کو مقرر کیا گیا۔ جو سنسکرت کا عالم اور مشرقی علوم کا حامی تھا۔[4] اور اس کمیٹی سے متعلق و ملحق مجلسیں (Local committees) دلی اور دیگر برطانوی مقبوضات میں بھی قائم کی گئیں۔ مجلس تعلیمات عامہ کا صدر مقام کلکتہ رکھا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ تجویز بھی رکھی

---

[1] بحوالہ ماسٹر رام چندر ص ۱۴

[2] بحوالہ ذوق جستجو ص ۲۴۶

[3] نور اللہ و نایک، تاریخ تعلیم ہند ص ۹۲

[4] ذوق جستجو ص ۲۴۶

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

گئی کہ منجملہ اور جگہوں کے دلی میں بھی ایک اعلا پیمانے کی مشرقی درس گاہ قائم کی جائے۔ اس کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ دلی، آگرہ، بریلی وغیرہ مقامات کا تعلیمی جائزہ لیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان مقامات میں تعلیمی سرگرمیوں کی کیا کیفیت ہے اور جو مدارس چل رہے ہیں ان کی حالت کیسی ہے۔ اس سلسلے میں مجلس تعلیمات عامہ نے جو اقدام کئے ان کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں :

(General committee of Public instruction) ۱۸۲۳ء کے اواخر میں مجلسِ تعلیم عامہ نے ایک مطبوعہ گشتی چھٹی دلی، آگرہ اور دوسرے مقامات کی مقامی مجلسوں کے نام جاری کی، جس میں ان اضلاع کے تعلیمی حالات دریافت کیے گیے تھے۔ نیز یہ بھی دریافت کیا گیا تھا کہ ان مقامات میں توسیع و ترقی تعلیم کے لئے کیا کیا وسائل اور ذرائع اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے استفسارات یہ تھے کہ ان اضلاع کے قصبات و دیہات میں کون سے مکتب یا تعلیم گاہیں ہیں۔ ان میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور کون کون سی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان میں سے کون کون سے مدارس سرکاری امداد و اعانت کے مستحق معلوم ہوتے ہیں اور اس امداد کی کون سی صورت زیادہ مناسب اور بہتر ہوگی۔ ان سب امور کے بیان کرتے کے بعد یہ اطلاع بھی دی گئی کہ گورمنٹ کا منشا دلی میں کالج قائم کرنے کا ہے[1]۔"

دلی کی مقامی مجلس کے سکریٹری جوزف ہنری ٹیلر تھے۔ مسٹر ٹیلر اور دیگر ارکانِ مجلس نے پوری مستعدی کے ساتھ دلی کا تعلیمی جائزہ لیا اور ایک مبسوط رپورٹ تیار کی، جو جنوری ۱۸۲۴ء میں گورنمنٹ کو پیش کی گئی۔ اس رپورٹ کے خاص خاص امور یہ تھے۔

دلی میں مسلمانوں کے بہت سے مدرسے قائم ہیں، لیکن ان میں سے کسی کی بھی حالت بہتر نہیں جس کی وجہ سرمائے کی قلت ہے۔ ان مدارس میں عربی فارسی کی تعلیم ہوتی ہے۔ طلبہ کا بیشتر وقت حفظ قرآن اور فقہی تعلیم میں صرف ہوتا ہے۔ ان مدارس میں جس نہج پر تعلیم دی جاتی ہے اس سے برائے نام ہی فائدہ ہوتا ہے اس لیے طلبہ کی تعداد بھی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ حاضری

[1] مرحوم دلی کالج ص ۳۔۴

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کا کوئی خاص لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ چونکہ اب وہ مخیر حضرات جن کی داد و دہش اور جود و نوازش سے یہ مدرسے چلتے تھے اب انقلاب زمانہ کے ہاتھوں وہ خود نان شبینہ کے محتاج ہیں اس لیے ان مدرسوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے۔ شہر کے علما و فضلا دربدر خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ نیز جو مدرسے حکومتِ وقت کی طرف سے قائم تھے سیاسی اتھل پتھل کی وجہ سے ان کا انتظام بھی درہم برہم ہو گیا ہے۔ ان رقوم کا از سر نو جاری ہونا بھی ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ مجلس نے یہ مشورہ بھی دیا کہ دلی میں جلد از جلد ایک اعلا درجے کا مدرسہ قائم کیا جائے جس میں اعلا قابلیت کے مدرسین مقرر کیے جائیں۔ مجلس نے بالخصوص مدرسہ غازی الدین خاں کا ذکر کیا تھا کہ اس مدرسے کی حالت تو اور بھی خراب ہے، عمارت خستہ و شکستہ اور مرمت طلب ہے اور تعلیم کا حال اس سے بھی بدتر ہے۔ مسٹر ٹیلر کی رپورٹ کے مطابق ۱۸۲۴ء میں مدرسہ غازی الدین میں نو طلبہ تھے اور مولوی عبداللہ ان کو درس دیتے تھے[1]

رپورٹ کا اختتام دلی کی عظمت رفتہ و حشمت گذشتہ کی یاد دہانی اور موجودہ ویرانی کی طرف انعطافِ توجہ کے ساتھ وہاں کالج قائم کرنے کی پر زور اور دردمندانہ اپیل پر ہوا ہے۔ اس کا یہ حصہ بطور خاص ملاحظہ طلب ہے۔

"جب آپ کی کمیٹی کے ارکان اس ملک کے گذشتہ عہد کے عروج اور شان و شوکت کو یاد کریں گے جبکہ دلی اس کی عظیم الشان اور وسیع سلطنت کا شان دار دار الخلافہ تھی، جو علوم و فنون کی سرپرستی اور ہنر پروری کے لیے چار دانگ عالم میں مشہور تھی اور اس کے زرخیز اور خوش حال خطوں کے فرزند علم کے شوق میں اس مشرقی علوم کے کے گہوارے میں جوق جوق آتے تھے اور جہاں ایسے ایسے شاعر اور حکیم پیدا ہوئے ہیں جن کے نام اب تک تاریخ کے صفحات پر یادگار ہیں۔ اور پھر جب آپ کے ارکان اُن بے شمار تعلیم گاہوں کے کھنڈروں کو خیال کریں گے جو ان شاہانہ فیاضیوں کے آثار ہیں جو علم کی اشاعت اور ترقی کے لیے وقف تھیں اور اب خراب خستہ اور شکستہ حال ہیں۔ اور جب وہ گذشتہ عہد کی ان مقدس علمی یادگاروں کو دیکھیں گے

---

[1] خواجہ احمد فاروقی، ذوق و جستجو ص ۲۲۰

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

جن پر اب ویرانی و بے کسی برستی ہے اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں تو ہمیں یقین ہے کہ آپ کے ارکان کے دلوں میں دلی کی ہمدردی کا جوش پیدا ہوگا اور آپ، جن کے ہاتھوں میں رعایا کی دماغی ترقی و اصلاح کا کام تفویض کیا گیا ہے، ضرور دلی کے لئے اس عطیے کا ایک حصہ مخصوص کریں گے جو گورنمنٹ نے اس غرض کے لئے منظور کیا ہے۔[1]

جنرل کمیٹی نے یہ رپورٹ مع اپنی سفارش کے انگلینڈ بھیج دی۔ برطانوی پارلیمنٹ نے اسے صرف منظوری ہی عطا نہیں کی بلکہ دلی میں ایک کالج کے قیام کا حکم صادر کر دیا اور لکھا کہ غازی الدین خاں کے مدرسے کی عمارت میں کالج قائم کیا جائے چونکہ اس مدرسے کی عمارت بوسیدہ ہو چکی تھی اور فوری توجہ کی محتاج تھی اس لیے اس کی مرمت کے لیے بھی کچھ روپے خرچ کرنے کی اجازت دی گئی۔

---

[1] بحوالہ مرحوم دہلی کالج ص

زمانۂ قیام کی تاریخ

برطانوی پارلیمنٹ کے فرمان کی تعمیل میں ۱۸۲۵ء میں غازی الدین خاں کے مدرسے میں "دلی کالج" کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ مسٹر جوزف ہنری ٹیلر، جو دلی مقامی مجلس کے سکریٹری تھے، اس کے عارضی پرنسپل، کالج کی انتظامیہ کمیٹی کے سکریٹری اور سپرنٹنڈینٹ مقرر ہوئے [۱] ان کا ماہانہ مشاہرہ ایک سو پچھتر روپیے طے پایا، جو بعد میں بڑھ کر تین سو روپیہ ہوگیا [۲] ایک سو بیس روپیے پر ایک ہیڈ ماسٹر، پچاس پچاس روپیے پر دو مدرسین اور باقی منشی تیس تیس اور پچیس پچیس روپیے ماہانہ پر ملازم رکھے گیے۔ شروع میں کالج کے پورے مصارف کے لیے محض چھ ہزار روپیے سالانہ مقرر ہوئے تھے اور صرف مشرقی علوم والسنہ کی تعلیم ہی کا انتظام تھا۔ طالب علموں کی امداد اور ہمت افزائی کی غرض سے پہلے سال تین تین روپے ماہ وار کے نواسی ۸۹ وظائف بھی جاری کیے گیے تھے [۳]

ایک سال کے بعد یعنی ۲۶ جولائی ۱۸۲۶ء کو گورنر جنرل نے ایک رپورٹ پیش کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک سال کے عرصے میں کالج نے نمایاں ترقی کی اور طلبہ کی تعداد بڑھتے بڑھتے ایک سو بیس ہوگئی۔ ۱۸۲۷ء میں طلبہ کی مجموعی تعداد ۲۰۴ تک پہنچ گئی تھی [۴]

کالج کی مجلس انتظامیہ:-

کالج کی دیکھ بھال اور فلاح و بہبود کے لیے ایک کمیٹی کا قیام ضروری تھا۔ چنانچہ دلی کی مقامی

---

[۱] مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج ص ۶ - ۵

[۲] ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کا یہ بیان درست نہیں کہ مسٹر ٹیلر کالج کے پرنسپل نہیں تھے، بلکہ اس کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور ان کو ایک سو پچاس روپیے ماہانہ الاونس ملتا تھا اور پرنسپل کو سو روپیہ دیا جاتا تھا۔ (ذوق جستجو ص ۲۴۶)

[۳] خواجہ احمد فاروقی۔ مقدمہ ماسٹر رام چندر۔ ص ۱۳

[۴] خواجہ احمد فاروقی۔ ذوق جستجو ص ۲۴۶

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

مجلس ہی کو کالج کی مجلس انتظامیہ میں تبدیل کر دیا گیا لیکن اس کے اختیارات محدود تھے۔ تمام انتظامی اور تعلیمی امور کے لیے لفٹنٹ گورنر کی منظوری لازمی تھی لیکن اکثر و بیشتر یہی ہوتا کہ کالج کی فلاح و بہبود سے متعلق مجلس انتظامیہ جو رائے دیتی تھی اسے منظور کرلیا جاتا تھا۔ مجلس تعلیمات عامہ مجلس انتظامیہ کی رائے سے اختلاف کی مجاز تھی لیکن ایسا موقع شاذ و نادر ہی آیا ہوگا کہ مجلس انتظامیہ کی رائے کو ٹھکرا دیا گیا ہو۔

مجلس انتظامیہ کا صدر کوئی سرکاری افسر اور کالج کا پرنسپل اس کا سکریٹری ہوتا تھا۔ شروع میں کمیٹی کے مندرجہ ذیل عہدہ دار وارکان تھے۔

۱۔ صدر۔ سرٹی۔ مٹکاف (دلی کے ریزیڈنٹ کمشنر)

۲۔ سکریٹری۔ جے۔ ایچ۔ ٹیلر (کالج کے عارضی پرنسپل)

۳۔ رکن۔ مسٹر کالون (جوائنٹ مجسٹریٹ دہلی)

۴۔ ڈاکٹر راس (سول سرجن دہلی)

بتدریج کمیٹی کے ارکان میں اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ ۱۸۵۵ء-۱۸۵۴ء میں ان کی تعداد بڑھ کر نو ہوگئی تھی، جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔ صدر۔ جے۔ پی۔ ہورٹر (مجسٹریٹ و سکریٹری دہلی)

۲۔ سکریٹری۔ جے۔ کارگل (پرنسپل دلی کالج)

۳۔ رکن۔ سرجے۔ تھیوفلس (اسسٹنٹ مجسٹریٹ دہلی)

۴۔ کیپٹن آر۔ سی۔ ڈگلس

۵۔ " ۔ مفتی صدرالدین آزردہ (صدرامین اعلا دہلی)

۶۔ " ۔ نواب حامد علی

۷۔ " ۔ سائمن فریزر۔ (کمشنر دہلی)

۸۔ " مسٹر۔ آر۔ بی۔ مورگن (سول اینڈ سشن جج دہلی)

۹۔ " ۔ پی۔ اے۔ ایجرٹن (مجسٹریٹ و کلکٹر دہلی)[1]

---

[1] مرحوم دہلی کالج ص ۱۱۶-۱۱۵

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کالج میں انگریزی یا مغربی شعبے کا قیام :-

دلی کالج قائم کرنے کا مقصد مشرقی علوم کی ترویج و ترقی کے ساتھ ساتھ مغربی علوم فنون سے ہندوستانیوں کو واقف کرانا تھا۔ اس لیے سر چارلس ٹی۔ مٹکاف ریزیڈنٹ دہلی کی سفارش پر ۱۸۲۸ء میں انگریزی شعبے کا اضافہ کیا گیا اور اس کے لیے الگ سے تین ہزار سالانہ کی رقم منظور کی گئی۔ اس طرح کالج میں دو شعبے قائم ہو گیے۔ ایک مشرقی اور دوسرا مغربی یا انگریزی شعبہ[1]

اس ابداع و اختراع سے دلی میں بڑا ہنگامہ برپا ہوا۔ ہندو اور مسلمان دونوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اور ان کے بزرگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ اقدام ہمارے نوجوانوں کو مذہب سے برگشتہ کرنے اور در پردہ عیسائیت کی تبلیغ کی غرض سے کیا گیا ہے۔ اس سے قبل ڈیوڈ ہیر نے راجہ رام موہن رائے کی مدد سے کلکتے میں ہندو کالج قائم کیا تھا، اس کے خلاف بھی بنگال میں زبردست شورش برپا ہوئی تھی لیکن وہاں راجا رام موہن رائے جیسا دور اندیش، روشن خیال اور زبردست رہنما موجود تھا، اس لیے یہ ہنگامہ اٹھا تو سہی مگر چند ہی دنوں میں کافور ہو گیا۔ دلی میں بھی یہ طوفان زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ رفتہ رفتہ ہندوستانیوں کا یہ سوئے ظن حسن ظن میں تبدیل ہو گیا اور ہندوستانی طلبہ مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم و فنون اور انگریزی زبان کا بھی مطالعہ کرنے لگے۔ حتیٰ کہ انگریزی شعبہ علاحدہ ہونے پر ہندوستانی طلبہ مشرقی شعبہ چھوڑ چھوڑ کر انگریزی شعبے میں داخلہ لینے لگے۔ اس کے انسداد کے لیے مشرقی شعبے کے وظائف بند کرنے کی دھمکی بھی دی گئی تھی۔ غالباً یہ زمانہ ۲۱-۱۸۳۰ کا رہا ہو گا۔

اعتماد الدولہ کا صدقۂ جاریہ :-

شاہ اودھ کے وزیر اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں نہایت شریف، منکسر المزاج، اتقا اور دریا دل انسان تھے۔ خدمت خلق اور خدا ترسی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وہ صدقۂ جاریہ کے طور پر ایک رقم محفوظ کر کے اس کے ذریعے دلی کے مسلمان طلبہ کے لیے عربی، فارسی اور دینی تعلیم کی ایک درس گاہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد سے انھوں نے ۱۸۲۹ء میں ایک لاکھ ستر ہزار روپیے کی خطیر رقم

---

[1] مشرقی شعبے میں قدیم مشرقی زبانیں مثلاً عربی، فارسی، اور سنسکرت اور مغربی شعبے میں انگریزی زبان اور یورپ کے جدید علوم کے علاوہ جدید ہندوستانی زبانیں بھی پڑھائی جاتی تھیں۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

حکومت کو تفویض کی اور کہا کہ اس کی صورت وقف کی ہوگی اور یہ رقم گورنمنٹ کے پانچ فیصد والے قرض میں لگادی جائے جس کے منافعے سے درس گاہ کا خرچ پورا ہوسکے۔ گورنمنٹ نے یہ رقم شکریہ کے ساتھ قبول کرلی لیکن مجلس تعلیمات عامہ نے نواب صاحب سے یہ گزارش کی کہ اتنی رقم سے ایک اعلا درجے کے مدرسے کا خرچ پورا ہونا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اس لیے نیا مدرسہ قائم کرنے کی بجائے اسے دلی کالج کی آمدنی میں شامل کرلیا جائے جس کے لئے گورنمنٹ نے منظوری بھی دی ہے اور یہ کالج ۱۸۲۵ء سے قائم بھی ہے جس میں مشرقی علوم کی تعلیم کماحقہٗ دی جارہی ہے۔ اگر آپ یہ تجویز قبول کرلیں گے تو گورنمنٹ کالج کے معاملات کے افسر سمجھے جائیں گے اور پروفیسروں اور عالب علموں کا تقرر آپ کے نام سے کیا جائے گا۔ بہرحال انھوں نے اس مشورے کو بسروچشم قبول کرلیا اور ۱۸۳۰ء میں ایک وصیت لکھوائی۔

"۔۔۔ میں ایک لاکھ ستر ہزار کی رقم نیک نیتی سے اس کالج کی امداد کے واسطے برٹش گورمنٹ کی تحویل میں چھوڑتا ہوں جو نواب غازی الدین خاں مرحوم نے میرے وطن دہلی میں عربی و فارسی علوم کی ترقی و تعلیم کے واسطے قائم کیا تھا۔ جو میرے مذہبی علوم ہیں اور اخلاق کے سرچشمے ہیں۔ اور میں وصیت کرتا ہوں کہ رقم موقوفہ کا منافع ان علوم کے طلبا اور اساتذہ پر خرچ کیا جائے۔[1]"

گورنمنٹ نے ان کی اس دریا دلی اور فیاضی کے اعتراف میں ایک کتبہ[2] کالج کے اندرون صحن کے صدر دروازے کی اوپری منزل پر نصب کرایا۔ اس وقت سے کالج نے بڑا عروج پایا کیوں کہ اس کالج کی آمدنی یک بارگی دگنی ہوگئی۔ اس عطیے کی رقم کے سود سے سات سو روپیے ماہانہ کی آمدنی

---

[1] بحوالہ مرحوم دہلی کالج۔ ص ۱۰

[2] کتبے پر یہ عبارت کندہ ہے۔

نہ بر لوح نقشے بماند ولیک
جزائے عمل ماند و نامِ نیک

بیاد حسنات نواب اعتماد الدولہ ضیاء الملک سید فضل علی خاں بہادر شہراب جنگ کہ یک لک و ہفتاد ہزار روپیہ برائے ترقیِ علوم در مدرسۂ ہٰذا واقعہ دہلی خاص مولد و موطن خویش بصاحبان کمپنی انگریز بہادر تفویض نمودہ اند منقوش گردیدہ۔ در سنہ ۱۸۲۹ عیسوی۔ (قدیم دلی کالج ص ۸۰ ۔ ۷۹)

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ہوتی تھی جب کہ مجلس تعلیمات عامہ نے صرف چھ ہزار روپے سالانہ یعنی پانچ سو روپے ماہانہ ہی منظور کیا تھا۔ اور انگریزی شعبے کے اضافے کے بعد تین ہزار سالانہ کی رقم الگ سے منظور ہوئی تھی۔

تعلیمی تاریخ کا نیا دور :-

۱۸۳۵ء میں ہندوستان میں تعلیمی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا جس کے نتیجے میں ہندوستان کے طریقۂ تعلیم میں بعض اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان تبدیلیوں کے اثرات سے دلی کالج بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ ہوا یہ کہ کمپنی کے ۱۸۱۳ء کے چارٹر کی دفعہ (۴۳) کو لے کر ہندوستانی سرکاری حلقے اور مجلس تعلیمات عامہ نے دو حریف جماعتوں کی حیثیت اختیار کر لی [illegible] علوم والسنہ کی دلدادہ تھی تو دوسری اس کی مخالف اور انگریزی کی حامی [illegible] ثابت کرنا چاہتی تھی کہ دلی کالج جن مقاصد کے تحت قائم کیا گیا ہے وہ چارٹر کی دفعہ [illegible] عین مطابق ہے۔ دوسری جماعت (انگریزی جماعت) مشرقی علوم کی تعلیم کو بیکار [illegible] تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دفعہ (۴۳) کا مقصد مشرقی علوم کی تعلیم نہیں بلکہ مغربی علوم اور انگریزی زبان کی تعلیم و ترویج ہے۔ مگر ابتدا میں اس گروہ میں کوئی ایسا ترجمان موجود نہ تھا جو اس [illegible] کو منطقی استدلال کے ساتھ بہتر طور پر پیش کرتا اور حریف پر غالب آتا۔ بعد میں اتفاق سے اس جماعت کو لارڈ میکالے جیسے قادر الکلام مقرر اور مغربی علوم اور انگریزی زبان کی محبت سے سرشار [illegible] کی حمایت حاصل ہو گئی جس سے اس کی کوششوں میں ایک نئی توانائی آ گئی۔

لارڈ میکالے جون ۱۸۳۴ء میں گورنر جنرل کی کونسل کے ایک رکن کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور مجلس قانون کا قلمدان بھی انھی کے سپرد کیا گیا۔ ان کے [illegible] گویا [illegible] نہیں مانے۔ کیوں کہ انھوں نے متذکرہ بالا کمی پوری کر دی تھی مجلس تعلیمات عامہ [illegible] ہو گئے تھے اور تقسیم آدھوں آدھ کی تھی یعنی پانچ ارکان مشرقی جماعت [illegible] مغربی جماعت سے وابستہ تھے۔ لہٰذا وہاں کوئی فیصلہ ہو نہ سکا۔ [illegible] کے اندر بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا کیوں کہ انھیں معلوم تھا [illegible] قانون [illegible] سے لازماً یہ قضیہ میرے سامنے آئے گا۔ بالآخر یہی ہوا جس کے [illegible] کے لیے کونسل کے سامنے پیش کیا گیا۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لارڈ میکالے نے [illegible]

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کے متعلق ۲، فروری ۱۸۳۵ء کو اپنی رپورٹ پیش کی؟ جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ ۱۸۱۳ء کے چارٹر کی دفعہ (۴۳) کی رو سے لفظ "ادب" سے مراد انگریزی ادب بھی تو ہو سکتا ہے اور "ہندوستانی اہل علم" کا نام اس شخص کو بھی دیا جا سکتا ہے جو لاک کے فلسفے کا ماہر ہو اور اسے ملٹن کی نظمیں از بر ہوں۔
جہاں تک "مغربی علوم اور سائنس کی ترقی و اشاعت" کا سوال ہے تو یہ صرف انگریزی کو ہی ذریعۂ تعلیم بنا کر ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ اگر دفعہ (۴۳) سے وہ مراد نہیں جو میں نے قلم بند کہا ہے تو میں اسی پر راضی ہوں کہ اس دفعہ کی مزید توضیع کے لیے اسے مکرر پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے، یا پھر اس میں ترمیم کی جائے۔ لیکن جہاں تک ذریعۂ تعلیم کا سوال ہے تو ہندوستان کی بول چال کی زبان میں ابھی اتنی صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوئی ہے کہ اسے جدید علوم و فنون کی تعلیم کے لیئے استعمال کیا جا سکے کیونکہ تمام ہندوستانی زبانیں ابھی کم عمر اور ناپختہ ہیں۔[۲]
مشرقی جماعت نے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے خلاف یہ استدلال پیش کیا کہ ہندوستان کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے لہٰذا یہ خدشہ ہے کہ کہیں یہ لوگ تعلیم ہی سے یکسر معرض و متنفر نہ ہو جائیں۔

غرض کافی بحث و تمحیص کے بعد لارڈ میکالے نے حسب ذیل سفارشات قلم بند کیں۔

(۱) عربی اور سنسکرت کی کتابوں کی طباعت اور اشاعت فوراً بند کر دی جائے۔

(۲) کلکتے کا مدرسہ عالیہ اور سنسکرت کالج بند کر دئے جائیں۔

(۳) سنسکرت کالج بنارس اور دلی کالج حسب ضرورت جاری رکھے جا سکتے ہیں لیکن اس شرط پر کہ اگر اب وہاں کوئی طالب علم داخلہ لینے کو آئے تو اسے تعلیمی وظیفہ ہرگز نہ دیا جائے۔ اور

(۴) ان اقدامات سے جو روپیہ بچے اس سے مختلف اہم شہروں میں مدارس کھولے جائیں جن میں انگریزی پوری توجہ سے پڑھائی جائے۔"[۳]

---

[۱] Selections from Educational Records vol. 1, P. 107

[۲] Selections from Educational Records vol. I, P. 107-108

[۳] بحوالہ قدیم دلی کالج ص ۳۴

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

مجلس تعلیمات عامہ کی مشرقی جماعت نے میکالے کی ان سفارشات کی پرزور مخالفت کی اور پرنسپ[1] نے تو اس کا جواب بھی لکھا۔ لیکن گورنر جنرل لارڈ بینٹنگ نے یہ کہتے ہوئے کہ کونسل کے کسی رکن کے خلاف انگشت نمائی نہیں کی جاسکتی۔ ان کے دلائل پر مطلق دھیان نہیں دیا۔ اور میکالے کی ہم نوائی کرتے ہوئے ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو ایک قرار داد کے ذریعے حکم صادر کر دیا کہ

"ہندوستان میں گورنر جنرل ان کونسل نے کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن (مجلس تعلیمات عامہ) کے سیکریٹری کے ۲۱ اور ۲۲ جنوری کے مراسلوں اور دوسرے متعلقہ کاغذات کا بغور مطالعہ کیا ہے۔

(اول) ہز لارڈ شپ کی رائے ہے کہ برطانوی حکومت کا عظیم مقصد ہندوستان میں یورپی ادب اور سائنس کی ترقی ہونا چاہیے۔ اور یہ کہ تمام امدادی رقمیں جو تعلیم کے لئے تھیں ان کا بہترین مصرف یہ ہے کہ انھیں انگریزی علم پر لگایا جائے۔

(دوم) لیکن ہز لارڈ شپ کا ارادہ دیسی علوم کے کسی کالج یا اسکول کو بند کرنا نہیں ہے۔ اور اگر دیسی باشندے کسی ایسے ادارے سے فائدہ اٹھانا چاہیں گے تو ہز لارڈ شپ ہدایت کرتے ہیں کہ کمیٹی کے زیر نگرانی اداروں کے تمام موجودہ پروفیسروں (کو تنخواہیں) اور طالب علموں کو وظیفے ملتے رہیں گے۔ مگر ان اداروں میں داخلہ لینے والے نئے لوگوں کو کوئی وظیفہ نہیں ملے گا۔ اور یہ کہ جب کبھی مشرقی علوم کے کسی پروفیسر کی جگہ خالی ہو تو کمیٹی حکومت کو تعداد، صورت حال اور عہدے کی تفصیلات سے مطلع کرے گی تاکہ حکومت دوسرے تقرر کی مصلحتوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرسکے۔

(سوم) گورنر جنرل ان کاؤنسل کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ کمیٹی نے خاصی بڑی رقم مشرقی تخلیقات (کی اشاعت) پر صرف کی ہے۔ ہز لارڈ شپ ہدایت کرتے ہیں کہ اب امداد کا کوئی حصہ اس طرح کے مصرف میں نہ لایا جائے۔

(چہارم) ہز لارڈ شپ ہدایت کرتے ہیں کہ ان اصلاحات کے لیے جو سرمایہ ملے گا

[1] مجلس تعلیمات عامہ کے سکریٹری، جو مشرقی زبان و ادب کے بہت بڑے حامی تھے۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کو تفویض ہوگا وہ اب سے دیسی آبادی کو انگریزی زبان کے ذریعہ انگریزی ادب اور سائنس کی تعلیم دینے پر صرف ہونا چاہیے اور ہز لارڈ شپ کیٹی سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ جلد از جلد اس مقصد کے حصول کا ایک منصوبہ حکومت کی خدمت میں پیش کرے۔"[1]

اس قرار داد کے جاری ہوتے ہی ہندوستانیوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس کی مخالفت صرف انہی لوگوں نے نہیں کی جن کی روزی پر اس سے آنچ آتی تھی۔ بلکہ بہت سے یورپی مستشرقین بھی اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں میں شامل تھے۔ شیکسپیر نے، جو مجلس تعلیمات عامہ کے صدر تھے اس کی صدارت سے دست بردار ہو کر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ اب ان کی جگہ مسند صدارت پر میکالے ہی رونق افروز ہوئے۔

غرض اس قرار داد کے ذریعے سے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کی جو مزموم کوشش کی گئی اس سے ہندوستانی طلبہ کافی پریشان ہوئے۔ مزید ستم ظریفی یہ ہوئی کہ نادار اور غیر مستطیع طالب علموں کے وظائف بند کر دیے گئے جن کے سہارے وہ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لہٰذا انھیں تعلیمی سلسلہ بند کر دینا پڑا۔ دیگر ملازمین جن کی روزی دلی کالج یا ایسے ہی مشرقی مدارس سے وابستہ تھی یا وہ لوگ جو ایسے ہی مدارس سے اپنی ملازمت کی امیدیں وابستہ کیے تھے وہ سرگردان اور پریشان نظر آنے لگے۔

لارڈ آکلینڈ کی آمد :۔

ولیم بینٹنک کے بعد جب آکلینڈ ۱۸۳۶ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل ہو کر آئے تو یہاں کے تعلیمی افق پر ایک ایسا ستارہ نمودار ہوا، جس کے ضیا پاشیوں سے یہاں کے مشرقی تعلیمی حلقوں میں امید کی ایک نئی کرن جگمگا اٹھی۔ انھوں نے آتے ہی یہاں کے تعلیمی مسئلے کا جائزہ لیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مشرقی جماعت کی اصل ناراضگی طلبہ کے وظائف اور مشرقی علوم وفنون کی کتابوں کی طباعت و اشاعت بند کرنے کی بنا پر ہے، نہ کہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی وجہ سے۔ چنانچہ انھوں نے ۲۴ر نومبر ۱۸۳۹ء کو ایک قرار داد مجلس تعلیمات عامہ کے نام جاری کی جس کے خاص امور یہ تھے۔

---

[1] بہ حوالہ تاریخ تعلیم ہند ص ۱۰۲-۱۰۳

(۱) موجودہ مشرقی تعلیمی ادارے بدستور جاری رکھے جائیں اور پروفیسروں کی جگہ خالی ہونے پر فاضل اور سند یافتہ طلبہ اسی تنخواہ پر کام کریں گے۔ علاوہ بریں طالب علموں کے وظائف بند نہ کیے جائیں۔

(۲) منظور شدہ رقوم سے مشرقی علوم و فنون کی کتابوں کی طباعت و اشاعت حسب معمول جاری رکھی جائے۔

(۳) دیسی مدرسوں کا فرض ہو گا کہ اپنے طالب علموں کو مشرقی زبان میں تعلیم دیں۔ اس مقصد کی بجا آوری کے بعد انگریزی زبان کا "اضافی" انتظام کریں اور اگر اس راہ میں مالی مشکلات حائل ہوں تو اس کے لیے الگ سے روپے منظور کیے جائیں گے۔

گورنر جنرل نے ان مدوں پر خرچ کی گئی اکتیس ہزار [۳۱] کی زائد رقم کی بھی منظوری دی[۱] اور کمپنی کے ڈائرکٹروں کو لکھا کہ اس معمولی رقم کے مزید خرچ سے یہ قضیہ ہمیشہ کے لئے ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کمپنی نے ان کے اس فیصلے کو بلا پس و پیش قبول کر لیا۔ ابھی تک دلی کالج میں اردو اور انگریزی زبانوں کی تعلیم ساتھ ساتھ ہو رہی تھی۔ لیکن آکلینڈ نے یہ فیصلہ بھی دیا کہ جب تک دیسی زبانوں میں نصابی کتابیں تیار نہیں ہو جاتیں تب تک انگریزی کی وساطت سے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا جائے اور جب دیسی زبانوں میں بقدر ضرورت کتابیں تصنیف ہو جائیں تب طلبہ کو اختیار ہو گا کہ وہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کریں یا انگریزی میں۔

آکلینڈ کے اس فیصلے پر مشرقی جماعت نے دیسی زبانوں میں کتابیں تیار [illegible] ایک تحریک چلائی۔ لیکن اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ دلی کی مقامی جلس نے ۱۸۴۵ء میں "ایجوکیشن کمیٹی" قائم کی تھی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب کہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کی مذموم [illegible] ہو رہی تھی۔ اس کمیٹی کا مقصد دیسی زبانوں میں درسی کتابوں کی تالیف و تصنیف تھا۔ اس سے پہلے اسکول بک سوسائٹی نے ہزاروں کتابیں دیسی زبانوں میں شائع کیں۔ لیکن اس کی توجہ [illegible] زیادہ سنسکرت اور عربی کی طرف مبذول رہی۔

جب آکلینڈ نے دیسی زبانوں میں کتابوں کی تیاری کی طرف توجہ دلائی تو پہلی بھی [illegible]

---

[۱] واضح ہو کہ گورنمنٹ نے مشرقی علوم کی کتابوں کی اشاعت نیز طلبہ کے وظائف کے لیے جتنی رقم خرچ کرنے کی اجازت دی تھی اس سے اکتیس [۳۱] ہزار روپیہ زیادہ خرچ ہو چکے تھے۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

میں آئی اور ۱۸۴۱ء میں "ایک ضمنی کمیٹی" قائم کی جس کے ارکان میں یورپی مستشرقین مسٹر پرنسپ مسٹر سدرلینڈ، سرایڈورڈ ریان (Ryan) اور ملٹ بھی شریک تھے۔ اس کمیٹی نے تجویز پیش کی کہ۔

(۱) صرف و نحو پر کتابیں تیار ہونا چاہئیں۔

(۲) ایسے افراد کا انتخاب ہونا چاہیے جو اس کے اہل ہوں اور بلا معاوضہ یا معمولی تنخواہ پر کام کر سکیں۔

(۳) ہر شعبۂ علم سے متعلق کتابوں کی تیاری بہ تدریج عمل میں آنا چاہیے۔

بہر حال ایجوکیشن کمیٹی یا اس عہد کی دوسری انجمنوں نے جو بھی کتابیں لکھوائیں اور شائع کیں، وہ صرف مدارس تک محدود رہیں۔ مدرسوں کے احاطے کے باہر ان کی مانگ نہیں کے برابر تھی تاریخ ہند یا نیچرل فلاسفی وغیرہ موضوعات پر کتابیں لکھوائی جاتیں تو یقیناً وہ مقبول انام ہوتیں۔ اور ان کی ہندوستان میں کھپت بھی ہوتی لیکن ان کی قیمت اتنی زیادہ ہوجاتی کہ ہندوستانی آسانی سے ادا نہ کر پاتے۔ یہ سب پریشانیاں تھیں، جن کے باعث دلی کی مقامی مجلس اپنے اس مقصد میں پوری طرح ناکام رہی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اسے ایسے تجربہ کار اور باشعور مترجم نہ مل سکے جو بلا معاوضہ یا کم تنخواہ پر کام کرتے اور نہ اسے صاحب ثروت اشخاص کی سرپرستی ہی حاصل ہو سکی جو اس بجھتے ہوئے چراغ کو روشن رکھنے میں مددگار ثابت ہو سکتے۔ لہٰذا ان کے لڑکھڑاتے ہوئے قدم آگے نہ بڑھ سکے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مشرقی جماعت کی کوششیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔

فیلکس بوترو: پرنسپل:۔

دلی کالج کے قیام کے وقت سے مسٹر جوزف ہنری ٹیلر اس کے عارضی پرنسپل چلے آرہے تھے۔ وہ اس کے پرنسپل ہی نہیں بلکہ اس کی انتظامیہ کمیٹی کے سکتر اور کرتا دھرتا بھی تھے۔ ان متنوع و گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے پرنسپلی کا کام کماحقہٗ انجام نہیں دے پاتے تھے، جس سے اس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ کسی ایسے شخص کو پرنسپل بنایا جائے جو اپنا پورا وقت کالج کی دیکھ بھال اور درس و تدریس میں صرف کر سکے۔ اس کے لیے حکومت سے منظوری بھی مل گئی تھی اور ۱۸۲۷ء میں مسٹر ٹیلر کا نام بھی لیا گیا تھا لیکن کئی سال تک اس

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

پر عمل درآمد نہ ہوسکا۔ ۱۸۴۱ء میں ایک فرانسیسی مستشرق کو جس کا نام فیلکس بوترو (Felix Boutros) تھا، چھ سو روپے ماہانہ مشاہرہ پر دلی کالج پرنسپل مقرر کیا گیا۔
مسٹر بوترو اوائل عمری ہی میں ہندوستان آگئے تھے جس کی وجہ سے انھوں نے ہندوستانی زبان میں خاصی مہارت حاصل کرلی تھی۔ وہ ہندوستانی زبانوں میں نہ صرف گفتگو کرتے بلکہ مضامین بھی لکھ لیتے تھے۔ مزید براں انھوں نے تعلیم کی تکمیل بھی ہندوستان ہی میں کی تھی۔
جس وقت بوترو کالج کے پرنسپل تھے اس زمانے کے حالات کی دیدہ و دریافت کے لیے اس خط سے زیادہ معتبر کوئی دستاویز موجود نہیں، جو انھوں نے ۱۹ دسمبر ۱۸۴۱ء کو گارسن ڈی ٹاسی (۱۷۹۴ء - ۱۸۷۸ء) کے نام لکھا تھا۔ اس لیے ہم اس خط کا پورا متن یہاں نقل کر رہے ہیں۔

دہلی - ۱۹، دسمبر ۱۸۴۱ء

دہلی کالج میں تعلیم کے دو شعبے ہیں۔ پہلے میں انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے علاوہ جدید یورپ کے علوم (Sciences) پڑھائے جاتے ہیں۔ اور دوسرے میں قدیم شرقی زبانیں یعنی عربی، فارسی، سنسکرت پڑھائی جاتی ہے۔ کالج میں بیس پروفیسر ملازم ہیں۔ دلی کالج کے زیر نگرانی دو دوئم درجے کے کالج بھی ہیں۔ ایک میرٹھ میں دوسرا بریلی ہیں۔
ہندوستانی زبان نے دو تین سال میں ایسی اہمیت حاصل کرلی ہے جو اس سے پہلے نہ تھی۔ یہ بہار اور مغربی صوبوں کی یعنی راج محل سے لے کر ہردوار تک کی سرکاری زبان بن گئی ہے۔ ہردوار ہمالیہ کے دامن میں ایک قصبہ ہے۔ مزید براں یہ زبان سارے ہندوستان میں سمجھی جاتی ہے۔ اور کم سے کم چار کروڑ اشخاص اسے روزمرہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اب انگریزی حکومت نے اسے عدالتوں اور سرکاری اخباروں میں جاری کر دیا ہے۔
تقریباً چھ مہینے سے میں نے کوئی بیس مترجم کالج میں ملازم رکھے ہیں۔ یہ عربی، فارسی اور سنسکرت کی مشہور کتابوں کے علاوہ انگریزی کی بعض کتابیں متعلق بہ علوم طبیعیات، ریاضیات، تاریخ، فلسفہ، قانون اور برطانوی ہند میں رائج الوقت قانون کی کتابیں اردو میں ترجمہ کرتے ہیں۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

رامائن اور مہابھارت کا ترجمہ یقیناً خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ فی الحال میں نے ان دو نظموں کے ایک خلاصے سے ترجمہ کا کام شروع کر دیا ہے۔ بعد میں اصل کے مکمل ترجمے کی طرف توجہ کروں گا۔

(ژونال آسیاتک۔ فروری ۱۸۴۲ء)

دستخط بوتروس [1]

مسٹر بوترو کا پرنسپل ہونا دلی کالج کے لیے فال نیک ثابت ہوا۔ کیوں کہ وہ اس اصول کے پرزور حامی اور مؤید تھے کہ یہاں کے طلبہ کی تعلیم ان کی مادری زبان میں ہونا چاہیے لیکن یہاں دیسی زبانوں میں کتابیں ناپید تھیں اور کتابوں کے بغیر کام چلنا محال تھا۔ اس کے لیے انھوں نے ۱۸۴۳ء میں اپنے ہم خیال دوستوں کے ساتھ مل کر ایک انجمن قائم کی جس کا نام

(Society for the Promotion of Knowledge in India Through the medium of Vernacular Language)

(انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی) تھا۔ لیکن اتنے بڑے نام کا یاد رکھنا آسان نہ تھا اس لیے بعد کے مصنفوں نے اسے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے جن میں دو نام زیادہ مقبول ہوئے: "دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی" (Delhi Translation Society) اور "ورناکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی" (Vernacular Translation Society)۔ اس سوسائٹی کی دیکھ بھال اور اسے بہتر طریقے سے چلانے کے لیے ایک انتظامیہ کمیٹی کی تشکیل کی گئی تھی جو مندرجہ ذیل چھ ارکان پر مشتمل تھی۔

(۱) فیلکس بوترو	سکریٹری	پرنسپل دلی کالج
(۲) ٹامس مٹکاف	رکن	دلی
(۳) چارلس گرانٹ	"	"
(۴) ک۔ ریون شا	"	"

---

[1] اس خط کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب مرحوم دہلی کالج کے شروع میں یعنی صفحہ اول سے پہلے اور فہرست کے بعد منسلک کیا ہے جس پر صفحہ نمبر درج نہیں ہے۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

(۵) ولیم سان کوئنٹون　　رکن　　کلکتہ
(۶) دوارکا ناتھ ٹیگور　　"　　"

اس سوسائٹی کے معاونین اور حامیوں میں بلا امتیاز مذہب و ملت اور بلا تفریق رنگ و نسل ہر فرقے کے لوگ شامل تھے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ معطیوں کی کل تعداد ایک سو سولہ تھی جس میں باون انگریز تھے جو چندے میں بھی تقریباً برابر کے شریک تھے[۱] ہندوستان کی جن معزز ہستیوں نے اپنے گراں قدر عطیات سے اس سوسائٹی کو نوازا تھا ان میں شاہِ اودھ اور حیدرآباد دکن کے سالار جنگ، سراج الملک بہادر اور راجہ رام بخش کے نام نمایاں ہیں۔ سوسائٹی کے قیام کا مقصد جملہ علوم و فنون کی کتابیں ہندوستانی زبانوں میں مہیا کرنا تھا۔ چوں کہ مغربی و مشرقی علوم و فنون کی کتابیں دیسی زبانوں میں موجود نہ تھیں اس لیے یہ طے ہوا کہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے علاوہ انگریزی زبان کی اہم کتابیں بھی اردو، ہندی اور بنگلہ میں ترجمہ کرائی جائیں[۲] اور خاص طور پر درسی کتابوں کو اولیت دی جائے۔

ترجمے کا کام شروع ہوا تو منصوبے کے مطابق مختلف موضوعات پر کتابیں تیار کی گئیں جن سے مشرقی طلبہ کو بہت بڑا فائدہ پہنچا۔ اب وہ سائنس، ریاضی، فلسفہ، تاریخ و جغرافیہ اور قانون وغیرہ کی تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کرنے لگے۔ اس طریقۂ تعلیم سے مشرقی شعبے کے طلبہ سائنس اور جدید علوم کے حصول میں مغربی شعبے کے طلبہ کے دوش بدوش ہی نہیں آ گئے بلکہ بعض میدانوں میں ان پر سبقت بھی لے گئے۔ اس ضمن میں ماسٹر رام چندر کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انھیں اپنے دور میں جو امتیاز حاصل ہوا اس کی وجہ صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ انھیں اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا تھا۔

بوترو کے دوران پرنسپلی اردو میں کتابوں کے ترجمے اور تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے "اگرچہ اس (اردو) زبان میں کتب علمی انگریزی کی ابتدا سے کم و بیش ترجمے ہوتے رہے۔ مگر زیادہ تر اور قابل شمار ترجمے دہلی میں بوتراس صاحب بہادر پرنسپل سابق دہلی کالج کی تجویز اور کوششوں سے سنہ ۴۰ سے سنہ ۴۵ (۱۸۴۰ء سے ۱۸۴۵ء) تک ہوئے[۳]

[۱] ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، ص ۱۲۶　[۲] لیکن صرف اردو ہی میں کتابیں تالیف یا ترجمہ ہوئیں، ہندی اور بنگلہ میں نہیں　[۳] مقالاتِ مولانا محمد حسین آزاد جلد اول مرتبہ آغا محمد باقر، ص۔ ۶۱-۶۲

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

مشرقی اور مغربی شعبوں کا انضمام :۔

کالج میں انگریزی شعبے کا اضافہ ۱۸۲۸ء میں کیا گیا تھا۔ لیکن اعتماد الدولہ کے وقف کے بے جا مصرف اور انگریزی کی مخالفت کی بنا پر ۱۸۳۱ء میں اس شعبے کو مشرقی شعبے سے علاحدہ کر دیا گیا تھا، جبھی سے یہ دونوں شعبے الگ الگ عمارتوں میں کام کر رہے تھے۔ ۱۸۴۴ء میں مسٹر بوترس نے دوبارہ دونوں شعبوں کو یک جا کر دیا۔[1] اس انضمام سے طلبہ کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی کہ اجمیری دروازے کے باہر غازی الدین کے مدرسے میں کلاسز کا چلنا محال ہوگیا۔ اس لیے وہاں سے کالج کو کشمیری دروازے کے اندر دارا شکوہ کے کتب خانے والی عمارت میں منتقل کردیا گیا۔[2] لیکن اجمیری دروازے والی عمارت کالج کے پرنسپل کے قبضے میں تھی جو کبھی کبھی بورڈنگ کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔[3] محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ "قفس کی تیلیوں" والا مشہور مشاعرہ ۔۔ غازی الدین خاں کے مدرسے ہی میں ہوتا تھا۔[4] جیمس ٹامس نگراں نے ۱۸۴۱ء میں یہ مشورہ دیا تھا کہ انگریزی شعبے کے لیے جگہ ایسی ہونا چاہیے کہ وہ یورپی بنگلوں کے قریب ہو۔ عموماً یورپی بنگلے کشمیری دروازے کے باہر تھے۔ اس تبدیلی سے ان کے عندیہ کی بھی تکمیل ہو گئی۔

ان دونوں شعبوں کو ملانے سے کالج کی تعطیلات میں اہم تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ اب سبھی طلبہ کو صرف اتوار کو چھٹی دی جانے لگی اور مسلمان طلبہ کو جمعہ کو اتنی چھٹی دی جاتی کہ نمازِ جمعہ ادا کر سکیں۔ اس سے قبل عیسائی طلبہ کو اتوار کے دن، مسلمان طلبہ کو جمعہ کے روز اور ہندو طلبہ کو ہر ماہ کی پہلی، آٹھویں، پندرھویں اور بائیسویں تاریخ کو چھٹی دی جاتی تھی۔

---

[1] ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج ص ۔ ۲۷

[2] خواجہ احمد فاروقی نے "واقعات دارالحکومت دہلی" از بشیر الدین احمد کے حوالے سے لکھا ہے کہ "دہلی کالج ۱۸۴۴ء تک اجمیری دروازے میں رہا۔ بعد میں کشمیری دروازے کے قریب ریذیڈنسی کی عمارت میں منتقل ہوگیا۔ (ذوق و جستجو۔ ص ۲۳۸)

[3] خواجہ احمد فاروقی۔ ذوق و جستجو۔ ص ۲۳۸

[4] آب حیات ص ۴۵۴

مسٹر بوترو کے ان دو کارناموں، دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی کے قیام اور انگریزی اور مشرقی شعبوں کے انضمام سے اردو ادب اور مشرقی شعبے کے طلبہ کو بڑا فائدہ پہنچا۔ اردو ادب میں علوم جدیدہ کے موضوعات پر کافی کتابیں ترجمہ یا تالیف ہوئیں، جن سے اردو کے علمی سرمائے میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ یہ کتابیں مشرقی شعبے کے طلبہ کے لیے نعمت عظمیٰ ثابت ہوئیں۔

بوترو کا مشروط استعفا :۔

کالج اور سوسائٹی کے کاموں میں ہمہ وقت مصروف و منہمک رہنے اور ہندوستان میں طویل قیام کی وجہ سے بوترو کی صحت خراب ہونے لگی اور وہ کبھی کبھار بیمار رہنے لگے۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ اگر آپ اپنے وطن فرانس چلے جائیں تو تبدیلی آب و ہوا سے شاید کچھ خوش گوار نتیجہ نکل سکے۔ ڈاکٹروں کے اس مشورے پر ۱۸۴۵ء میں انھوں نے مشروط استعفا لکھا کہ اگر میں دو برس بعد فرانس سے واپس آؤں تو میرے استعفے پر کوئی غور نہ کیا جائے اور اس دو سال کے وقفے کو تعطیل علالت تسلیم کیا جائے اور مجھے حسب سابق پرنسپلی کا عہدہ دیا جائے۔ فرانس پہنچنے کے بعد ان کی صحت بحال ہوگئی۔ وہاں انھوں نے شادی بھی کی، لیکن دوبارہ ہندوستان آنا خدا کو منظور نہ تھا۔ فرانس ہی میں ۱۸۶۳ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح وہ صرف پانچ سال دلی کالج کی خدمت انجام دے سکے۔ گارسن ڈی تاسی کا یہ بیان، جو انھوں نے ۱۸۵۲ء کے خطبے میں دیا ہے قطعی درست نہیں کہ دلی کالج کا صدر یعنی پرنسپل بارہ سال، سے فلیکس بوترو ہے[۱]

ڈاکٹر اشپرنگر دلی کالج میں :۔

مسٹر بوترو کے مشروط استعفے اور فرانس مراجعت کے بعد الائز اشپرنگر (Aloys Sprenger) کالج کے پرنسپل اور دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ وہ تھے تو جرمن نژاد، لیکن عربی و فارسی میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ اسلامی اور مشرقی علوم سے انھیں غیر معمولی شغف تھا اسی ذوق جستجو نے انھیں ہندوستان آنے اور دلی کالج کی پرنسپل شپ قبول کرنے کی ترغیب دی۔

---

[۱] خطبات گارساں دتاسی ص ۱۰

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

اشپرنگر نے آتے ہی مشرقی شعبے کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔ یورپ میں عربی و فارسی کی جو کتابیں طبع ہو چکی تھیں انھوں نے انھیں وہاں سے منگا کر داخلِ نصاب کیا اور بعض کے اردو ترجمے کرائے۔ علاوہ بریں دلی کالج سے بعض اردو جرائد کا اجرا بھی انھیں کی دلچسپیوں کا رہین منت تھے۔

مارچ ۱۸۴۸ء میں اشپرنگر حکومت کے ایما سے اودھ کے شاہی کتب خانے کے عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کی فہرست مرتب کرنے کے لئے لکھنؤ پہنچے، اور وہاں تقریباً ۲۲ مہینے قیام کیا۔ اس قلیل مدت میں انھوں نے تقریباً دس ہزار کتابوں کی ورق گردانی کی اور ان میں سے اہم اور مفید کتابوں کی ایک جامع فہرست تیار کی جو "اودھ کیٹیلاگ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس فہرست میں ہر کتاب کے ساتھ اس کے مصنف کا مختصر حال بھی لکھا گیا ہے۔

اشپرنگر کی عدم موجودگی میں کالج کے سابق و عارضی پرنسپل اور موجودہ فرسٹ اسسٹنٹ اور ہیڈ ماسٹر مسٹر ٹیلر قائم مقام پرنسپل رہے۔ جنوری ۱۸۵۰ء میں اشپرنگر لکھنؤ سے واپس آئے لیکن اب زیادہ دنوں تک دلی میں رہنا ان کے مقدر میں نہ تھا۔ تین چار مہینے کے بعد وہ علالت کی وجہ سے شملہ چلے گیے۔ اس کے بعد وہ فارسی کے ترجمان اور ایشیاٹک سوسائٹی کے معتمد بن کر کلکتہ چلے گیے۔

کارگل : پرنسپل :-

۱۹ اپریل ۱۸۵۰ء کو اشپرنگر شملہ گیے تو کالج کی باگ ڈور جان کارگل کے ہاتھ میں آئی۔ دستور کے مطابق سوسائٹی کے سکریٹری کی ذمہ داریاں بھی انھیں سنبھالنا پڑیں۔ جان کارگل کو پرنسپل بنے ابھی مشکل سے دو سال ہی ہوئے تھے کہ ۱۸۵۲ء میں مشرقی شعبے کے سائنس کے استاد ماسٹر رام چندر اور کالج کے ایک سابق طالب علم چمن لال عیسائی ہو گئے۔ یہ خبر شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی جس کے نتیجے میں خاصا ہنگامہ برپا ہوا اور کالج کو یک بارگی بڑا دھچکا لگا۔ طلبہ نے اس سال نہ صرف یہ کہ داخلے سے احتراز کیا بلکہ بعض طالب علموں نے کالج سے نام کٹا کر دوسرے مدرسوں میں داخلے بھی لیے۔ لیکن مرور ایام کے ساتھ ساتھ لوگ اس واقعے کو بھولتے اور نظر انداز کرتے گیے۔ اور ۱۸۵۴ء تک طلبہ پھر کثرت سے داخلہ لینے لگے۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۱۸۵۴ء میں جب مسٹر کارگل نے اپنے عہدے سے استعفادیا تو پھر مسٹر ٹیلر کو قائم مقام پرنسپل بنایا گیا۔ مسٹر ٹیلر نہ صرف کالج کے بانیوں میں سے تھے بلکہ جب تک وہ زندہ رہے کالج کے سرگرم معاون اور روح رواں بنے رہے۔ انھوں نے سب سے زیادہ یعنی تیس برس تک اس ادارے کی خدمت کی اور اس مدت میں جو کارنامے انجام دیے وہ ہر اعتبار سے لائق تحسین اور قابل ستایش ہیں۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ:۔

۱۸۵۷ء کا قیامت خیز ہنگامہ، جسے ہندوستانی مورخین پہلی جنگ آزادی سے موسوم کرتے ہیں اور انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا، یہ ہماری سیاسی و معاشرتی تاریخ کا ایک ایسا اہم واقعہ ہے جو بہ یک وقت زندگی کے تمام شعبوں پر اثر انداز ہوا اور جس کی ہوش ربا یادیں برسوں ذہنی یک سوئی اور طمانیت قلب کا شیرازہ منتشر کرتی رہیں۔ اس ہنگامے کے دوران ہزاروں قیمتی جانیں نذر اجل ہوئیں اور صدہا عالی شان عمارتیں دیکھتے دیکھتے خاک کے ڈھیر بن گئیں۔ تعمیر و ترقی سے متعلق تمام سرگرمیاں ایک طویل عرصے تک معطل رہیں۔ کچھ ادارے مہینوں بند پڑے رہے۔ اس انقلاب عظیم سے دلی کالج سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ یہ بند ہوا تو سات سال تک بند ہی رہا۔ اور اس کے بانی اور مخلص خادم مسٹر ٹیلر بھی اس شورش کی نذر ہو گیے۔ مالک رام نے اس ہنگامے اور ٹیلر کی موت کا مجمل لیکن جامع نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

> ۱۱ مئی پیر کے دن صبح کے وقت جب میرٹھ کی فوج شہر میں آئی اور انگریزوں کا قتل عام شروع ہوا تو انگریزی فوج کے کمانڈان کے مشورے پر ٹیلر صاحب اور کالج کے دوسرے مدرسین سب نے بھاگ کر سرکاری میگزین میں پناہ لی۔ یہاں اندر دس بارہ آدمی تھے۔ دیسی سپاہ نے میگزین کا محاصرہ کر لیا۔ اور سپاہی سیڑھیوں کی مدد سے اندر اترنے کی کوشش کرنے لگے، گھرے ہوئے انگریزوں کو اپنے بچاؤ کی کوئی امید نہ رہی، تو انھوں نے میگزین کے بارود کو آگ لگا دی۔ پوری عمارت بھک سے اڑ گئی۔ خود بھی مرے اور سیکڑوں ہندوستانی بھی ان کے ساتھ اجل کا شکار ہو گئے۔ لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ اتنے بڑے حادثے کے

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

باوجود ٹیلر صاحب کسی طرح یہاں سے بچ نکلے اور کالج واپس آگیے۔ وہ اپنے بوڑھے مسلمان خانساماں کی مدد سے قریب ہی مولوی محمد باقر (مولوی محمد حسین آزاد کے والد) کے مکان پر پہنچے۔ ٹیلر صاحب کا ان سے پرانا یارانہ تھا۔ مولوی محمد باقر نے انھیں اپنے مکان کے تہہ خانے میں چھپا دیا۔ وہ یہاں ایک رات، ایک دن رہے، لیکن نہ جانے کیسے اگلے دن یہ خبر محلے بھر میں جنگل کی اگ کی طرح پھیل گئی کہ محمد باقر کے ہاں ایک گورا چھپا بیٹھا ہے۔ لوگ غم و غصے سے پاگل، ان کے مکان پر چڑھ دوڑے۔ مولوی محمد باقر نے دیکھا کہ اب مخلصی کی کوئی صورت نہیں تو انھوں نے ٹیلر کو ہندوستانی کپڑے پہنا کر وہاں سے کھسک جانے کو کہا۔ یہ غریب اس ہیئت کذائی میں جا رہے تھے کہ لوگوں نے انھیں پہنچان لیا۔ بس کیا تھا بھیڑ نے انھیں نرغے میں لے لیا اور لاٹھیاں مار مار کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔"[1]

اس شورش کے نتیجے میں کالج کی لائبریری اور لیبارٹیری بھی بری طرح تباہی و بربادی کا شکار ہوئی۔ کتابوں کو نہایت بے دردی کے ساتھ پھاڑا پھینکا اور جلا دیا گیا۔ بعض لوگ کچھ قیمتی اور مفید کتابیں اٹھا لے گیے جو کباڑیوں کے ہاتھ کوڑی کے مول بیچ دی گئیں۔ سائنسی آلات کو توڑا پھوڑا اور ان میں سے پیتل تانبا جستہ وغیرہ نکال کر انھیں اس قدر برباد کر دیا گیا کہ وہ دوبارہ کام کے نہ رہے۔

جب ہنگامہ ختم ہوا تو حکومت بدل چکی تھی۔ اب ہندوستان کی زمام سلطنت براہ راست برطانوی پارلیمنٹ کے ہاتھ میں تھی۔ الیسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہو چکی تھی اس لیے حکام کو از سر نو نظم و نسق قائم کرنے کے ساتھ ہی ساتھ دوستوں کو جزا اور دشمنوں کو سزا دینے کی دھن سوار تھی۔ انھیں اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ کالج کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے۔ جن ہندوستانیوں کو کالج کے معاملات سے دل چسپی تھی وہ اپنی جان اور عزت و آبرو کے لیے سرگرداں تھے۔ عمائد اور معززین کو کھلے عام گولیوں کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ اور جو لوگ روپوش تھے، ان میں سے اکثر کے نام گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔

---

[1] قدیم دلی کالج ص ۵۷-۵۶

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کالج کی نشاۃ الثانیہ :۔

کالج ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو بند ہوا تھا۔ اس کے ٹھیک سات سال بعد یکم مئی ۱۸۶۴ء کو اسے دوبارہ جاری کیا گیا۔ لیکن نہ وہ زمین تھی نہ وہ آسمان۔ وہ لوگ جنھیں علوم شرقیہ سے والہانہ محبت تھی خود بے ٹھکانا ہو چکے تھے۔ اس تبدیلی کے ساتھ کالج کی عمارت بھی تبدیل کر دی گئی۔ کشمیری دروازے والی عمارت کو خیرباد کہہ کر اب اسے کمیٹی کے کتب خانے والی عمارت میں جو چاندنی چوک میں گھنٹا گھر کے بائیں جانب واقع تھی، لے آیا گیا۔

کالج کھلنے کو تو کھل گیا لیکن اس کی گئی ہوئی رونق اور چہل پہل واپس نہ آسکی۔ حکام کا رویہ بھی کالج کی جانب سرد مہری ہی کا رہا۔ کالج کھلنے کے چار پانچ مہینے تک اس کے کرتا دھرتا پروفیسر ہٹن (Hattam) رہے۔ جب مسٹر ایڈمنڈ ولمونٹ (Admand Wilmont) ولایت سے پرنسپل بنا کر بھیجے گئے تو مسٹر ہیلٹن انگریزی پڑھانے لگے۔ ۱۸۶۵ء میں ہیلٹن انسپکٹر مدارس ہو کر پنجاب چلے گئے، تو اس خلا کو پر کرنے کے لیے جی۔ کے کلک (G.K.ccclz) کو بلایا گیا۔ فروری ۱۸۶۸ء میں ولمونٹ بھی کالج سے دست کشی اختیار کر لی۔ تو کلک صاحب کو ترقی دے کر پرنسپل بنا دیا گیا۔

مسٹر ولمونٹ نے بڑے ریاض سے ریاضیات پر لیکچر دینا شروع کیا تھا۔ ان کی اس بدعت حسنہ یعنی لیکچر میتھڈ (Lecture Method) سے بڑی امیدیں وابستہ کی گئی تھیں۔ لیکن وہ ایک حادثے کی بنا پر کالج کی خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔ وہ علم ہندسہ کے جید عالم تھے اور انٹرنیس کی جماعت کو ریاضی پڑھاتے تھے۔

غدر کے بعد کالج دوبارہ شروع ہوا تو سنسکرت کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ چناں چہ ہندو طلبہ بھی عربی پڑھنے لگے۔ ۱۸۶۸ء میں انھوں نے اس پر شور مچایا تو ایک پنڈت جی کو سنسکرت پڑھانے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس سال ایف۔ اے۔ کے پچیس طلبہ میں سے اکیس نے سنسکرت لی تھی۔

کالج کا زوال اور خاتمہ :۔

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد حکومت نے دلی والوں کے ساتھ جس سرد مہری بلکہ انتقام

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کار ویہ اختیار کیا اس کے زیر اثر دلی کالج کے وظائف کی رقم بھی کم ہو کر صرف چھٹا حصہ رہ گئی۔ چناں چہ کالج میں وہ کشش باقی نہ رہی جو غدر سے پہلے تھی۔ نتیجے کے طور پر طلبہ کی تعداد روز بروز کم ہوتی گئی۔ اس کے برعکس بنارس، آگرہ اور بریلی کے کالجوں کے وظائف بدستور جاری رہے۔ حالاں کہ کالج کے پرنسپل نے حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کراتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر یہی حالت رہی تو پنجاب کے تمام کالج ٹوٹ جائیں گے۔ لیکن لفٹیننٹ گورنر نے اس کان سن کے اس کان اڑا دیا۔

۱۸۵۷ء میں جب دلی میں انگریزوں پر عرصۂ حیات تنگ تھا تو پنجاب نے انھیں کمک پہنچائی تھی چنانچہ حالات پر دوبارہ قابو پانے کے بعد انھوں نے اہل پنجاب کے مقابلے میں دلی والوں کو نیچا دکھانے کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ اس فارمولے کے تحت یہ فیصلہ کیا گیا کہ دلی کالج کو محکمۂ تعلیم پنجاب کے انتظام میں دے دیا جائے۔ اس طرح دلی کالج کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے کر دیا گیا۔ حالانکہ اس وقت پنجاب یونیورسٹی امتحان لینے کی مجاز بھی نہ تھی اور کالج کی اعلا جماعت کے طلبہ کلکتہ یونیورسٹی سے امتحان دیتے تھے۔ طلبہ کے وظائف بند ہونے کی وجہ سے ان کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی اور مشرقی علوم فنون کی تعلیم سے حکومت بہت زیادہ تغافل برتنے لگی تھی۔ اس کے باوصف بھی کالج افتاں و خیزاں چلتا رہا۔

اسی اثنا میں ڈاکٹر لائٹنر[1] (Leitner) گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل بن کر آئے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا کالج خوب چمکے۔ پرنسپل شپ کے دوران انھوں نے سرکاری حلقے میں کافی اثر و رسوخ بھی پیدا کر لیا تھا۔ معلوم نہیں انھوں نے سرکار کے اعلا افسروں سے کیا کہا سنا کہ حکومت نے دلی کالج کو لاہور کالج میں ضم کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اس حکم کے تحت اپریل ۱۸۷۷ء میں دلی کالج توڑ کر اس کے تمام طلبہ اور اساتذہ کو لاہور گورنمنٹ کالج بھیج دیا گیا۔ اس طرح اہل دلی اپنے محبوب دلی کالج سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیے۔

دلی کالج دوسرے نام اور شکل میں :

دلی کالج کے خاتمے کے بعد دلی کے بعض عمائد تعلیمی ضروریات کے پیش نظر ایک ایسا کالج

---

[1] وہ ایک عظیم مستشرق تھے۔ انھوں نے اپنی تعلیم ترکی میں مکمل کی تھی۔ تنہائی میں وہ سنسکرت میں تقریر کرنے کی مشق کیا کرتے تھے۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

قائم کرنا چاہتے تھے جو دلی کالج کا نعم البدل ہوسکے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے دلی میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ دلی کے علاوہ علی گڑھ کے بھی معزز اشخاص مدعو کیے گیے۔ اس جلسے کے روح رواں بقول سر سید احمد خاں مرزا الٰہی بخش کے فرزند ثریا جاہ مرزا محمد کیواں تھے[1]

یہ جلسہ ۹ دسمبر بروز یک شنبہ ۲ بجے دن چاندنی محل میں منعقد کیا گیا تھا[2] اور مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں اور انگریزوں نے بھی شرکت کی جن میں ماسٹر مدن گوپال، مرزا سلیمان جاہ (ثریا جاہ کے چھوٹے بھائی) مولوی سید فریدالدین اور سر سید احمد خاں کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں لوگوں نے اپنے اپنے چندے لکھوائے۔ سب سے زیادہ چندہ ایک ہزار روپیے مرزا الٰہی بخش نے دیا۔ نواب ضیاء الدین احمد بہادر بہ سبب علالت جلسے میں شریک نہ ہوسکے تھے، ان کے نام پانچ سو روپیے لکھے گیے۔ حسب استطاعت سبھی لوگوں نے چندے لکھوائے۔ کچھ لوگوں نے اپنی ایک ماہ کی تنخواہ سے معاونت کا وعدہ کیا۔ اس طرح ایک خطیر رقم جمع ہوگئی۔

اس کے بعد ۱۸۸۲ء میں دلی کالج ہی کی عمارت میں انگلو عربک اسکول قائم کیا گیا۔ دو سال بعد ۱۸۸۴ء میں اسے ہائی اسکول کی منظوری مل گئی۔ چونکہ انگریزوں کے زخم ابھی پوری طرح مندمل نہ ہوئے تھے اس لیے چالیس برس تک یہ ہائی اسکول سے آگے نہ بڑھ سکا۔ کافی تگ و دو کے بعد ۱۹۲۴ء میں اسے انٹرمیڈیٹ کا درجہ دیا گیا اس طرح ۱۹۲۹ء میں ڈگری کالج اور ۱۹۴۷ء میں پوسٹ گریجویٹ کالج تسلیم کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد اور تقسیم ہوا تو پھر اس کا شیرازہ بکھیرنے کی کوشش کی گئی لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین نے بر وقت اس کی دست گیری کی چنانچہ یہ منصوبہ کامیاب نہ ہوسکا۔

۱۹۴۸ء میں حکومت ہند نے کالج کی تنظیم نو کے لیے ایک مجلس انتظامیہ کی تشکیل کی، جس کی مسند صدارت پر ڈاکٹر ذاکر حسین کو سرفراز کیا گیا۔ موصوف کے حسن تدبر سے کالج نے بڑا نام پیدا کیا۔

مرکزی وزارت تعلیم نے ۱۹۷۴ء میں ایک ٹرسٹ اور ایک نئی مجلس منتظم کی تشکیل کی اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خدمات کے اعتراف اور بقائے نام کی غرض سے اس کا نام "ڈاکٹر ذاکر حسین

---

[1] انتخاب مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ص ۵۵

[2] سر سید احمد خاں۔ انتخاب مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ص ۵۴ غالباً سن ۱۸۸۱ء رہا ہوگا۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

میموریل کالج" رکھا گیا۔ چونکہ یہ نام طویل تھا، اس لیے اب صرف "ذاکر حسین کالج" ہی برقرار ہے۔ اس میں ایم۔ اے۔ اور ایم۔ ایس سی۔ کے درجات تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لوگوں کی سہولت کے پیش نظر شبینہ درجات بھی قائم ہیں۔ کالج کا الحاق دلی یونیورسٹی سے ہے۔ نواب اعتماد الدولہ کا وقف اب اسی کالج کو منتقل کر دیا

دلی کالج کی تاریخ کے کچھ دیگر گوشے[1]

سنہ	تعداد طلبہ مع قومیت				تعداد طلبہ شعبہ جات		تعداد طلبہ وظیفہ خوار		تعداد فیس دہندہ	فیس کی سالانہ آمدنی روپیوں میں
	ہندو	مسلمان	عیسائی	جملہ	انگریزی	مشرقی	انگریزی	مشرقی		
۱۸۲۵ء				۸۹				۸۹		
۱۸۲۶ء				۱۲۰						
۱۸۲۷ء				۲۰۴						
۱۸۳۳ء				۴۱۳	۱۵۲	۲۷۹	۱۳۴	۲۴۳		
۱۸۳۴ء				۳۸۰	۱۴۰	۲۴۸	۱۲۹	۲۳۰		
۱۸۳۵ء				۴۱۵	۱۸۸	۲۲۷	۱۲۷	۲۱۷		
۱۸۳۵-۳۶ء	۲۰۱	۱۵۸	۵۰	۳۶۴	۱۶۶	۱۹۸	۱۶۴	۱۱۷		
۱۸۳۶-۳۷ء	۱۳۴	۱۰۸	۷	۲۴۹	۱۰۸	۱۴۱	۱۲۴	۶۸		
۱۸۳۷-۳۸ء	۱۱۴	۸۹	۸	۲۱۱	۸۸	۱۲۳	۸۹	۴۷		
۱۸۳۸-۳۹ء	۱۴۰	۸۰	۶	۲۲۶	۱۲۳	۱۰۳				
۱۸۳۹-۴۰ء	۱۰۵	۷۳	۱۱	۱۸۹	۸۵	۱۰۴				
۱۸۴۰-۴۱ء	۹۳	۴۰	۳	۱۴۴	۸۴	۸۲				
۱۸۴۱-۴۲ء	۲۱۴	۱۰۲	۱۰	۳۲۶	۱۵۷	۱۴۹				

[1] اس گوشوارہ کی ترتیب میں ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی کی تصنیف "ماسٹر رام چندر"، اور خاص طور سے ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی کتاب "مرحوم دہلی کالج" سے مدد لی گئی ہے۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

سنہ	تعداد طلبہ مع قومیت: ہندو	مسلمان	عیسائی	جملہ	تعداد طلبہ شعبہ جات: انگریزی	مشرقی	تعداد طلبہ وظیفہ خوار: انگریزی	مشرقی	تعداد طلبہ فیس دہندہ	فیس سے آمدنی (روپیہ میں)
۱۸۴۲-۴۳ء	۱۳۶	۱۲۸	۱۲	۲۸۶	۱۲۴	۱۶۲				
۱۸۴۳-۴۴ء	۱۷۹	۱۱۱	۱۵	۳۰۵	۱۶۲	۱۴۳				
۱۸۴۴-۴۵ء	۲۹۹	۱۳۶	۱۵	۴۵۰	۲۳۵	۲۱۵				
۱۸۴۵-۴۶ء	۲۳۰	۱۳۲	۱۳	۳۷۵	۱۹۶	۱۷۹				
۱۸۴۶-۴۷ء	۲۰۹	۱۰۷	۱۸	۳۳۴	۱۹۸	۱۳۶			۱۴	۱۹۲
۱۸۴۷-۴۸ء	۲۲۴	۱۰۹	۱۶	۳۵۹	۲۳۱	۱۲۸			۲۱	۳۲۱
۱۸۴۸-۴۹ء	۲۲۲	۱۰۵	۱۲	۳۳۹	۲۲۶	۱۱۳			۷۷	۶۲۲
۱۸۴۹-۵۰ء	۲۲۱	۹۴	۱۱	۳۲۶	۲۲۴	۱۱۲			۱۲۵	۹۵۸
۱۸۵۰-۵۱ء	۲۰۶	۱۰۵	۲۲	۳۳۳	۲۲۲	۱۱۱			۱۸۱	۱۳۵۸
۱۸۵۲-۵۳ء	۲۱۷	۹۳	۱۰	۳۲۰	۱۹۹	۱۲۱			۲۳۰	۱۹۱۰
۱۸۵۳-۵۴ء	۲۰۶	۱۱۲	۱۵	۳۳۳	۲۱۱	۱۲۲			۲۳۹	۲۰۸۲
۱۸۵۴-۵۵ء	۲۴۳	۹۷	۱۰	۳۵۰	۲۱۷	۱۲۳				
۱۸۵۵-۵۶ء	۱۵۸	۸۳	۴	۲۴۵						
۱۸۵۶-۵۷ء				۳۴۵						۲۴۰۵/۱/۳[1]

[1] ۲۴۰۵ روپے ایک آنہ اور تین پائی۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

دلی کالج کے اجتہادی و تعمیری کارنامے

دلی کالج کے قیام سے انگریزوں کا مقصد خواہ مغربی علوم والسنہ کی تعلیم رہا ہو خواہ مشرقی زبان وادب کی ترویج و ترقی۔ خواہ اس کا مقصد ہندوستان کے ارباب علم وفضل کی حوصلہ افزائی کرکے ہندوستانیوں کی تالیف قلب ہو، بہر صورت مغربی و مشرقی علوم والسنہ کی تعلیم کا یہ خوش گوار امتزاج ہندوستانیوں کے لئے بہت سود مند ثابت ہوا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دلی کالج نے نہ صرف اردو زبان میں تعلیم کی شاندار روایات قائم کیں بلکہ جدید و قدیم اقدار کے خوش آیند ارتباط و امتزاج کی بنیاد رکھی اور اس جمہوری انداز نظر کی تاسیس و فروغ کا سامان کیا جو آج ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور جس کی روشنی اور مدد سے ہم اپنے سماج اور ملک کا لائحہ عمل متعین کرنے میں مصروف ہیں۔

۱۷۸۹ء کے فرانسیسی انقلاب نے یورپ کو صنعتی اعتبار سے بیدار کیا جس سے نہ صرف یورپ بلکہ دنیا بھر میں مشینی دور کا آغاز ہوا حتیٰ کہ انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے سائنسی اور تکنیکی تعلیم کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کے حالات بھی اس کے متقاضی ہوئے کہ یہاں ایسی درسگاہیں قائم کی جائیں جہاں ہندوستانی طلبہ مشرقی علوم والسنہ کے ساتھ ساتھ جدید مغربی علوم اور سائنس سے بھی استفادہ کر سکیں۔ دلی کالج کے نصاب تعلیم کے سرسری مطالعے سے ہی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں مشرقی علوم کے ساتھ تقریباً تمام مغربی علوم اور مضامین بھی شامل تھے۔ ہندوستانی طلبہ بڑے شوق وانہماک سے ان جدید علوم کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور سائنس کے عملی تجربات میں پوری دلچسپی لیتے تھے۔ اور جب اپنے گھر جاتے تو اس کے عجائبات اپنے بزرگوں سے بیان کرتے تھے۔

دلی کالج کے ماحول نے وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کو مذہبی منافرت، قومی تعصب اور لسانی تنگ نظری سے بلند تر رکھ کر ان میں وسعتِ قلب اور کشادگیِ ذہن پیدا کی۔ ان لوگوں

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کو جہاں مشرق کی علمی و اخلاقی روایات عزیز تھیں، وہیں مغربی افکار و نظریات سے بھی کسی قسم کا بُعد نہ تھا۔ یہ طلبہ کالج سے صرف ادیب اور شاعر ہی بن کر نہیں نکلے تھے بلکہ ان میں ڈاکٹر، انجینیر اور وکیل بھی ہوتے تھے اور بہ شرط ضرورت ان ہی میں سے بعض لوگ گورنمنٹ کے اعلا عہدوں پر بھی مامور کیے جاتے تھے۔ بالفاظ دیگر کالج کی وسیع تر دنیا میں قدم رکھنے کے بعد طلبہ کے مزاج میں جو تغیر اور فکر و نظر میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کے نتیجے میں ہندوستانی ادب اور سماج میں ایک انقلاب پیدا ہوا اور ایسی روایات قائم ہوئیں جن کا خوش گوار نتیجہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اگر دلی کالج نہ ہوتا تو شاید اس دور میں ماسٹر رام چندر، مولانا امام بخش صہبائی، مولوی مملوک العلی نانوتوی، پیارے لال آشوب، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی ضیاء الدین، میر ناصر علی (ایڈیٹر صلائے عام) مدن گوپال (ایڈوکیٹ) اور پیرزادہ محمد بخش (سیشن جج) جیسی ہمہ جہت ہستیاں ہندوستان کی سرزمین پر پیدا نہ ہوئی ہوتیں۔ دلی کالج نہ ہوتا تو یہ لوگ کیا ہوتے اس کا جواب ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح دیا ہے۔

"اگر میں دلی کالج میں نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، ٹالرشن (درگزر) گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی، اجتہاد علی بصیرۃ، یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں شرط زندگی ہیں ان کو میں نے دلی کالج ہی میں سے سیکھا اور حاصل کیا اور اگر میں دلی کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو بتاؤں کیا ہوتا۔ مولوی ہوتا تنگ خیال، متعصب، اکھل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ دوسروں کے عیوب کا متجسس، برخود غلط، مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا بہرا۔"[1]

بہرحال اس سلسلے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ دلی کالج نے نہ صرف ایسی شخصیتوں کو جنم دیا جن کی کوششوں اور کاوشوں سے ہمارے سرمایۂ ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا بلکہ ساتھ ہی ساتھ ایک ایسی فعال اور بیدار مغز جماعت بھی پیدا کی جس نے ہندوستان کی تعمیر نو میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ اس لیے اگر دلی کالج کو "شخصیتوں کا جنم داتا" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ مولوی عبد الحق

[1] بحوالہ داستان تاریخ اردو ص ۳۴۶

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ

"دلی کالج کا پھل اس کے وہ سپوت ہیں جو اس کی آغوش میں پلے اور پھلے پھولے اور جنھوں نے علم کے اس نور سے جو ان کے سینوں میں مشتعل تھا اپنے ملک اور اپنی زبان کو جگمگا دیا۔ علم کے وہ پجاری آج ہماری زبان کے دیوتا ہیں"۔[1]

عبدالرحمٰن پرواز اعتراف کرتے ہیں کہ

"اس کالج سے وسیع النظری اور رواداری کی فضا قائم ہوئی۔ ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کے جذبات پروان چڑھے۔ تحقیق و ریسرچ کا ذوق پیدا ہوا۔ علمی و ادبی بیداری پیدا ہوئی۔ اردو کے صاحب طرز ادیب و نقاد اور چوٹی کے مصنف اور بلند پایہ شخصیتیں پیدا ہوئیں"۔[2]

ماہرین تعلیمات کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اگر طلبہ کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے تو اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ دلی کالج کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں ذریعۂ تعلیم اردو زبان تھی اور صرف عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم کے لیے ہی اردو کا استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ سائنس، ریاضی، جغرافیہ و تاریخ، قانون، طب اور منطق و فلسفہ کی تعلیم بھی اردو میں دی جاتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس وقت تک اردو کسی علاقائی اور مذہبی و ملی تفریق کے بغیر ہندوستان کی مقبول عام زبان بن چکی تھی۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ اس زبان میں تمام موضوعات کے لیے اظہار خیال کا ذریعہ بننے کی صلاحیت موجود تھی۔ ناظم تعلیمات احاطۂ بنگال مسٹر کر نے کالج کی سالانہ رپورٹ بابتہ ۱۸۵۲ء میں اس کی ان امتیازی خصوصیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

"ایک مدت سے دلی کالج کی ایک خصوصیت ایسی چلی آرہی ہے جو اسے بالائی اور زیریں صوبجات کے دوسرے کالجوں سے ممتاز کرتی ہے اور وہ یہ کہ وہاں دیسی زبان (اردو) کے ذریعہ تعلیم دیجاتی ہے اور یہ (امتیازی خصوصیت) خاص طور سے ریاضیات کی تمام شاخوں اور کم و بیش تاریخ و اخلاق و فلسفہ (مارل سائنس) کی تعلیم سے تعلق رکھتی ہے۔ اس طریقۂ تعلیم پر مسٹر بتروس نے اپنے زمانہ

---

[1] بحوالہ مرحوم دہلی کالج ص ۱۵۶

[2] مفتی صدرالدین آزردہ ص ۳۴

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

پرنسپلی میں استقلال کے ساتھ عمل درآمد کیا اور ان کے جانشین ڈاکٹر اسپرنگر نے اسی جوش کے ساتھ جاری رکھا۔ یہ اب دہلی کالج کے نظام تعلیم کا ایک جُز تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اسے آزادی کے ساتھ بڑھنے اور پھولنے پھلنے دیا جائے۔ چند سال بعد ہمیں اس کے نتائج کا دوسرے طریقوں کے نتائج سے مقابلہ کرنے کا موقع ملے گا۔" [1]

دلی کالج کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بدولت اردو کے علمی و ادبی سرمائے میں قابل قدر اضافے ہوئے۔ کالج کے قیام سے قبل اردو میں نہ صرف یہ کہ مغربی علوم وفنون سے متعلق کتابیں نایاب تھیں بلکہ مشرقی علوم پر بھی معقول کتابوں کا فقدان تھا۔ اردو نثر میں تالیف یا ترجمہ کی صورت میں جو کتابیں دستیاب تھیں وہ فورٹ ولیم کالج کی لکھی ہوئی تھیں اور اکثر و بیشتر قصوں اور کہانیوں پر مشتمل تھیں۔ چوں کہ دلی کالج کا دائرہ کار فورٹ ولیم کالج کے مقابلے میں زیادہ وسیع تھا اس لیے یہاں جدید مضامین و موضوعات پر بکثرت کتابیں ترجمہ اور تالیف ہوئیں تاکہ مشرقی شعبے کے طلبہ کو مغربی علوم کے حصول میں دشواریاں پیش نہ آئیں۔ اس طریقۂ کار سے نہ صرف یہ کہ اردو کے سرمائے میں اضافہ ہوا بلکہ اس کی مقبولیت بھی عام ہوئی۔ اور یہ سمجھا جانے لگا کہ ہندوستانی زبانوں میں اردو کو وہ وسعت و ہمہ گیری حاصل ہے کہ اسے یکساں طور پر مشرقی و مغربی دونوں علوم وفنون کے اظہار کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دلی کالج کے زیر نگرانی "دلی ٹرانس لیشن سوسائٹی" کا قیام اسی غرض سے عمل میں آیا تھا کہ اردو میں جدید نصابی مضامین سے متعلق کتابیں تیار کرائی جائیں۔ اس کی کوششوں سے ریاضیات، سائنس، تاریخ و جغرافیہ، قانون، طب، فلاحت و زراعت، اخلاقیات وغیرہ پر سوا سو سے زیادہ کتابیں ترجمہ یا تالیف ہوئیں۔

اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اردو زبان میں نئے نئے الفاظ اور مختلف النوع اصطلاحات کا اضافہ ہوتا گیا۔ چناں چہ اگر یہ کہا جائے کہ اس تحریک کی بدولت عثمانیہ یونیورسٹی جیسے عظیم ادارے کو معرض وجود میں لانے کی راہ ہموار ہوئی تو بے جا نہ ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا

---

[1] بحوالہ مرحوم دہلی کالج ص ۲۷

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

جاسکتا ہے کہ دلی کالج عثمانیہ یونیورسٹی کا پیش رو تھا، کیونکہ یہی کالج ہندوستان کی پہلی درس گاہ تھی جہاں مغربی اور جدید علوم وفنون کی تعلیم اردو زبان میں دینے کا پہلا کامیاب تجربہ کیا گیا تھا، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کا موازنہ ومقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس زمانہ میں (فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد) بعض انگریزوں نے اردو کی لغات، صرف ونحو کی کتابیں اردو لسانیات اور اردو تاریخ پر بعض کتابیں لکھ کر اردو کے علمی مطالعہ کا آغاز کیا لیکن فورٹ ولیم کالج کا حلقۂ اثر محدود اور ادارہ کے مصنفوں کا مقصد مخصوص تھا اس لئے ان کے رجحانات نے اس وقت کسی تحریک کی صورت اختیار نہیں کی البتہ ۱۸۵۷ء سے کوئی پچیس تیس سال پہلے خود دلی میں ایک ایسا کالج قائم ہوا۔ جہاں پہلی مرتبہ جدید علوم وفنون کی تعلیم مشرقی زبان میں دینے کا تجربہ کیا گیا، اور اس کے لئے انگریزی سے بعض درسی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا، (اس طرح) مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا ایک اہم حصہ آہستہ آہستہ اردو میں منتقل ہونے لگا تھا جس کے ساتھ زبان میں نئے نئے الفاظ واصطلاحات کا بھی اضافہ ہو رہا تھا[1]"

دلی کالج سے قبل ہندوستان میں عام طور پر تین قسم کی درسگاہیں پائی جاتی تھیں، اولاً وہ مکتب اور مدرسے جو مسلمانوں کی طرف سے چلائے جاتے تھے اور جن میں عربی، فارسی اور اسلامیات کی تعلیم دی جاتی تھی، یہ درسگاہیں مسلمانوں کے مذہبی شغف اور عقائد کی نمائندگی کرتی تھیں، اور ان کے قیام کے پس پشت ثواب اور اجر آخرت کا جذبہ کارفرما تھا، دوسری قسم کی درس گاہیں وہ ہوتی تھیں جنھیں ہندو قائم کرتے تھے اور جو ودیا مندر یا پاٹ شالہ کہی جاتی تھیں۔ مسلمانوں کے مکاتب ومدارس کی طرح یہ ادارے بھی دھارمک شکشا کے مراکز کی حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ ان میں سنسکرت اور دھرم شاستر کی تعلیم کو اولیت دی جاتی تھی، تیسری قسم کی درسگاہوں کے تحت وہ اسکول آتے تھے جن کا نظم ونسق انگریز مشنریوں، پادریوں اور چیلنوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا جو عیسائیت ومسیحیت کی تعلیم وتبلیغ کی غرض سے کھولے جاتے تھے،

---

[1] ماہ نو، کراچی، ستمبر سنہ ۱۹۵۳ء ص ۱۳-۱۴

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ان اسکولوں میں انگریزی زبان کی تدریس کو ترجیح دی جاتی تھی۔

ان روایتی قسم کے تعلیمی اداروں کے برخلاف دلی کالج ایسا تعلیمی ادارہ تھا جس میں بہ یک وقت عربی، فارسی، اردو، سنسکرت اور انگریزی زبانوں کے پہلو بہ پہلو دوسرے مشرقی و مغربی علوم کی تعلیم بھی کماحقہ طور پر دی جاتی تھی۔ مولوی عبدالحق کے الفاظ میں "یہی وہ پہلی درسگاہ تھی جہاں مشرق و مغرب کا سنگم قائم ہوا۔ (اور جہاں) ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی وہ جماعت میں مشرق و مغرب کا علم و ادب ساتھ ساتھ بڑھایا جاتا تھا"[۱]

دلی کالج کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اس کا فیضان ہندو، مسلمان اور عیسائی تمام فرقوں کے طلبہ کے لیے عام تھا۔ یہاں سب ایک ساتھ بیٹھتے اور اس مائدۂ علم سے یکساں طور پر مستفید ہوتے تھے۔ ٹھیک یہی بات اساتذہ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ ان میں بھی ہندو، مسلمان، عیسائی، ملکی اور غیر ملکی بھی شامل تھے۔ کالج کے پرنسپل برطانوی (ٹیلر، کارگل ہیٹن، ولمونٹ اور کک) جرمن (اشپرنگر) اور فرانسیسی (بوترو) قوم کے ہوئے۔ لیکن باقی اساتذہ میں ہندوستانیوں کی کثرت تھی، جن میں ہندو اور مسلمان کی تفریق نہ تھی۔ ان تاریخی حقایق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دلی کالج ایک ایسی "بین الملکی انجمن" کی حیثیت رکھتا تھا جہاں ہندوستان، انگلینڈ، فرانس اور جرمن کے ہندو، مسلمان اور عیسائی علما و فضلا سر جوڑ کر بیٹھتے، نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے لئے نئے نئے منصوبوں کو عملی شکل دیتے اور علم کی ضیا پاشیوں سے طلبہ کے دل و دماغ کو منور کرتے تھے۔ باہمی ارتباط و اختلاط کے اس ماحول میں تربیت یافتہ طلبہ اور ان کے اساتذہ کے درمیان گاہ بگاہ مذہبی، ثقافتی، سائنسی اور سیاسی موضوعات و مسائل پر مذاکرات بھی ہوتے رہتے تھے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک دلی کالج قائم رہا علمی تبادلۂ خیال اور ثقافتی لین دین کا مرکز بنا رہا۔ یہاں کے طلبہ اور اساتذہ مختلف ذہنی رجحانات و نظریات کے حامل ہونے، کوئی مغربی تہذیب و ادب کا گرویدہ ہوتا تو کوئی مشرقی تمدن اور علوم و السنہ کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ وقت کی اس بوقلمونی اور افکار و نظریات کی اس رنگارنگی نے ہندوستانی طلبہ و اساتذہ پر گہرے اثرات مرتب کیے اور ان کے نتیجے میں

---

[۱] مرحوم دہلی کالج ص ۱۶۲

خیالات کی تبدیلی، فکر کی اصلاح اور معلومات میں اضافے کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس سے نہ صرف یہ کہ افادی ادب کی بنیاد پڑی بلکہ نئے تہذیبی اور سائنسی دور کی ابتدا بھی ہوئی اور ہماری نسلوں میں ایک جماعت ایسی پیدا ہوئی جس میں فکر و خیال کی اس نئی رو کے زیر اثر ہمارے ملک میں ایسے روشن ضمیر اور بالغ النظر افراد پیدا ہوئے جنھوں نے ہمارے سماج اور ادب کا رخ تعمیر و ترقی کی ایک نئی سمت کی طرف موڑ دیا اور جن کے احسانات ہماری علمی و تہذیبی تاریخ میں قائم و دائم رہیں گے۔

اپنی ان گوناگوں خدمات و خصوصیات کے باوصف دلی کالج ہمیں ایسا کوئی ادبی شاہکار ورثے میں نہ دے سکا جس کی لازوال قدر و قیمت خواص کی طرح عوام میں بھی اس کا نام اور شہرت و مقبولیت برقرار رکھنے میں مددگار ثابت ہوتی۔ اگرچہ فورٹ ولیم کالج کی طرح یہاں بھی خالص ادبی اور عام دلچسپی کے موضوعات اور مباحث پر متعدد کتابیں تالیف یا ترجمہ کی گئیں۔ لیکن ان میں میرامن کی "باغ و بہار"، خلیل علی خاں اشک کی "داستان امیر حمزہ"، حیدر بخش حیدری کی "توتا کہانی اور" قصہ حاتم طائی" بہادر علی حسینی کی اخلاق ہندی" اور نہال چند لاہوری کی "مذہب عشق" جیسا قبول عام کسی کتاب کو حاصل نہ ہوسکا۔ دلی کالج کی کتابیں فورٹ ولیم کالج کی ان تصانیف کے چالیس پچاس سال بعد وجود میں آئی تھیں۔ اس اعتبار سے انھیں ادبی چاشنی اور لسانی لطافت و نفاست سے اور زیادہ مزین و مملو ہونا چاہیے تھا۔ لیکن یہاں کے مصنفین و مترجمین نے اس پہلو پر مناسب توجہ نہیں دی اس لیے ان کے کارنامے ادبیت کے اس اعلا و ارفع معیار تک پہنچنے میں ناکام رہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس کالج کا ماحول اور اس کے مطالبات و مقتضیات فورٹ ولیم کالج کے ماحول اور اس کے اغراض و مقاصد سے یکسر مختلف تھے۔ یہاں تمام تر زور مغربی علوم و فنون کی توسیع و ترقی اور تشویق و ترویج پر صرف کیا گیا اور ادب کی طرف کسی نے خاص توجہ مبذول نہیں کی۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے بقول "انگریزی اثر سے بنگال میں جو بیداری پیدا ہوئی تھی وہ نیادہ تر ادبی تھی لیکن دلی میں اس کی حیثیت سائنسی ہے"۔[1]

---

[1] "ماسٹر رام چندر" مقدمہ ص ۲۴

دلی کالج کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اس کی بدولت مقالہ نگاری اور صحافت کو فروغ حاصل ہوا اور اردو کے طلبہ اور قارئین جدید علوم وفنون خصوصاً مغربی فلسفے اور سائنس سے روشناس ہوئے اس کالج نے مغربی ومشرقی علوم پر بے شمار مفید اور کارآمد کتابیں مرتب کرا کے جدید وقدیم کے خوش گوار امتزاج سے ایک ایسی شمع روشن کی جو آج بھی جادۂ نوردانِ شوق کے لیے مشعل راہ بنی ہوئی ہے۔ اور جس کی ضیاپاشیوں سے ہماری علمی تاریخ کا ایک باب رہتی دنیا تک منور وتابناک رہے گا۔

دلی سوسائٹی کی تالیفات اور تراجم (فہرست نمبر۱)

دلی ٹرانس لیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام جو کتابیں تالیف یا ترجمہ ہوئیں، ذیل میں ان کی ایک جامع فہرست پیش کی جا رہی ہے۔ لیکن وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ فہرست مکمل ہے۔ تحقیق وتلاش سے اس میں مزید اضافے کیے جا سکتے ہیں۔

کتاب	مصنف	مترجم	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
مذہبیات واخلاقیات				
۱۔ سنن ترمذی		مملوک العلی		حدیث کی مشہور کتاب ترمذی شریف کا اردو ترجمہ ہے۔
۲۔ رسالہ احکام الایمان				
۳۔ رسالہ در اثبات وجود باری	ریون شا			
۴۔ مختصر قدوری				
۵۔ ترجمہ Smith's Moral Sentiments.				
۶۔ نیچرل تھیالوجی	پالے			
۷۔ خلاصۂ راماین ومہابھارت	فلیکس بوترو			زیر ترجمہ
ادبیات				

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کتاب	مصنف	مترجم	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
۸۔ عجائبات روزگار	رام چندر		دہلی اردو اخبار، ۱۸۴۷ء	
۹۔ حدائق البلاغت	امام بخش صہبائی		لیتھوگراف پریس دہلی ۱۸۴۳ء	"حدائق البلاغت" (فارسی) کا ماخذ ہے۔
۱۰۔ طبقات شعرائے ہند	ایف فیلن اور کریم الدین		مطبع العلوم، ۱۸۴۸ء	اس کی تالیف میں ڈی تاسی کی تاریخ سے کافی مدد لی گئی ہے
۱۱۔ تذکرۂ فرائد الدہر	مولوی کریم الدین		مطبع العلوم، مدرسۂ دہلی ۱۸۴۷ء	اس کا اردو نام "تاریخ عرب" ہے۔
۱۲۔ الف لیلہ		جعفر علی، محمد حسن علی خاں اور سدید الدین خاں	مطبع العلوم، مدرسۂ دہلی ۱۸۴۴ء	
۱۳۔ انتخاب دواوین	مولوی امام بخش صہبائی		دہلی اردو اخبار پریس ۱۸۴۴ء	
۱۴۔ قواعد اردو	"		مطبع العلوم، مدرسہ دہلی ۱۸۴۹ء	
۱۵۔ رسالہ مقتضی الحالۃ العلالہ علم عروض کا	مولوی کریم الدین		مطبع رفاہ عام، دہلی ۱۸۴۵ء	
۱۶۔ سفر یوسف خاں کمل پوش کا انگلستان میں			مطبع العلوم، مدرسہ دہلی ۱۸۴۷ء	اس کا دوسرا ایڈیشن ستمبر ۱۸۷۳ء میں مطبع نول کشور سے بھی شائع ہوا تھا۔
۱۷۔ ترجمہ گلستان سعدی (فارسی)	شیخ سعدی	مولوی حسن علی خاں		
۱۸۔ کریم اللغات	مولوی کریم الدین			یہ بعد میں کئی مرتبہ طبع ہو چکی ہے
۱۹۔ راجبن				
۲۰۔ مہابھارت				انتخاب مہابھارت
۲۱۔ محاورات اردو	سبحان بخش			
۲۲۔ سنسکرت اور انگریزی ڈرامے				

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کتاب	مصنف	مترجم	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
۲۳۔ چشمۂ فیض	مولوی احمد علی			مختصر قواعد اردو
۲۴۔ صرف ونحو انگریزی (اردو میں)	پنڈت رام کشن			اشپرنگر کی مدد شامل تھی
۲۵۔ تذکرۂ ہندو شعرا	موتی لال کانجو بسمل			
۲۶۔ ہدایت المبتدی				
۲۷۔ قصۂ یوسف سلیمانی				
ریاضیات:				
۲۸۔ اصول علم مثلث و تراش ہائے مخروطی و علم ہندسہ بالجبر	Bouchartlet and Samson	ماسٹر رام چندر	مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۹ء	انگریزی کتاب کا ترجمہ
۲۹۔ اصول علم حساب	ڈی مارگن De Morgan	ہردیو سنگھ بہ ود اشرف علی اور پنڈت اجودھیا پرشاد	مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۴ء	انگریزی کتاب Principles of Arithmetic کا ترجمہ
۳۰۔ رسالہ در پیمائش خطوط و سطح مستوی و مجسم و جسامت شئی مجسمات	ایلیٹ Elliott	بہاری لال	مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۵۰ء	انگریزی کتاب کا ترجمہ
۳۱۔ اصول علم حساب، جزئیات وکلیات	T.L.Bouchardlat	رام چندر	مطبع رفاہ عام دہلی ۱۸۴۵ء	اس کتاب کے ترجمے میں [illegible] نے اضافہ [illegible]
۳۲۔ ہندسہ بالجبر	Wand	رام چندر، ورادھا کشن	مطبع دہلی اردو اخبار ۱۸۵۲ء	
۳۳۔ رسالہ پیمائش زمین کا	Theodalite	ہردیو سنگھ	مطبع العلوم مدرسہ دہلی [illegible]	[illegible] علی نے اضافہ کی تھی
۳۴۔ اصول جبر ومقابلہ	رام چندر		دہلی اردو اخبار پریس دہلی ۱۸۴۵ء	
۳۵۔ سریع الفہم	رام چندر		دہلی اردو اخبار پریس ۱۸۴۹ء	
۳۶۔ تحریر اقلیدس مقالہ اولیٰ		مسلوک العلی	مطبع العلوم مدرسہ دہلی	ترجمہ [illegible]

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کتاب	مصنف	مترجم	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
۳۷۔ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار	دبیر الدولہ فرید الدین	سید احمد خاں بہادر	چھاپہ خانہ سید الاخبار دلی ۱۸۴۶ء	
۳۸۔ الجبرا (ترجمہ برجز)	برجز	رام چندر		
۳۹۔ استعمال آلات ریاضی				
۴۰۔ میکانیات	لارڈ نر			
۴۱۔ Statics کا ترجمہ				
۴۲۔ حرکیات و سکونیات	ینگ Young			Dynamics & Statics کا ترجمہ
۴۳۔ لیلاوتی (حساب)	بھاسکر			بھاسکر کی معروف سنسکرت کتاب کا اردو ترجمہ
تاریخ:				
۴۴۔ تاریخ کشمیر	محمد اعظم	منشی اشرف علی	مطبع العلوم، مدرسہ دہلی ۱۸۴۶ء	فارسی کتاب کا ترجمہ
۴۵۔ تاریخ بنگال، ابتدائے عملداری کمپنی بہادر سے ۱۸۴۰ء تک	مارش مین Marshman	منشی نور محمد	" ۱۹۴۶ء	انگریزی کتاب کا ترجمہ
۴۶۔ پنجاب کے سکھ عہد کی تاریخ اور سوانح مہاراجہ رنجیت سنگھ	ایچ۔ ٹی۔ پرنسپ	شنکر داس	دہلی اردو اخبار پریس، دہلی۔ ۱۸۴۶ء	رام چندر نے اس کی تصحیح کی تھی۔
۴۷۔ توزک تیموری		مولوی سبحان بخش	" ۱۸۴۵ء	فارسی کتاب کا ترجمہ
۴۸۔ مارش مین صاحب کی خلاصۃ التواریخ حصہ اول: ابتدائے آفرینش سے تولد ہونے عیسیٰ تک	مارش مین	سروپ نراین اور شیو نراین	" ۱۸۴۴ء	
۴۹۔ مارش مین کی خلاصۃ التواریخ حصہ دوم تولد عیسیٰ سے شاہ شارلمین تک	"	سروپ نراین و شیو نراین	" ۱۸۴۴ء	شیوارڈ (Steward) نے اصلاح دی تھی
۵۰۔ تواریخ یونان	گولڈ اسمتھ	منشی وزیر علی	مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۶ء	۱۵۲ صفحے کے بعد کا ترجمہ شیو پرشاد نے کیا تھا۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کتاب	مصنف	مترجم	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
۵۱۔ تواریخ بری اور بحری	لارڈنر	شیو پرشاد	دہلی اردو اخبار پریس ۱۸۴۵ء	سیٹوڈ نے اس پر اصلاحات دی تھی
۵۲۔ تواریخ روم	گولڈ اسمتھ	شیو پرشاد	" ۱۸۴۵ء	اس پر بھی سیٹوڈ نے صحت کی تھی
۵۳۔ تاریخ ایران	گونڈر [illegible]	منشی حسینی	" ۱۸۴۵ء	
۵۴۔ تذکرہ سکندر اعظم		پنڈت سرپ نراین	مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۷ء	انگریزی سے ترجمہ
۵۵۔ تذکرہ سسرو		موتی لال کاجو	۱۸۴۷ء	"
۵۶۔ تاریخ مغلیہ		منشی حسینی و نور محمد	۱۸۴۷ء	"
۵۷۔ ترجمہ تاریخ حکما اور تذکرۃ المفسرین اور تذکرۃ الفقہا خلاصہ[2] وفیات الاعیان ابن خلکان کا (عربی سے)	علامہ عبدالرحمٰن جلال الدین سیوطی[1]	مولوی سبحان بخش	۱۸۴۸ء	عربی سے ترجمہ
۵۸۔ تاریخ ابوالفدا[2]		کریم الدین و محمد لمیر	۱۸۴۷ء	عربی سے ترجمہ
۵۹۔ تذکرہ ڈیموستھینیز		شیو نراین	مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۸ء	انگریزی سے ترجمہ
۶۰۔ تذکرۃ الکاملین	ماسٹر رام چندر		۱۸۴۹ء	
۶۱۔ تاریخ ہند				زمانہ قدیم سے زمانہ حال تک
۶۲۔ تاریخ انگلستان	گولڈ اسمتھ	متعدد مدرسین صاحبان دہلی کالج		خلاصے کا ترجمہ
۶۳۔ تاریخ اسلام				
۶۴۔ انتخاب پلوٹارکس لائوز (مشاہیر یونان و روما)				
۶۵۔ تاریخ چارلس دوم				زیر ترجمہ

[1] سیوطی محض تاریخ حکما اور تذکرۃ المفسرین ہی کے مؤلف ہیں۔

[2] چھ جلدوں میں سے پانچ کا ترجمہ کریم الدین نے کیا۔ صرف تیسری جلد کا ترجمہ محمد لمیر نے کیا تھا (طبقات الشعرائے ہند طبع چہارم ص ۸۰)

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کتاب	مصنف	مترجم	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
۶۶۔ حکمائے یونان				
۶۷۔ تاریخ مسعودی				
۶۸۔ تاریخ یمینی	اشپرنگر			
جغرافیہ:				
۶۹۔ جغرافیۂ ہند	Murray	سروپ نراین اور شیو نراین	مطبع العلوم مدرسۂ دہلی ۱۸۴۹ء	Encyclopaedia of Geography کا ترجمہ
۷۰۔ جغرافیہ بزبان اردو			" ۱۸۵۳ء	
۷۱۔ اٹلس (جغرافیہ)				
۷۲۔ جغرافیۂ قدیم کے نقشے				
۷۳۔ جغرافیۂ طبعی	ٹریل			
سائنس اور علوم:				
۷۴۔ تشریح اور تتمیم علم طبعی کی	Arnot	سروپ نراین اور شیو نراین	دہلی اردو اخبار پریس ۱۸۴۵ء	انگریزی کا ترجمہ
۷۵۔ رسالۂ علم طبیعی		اجودھیا پرشاد اور شیو پرشاد	مطبع العلوم مدرسۂ دہلی ۱۸۴۸ء	"
۷۶۔ رسالۂ علم ہیئت	Herschel	اجودھیا پرشاد اور رام چندر	دہلی اردو اخبار پریس ۱۸۴۸ء	انگریزی کتاب "Astronomy" کا ترجمہ۔[1]
۷۷۔ رسالۂ مقناطیس		سید کمال الدین حیدر	مطبع العلوم مدرسۂ دہلی ۱۸۵۰ء	انگریزی کا ترجمہ
۷۸۔ اصول قواعد مائیات	تھامس ویبسٹر (Thomas Webster)	اجودھیا پرشاد	دہلی اردو اخبار پریس ۱۸۵۰ء	"
۷۹۔ رسالۂ علم ادات	ینگ Young	پنڈت رادھا کشن	مطبع العلوم مدرسۂ دہلی ۱۸۵۲ء	"

[1] آخری بارہواں باب اور ضمیمہ "Encyclopaedia Britannica" سے ماخوذ ہے۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کتاب	مصنف	مترجم	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
۸۰۔ رسالہ کیمسٹری	پارکر			
۸۱۔ علم معدنیات				زیر ترجمہ
۸۲۔ علم مناظر	نیلپ Phelib	موتی لال کاٹجو		
۸۳۔ حرارت				لائبریری آف یوزفل نالج کے رسالے کا ترجمہ
۸۴۔ ترجمہ (Hydraulics)				
۸۵۔ ترجمہ (Double Refraction & Polarisation of Light)				
۸۶۔ رسالہ علم برق	زاجبٹ			
۸۷۔ گالون ازم	"			
۸۸۔ رسالہ مرایا و مناظر	برشل	پنڈت موتی لال کاٹجو		
قانون :				
۸۹۔ قوانین دیوانی	پرنسپ	منشی حسینی	دہلی اردو اخبار پریس ۱۸۴۳ء	۱۸۲۸ء تک پرنسپ کی کتاب کا ترجمہ ہے اور ۱۸۲۹ء سے ۱۸۴۲ء تک گشتی اور توضیحات سے
۹۰۔ اصول دھرم شاستر	ڈبلیو ایچ مکناٹن	رام کشن	" ۱۸۴۰ء	
۹۱۔ کلیات قوانین دیوانی[1]		متعدد مولوی صاحبان	" ۱۸۴۲ء	
۹۲۔ اصول قواعد اخلاق اور قوانین	Bentham & Dumont.	پنڈت رام کشن	مطبع رفاہ عام دہلی ۱۸[illegible]ء	انگریزی سے ترجمہ

[1] بنگال اور اضلاع شمال و مغربی کے تمام قوانین اور مارشن میں کے سرکلر کا خلاصہ بھی شامل ہے۔ علاوہ بریں دھرم شاستر اور شرح شریف محمدی بھی شامل ہے۔

کتاب	مصنف	مترجم	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
۹۳۔ اصول پولیٹی کل اکونومی	John stuart mill	منشی وزیر علی	مطبع رفاہ عام، دہلی ۱۸۴۳ء	انگریزی سے ترجمہ
۹۴۔ اصول قوانین ممالک مخلوط مع بعض مثالوں کے تواریخ سے	F. Boutros	پنڈت رام کشن	دہلی اردو اخبار پریس ۱۸۴۴ء	"
۹۵۔ اصول سرکاری محاصل کے مع ایک خلاصہ قوانین سرکاری محاصل	"	"	" ۱۸۴۴ء	"
۹۶۔ اصولِ علم انتظام مدن	Francis Wayland	دھرم نارائن	" ۱۸۴۶ء	"
۹۷۔ ترجمہ نسخۂ رہنمائی قانون مال کا		متعدد مولوی صاحبان	" ۱۸۴۶ء	فارسی سے ترجمہ
۹۸۔ اصول گورنمنٹ کے	Norton نورٹن	رام چندر اور چمبر	" ۱۸۴۸ء	سید محمد نے اصلاح کی تھی
۹۹۔ سراجیہ (اسلامی قانون وراثت)	مکناٹن	سید محمد اور حسینی		
۱۰۰۔ قانون محمدی فوجداری	"	ماسٹر حسینی		
۱۰۱۔ قانون مال	مارشمین	حسن علی خاں		
۱۰۲۔ خلاصہ قانونِ فوجداری	اسکیپ وتھ	ماسٹر حسینی		
۱۰۳۔ اسسٹنٹ مجسٹریٹ کا گائڈ				
طب :				
۱۰۴۔ رسالہ بیچ بیان اعمال جراحی کے	cooper	جوزف ہنری ٹیلر	مطبع العلوم مدرسۂ دہلی ۱۸۴۹ء	انگریزی کا ترجمہ
۱۰۵۔ رسالہ علم طب میں	پنڈت رام کشن		" ۱۸۴۷	
۱۰۶۔ علم و عمل طب				زیر ترجمہ (عربی سے)
۱۰۷۔ حفظان صحت				ترجمہ عربی سے
۱۰۸۔ عضویات				زیر ترجمہ

لہ باب ۱-۹ (دفعہ ۲) تک کا ترجمہ سبحان بخش نے کیا، باب ۹ (۲) اور باب دس کا مولوی امام بخش صہبائی نے، باب ۱۱ تا ۱۴ تک کا مولوی احمد علی نے، باب ۱۵ تا ۲۳ تک کا میر سید محمد خوش نویس نے اور مولوی حسن علی خاں نے باب ۲۴ سے آخری باب ۳۰ تک کا۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کتاب	مصنف	مترجم	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
زراعت:-				
۱۰۹- مزید الاموال باصلاح الاحوال در علم کشتِ و کار	رایل	پنڈت رام کشن	دہلی اردو اخبار پریس	رایل کی انگریزی کتاب کا خلاصہ
۱۱۰- ہندوستان کے پیداواری ذرائع	رایل			یہ ترجمہ ہے
۱۱۱- طبعی نباتات				زیر ترجمہ
متفرقات:				
۱۱۲- اصولِ علم منطق[1] (ترجمہ شمسیہ)		مولوی سید محمد	اردو اخبار پریس، دہلی ۱۸۴۴ء	
۱۱۳- تعلیم نامہ				
۱۱۴- فلسفہ (Abercrombie's Mental Philosophy)				
۱۱۵- نگارستان				زیر ترجمہ

۱؎ اسی پر سید محمد نے دیباچہ بھی لکھا تھا۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

(فہرست نمبر ۲)

دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی نے تالیف و ترجمہ کے علاوہ جو درسی ضروریات کے تحت بطور خاص تیار کرائی گئی تھیں، متعدد ایسی کتابیں بھی شائع کیں جو علم و ادب کے اعلا معیار کی نمائندہ ہیں اور نصاب کے نقطہ نظر سے مفید و کارآمد تصانیف کے ضمن میں آتی ہیں۔ اس قسم کی کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے :-

کتاب	مصنف	مطبع اور سال طباعت	کیفیت
۱۔ فسانہ لیلیٰ مجنوں کا	محمد حسین تجلی عرف میاں حاجی	مطبع زماہ عام، دہلی ۱۸۴۴ء	منظوم مشہور مثنوی ہے
۲۔ شمشیر خانی یعنی خلاصۂ شاہنامہ	منشی مول چند	دہلی اردو اخبار پریس ۱۸۴۲ء	منظوم ترجمہ امام بخش کی تصحیح کے بعد شائع
۳۔ دیوان خواجہ میر درد دہلوی	میر درد		
۴۔ نل دمن	فیضی		
۵۔ دیوان سودا	مرزا رفیع محمد سودا		
۶۔ دیوان میر تقی میر	میر تقی میر		
۷۔ دیوان جرأت	جرأت		
۸۔ زلیخا (یوسف زلیخا)	جامی، عبدالرحمٰن		یہ فارسی کی مشہور مثنوی ہے
۹۔ بدر منیر (سحر البیان)	میر حسن		
۱۰۔ شکنتلا	کالی داس		
۱۱۔ رگھو ونس	"		ڈراما
۱۲۔ جامع الحکایات	سدید الدین محمد عوفی		
۱۳۔ تاج الملوک و بکاولی (گلزار نسیم)	دیا شنکر نسیم		
۱۴۔ قصہ چہار درویش معروف بہ باغ و بہار	میر امن دہلوی		
۱۵۔ کلیلہ و دمنہ			

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

دلی کالج کے مصنفین

(الف) نامور اساتذہ اور ان کے کارنامے

ڈاکٹر الائز اشپرنگر

اشپرنگر دلی کالج کے تیسرے پرنسپل تھے جن کا تعلق جرمن قوم سے تھا۔ ٹیلر ۲۲ برس تک اور بوترو چار سال کالج کے پرنسپل رہے لیکن اشپرنگر لگ بھگ تین سال تک ہی اس عہدے پر فائز رہے۔ اس قلیل مدت میں بھی انھوں نے مشرقی علوم اور مشرقی شعبے کی جو خدمات انجام دیں وہ ان کے پیش روؤں سے کہیں زیادہ گراں قدر ہیں۔ وہ بڑے ذہین ذکی، اعلا صلاحیت کے [illegible] مالک اور علوم شرقیہ کے بڑے دلدادہ تھے۔ مشرقی اور اسلامی علوم سے اس قدر انہماک اور انسلاک سے ان کی ماقبل زندگی کا عمیق تعلق ہے۔

اشپرنگر کی ولادت ۳ ستمبر ۱۸۱۳ء کو ٹائرول (Tyrol) کے قصبہ ناسرت (Nassereuth) میں ہوئی۔[1] ان کے والد کا نام کرسٹوف اشپرنگر تھا۔ اشپرنگر کی تعلیم کی ابتدا ذی آنا آسٹریا سے ہوئی۔ ابھی سن تمیز کو پہنچے ہی تھے کہ انھیں مشرقی اور اسلامی علوم والسنہ سے خاص شغف پیدا ہوگیا۔ یہ شغف اس حد تک بڑھا کہ وہ کسی مشرقی ملک میں پہنچ کر مشرقی علوم والسنہ کی تحصیل کا منصوبہ بنانے لگے تاکہ مشرق و مغرب کے مابین مغائرت و منافرت کا جو کثیف پردہ حائل ہے اگر اسے ہٹایا جا سکے تو کم از کم اس قدر شفاف اور لطیف کر دیا جائے کہ مشرق و مغرب والے اقوام ایک دوسرے کو دیکھ بھال [illegible] سمجھ بوجھ سکیں۔ اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے مشرقی ممالک میں [illegible] دی، جس کے لیے انھیں کافی پاپڑ بیلنا پڑے۔ سب سے پہلے انھیں برطانوی شہریت حاصل کرنے کی فکر لاحق ہوئی تاکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی وساطت سے ہندوستان پہنچنے کی راہ ہموار ہوسکے۔ اس خواب

---

[1] E.C. Buckland, Dictionary of National Biography, P.398

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کو بروئے عمل لانے کے لیے اشپرنگر ۱۸۳۶ء میں ۲۳ برس کی عمر میں انگلینڈ پہنچے، اور لائیڈن یونی ورسٹی (ہالینڈ) سے طب میں فراغت حاصل کی۔ ۱۸۴۱ء میں لندن یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹر آف میڈیسن (M.D.) کی ڈگری تفویض کی۔ دوران تعلیم اشپرنگر کو برطانوی شہریت بھی حاصل ہو چکی تھی، چناں چہ آگے کے مراحل آسان ہو گئے۔

۱۸۴۳ء کے اوائل میں اشپرنگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی میڈیکل سروس میں داخل ہوئے اور اسی سال "اسسٹنٹ سرجن آف بنگال" کی حیثیت سے کلکتہ پہنچے۔ جب مسٹر بوترو نے اپنا مشروط استعفا دیا تو ۱۸۴۵ء میں وہ دلی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔[1]

مسٹر بوترو نے مشرقی شعبے اور طلبہ کی جانب خاص توجہ مبذول کی تھی۔ اس کی ترقی کے لیے ۱۸۴۳ء میں دلی ٹرانس لیشن سوسائٹی قائم کر کے کتابوں کی طباعت و اشاعت کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس شعبے کی ترقی اور اس کے طلبہ کی فلاح و بہبود کے لیے جس جوش اور لگن سے کام شروع ہوا تھا ایسا لگتا تھا کہ بوترو کی ہندوستان سے واپسی کے بعد وہ جوش و خروش ماند پڑ جائے گا لیکن ڈاکٹر اشپرنگر بوترو پر بھی سبقت لے گیے۔ انھوں نے آتے ہی مشرقی شعبے کی طرف خاص توجہ کی اور اس کے نصاب میں کچھ اہم تبدیلیاں کر کے اسے زمانے کے مطابق بنانے کی کوشش کی۔ طلبہ کو ان کے مضامین سے رغبت پیدا کرنے کے لیے کچھ مفید اور اہم کتابیں داخل نصاب کیں۔ بعض کتابیں ہندوستان میں کمیاب بلکہ نایاب تھیں اور یورپ میں شائع ہو چکی تھیں، وہ وہاں سے منگائی گئیں۔ متنبی اور حماسہ کے نسخے بہم پہنچائے اور خود بھی نصاب کے لیے تاریخ یمینی مرتب کی اور اسے چھپوایا۔ علاوہ بریں مشرقی شعبے کے طلبہ کے لیے جن کتابوں کی ضرورت پڑتی تھی وہ انھیں ترجمہ کراتے اور چھپواتے۔ چوں کہ وہ دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی کے سکریٹری بھی تھے اس لیے اس کام میں دیر نہ لگتی تھی۔

قیام دلی ڈاکٹر اشپرنگر کے لیے بڑا مفید ثابت ہوا۔ کیوں کہ اس عہد میں دلی مشرقی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا مرکز تھی۔ اور وہ جس عہدے پر فائز تھے اس کی نوعیت بھی ایسی تھی کہ دلی کے شرفا و امرا اور علما و فضلا سے تعلق استوار کرنے میں انھیں بڑی آسانی ہوئی جس کی وجہ سے اشپرنگر کو اپنے مقاصد کے حصول میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ دلی کے علما و فضلا کی صحبت نے مشرقی علوم و فنون کے حصول میں ان کے لیے

---

[1] جارج اسمتھ نے اشپرنگر کے پرنسپل بننے کا سنہ ۱۸۴۸ء لکھا ہے، جو درست نہیں ہے (کانسائز ڈکشنری آف نیشنل بایوگرافی ص ۱۲۲۹)

سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ دلی آئے ابھی تین برس بھی نہیں ہوئے تھے کہ ۱۶ دسمبر ۱۸۴۸ء کو گورنمنٹ نے انھیں عارضی طور پر لکھنؤ کے ریزیڈنٹ کا ایڈیشنل اسسٹنٹ مقرر کر دیا۔ اس عارضی تقرری کا یہ مقصد تھا کہ وہ شاہانِ اودھ کے کتب خانوں کی ایک جامع فہرست مرتب کریں۔ اشپرنگر کے لکھنؤ میں ورود و قیام اور اس زمانے کی مصروفیات کا تذکرہ کرتے ہوئے سید مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں۔

"۳۰ مارچ سنہ ۱۸۴۸ء کو اشپرنگر لکھنؤ میں وارد ہوئے اور یکم جنوری سنہ ۱۸۵۰ء تک وہ مقیم رہے۔ بائس ماہ کے اس قیام میں ایک مہینا بعض دوسرے فرائض کی انجام دہی میں صرف ہوا۔ تین مہینے بیماری کی بیکاری میں گزرے باقی ڈیڑھ برس کا زمانہ فہرست مرتب کرنے میں لگا۔ اس زمانے میں کوئی دس ہزار کتابیں ڈاکٹر اسپرنگر کی نظر سے گزریں، جن میں بہت سی کتابیں ناقص تھیں، جن کے نام، مصنف اور تاریخ تصنیف کا پتا بہت تلاش سے بھی نہ لگا، اور آخر ان کو قلم انداز کر دینا پڑا۔"[1]

اشپرنگر کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ وہ ہر تیسرے مہینے اپنے کام کی رپورٹ بھیجتے رہیں۔ ان کی پہلی رپورٹ کے مطابق لکھنؤ کے شاہی کتب خانے تین مقامات پر تھے۔ پہلا موتی محل کے بیرونی دفاتر میں، دوسرا توپ خانے میں[2] اور تیسرا فرح بخش محل[3] میں۔

موتی محل کے کتب خانے میں تین ہزار سے زاید کتابیں تھیں، جن میں عربی، فارسی، پشتو، اردو اور چغتائی ترکی کے مخطوطے شامل تھے۔ ان میں ایک ہزار سے زیادہ مخطوطوں کے دوسرے اور تیسرے نسخے بھی موجود تھے۔ ان کی زبان وار تعداد حسب ذیل تھی

"عربی ۵۰۳، فارسی ۱۲۸۵، اردو ۷۰، چغتائی ترکی ۲۱، پشتو ۳، کل تعداد ۲۰۴۲"[4]

---

[1] تقریظ یادگار شعرا ص ۳

[2] یہ توپ خانہ ایک وسیع و عریض عمارت تھی، جس میں توپیں، بارود اور جنگ سے متعلق چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ اس کے تین حصوں میں فوجوں کے لیے اسٹور تھا اور شمال کی جانب اوپری منزل میں کتب خانہ تھا۔

[3] یہ غازی الدین حیدر کی قیام گاہ تھی۔ غازی الدین حیدر نواب سعادت علی خاں بن نواب شجاع الدولہ کے بیٹے تھے۔ ان کی یادگاریں لکھنؤ میں اب بھی موجود ہیں، جن میں قدم رسول اور شاہ نجف شامل ہیں۔ شاہ نجف ان کا مقبرہ ہے۔ اس کا نام شاہ نجف اس لیے پڑا کہ یہ روضہ حضرت علی کے روضۂ اقدس کے مشابہ ہے۔

[4] محمد عتیق صدیقی، اکادمی، لکھنؤ جولائی ۱۹۸۱ء ص ۴۰

توپ خانے والے کتب خانے میں کارآمد اور بیش بہا کتابیں بار برداری کے چالیس بڑے نیم شکستہ شتر نما صندوقوں (camel Tranks) میں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے بعض کتابوں کو چوہوں نے کاٹ کھایا تھا۔ توپ خانے کے آخری حصے میں مفید کتابیں کئی بوریوں میں بند تھیں، جن میں "تاج اللغات" اور "ہفت قلزم" کی تمام جلدیں دیمکوں کی افزائشِ نسل کی وجہ سے چھلنی بن گئی تھیں۔ سب سے زیادہ کتابیں اسی کتب خانے میں موجود تھیں۔ لیکن نسبتاً وہ زیادہ بوسیدہ اور کرم خوردہ بھی تھیں۔ اشپرنگر نے ان کتابوں کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہاں ایسی کتابیں ملیں جو دنیا میں کسی اور جگہ نہیں مل سکتی تھیں۔" اس نے اپنی فہرست کیلئے اس کتب خانے سے ۱۱۴۳ کتابیں منتخب کی تھیں، جو ۲۲ مختلف موضوعات سے تعلق رکھتی تھیں۔ انمیں اردو کے ۶۲ اور ہندی کے ۵ مخطوطات بھی شامل تھے۔[۱]

فرح بخش محل میں واقع کتب خانے میں تقریباً ایک ہزار عمدہ اور نایاب مخطوطے موجود تھے۔ یہ مخطوطات بڑے سلیقے سے الماریوں میں رکھے ہوئے تھے۔ بعد میں یہ ذخیرے بلوائیوں کی نذر ہو گئے۔ اشپرنگر نے بڑی جاں فشانی، دیدہ ریزی اور سعیِ پیہم سے عربی، فارسی اور ہندوستانی مخطوطات کی ایک فہرست مرتب کی، جو "اودھ کیٹلاگ"[۲] (Audh catalogue) کے نام سے مشہور ہوئی۔ اسکی ترتیب میں علی اکبر پانی پتی نے ڈاکٹر اشپرنگر کی بڑی مدد کی تھی۔ علی اکبر دلی کالج کے طالب علم تھے۔ اشپرنگر انھیں اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کی جاں کاہی اور جفا شعاری سے متاثر ہو کر اشپرنگر نے لفٹننٹ گورنر سے سفارش کر کے انھیں آگرہ کالج میں عربی کا پہلا پروفیسر مقرر کرا دیا تھا۔ ۱۸۵۲ء میں عنفوانِ شباب میں وہ موت کی نذر ہو گیے۔

جنوری ۱۸۵۰ء میں "اودھ کیٹلاگ" کی ترتیب سے فارغ ہو کر اشپرنگر نے اپنی اصل خدمت پر مراجعت کی۔ ۱۹ اپریل ۱۸۵۰ء کو وہ بربنائے علالت چھٹی لے کر شملہ چلے گیے اور اس کے ایک ہی ماہ بعد یعنی مئی ۱۸۵۰ء میں انھیں حکومت کی طرف سے فارسی کا ترجمان اور ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا معتمد مقرر کر کے کلکتہ بھیج دیا گیا جہاں وہ سات سال رہے۔ اس دوران انھوں نے مدرسہ عالیہ اور

---

[۱] محمد عتیق صدیقی، اکادمی، لکھنؤ جولائی ۱۹۸۱ء ص ۱۴۱

[۲] اس کا پورا نام "A catalogue of Arabic Persian And Hindustani Manuscript of the Libraries of the King of Audh" تھا۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ہگلی کے مدرسے میں پرنسپل کی خدمات بھی انجام دیں۔ اس کے علاوہ وہ فورٹ ولیم کالج کے ممتحن بھی مقرر ہوئے تھے۔ کالج کے خاتمے کے بعد جنوری ۱۸۵۴ء میں لارڈ ڈلہوزی کے ایما سے جب بورڈ آف اگزامنرز کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کے رکن منتخب ہوئے[1]

دلی کے قیام کے دوران اشپرنگر نے اردو کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ نہ صرف یہ کہ انھوں نے کتابیں لکھیں بلکہ ان کی ترغیب سے بہت سی کتابیں معرض وجود میں آئیں۔ انھوں نے ایک رسالہ "فوائد الناظرین" ماسٹر رام چندر کی ادارت میں جاری کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سر سید احمد خاں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "آثار الصنادید" اشپرنگر ہی کی تحریک سے متاثر ہو کر تصنیف کی تھی۔ اشپرنگر نے "قران السعدین" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار بھی جاری کیا تھا جس میں مغربی ممالک کی خبریں، سائنس کے موضوعات پر کالج والوں کے مضامین، دوسرے اخبارات کے اقتباسات اور انگریزی کتابوں کے تراجم شائع کیے جاتے تھے۔ دوران قیام کلکتہ جب وہ ایشیاٹک سوسائٹی کے سکریٹری تھے تو وہاں بھی انھوں نے علما و فضلا کی مدد سے عربی و فارسی کی متعدد کتابوں کی اشاعت کا انتظام و اہتمام کیا۔ دوران قیام ہندوستان اشپرنگر نے دو سال کی چھٹی لے کر عراق، شام اور دیگر اسلامی ممالک کا سفر بھی کیا تھا۔

۱۸۵۷ء میں اشپرنگر نے ہندوستان کو خیرباد کہا۔ لیکن مشرقی علوم والسنہ کی خدمات کا جذبہ اب بھی کم نہ ہوا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یورپ پہنچنے کے بعد برلن یونیورسٹی اور اس کے بعد ۱۸۸۱ء میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی (جرمن) میں مشرقی زبان کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ جرمنی کے قیام کے دوران انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اور تعلیمات کے عنوان سے جرمنی زبان میں تین جلدوں پر مشتمل ایک کتاب تصنیف کی جو ۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۵ء کے درمیان برلن سے شائع ہوئی۔[2] اس کی تصنیف کا مقصد ان غلط فہمیوں کا ازالہ تھا جو اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف اقوام مغرب کے ذہنوں میں راسخ ہو چکی تھیں۔ جرمنی میں اسی برس کی عمر میں ۱۸۹۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔

---

[1] مارشمن، فورٹ ولیم کالج ص ۱۶۱

[2] Concise Dictionary of National Biography by G. Smith P.1224

[3] جرمن زبان میں کتاب کا نام ہے "Lehen and Lehren Mohammad".

ڈاکٹر اشپرنگر کو مشرقی علوم سے جو شغف تھا اس میں مکر وریا اور ظاہر داری و زمانہ سازی کا سرمو دخل نہ تھا۔ جدید انکشافات سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ انھیں علوم شرقیہ سے جو دلچسپی تھی وہ خلوص پر مبنی تھی۔ جو کتابیں انھوں نے ہندوستان میں جمع کی تھیں انھیں یہاں سے واپسی کے وقت وہ اپنے ساتھ لے گیے اور اس غرض سے کہ یورپین ان کے مطالعہ سے مستفید ہو سکیں اس بیش بہا علمی ذخیرے کو برلن کے سرکاری کتب خانے کے سپرد کر دیا۔

ڈاکٹر اشپرنگر ہر شعبۂ ادب سے دلچسپی رکھتے تھے لیکن اردو سے انھیں خاص شغف تھا۔ وہ اردو کی پر تکلف اور عربی فارسی سے بوجھل عبارت آرائی اور لفظی ترجمے کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اسے نقصان دہ سمجھتے تھے اور اس کے مقابلے میں آسان، صاف اور رواں عبارت کو ترجیح دیتے تھے چنانچہ دلی کالج کی ۱۸۴۵ء کی رپورٹ میں انھوں نے دقیق اور مولویانہ طرز تحریر کے نقائص اور صاف ستھری عبارت کے فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"مولوی صاحب جو اپنے شاگردوں سے فارسی اور عربی سے اردو میں ترجمہ کراتے ہیں وہ اس قدر لفظی ہوتا ہے کہ میں نے اکثر یہ دیکھا ہے کہ اگرچہ طالب علم استاد کی منشا کے مطابق ترجمہ کر لیتا ہے لیکن اصل مفہوم سے نا آشنا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولویوں اور ان کے شاگردوں کا طرز تحریر بھدا اور زبان بے مزہ اور غلط ہوتی ہے۔ ان کے خیالات ملّایانہ طرز تعلیم کی وجہ سے نہایت محدود ہوتے ہیں۔ میری رائے میں مشرقی شعبے کے تمام نقائص میں سے سب سے پہلے اس کی اصلاح ہونی چاہیے اور مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد دوسرے ہی امتحان میں ترقی نظر آئے گی۔"[۱]

اس طرح ہم دیکھتے ہے کہ اشپرنگر کی قیادت ہر اعتبار سے دلی کالج کے لیے نعمت عظمیٰ ثابت ہوئی۔ ان کی وجہ سے دلی کالج کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ اگرچہ انھوں نے یہاں صرف تین برس گزارے تاہم اس مختصر مدت میں بھی کالج کی شہرت کو آسمان پر پہنچا دیا۔ ان کی انھی ناقابل فراموش خدمات کی بنا پر مشرقی علوم والسنہ کے یورپی عالموں میں ان کا نام عزت و احترام کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

---

[۱] بحوالہ مرحوم دہلی کالج ص ۴۲ - ۴۱

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

تصنیفات :

(۱) اودھ کیٹلاگ ۔ یہ شاہانِ اودھ کے کتب خانوں کے مخطوطات کی ایک جامع فہرست ہے، جسے ۱۸۵۴ء میں کلکتہ سے شائع کیا گیا۔ یہ ۶۵۵ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ۳۲۰ مخطوطات کا ذکر ہے[۱] اودھ کیٹلاگ تین ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول کے تحت فارسی اور اردو شعرا کے تذکروں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ باب دوم میں فارسی شعرا کی بعض تصانیف کا ذکر ہے۔ تیسرا باب ہندوستانی شعرا کی بیش بہا اور نادر کتابوں کی تفصیلات پر مشتمل ہے اور شاید یہی حصہ سب سے مفید اور اہم بھی ہے۔ اس میں ایسی بہت سی نادر اور نایاب کتابوں کا ذکر ہے، جو اب عنقا ہیں اور جن کے بارے میں ہماری تمام تر معلومات کا یہی واحد ماخذ باقی رہ گیا ہے ۔

اودھ کیٹلاگ کے پہلے باب کا وہ حصہ جس میں شعرائے اردو اور ہندی کے مختصر حالات بغیر نمونۂ کلام درج ہیں اور جو صفحہ ۱۹۳ سے ۳۰۶ تک یعنی ایک سو چودہ صفحات کو محیط ہے، طفیل احمد نے ۱۹۳۲ء میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ "یادگار شعرا" کے نام سے ۱۹۴۳ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی جانب سے پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا[۲] اتر پردیش اردو اکادمی نے اسے ۱۹۸۵ء میں دوبارہ شائع کر دیا ہے۔"

"یادگار شعرا" میں ۱۵۱۲ شعرائے اردو کے مختصر حالات درج ہیں۔ اس کی ابتدا شیخ نجم الدین علی خاں معروف شاہ مبارک آبرو کے ذکر سے اور خاتمہ حکیم یونس کے حالات پر ہوا ہے۔ اس میں طفیل احمد کا مختصر دیباچہ اور پروفیسر مسعود حسن رضوی کی لکھی ہوئی تقریظ شامل ہے ۔

"اودھ کیٹلاگ" اغلاط سے مبرا نہیں۔ یہ غلطیاں زیادہ تر تاریخی نوعیت کی ہیں لیکن ان کی وجہ سے اس کی افادیت واہمیت میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسی فہرست ہے جس سے اردو زبان وادب کی تاریخ کے بہت سے ایسے گوشے جو ابھی تک گمنامی میں ہیں، سامنے آجاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس مکمل کیٹلاگ کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ یہ ترجمہ ہمارے ادبی سرمائے میں یقیناً ایک گراں قدر اضافہ ہوگا۔

---

[۱] فہرست کا آغاز "لباب الالباب" سے اور اختتام "نشتر عشق" مصنفہ حسین علی خاں پر ہوتا ہے۔

[۲] محمد رضا انصاری (چیرمین اردو اکادمی لکھنو) کا یہ بیان صحیح نہیں کہ "یادگار شعرا" ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا تھا۔ (پیش لفظ یادگار شعرا ص ۳)

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

دراصل اشپرنگر "اودھ کٹیلاگ" کو پانچ جلدوں میں مرتب کرنا چاہتے تھے۔ پہلی جلد کے منظر عام پر آنے کے بعد اشپرنگر اور گورنر جنرل کے دفتر سے جو مراسلت ہوئی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری جلد بھی مرتب ہو کر پریس جانے کے لئے تیار تھی، گورنر جنرل اس کی طباعت کے اخراجات بھی منظور کر چکے تھے۔ لیکن دریں اثنا کسی خاص سبب سے اشپرنگر کو یورپ واپس جانا پڑا۔ یورپ مراجعت سے قبل ستمبر ۱۸۵۷ء میں انھوں نے گورنر جنرل سے دوسری اور بقیہ تین جلدوں کو لندن سے شائع کرنے کی اجازت مانگی لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اس کی اجازت نہ مل سکی اشپرنگر کے اس بقیہ سرمائے کا جو انھوں نے بڑی عرق ریزی اور محنت سے تیار کیا تھا، اب کہیں پتا نہیں چلتا۔

۲۔ انگریزی ہندوستانی قواعد۔ اس کتاب میں جو خاص طور سے انگریزوں کے لیئے لکھی گئی تھی اردو قواعد کو انگریزی قواعد کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔

۳۔ عربی ادب کا انتخاب ۔ عربی کے منتخب شہ پاروں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب طلبہ کی نصابی ضروریات کے تحت مرتب کی گئی تھی۔

۴۔ اصطلاحات صوفیہ ۔ یہ تصوف کے موضوع پر ایک مختصر رسالہ ہے۔

۵۔ محمود غزنوی ۔ یہ کتاب محمود غزنوی اور اس کے عہد حکومت کی ایک مختصر تاریخ ہے

۶۔ تاریخ یمینی ۔ خاص طور پر یہ مشرقی شعبے کے طلبہ کے لیے لکھی گئی تھی۔

۷۔ (محمدؐ حیات و تعلیمات) تین جلدیں Lehben and Lehred Mohammad

اپنے وطن مراجعت کے بعد اشپرنگر نے پیغمبر اسلام کی حیات اور تعلیمات سے متعلق جرمنی زبان میں یہ کتاب تصنیف کی، جو ۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۵ء کے درمیانی زمانے میں برلن سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں حضور اکرم اور ان کے اخلاق و کردار کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں بعض ایسے عقائد و اوہام سے نقاب کشائی کی گئی ہے جو یورپ کے لوگوں میں رائج تھے اور جنکی بنا پر وہ اسلام اور حضور اکرم سے بدظن تھے۔ مالک رام اس کا سبب تالیف بیان کرتے ہیں کہ "ان غلط فہمیوں کے ازالے کی کوشش کی ہے جو مغرب میں اسلام اور شارع اسلام سے متعلق راسخ تھے"[1]

---

[1] بحوالہ قدیم دلی کالج ص ۵۱

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

چنانچہ اس کتاب کی ہندوستانیوں ہی نے نہیں بلکہ بعض یورپی مستشرقین نے بھی تعریف کی ہے۔ اور اشپرنگر کی قابلیت کی داد دی ہے۔ ایک جرمن مصنف اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے "کوارٹرلی ریویو" میں لکھتا ہے کہ

"جن لوگوں نے اسلام کی نسبت لکھا ہے ان میں ڈاکٹر اشپرنگر کی کتاب کو جو مصنفوں میں اول درجہ رکھتا ہے، ہم نے اس لیے سب سے افضل قرار دیا ہے کہ وہ بہ نسبت اور سب کے نہایت جامع ہے اور بڑی قابلیت سے لکھی گئی ہے۔"[1]

واضح رہے کہ اشپرنگر نے ہندوستان کے زمانۂ قیام میں سیرت نبوی سے متعلق انگریزی میں ایک اور کتاب لکھی تھی، جو ۱۸۵۱ء میں الہ آباد سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں انھوں نے پیغمبر اسلام پر انواع واقسام کے الزام عاید کیے ہیں اور ایسی خود ساختہ باتیں کہی ہیں جو ان جیسے سنجیدہ شخص کے لیے مناسب معلوم نہیں ہوتیں۔ چنانچہ ہندوستانیوں کے علاوہ بعض انصاف پسند انگریزوں نے بھی ان کی اس کتاب کی تنقیص وتردید کی ہے۔ سر ولیم میور جو خود ایک سیرت نگار ہیں، لکھتے ہیں کہ

"ڈاکٹر اشپرنگر صاحب کی کتاب ایسے موقع پر میرے پاس پہنچی جب کہ میں اس مضمون کی تحصیل وتلاش کر رہا تھا اور جیسا کہ میں نے اپنی کتاب کے بعض مقامات میں ثابت کیا ہے کہ اس کے مضامین کی بنیاد غلطی پر معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے محمد (ص) کے قبل زمانے کے عرب کا اور خاص محمد (ص) کا اور ان کی خصلت کا جو حال لکھا ہے وہ سب غلط رایوں پر مبنی ہے۔"[2]

ان کتابوں کے علاوہ اشپرنگر نے گلستاں، الاصابۃ فی احوال الصحابہ اور سکندر نامہ ایڈٹ کر کے کلکتہ سے شائع کیا تھا۔

مولانا مملوک العلی نانوتوی:

مولانا مملوک العلی[3] کی ولادت ۱۲۰۴ھ میں سہارنپور کے ایک گاؤں نانوتہ میں ہوئی تھی، جو ان کا آبائی وطن تھا۔[4]

---

[1] بحوالہ دیباچہ الخطبات الاحمدیہ ص ۲۶

[2] ایضاً ص ۱۵

[4] عبدالحی حسنی۔ نزھۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر جلد ۷ ص ۴۹۲

[3] والدین نے ان کا نام مملوک علی رکھا تھا جس کے معنی علی کا بندہ ہوا۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد انھوں نے اس میں ترمیم کر کے مملوک العلی لکھنا شروع کر دیا۔ اس ترمیم سے مملوک کی نسبت حضرت علی کی بجائے خدا کی طرف ہو جاتی ہے جس کا ایک نام "علی" بھی ہے۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

ابتدائی تعلیم انھوں نے یہیں حاصل کی۔ اس کے بعد دلی چلے گئے وہاں علامہ رشید الدین دہلوی اور دوسرے علما سے فقہ، اصول فقہ، عربی ادب، منطق اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی اور ان میں مہارت پیدا کی۔ اس کے بعد مدرسۂ دارالبقا کے معلم مقرر ہوئے جب دلی کالج کھلا تو عربی کے پہلے صدر مدرس مقرر ہوئے[1] ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں حج کے ارادے سے سفر حجاز کیا اور پورے ایک سال بعد ہندوستان واپس آئے۔ ۱۱ر ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ (۷ر اکتوبر ۱۸۵۱ء) کو یرقان کے مرض میں وفات پائی[2] حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ کے قبرستان مہندیوں میں مسجد کے سامنے مدفون ہیں، قبر کا نشان موجود نہیں رہا[3]

مملوک العلی عربی کے گنے چنے عالموں میں سے تھے۔ ان کی شہرت نہ صرف دلی میں تھی بلکہ مضافات دلی کے ارباب علم بھی ان کی علمیت و فضیلت اور زہد و اتقا کی بنا پر انھیں سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے۔ عربی میں تو انھیں کمال حاصل تھا ہی، فارسی اور اردو میں بھی وہ خاصی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کی ذہانت و فطانت کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی طالب علم ان کے پاس پڑھنے کے لیے جاتا تو اسے اس طرح پڑھاتے گویا وہ سبق انھیں حفظ ہے۔ مولوی کریم الدین کے الفاظ میں انھیں "کان علم" اور "مخزن اسرار" کہا جائے تو بجا ہے[4] کالج میں ان کی ذات بابرکات سے طلبہ نے اتنا فیض اٹھایا کہ شاید کسی زمانے میں کسی اور استاد سے نہ اٹھایا ہو۔

کالج کے اکثر طلبہ مدرسے کے اوقات کے علاوہ پڑھنے کے لیے ان کے گھر جایا کرتے تھے علم پروری چوں کہ ان کی جبلت بن چکی تھی اس لیے کسی سے انکار نہ کرتے اور سب کو پڑھاتے تھے۔ ہمہ وقت درس و تدریس میں مشغولیت کے باعث انھیں تصنیف و تالیف کے کام کے لیے بالکل فرصت نہ ملتی تھی۔ اس کے باوجود کالج کی ملازمت کے دوران انھوں نے بعض کتابیں تالیف و ترجمہ کی ہیں، جو ان کی

---

[1] لیکن تعجب ہے کہ مولانا موصوف کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے مولانا قاسم نانوتوی کے تذکرے میں اپنے والد ماجد کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن دلی کالج کی مدرسی کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے بلکہ یوں لکھا ہے "... مدرسۂ دارالبقا میں مدرس مقرر ہوئے اور ساری عمر وہیں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔" (نزھۃ الخواطر جلد ۷ ص ۴۲۰)

[2] نزھۃ الخواطر جلد ۷ ص ۴۲۰۔ [3] سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اول ص ۱۰۰

[4] ایف فلن و مولوی کریم الدین۔ طبقات الشعرائے ہند، طبقہ چہارم ص ۶۹

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

محنت ومہارت کی شاہد ہیں۔ وہ جس کام پر مامور کیے جاتے اسے بڑے تندہی اور شوق سے پایۂ تکمیل تک پہنچاتے تھے۔

ان کے ترجمے دوسرے اساتذہ اور منشیوں کے مترجم کی طرح عربی وفارسی تراکیب سے بوجھل نہیں بلکہ عام فہم اور سلیس زبان میں ہیں۔ انھوں نے اقلیدس کا جو اردو ترجمہ کیا ہے وہ نہایت آسان و عام فہم ہے۔ اس کے متعلق مولوی کریم الدین نے کہا ہے "حق یہ ہے کہ علم ہندسہ کو پانی کی طرح بہا دیا ہے۔"[1]

تالیفات :-

(۱) تحریر اقلیدس کے بارہ مقالے۔ یہ کتاب کالج کے مشرقی شعبے کے نصاب میں شامل تھی۔

(۲) سنن ترمذی کا اردو ترجمہ۔ سنن ترمذی حدیث کی مشہور کتاب ہے مولانا نے اس کا بھی ترجمہ اردو میں کیا تھا۔

مولانا امام بخش صہبائی :-

مولانا کا وطن تھانیسر تھا۔ لیکن ان کی ولادت دلی میں ہوئی تھی۔ تاریخ پیدائش کے سلسلے میں کوئی مستند شہادت موجود نہیں۔ البتہ مولوی کریم الدین نے قیاساً لکھا ہے کہ "عمر ان کی بالفعل اس سال یعنی ۱۲۶۱ھ میں قریب چالیس برس کے ہوگی"[2] اس حساب سے زمانۂ ولادت ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) کے آس پاس قرار پاتا ہے۔ انھوں نے عبداللہ علوی سے فارسی اور مختلف لوگوں سے عربی پڑھی۔ وہ فارسی کے جید عالم تھے اور اپنے زمانے کے مشہور علما شعرا اور لغت، علم بیان، علم بدیع وغیرہ کے ماہرین میں شمار کیے جاتے تھے۔ دلی کالج میں آنے سے پہلے وہ فارسی کی متعدد کتابیں لکھ چکے تھے۔ ان میں سے بعض یہاں شامل نصاب بھی تھیں۔ فارسی کے علاوہ انھوں نے عربی اور اردو شعر و ادب کا بھی بڑا اچھا ذوق پایا تھا۔ اردو میں معاصرین کے درمیان ان کے مرتبے و مقام کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ رام بابو سکسینہ کے بقول "قلعہ کے اکثر شہزادے اور متوسلین ان سے اصلاح لیا کرتے تھے"[3] وہ نہایت سنجیدہ، متین، خلیق اور روشن خیال شخص تھے۔ مولوی کریم الدین اور سرسید نے ان کی بڑی

---

[1] ایف فلن اور مولوی کریم الدین۔ طبقات الشعرائے ہند۔ طبقۂ ... ص ۶۹

[2] ایضاً ص ۲۰

[3] تاریخ ادب اردو حصۂ نثر ص ۸۰

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

تعریف کی ہے۔ دلی شہر میں ان کے فضل وکمال اور ذہانت وفطانت کا ڈنکا بج رہا تھا۔ لیکن دلی کالج کی ملازمت سے پہلے ۱۸۴۰ء تک صہبائی کا کوئی مستقل ومعقول سلسلۂ معاش نہیں تھا۔ شرفا وامرا کے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے اور اس سلسلہ میں ہندو امرا کے یہاں بھی ان کی آمد ورفت تھی۔ چنانچہ گڑ والوں اور کشمیری پنڈتوں کے لڑکے ان کے زیر تعلیم تھے۔ اس کے بعد ان کا تقرر دلی کالج میں ہوگیا۔ مولوی عبدالحق نے ان کے تقرر کا عجیب واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"۱۸۴۰ء میں جب آنریبل مسٹر ٹامس لفٹننٹ گورنر مدرسے کے معائنے کے لئے آئے تو انھوں نے یہ تجویز کی کہ ایک مستند فارسی مدرس کا تقرر ہونا چاہیے۔ مفتی صدر الدین خاں صدر الصدور نے عرض کی کہ ہمارے شہر میں فارسی کے استاد صرف تین شخص ہیں۔ ایک مرزا نوشہ، دوسرے حکیم مومن خاں، تیسرے امام بخش صہبائی۔ لفٹننٹ بہادر نے تینوں کو بلایا۔ مرزا نوشہ بھلا یہ روگ کیوں پالنے لگتے، انھوں نے تو انکار کر دیا۔ مومن خاں نے یہ شرط رکھی کہ سو روپے ماہانہ سے کم کی خدمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش کا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا انھوں نے یہ خدمت چالیس روپے ماہانہ کی قبول کر لی۔ بعد میں پچاس ہوگئے[1]"

یہ پتا نہیں چلتا کہ صہبائی کے تقرر کے وقت دلی کالج میں فارسی کا صدر مدرس کون تھا اور نہ یہی معلوم ہو سکا کہ صہبائی فارسی کے صدر مدرس کب بنائے گئے، لیکن یہ امر مسلم ہے کہ وہ جلد ہی فارسی کے صدر مدرس مقرر ہوگیے تھے۔

مولانا صہبائی کا دلی کالج میں تقرر مشرقی شعبہ کے لیے نعمتِ عظمیٰ ثابت ہوئی۔ انھوں نے مشرقی شعبے کو ترقی دینے میں کلیدی رول ادا کیا ہے اور ترجمہ وتالیف کے کام میں غیر معمولی مدد کی۔ اکثر وبیشتر تراجم کے مسودے تصحیح کے لیے انھی کے پاس بھیجے جاتے تھے۔ کالج کے طلبہ میں تالیف وتصنیف کا جو جذبہ و حوصلہ پیدا ہوا اس میں صہبائی کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس کام میں وہ نہایت دلچسپی کے ساتھ طلبہ کی رہنمائی کرتے تھے۔ ان کے مشہور تلامذہ میں آزاد، پیارے لال آشوب اور "تذکرہ گلستانِ سخن" کے مولف مرزا قادر بخش صابر دہلوی کے نام بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ

---

[1] مرحوم دہلی کالج ص ۵۳-۱۵۲

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

تذکرہ "گلستان سخن" دراصل صہبائی ہی کی تالیف ہے[1] اسی طرح سرسید احمد خاں کی شہرۂ آفاق کتاب "آثار الصنادید" کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے پہلے ایڈیشن کا متن صہبائی ہی نے لکھا تھا چنانچہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کے اس بیان کے علاوہ کہ صہبائی نے "آثار الصنادید" کی تصنیف میں سرسید کی کافی مدد کی تھی[2]، مولانا حامد حسن نے لکھا ہے کہ "اس (آثار الصنادید) کی عبارت سرسید نے مولوی امام بخش صہبائی سے لکھوائی تھی"[3] اس ضمن میں حالی سے معتبر شہادت کس کی ہو سکتی ہے، انھوں نے لکھا ہے "آثار الصنادید" کا سب سے پہلا ایڈیشن جس کی عبارت میں بہت کچھ ساختگی اور تکلف پایا جاتا ہے، جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے ہیں مولانا صہبائی کا لکھا ہوا ہے[4] اس کے علاوہ قدیم عمارتوں کے کتبہ وغیرہ کی نقل اتارنے میں بھی انھوں نے سرسید کی کافی مدد کی تھی۔

مولانا صہبائی ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دار و گیر میں اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ گولی کا نشانہ بنائے گیے اور ان کا مکان مسمار کر دیا گیا مصور غم علامہ راشد الخیری نے ایک موقع پر ان کی شہادت کا واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> "مولانا قادر علی مولانا صہبائی کے حقیقی بھانجے تھے اور ان ہی کے ساتھ ان کے گھر میں رہتے تھے، ایک موقع پر بیان کرتے تھے کہ میں صبح کی نماز اپنے ماموں مولانا صہبائی کے ساتھ کٹرہ مہر پرور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دن دن کرتے آپہنچے، پہلی رکعت تھی کہ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں ... ہم گرفتار ہو کر دریا (جمنا) کے کنارے لائے گئے۔ ہم قریب ۴۰۔۴۵ آدمی تھے۔ مسلح سپاہیوں نے اپنی بندوقیں تیار کیں۔ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آکر کہا کہ ... تم میں سے جو لوگ تیرنا جانتے ہیں وہ دریا میں کود پڑیں۔ میں بہت اچھا تیراک تھا مگر ماموں، سب ... اور ان

---

[1] ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے کہ غالب، منشی ذکاء اللہ، سری رام چندر اور عبد الغفور نساخ جیسے ذمہ دار لوگ اسے (گلستان سخن) صہبائی ہی کی تالیف سمجھتے تھے۔ (نیگڈنڈی سالنامہ ۱۹۵۹ء ص ۳۷)

[2] تاریخ ادب اردو حصۂ نثر ص ۸۰

[3] مطالعہ سرسید احمد خاں ص ۲۲۶

[4] حیات جاوید ص ۳۵۷

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

سے کے صاحب زادے مولانا سوز تیرنا نہ جانتے تھے اس لیے دل نے گوارا نہ کیا کہ ان کو چھوڑ کر جان بچاؤں، لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا اس لیے میں دریا میں کود پڑا۔ میں تیرتا ہوا آگے بڑھتا اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا۔ پچاس یا ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کان میں آئیں اور صف بستہ گر گر مر گیے[۱]

صدرالدین آزردہ نے اس دردناک واقعے سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا تھا۔

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو[۲]

اکبرالٰہ آبادی نے بھی ان کے انتقال پر ملال پر اپنے تاثرات ظاہر کیے ہیں۔

نوجوانوں کو ہوئیں پھانسیاں بے جرم و قصور
مار دیں گولیاں پایا جسے کچھ زور آور
وہی صہبائی جو تھے صاحب قول فیصل
ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر[۳]

مولانا صہبائی کے علمی و ادبی کارناموں کی جو تفصیل ہمیں دستیاب ہو سکی ہے، حسب ذیل ہے۔

فارسی:

(۱) رسالہ گنجینۂ رموز۔ یہ رسالہ ایک معما کی شرح میں ہے۔ بقول سرسید متن و شرح دونوں آپ کے نتائج طبع کی رہین منت ہیں۔۔۔ کوئی رسالہ عہد آدم سے اس دم تک کسی صاحب استعداد کے پردۂ فکر سے جلوہ گر ہوا ہے[۴]" شاید اسی تصنیف کے متعلق کریم الدین نے لکھا ہے کہ "ایک رسالہ ایک معما کے حل میں انھوں نے بہت خوب تصنیف کیا ہے، اس میں ایک شعر سے سات سو نام نکلتے ہیں[۵]" لیکن

---

[۱] بحوالہ نوائے ادب۔ بمبئی جنوری ۱۹۶۳ء ص ۲۹

[۲] داستان تاریخ اردو ص ۱۸۷۔ اور جامعہ جولائی ۱۹۸۰ء ص ۳۰۱

[۳] بحوالہ نوائے ادب جنوری ۱۹۶۳ء ص ۳۰

[۴] آثارالصنادید ص ۶۲۲

[۵] طبقات الشعرائے ہند، طبقہ چہارم ص ۲۹ - ۳۸

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

سرسید نے لکھا ہے اور غالباً ان کا بیان صحیح ہے کہ "اس کے ایک بیت سے تین سو ساٹھ اسامی مستخرج ہوتے ہیں"[۱]

(۲) جواہر منظوم عزیز۔ یہ بھی فن معما پر مشتمل ایک منظوم رسالہ ہے۔ اس کی ہر رباعی سے اللہ تعالیٰ کا نام نکلتا ہے[۲]

(۳) زمزمۂ جواہر۔ صہبائی کی یہ تصنیف نظم و نثر کا مجموعہ ہے، جو عہد والی سراج الدین بہادر شاہ کی مدح سرائی پر مشتمل ہے۔

(۴) انشائے مکاتیب۔ بقول سرسید اس کی نثر بیدل کے طرز کی ہے[۳]

(۵) سحر البلاغہ۔ اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

اردو:

۶۔ حدائق البلاغت: یہ شمس الدین فقیر کی اسی نام کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔ بیل نے اسے عربی کا ترجمہ قرار دیا ہے جو صحیح نہیں ہے[۴] یہ ترجمہ صہبائی نے بقول خود ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں دلی کالج کے پرنسپل بوترو کی فرمائش پر کیا تھا[۵] کریم الدین کے بیان کے مطابق یہ کتاب پہلی بار سید عبدالغفور کے زیر اہتمام ۱۸۴۲ء میں سید الاخبار پریس دہلی میں اور دوبارہ ۱۸۴۴ء میں خود کریم الدین کے مطبع رفاہ عام واقع حوض قاضی دہلی میں چھپ کر شائع ہوئی[۶] حامد حسن قادری کے بقول "یہ ترجمہ صرف کہنے کو ترجمہ ہے ورنہ اصل میں فن بلاغت کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ (درحقیقت) اردو میں اس فن کی پہلی مکمل اور مستند کتاب ہے"[۷]

---

[۱] آثار الصنادید ص ۶۳۲

[۲] ایضاً ص ۶۳۲

[۳] ایضاً ص ۶۳۳

[۴] An Oriental Biographical Dictionary P.342

[۵] دیباچہ حدائق البلاغت بحوالہ اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری از ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص ۱۵-۳۱۴

[۶] طبقات الشعرائے ہند، طبقہ چہارم ص ۳۸

[۷] داستان تاریخ اردو ص ۱۸۷

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

(۷) انتخاب دواوین۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ اردو کے چند شعرا کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے۔ یہ انتخاب صہبائی نے دلی کالج کے پرنسپل بوتروکے حسب فرمائش ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں مرتب کیا تھا۔ جو ۱۸۴۴ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ صہبائی نے اس میں صرف بارہ (۱۲) شاعروں کے کلام کا انتخاب مع ان کے مختصر حالات درج کیا ہے۔ ان میں ولی، خواجہ میر درد، سودا، میر تقی میر، جرأت میر حسن، شاہ نصیر، میر نظام الدین ممنون، امام بخش ناسخ، منشی مول چند، شیخ ابراہیم ذوق اور حکیم مومن خاں مومن شامل ہیں[۱] ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بقول اشعار کا انتخاب پاکیزہ ہے مؤلف کے ذوق سلیم پر دلالت کرتا ہے[۲] تذکرہ نگاری کے عام روش کے برخلاف مولف نے اس مجموعہ میں غزل کے علاوہ دوسری اصناف سخن کے نمونے بھی پیش کیے ہیں اور جس صنف میں کوئی شاعر امتیازی حیثیت رکھتا ہے اس کے انتخاب پر خاص توجہ دی ہے۔ حالات کے بیان میں صہبائی نے غیر معمول اختصار سے کام لیا ہے، حتیٰ کہ مشہور و ممتاز معاصرین کے بارے میں بھی ان کے بیانات معدودے چند سطروں سے تجاوز نہیں کرتے۔

"انتخاب دواوین" کا دیباچہ جو اردو میں ہے طلبہ کے نقطۂ نظر سے بے حد کارآمد اور مفید معلومات کا حامل ہے۔ اس میں صہبائی نے شعر کی تعریف اور تاریخ، وزن کی اہمیت، قافیہ و ردیف مبادیات عروض اور اصناف سخن کے بارے میں مختصر مگر جامع مواد یکجا کر دیا ہے۔ اصناف سخن کی تعریف اور تعارف میں نسبتاً زیادہ تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ہر صنف کے مخصوص اوزان کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ممتاز شعرا کے کلام سے اس کے نمونے بھی پیش کر دیے گیے ہیں۔

(۸) قواعد اردو۔ یہ کتاب اردو صرف و نحو پر تالیف کی گئی ہے۔ یہ ۱۸۴۹ء میں دلی سے پہلی بار طبع ہوئی تھی۔ بقول مولوی عبد الحق یہ کتاب بھی اچھی ہے۔ اس کے آخر میں بہ ترتیب حروف ابجد اردو کے محاورات اور کہیں کہیں ضرب الامثال بھی درج ہیں[۳]

---

[۱] تعجب ہے کہ اس انتخاب میں ایک ایسے شاعر جو غالب کی شہرت کا مالک ہے، کا کلام شامل نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں صہبائی اور غالب میں چشمک تھی

[۲] اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ص ۳۱۶ [۳] قواعد اردو ص ۱۶

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ان کتابوں کے علاوہ فارسی میں ظہوری کی شرح، ٹیک چند بہار کی لغت "بہار عجم" کے بعض مشکل الفاظ کی شرح میں ایک رسالہ اور ایک دیوان اور ایک فارسی دیوان بھی ان سے یادگار ہے۔ انھوں نے خواجہ میر درد کے دیوان کی تصحیح بھی کی تھی، جسے دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی نے شائع کیا تھا۔

پنڈت رام کشن:

پنڈت رام کشن کشمیر الاصل برہمن تھے۔ لیکن ان کے بزرگوں نے ملازمت کے سلسلے میں دلی کو اپنا مستقر بنالیا تھا۔ چنانچہ یہ بھی یہیں تبدیل ہوئے اور اس نسبت سے دہلوی کہلائے۔ مولوی کریم الدین نے لکھا ہے کہ "عمر اوس کی سنہ ۱۸۴۷ء میں قریب ۳۵ برس کے ہوگی"[1] اس اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ۱۸۱۲ء کے آس پاس پیدا ہوئے ہوں گے۔ اس زمانے کے عام رواج کے مطابق طلبہ کو فارسی کی تعلیم لازماً دلائی جاتی تھی کیوں کہ تہذیب و تمدن کی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ یہ سرکاری زبان کے منصب پر بھی سرفراز تھی۔ چنانچہ پنڈت رام کشن نے بھی فارسی پڑھی اور ایسی مشق بہم پہنچائی کہ فارسی دانوں میں شمار ہونے لگے۔ کچھ انگریزی بھی پڑھی تھی۔ اس کے بعد دلی کالج میں مدرس مقرر ہوئے۔ یہاں آئے تو انگریزی دانوں کی صحبت نے اس زبان سے ان کی واقفیت میں چار چاند لگا دیے اور رفتہ رفتہ وہ انگریزی، فارسی اور اردو میں یکساں صلاحیت کے مالک بن گیے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کالج میں مشرقی شعبے کے طلبہ کے لیے اردو میں کتابیں تیار کرنے کی تحریک جاری تھی اور بیشتر کتابیں انگریزی کتابوں کی مدد ہی سے معرض وجود میں آرہی تھیں۔ پنڈت جی کا سرگرم تعاون اس کام کو آگے بڑھانے میں نہایت مفید ثابت ہوا۔

پنڈت رام کشن نے دلی کالج میں آنے سے پہلے اردو میں لکھنا شروع کردیا تھا۔ وہ اردو میں طبع آزمائی بھی کرتے تھے۔ یہاں اپنے جوہر دکھلانے کا انھیں اچھا موقع ہاتھ آیا۔ دوسری چیز جس نے انھیں تالیف و ترجمے کی طرف راغب کیا وہ اس کام کی معقول اجرت تھی۔ چناں چہ رام چندر اور کریم الدین کے بعد اگر کسی نے مشرقی شعبے کی کتابوں کی تیاری میں نمایاں حصہ لیا ہے تو وہ پنڈت رام کشن ہی ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور پوری ذمہ داری اور حسن و خوبی کے ساتھ ان کے تقاضوں کی تکمیل کی ہے۔ کریم الدین نے ان کے اسلوب نگارش اور تراجم کی

---

[1] طبقات شعرائے ہند، اکادمی ایڈیشن ص ۳۶۵

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اردو بہت صاف اور شستہ اوس کی ہے اوس کے ترجموں کی خوبی اور اچھے ہونے میں کچھ کلام نہیں[1]"

مندرجہ ذیل کتابیں ان سے یادگار ہیں۔

(۱) مزید الاحوال باصلاح الاحوال:۔ یہ فن زراعت میں پہلی کتاب ہے جو بہت مشہور ہوئی۔

(۲) اصول دھرم شاستر:۔ یہ مکناٹن کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔

(۳) ترجمہ سعید الاسلام:۔ اس کا موضوع اسلامیات واخلاقیات ہے۔

(۴) قواعد صرف ونحو انگریزی:۔ یہ کتاب ڈاکٹر اشپرنگر کی مدرسے لکھی گئی تھی، بظاہر اس کا مقصد طلبہ کو اردو کے ذریعے انگریزی زبان کی قواعد کے مبادیات اور اصول وضوابط سے واقفیت بہم پہنچانا معلوم ہوتا ہے۔

(۵) رسالہ علم طب (۶) اصول قوانین دیوانی وفوجداری

(۷) اصول قوانین کلکٹری:۔ اس کا دوسرا نام "اصول سرکاری محاصل کے" بھی ہے۔

(۸) اصول قوانین گورنمنٹ یا "اصول قوانین ممالک مختلفہ"

جوزف ہنری ٹیلر:۔

مسٹر ٹیلر کالج کے قیام سے ۱۸۵۷ء کی شورش تک ہیڈ ماسٹری اور پرنسپلی کے اعلا عہدوں پر فائز رہے۔ وہ بیس برس تک کالج کے عارضی پرنسپل اور بارہ برس تک ہیڈ ماسٹر رہے۔ اس طرح انھوں نے ۳۲ برس تک کالج کی خدمت انجام دی۔ ٹیلر نہایت خلیق وشریف النفس انسان تھے۔ طلبہ سے بے حد محبت کرتے اور ان کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ گزشتہ اوراق میں بالتفصیل ان کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان کی موت غدر کے زمانے میں ہوئی۔ ممالک مغرب وشمالی کے ناظم تعلیمات نے اس حادثے کے بعد انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"میں مسٹر ٹیلر کی بیش بہا کارگزاری کی تصدیق کرتا ہوں گورمنٹ کے کسی محکمے میں ان سے زیادہ صادق اور قابل قدر کوئی شخص نہ تھا۔ ان کے طویل قیام دہلی اور طلبا سے گہری واقفیت نیز اس ادب واحترام کی وجہ سے جو دہلی والے ان کا کرتے

---

[1] بحوالہ طبقات شعرائے ہند ص ۴۶۵

تھے اور بوجہ اس اثر کے جو وہ دلی کالج کے ہندوستانی اساتذہ پر رکھتے تھے، انھوں نے بہت سی اصلاحیں بغیر کسی مخالفت کے جاری کیں اور کالج کو بڑی ترقی کے درجے تک پہنچایا۔[1]"

جب کالج میں مشرقی شعبے کے طلبہ کے لیے اردو میں کتابوں کی تالیف وتصنیف کا کام شروع ہوا تو مسٹر ٹیلر نے بھی اس میں معاونت کی۔ انھوں نے علم الجراحت کے موضوع پر "رسالہ بیان عمال جراحی" کے نام سے سیمول کوپر کی انگریزی کتاب "Treatise on Surgery" کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

مولوی حسن علی خاں :۔

مولوی کریم الدین نے ان کی عمر ۱۸۴۷ء میں چالیس برس کے قریب بتائی ہے[2]۔ یہ دلی کالج میں فارسی کے مدرس تھے۔ فارسی اور اردو میں مہارت تامہ کے علاوہ عربی سے بھی بقدر ضرورت واقفیت رکھتے تھے۔ انھوں نے بموجب حکم پرنسپل مدرسہ دہلی جو کتابیں اردو میں ترجمہ کی تھیں اور جن کی طباعت واشاعت اسی زمانے میں عمل میں آچکی تھی، وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) ترجمہ قانون مال

(۲) ترجمہ گلستان سعدی

(۳) ترجمہ الف لیلیٰ (انتخاب)

(۴) ترجمہ کرۂ ارضی

میر اشرف علی :۔

دلی کالج کے منشیوں میں میر اشرف علی اپنی ذہانت و ذکاوت کے لیے مشہور تھے۔ اس کے ساتھ ہی شرافت اور منکسر مزاجی بھی ان کا نمایاں وصف تھی۔ مولوی کریم الدین نے ان کے اخلاق تواضع اور ظرافت وخوش مزاجی کی کھول کر تعریف کی ہے۔ میر صاحب فارسی اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ کالج کی طرف سے انھیں ترجمہ وتالیف کے علاوہ اصلاح

---

[1] مرحوم دہلی کالج ص ۵۰-۱۴۹

[2] طبقات الشعرائے ہند طبقہ چہارم ص ۴۲

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

و تصحیح کا کام بھی تفویض کیا گیا تھا۔

آپ نے محمد اعظم کی "تاریخ کشمیر" کو فارسی سے اردو میں منتقل کیا تھا۔ مولوی کریم الدین کے الفاظ میں یہ "بہت اچھا ترجمہ ہے"۔ اس کے علاوہ اصول علم حساب سے متعلق رسالے کی تالیف میں منشی ہردیو سنگھ کو مدد دی تھی اور "بریف سروے آف ہسٹری" کے اردو ترجمے کی تصحیح و اصلاح کر کے اسے طباعت و اشاعت کے لیے تیار کیا تھا۔

منشی حسینی :۔

منشی حسینی دلی کالج میں "تعلیم اطفال" کی خدمت پر مامور تھے کریم الدین کے بیان کے مطابق ۱۸۴۷ء میں ان کی عمر تیس[۲] برس کے قریب تھی۔[۱] اس اعتبار سے ان کی ولادت ۱۸۱۷ء کے قریب ہوئی تھی۔ وہ بڑے نیک، پارسا اور متقی شخص تھے۔ اردو انگریزی اور فارسی زبانوں میں انھیں عبور حاصل تھا۔ علاوہ بریں عربی میں بھی اچھی صلاحیت کے مالک تھے۔ منشی حسینی قانون اور تاریخ کی کتابوں کے ترجمے اور تالیف و ترتیب کا خاص ملکہ رکھتے تھے۔ حسب ذیل تصانیف انھیں کی رہین منت ہیں:

(۱) **تاریخ مغلیہ** :۔ کریم الدین نے اسے ترجمہ قرار دیتے ہوئے اس کے چھپ جانے کا ذکر کیا ہے۔ ان کے بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ ترجمہ فارسی سے کیا گیا تھا یا انگریزی سے۔ لیکن مالک رام نے کالج کی جو فہرست مرتب کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انگریزی کتاب "History of Mughal Empire" کا ترجمہ ہے۔ اس کے ترجمے میں ماسٹر نور محمد اور مولوی سبحان بخش بھی شریک تھے۔

(۲) **تاریخ ایران** :۔ یہ کونڈر صاحب کی انگریزی کتاب "Modern Travellers" کا اردو ترجمہ ہے۔

(۳) **شرع شریف** :۔ کریم الدین کی تحریر کے مطابق یہ مسٹر مکناٹن کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے[۲] جسے منشی جی نے مولوی سید محمد صاحب کی مدد سے تیار کیا تھا۔

(۴) **سراجیہ (اسلامی قوانین وراثت)** :۔ یہ بھی مکناٹن صاحب کی اسی موضوع پر انگریزی

---

[۱] طبقات الشعرائے ہند، طبقہ چہارم ص ۱۷

[۲] ایضاً ص ۱۷

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

میں لکھی ہوئی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔

(۵) قانون محمدی فوجداری:۔ یہ بھی مکناٹن کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

(۶) خلاصہ قوانین دیوانی:۔ مسٹر ریپسپ کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے

(۷) خلاصہ قانون فوجداری:۔ یہ اسکیپ وتھ کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

منشی وزیر علی:۔

وزیر علی کالج کے نامور استادوں میں سے تھے۔ فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ آپ نے انگریزی کی بعض مفید کتابوں کے اردو ترجمے کیے ہیں، جن میں جان اسکاٹ مل کی مشہور تصنیف "Elements of Political Economy"، کا اردو ترجمہ "اصولِ پولیٹکل اکونومی" بطور خاص قابل ذکر ہے۔ انھوں نے "Abridged History of Greece" کا بھی ایک سو باون ۱۵۲ صفحے تک کا ترجمہ کیا تھا۔ اس ترجمے کو شیو پرشاد نے مکمل کیا۔

مولوی احمد علی:

کریم الدین کے بیان کے مطابق ۱۸۴۷ء میں احمد علی کی عمر قریب ۳۵ برس کی تھی[۱] اس اعتبار سے ان کی ولادت کا زمانہ ۱۸۱۲ء کے آس پاس قرار پاتا ہے۔ یہ دلی کے رہنے والے تھے۔ کالج میں مبتدیوں کو فارسی پڑھاتے تھے۔ اور تفنّنِ طبع کے لیے شعر بھی کہا کرتے تھے۔ بقول مرزا قادر بخش صابر:

"ہر چند جمیع علوم میں درست گاہ تم تھے، لیکن فن طبابت میں یہ طولا اور تشخص امراض میں حدس صائب ایسی کہ بیماری نرگس کی علت اور سوسن کی گنگئی زبان کا سبب دریافت کرنا ایک کار سہل ہے۔ سوائے تکمیل مدارج علمی کے اخلاق پسندیدہ اور اوصاف حمیدہ اس طرح مجمع کمالات کی ذات میں فراہم ہیں کہ کتب اخلاق اگر تمام عالم سے محو ہوجاویں، اس کی گفتار و کردار سے ہر کتاب کے بدلے ایک اور کتب خانہ متن و شرح کا بہم ہو سکتا ہے[۲]"

انھوں نے قواعد اردو پر صرف ایک ہی کتاب مسمی بہ "چشمۂ فیض" تصنیف کی، جو بہت ہی مقبول ہوئی۔

---

[۱] طبقات الشعرائے ہند طبقۂ چہارم ص ۔

[۲] گلستان سخن ص ۲۵۶۔۲۵۷

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

مولوی سبحان بخش :

ان کی ولادت قریب ۱۸۰۷ء میں ہوئی۔ یہ دلی کالج میں عربی کے مدرس سوم تھے۔ مولوی کریم الدین کے بقول "بہت فہمیدہ۔ عقلمند اور عالم آدمی تھے اور فنون مستعلا میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔"[1] تالیف و تصنیف اور ترجمہ کے فن سے انھیں خاص شغف تھا۔ پرنسپلوں نے اپنی رپورٹوں میں جابجا ان کی کارگزاریوں کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔ کالج کے زمانۂ ملازمت میں انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف اور ترجمہ کیں۔

(۱) محاورات اردو۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ چناں چہ کئی بار چھپ چکی ہے۔

(۲) تذکرۂ حکما۔ } یہ دونوں کتابیں علامہ عبدالرحمٰن سیوطی کی عربی کتابوں کے ترجمے ہیں۔
(۳) تذکرۃ المفسرین۔ }

(۴) تذکرۃ الفقہا۔ یہ ابن خلکان کی مشہور کتاب "وفیات الاعیان" سے ماخوذ و مترجم ہے۔

یہ تینوں کتابیں (نمبر ۲، ۳ اور ۴) دلی سوسائٹی نے ۱۸۴۸ء میں ایک ہی جلد میں شائع کی تھیں۔

(۵) توزک تیموریہ۔ یہ اسی نام کی مشہور فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔

(۶) تاریخ مغلیہ۔ اس کتاب کے ترجمے میں منشی حسینی اور ماسٹر نور محمد ان کے شریک کار تھے۔

ہردیو سنگھ :

ان کے والد کا نام بستی رام اور دادا کا نام منشی دھرسا ہوتھا۔ وہ دلی کالج میں انگریزی کے استاد تھے۔ کریم الدین کے بقول ۱۸۴۷ء میں ان کی عمر ۲۸ برس کے قریب تھی۔[2] ان کے اوصاف حمیدہ اور فرائض منصبی کی بجا آوری میں دلچسپی و تندہی کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ

"یہ شخص بے کینہ اور بہت صاف دل اور یار باش اور اہل مروت ہے، کارگزار اپنے کار مفوضہ کا بہت ہے۔ نوکری کو اپنا کار تصور کر کے بجان و دل محنت کرتا ہے اور بہت ہوشیار، تیز اور چالاک آدمی ہے۔ میں نے ان کو کبھی فرصت سے بیٹھتے ہوئے نہیں پایا۔ جب دیکھا کار سرکاری میں مصروف دیکھا۔ خلیق اور متواضع آدمی ہے۔"[3]

---

[1] طبقات الشعرائے ہند طبقۂ چہارم ص ۱۷

[2] ایضاً ص ۶۷

[3] ایضاً ص ۶۷

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

تصانیف درج ذیل ہیں :۔

(۱) رسالہ پیمائش زمین ۔ یہ رسالہ دو حصوں میں ہے اور قادر علی کی نظر ثانی کے بعد شائع ہو چکا ہے۔

(۲) اصول علم حساب ۔ یہ ڈی مارگن کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس کی اصلاح اردو اور تصحیح میں منشی اشرف علی اور اجودھیا پرشاد نے بھی مدد کی تھی[1] لیکن کریم الدین اجودھیا پرشاد کا ذکر نہیں کرتے ۔

ماسٹر نور محمد :۔

اگر کریم الدین کا یہ بیان تسلیم کر لیا جائے کہ ۱۸۴۷ء میں نور محمد کی عمر ۲۵ برس ہے[2] تو ان کی ولادت کا زمانہ ۱۸۱۲ء کے قریب قرار پائے گا۔ وہ تحتانیہ جماعت کے معلم تھے اور کریم الدین کے بیان کے مطابق اچھی استعداد رکھتے تھے ۔ ان سے مندرجہ ذیل تراجم یادگار ہیں۔

(۱) تاریخ بنگال ۔ یہ مارش مین کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے، جس میں ابتدا سے ۱۸۴۰ء تک کمپنی کی علمداری کے حالات بیان کیے گیے ہیں ۔

(۲) تاریخ مغلیہ ۔ اس کتاب کے ترجمے کا کام انھوں نے منشی حسینی اور مولوی سبحان بخش کی شرکت میں کیا تھا۔

(۳) سیر الاسلام ۔ کریم الدین کی تحریر کے مطابق اس ترجمے کا کچھ حصہ ان کے نتائج قلم سے ہے[3]

رادھا کشن :

رادھا کشن دلی کالج میں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر تھے ۔ انھیں اردو اور فارسی پر بھی بہ قدر ضرورت عبور تھا۔ ان کی مندرجہ دو کتابیں ہمارے علم میں آئی ہیں۔

(۱) ہندسہ بالجبر ۔ یہ انگریزی کتاب " Algebraical Geometry " کا اردو ترجمہ ہے۔ اس ترجمے میں ماسٹر رام چندر بھی ان کے شریک کار تھے ۔

(۲) رسالہ علم ادات ۔ یہ بھی انگریزی سے ترجمہ ہے ۔

---

[1] مالک رام، قدیم دلی کالج ص ۶۸

[2] طبقات الشعرائے ہند طبقہ چہارم ص ۴۷۲

[3] ایضاً ص ۴۷۲

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

اجودھیا پرشاد :-

اجودھیا پرشاد دہلی کے رہنے والے کشمیری نژاد برہمن تھے۔ یہ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ اور طلبہ کی تعلیم وترقی میں بہت نمایاں حصہ لیتے تھے۔ وہ قلندر بخش جرأت کے شاگرد تھے۔ فن موسیقی اور تیر اندازی میں اچھا دخل رکھتے تھے۔

تصانیف :

(۱) رسالۂ علم ہیئت۔ یہ ہرشل کے انگریزی رسالے "A stronomy" کا اردو ترجمہ ہے اس ترجمے میں رام چندر نے بھی ان کی مدد کی تھی۔

(۲) اصول قواعد مائیات۔ یہ تھامس ویبسٹر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔

(۳) اصول علم حساب۔ یہ ترجمہ انھوں نے ہردیوسنگھ اور اشرف علی کی معیت میں کیا تھا۔

(۴) رسالہ علم طبیعی۔ اس ترجمے میں شیو پرشاد بھی ان کے شریک کار تھے۔

(۵) رسالہ علم مساحت۔ یہ قوانین مستعملہ ۷۷ صفحے کا ایک اردو رسالہ ہے۔

(ب) دلی کالج کے ممتاز طلبہ اور ان کے کارنامے

ماسٹر رام چندر :

رام چندر ۱۸۲۱ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد رائے سندر لال ماتھر محکمۂ مالیات میں اولاً نائب تحصیل دار اور بعد میں تحصیل دار کی حیثیت سے متعین رہے۔ رام چندر ابھی اپنی عمر کے نو برس ہی پورے کر پائے تھے کہ سندر لال ماتھر داغ مفارقت دے گئے۔ ان کی وفات نے گھر کا سارا نظام درہم برہم کر دیا۔ رام چندر چھ بھائی تھے۔ ان کی پرورش وپرداخت میں ان کی بیوہ ماں نے بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا۔ معاشی پریشانیوں کے طوفان میں گھرنے کے بعد انھیں زیورات کے ساتھ گھر کے دوسرے سامان بھی بیچنے پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن بچوں کی تعلیم کا سلسلہ منقطع نہ ہونے دیا۔ چوں کہ رائے سندر لال ماتھر دلی کے رہنے والے تھے اس لیے ان کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ بچوں کو لے کر دلی چلی آئی تھیں جس سے ان کی تعلیم میں کوئی خاص دشواری پیدا نہیں ہوئی۔ کیوں کہ جب ان کے بچے (جن میں رام چندر بھی شامل تھے) دلی کے انگلش اسکول میں داخل ہوئے، تو اس وقت ہر طالب علم کو کچھ نہ کچھ وظیفہ مقرر دیا

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

جاتا تھا، درجہ اول اور دوم کے بچوں کو پانچ پانچ روپیہ ملتا تھا۔

۱۸۳۳ء میں جب رام چندر اس اسکول میں داخل ہوئے تو تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے چھوٹے موٹے اخراجات وظیفے ہی سے پورے ہوتے رہے۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا، اس لیے ان کے یہ دن اچھے نہیں گزرے اور شاید اسی تنگ دستی کے باعث ایک کایستھ کی گونگی بہری لڑکی سے ان کی شادی کر دی گئی۔ صدیق الرحمٰن قدوائی نے اس سلسلے کی تفصیلات ان الفاظ میں بیان کی ہیں۔

"ابھی رام چندر گیارہ برس کے تھے کہ ان کی شادی کی بات چلی۔ پاس پڑوس کے لوگوں نے تو پوت کے پاؤں پالنے ہی میں دیکھ لیے تھے، اس لیے ان پر بہتوں کی نظر پڑی، اتفاق سے شہر کے ایک رئیس خوش حال رائے نے جب شادی کے لیے اپنی لڑکی کا زائچہ بنوایا تو وہ رام چندر کے موافق نکلا۔ خوش حال رائے کی دولت اور رسوخ کی بنا پر پنڈتوں پروہتوں کی ہمدردیاں ان ہی کے ساتھ تھیں، اس لیے ان کی رائے بھی خوش حال رائے کی مرضی کے مطابق رہی۔ دولت اور حسب و نسب کے باعث رام چندر کے خاندان والوں کو یہ رشتہ بہت پسند آیا۔ مزید امور کی زیادہ تحقیق کرنا اس وقت کا دستور نہ تھا۔ برادری میں جو لوگ باعزت، ذمہ دار اور قابل اعتبار سمجھے جاتے تھے ان کا اصرار ہی کافی تھا۔ چنانچہ لڑکی گونگی بہری نکلی۔ مگر کیا کیا جاتا زائچے دونوں کے ملتے تھے۔ لڑکی کا نام سیتا اور لڑکے کا رام چندر ہونا بھی نیک شگون تھا۔[1]"

خوش حال رائے رام چندر کے گھر کی مالی حالت سے خوب واقف تھے۔ اس لیے انھوں نے شادی کے پہلے دن سونے کی سات مہریں، چاندی سونے کے ورقوں میں پان اور بہت سا نقد روپیہ بھیجا۔ لیکن سسرال کا یہ اثاثہ بھی رام چندر اپنی تعلیم کے دوران محفوظ نہ رکھ سکے۔ انگریزی اسکول میں چھ سال تک خوب دل لگا کر پڑھا۔ دوران تعلیم انھیں ریاضی سے خاص شغف پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن یہ معمولی اسکول ان کے شوق کی تکمیل کے لیے ناکافی تھا۔

---

[1] ماسٹر رام چندر، ص ۳۰-۲۹

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

جب معاشی پریشانیاں اور بڑھیں تو انھوں نے پڑھائی چھوڑ کر محرری کا پیشہ اختیار کر لیا۔ لیکن تعلیم کی تکمیل کا شوق اب بھی انھیں بے قرار رکھے ہوئے تھا۔ اسی شوق کی خاطر وہ ۱۸۴۱ء میں ملازمت چھوڑ کر دلی کالج میں داخل ہو گیے۔ اس سلسلے میں انھیں بہ گمان غالب مسٹر بوترو کی ہمدردی حاصل تھی۔ چناں چہ کالج کے سینئر اسکالر شپ کے مقابلے میں بیٹھے تو اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے، اور تیس روپیے ماہانہ وظیفہ ملنے لگا۔ رام چندر جب دلی کالج میں داخل ہوئے تو سال دو سال بعد ہی پرنسپل بوترو کی سرگرمی میں اردو کتابوں کے تراجم کا کام شروع ہوا۔ رام چندر نے بھی بڑی محنت اور دل چسپی سے اپنے استاد مسٹر بوترو کی اس تحریک میں حصہ لیا اور انگریزی کی متعدد کتابوں کے ترجمے کیے۔ جو بہت زیادہ پسند کیے گیے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، بالآخر فروری ۱۸۴۴ء میں کالج کے مشرقی شعبے میں مدرس مقرر ہو گئے۔ وہ ریاضی اور سائنس اردو میڈیم میں پڑھاتے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے ریاضی کی ایک کتاب ترتیب دی۔ اور اپنے خرچ سے چھپوائی۔ اس کتاب کا نام "A Treatise on The Problems of Maxima And Minima" تھا۔ اس کتاب کی اشاعت نے ہندوستان کے علمی حلقے میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ بہت سے اہل علم نے تو اسے دیکھ کر حیرت اور استعجاب کا اظہار اور رام چندر کی بڑی تعریف و توصیف کی۔ ہندوستان کے باہر بھی اس کتاب نے ماسٹر رام چندر کا نام کافی روشن کیا۔ جب وہ اس کتاب کے سلسلے میں کلکتہ گیے تو ان کی ملاقات دلی کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر اشپرنگر سے ہوئی، جو اس وقت بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے معتمد تھے۔ انھوں نے رام چندر کی ملاقات ڈاکٹر بیتھون (Bethune) سے کرائی، جو اس وقت سپریم کونسل، پریزیڈنٹ لا کونسل اور کونسل آف ایجوکیشن کے ممبر تھے۔ انھوں نے رام چندر کی کتاب کا ایک نسخہ دو سو روپیے میں خریدا۔

ڈاکٹر بیتھون نے ان کی کتاب کے نسخے یورپ کے متعدد عالموں کے پاس بھیجے، جن میں لندن یونیورسٹی کے ریاضیات کے پروفیسر ڈیمارگن بھی تھے۔ انھوں نے اس کتاب کی بڑی قدر کی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کی توجہ اس کی جانب مبذول کرائی۔ انھوں نے یہ سفارش بھی کی کہ یہ کتاب انگلینڈ میں ریاضی کے ابتدائی درجے کے نصاب میں داخل کی جائے۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

پروفیسر ڈ مارگن کی رائے سے متاثر ہو کر کورٹ آف ڈائرکٹرز نے پانچ پارچے کا خلعت اور دو ہزار روپیے نقد رام چندر کے لیے بطور انعام منظور کیے۔ چناں چہ ۱۸۵۹ء میں دلی میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں شہر کے شرفا و امرا شریک تھے۔ اس جلسے میں یہ بیش بہا انعام انھیں تفویض کیا گیا، جس سے ہند اور بیرون ہند کے علمی افق پر ان کا نام ستارے کی طرح جگمگانے لگا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں رام چندر کے دن انتہائی پریشانی میں گزرے۔ دیسی سپاہیوں کو ان کی اور چمن لال کی تلاش تھی۔ کیونکہ رام چندر اور چمن لال نے (جو دلی کالج کے قدیم طالب علم اور اس وقت فرسٹ سب اسسٹنٹ سرجن دلی تھے) ۱۸۵۲ء میں عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔ چمن لال تو پکڑے گیے اور مارے گیے۔ لیکن رام چندر کسی طرح بچ نکلے اور ان کے ہندو بھائیوں نے انھیں ان کے پرانے گھر میں کچھ دنوں تک چھپائے رکھا۔ جب لوگوں کو یہاں ان کی موجودگی کا پتا چل گیا تو ان کا جاٹ نوکر انھیں دلی سے دس میل دور کسی گاؤں میں ایک زمیندار کے یہاں لے گیا۔ لیکن کسی طرح یہ بات بھی سپاہیوں کے علم میں آگئی اور انھوں نے وہاں دھاوا بول دیا۔ حسن اتفاق سے زمیندار کو اس حملے کی قبل از وقت اطلاع مل گئی تھی۔ اس نے رام چندر کو اس سے باخبر بھی کر دیا۔ چناں چہ وہ اور ان کا جاٹ نوکر دونوں گاؤں چھوڑ کر جنگل کی طرف چل دیے ابھی یہ لوگ کوس آدھ کوس ہی گیے تھے کہ سپاہیوں کی آمد اور فائرنگ کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ دونوں جھاڑیوں میں چھپ گیے اور سپاہی اس زمین دار کو لوٹ مار کر واپس چلے گیے۔ رام چندر اپنے جاٹ نوکر کی مساعدت سے بچتے بچاتے انگریزی خیمے میں جا پہنچے۔ وہ اس سے پہلے بھی اس قسم کی پریشانی کا سامنا کر چکے تھے، جب کہ انھوں نے ۱۱ جولائی ۱۸۵۲ء کو بپتسما (Babtism) لیا تھا[1]

۱۸۵۷ء کے گیرودار میں کالج بند ہوگیا، تو ماسٹر رام چندر ۱۸۵۸ء میں رڑکی کے ٹامسن سول انجینیرنگ کالج کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۲ء میں انھوں نے خرابیٔ صحت کی وجہ سے علمی پنشن کی درخواست کی اور باہم مراسلت اور تحقیق کے بعد سوا سو روپیے کی پنشن منظور ہوگئی۔

---

[1] مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج ص ۴۸

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ۱۸۶۶ء میں رام چندر پٹیالہ کے ولی عہد مہندر سنگھ کے اتالیق مقرر ہوئے ۱۸۶۸ء میں مہاراجا موصوف کی تخت نشینی کے موقع پر انھیں خلعت اور ایک ہزار روپیے کی جاگیر عطا ہوئی اور ۱۳؍ جون ۱۸۷۰ء کو جب پٹیالہ میں سررشتہ تعلیم کا قیام عمل میں آیا، تو وہ اس کے پہلے ڈائرکٹر مقرر کیے گیے۔ پٹیالہ کی ملازمت کے دوران وہاں انھوں نے جو گراں قدر علمی و تعلیمی خدمات انجام دیں اور ان کی کوششوں سے تعلیم اور محکمۂ تعلیم کو جو فروغ حاصل ہوا اس کے صلے میں حکومت پٹیالہ اور حکومت ہند دونوں کی طرف سے ان کی قدرافزائی اور تعریف ہوئی، جب وہ اس ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو حکومت پٹیالہ کی طرف سے بھی پنشن منظور کی گئی۔

رام چندر کی پہلی بیوی سیتا کا ۲۷؍ فروری ۱۸۷۰ء کو انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد مئی ۱۸۷۱ء میں انھوں نے ایک بنگالی برہمن لڑکی سے دوسری شادی کرلی۔ اس بیوی نے بھی عیسائی مذہب قبول کرلیا اور عیسائی عورتوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصہ لینے لگی۔

رام چندر کی صحت کبھی اچھی نہیں رہی۔ علمی مشاغل کی کثرت نے اس پر مزید خراب اثر ڈالا۔ حتیٰ کہ ۱۸۶۲ء سے وہ مستقلاً بیمار رہنے لگے اور ۱۱؍ اگست ۱۸۸۰ء کو جب کہ ان کی عمر صرف ۵۹ سال تھی، ان کا انتقال ہوگیا۔

ماسٹر رام چندر طبعاً نہایت خوش اخلاق اور شریف النفس انسان تھے۔ جب وہ طالب علم تھے تو ان کے اساتذہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور جب وہ خود استاد ہوئے تو وہ اپنے شاگردوں سے بڑی شفقت سے پیش آتے اور بڑی محنت اور لگن سے پڑھاتے۔ وہ نہایت وسیع النظر اور فراخ دل تھے اور کسی قسم کا تعصب نہ رکھتے تھے لیکن عیسائیت اصطباغ لینے کے بعد کے کاگ تنگ نظری اور تعصب سے پاک نہیں ہیں۔ کیونکہ تبدیلی مذہب کے بعد وہ انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کی تذلیل اور ان کے عقائد کی تنقیص و تحقیر پر اتر آئے۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں ان کا کافی وقت مذہبی مباحث جیسے ناپسندیدہ مشاغل میں صرف ہونے لگا۔ سید رفیق مارہروی لکھتے ہیں

"پروفیسر رام چندر جب تک ہندو رہے بجز خدمت علم و زبان دوسری طرف

راعب نہیں ہوئے عیسائیت نے جہاں ان کی زندگی کے روشن رخ کو بے وقعت کردیا، وہیں تبدیلی مذہب نے ان کے کیرکٹر میں رکاکت پیدا کر دی۔ ہندو قوم کا ایک فرد جو ہندو اور مسلمانوں میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا تھا، تعصب و فرقہ بندی کا شکار ہوگیا۔"[1]

رام چندر کے اعتراضات ہندو مذہب پر بہت کم ہیں۔ انھوں نے خاص طور پر اسلام اور اسلامی عقائد کو ہدف اعتراض بنایا اور ان کی مخالفت میں ہزاروں صفحات سیاہ کیے۔ ان کے اس عمل پر مسلمانوں نے بھی ان کے نظریات و افکار کا پوسٹ مارٹم کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور اسلام پر ان کی تنقید کے رد میں ایک کتاب کا جواب متعدد کتابوں سے دیا جانے لگا۔ یہ جوابات دلائل و براہین کے اعتبار سے اتنے مستحکم اور ٹھوس ہوتے کہ رام چندر کو منھ کی کھانی پڑتی تھی۔ حقیقتاً اس قسم کے مباحثے رام چندر کی شخصیت کے شایان شان نہ تھے۔ ان تنازعات نے ان کی شہرت و عظمت کو کافی نقصان پہنچایا۔ لیکن اس سے اتنا فائدہ ہوا کہ اردو صحافت کی رفتار تیز سے تیز تر ہوگئی۔

ڈاکٹر سید جعفر کے بقول "رام چندر اردو کے پہلے مصنف ہیں، جنھوں نے مغربی ادبیات سے متاثر ہو کر ان کی جانبدار روایات اور توانا ادبی قدروں کو اپنانے اور انھیں زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی"[2] گارسن ڈی تاسی کی تحریر کے مطابق وہ اپنے رسالے "فوائد الناظرین" انگریزی اخبارات اور رسائل سے صرف خبریں ہی نقل نہیں کرتے تھے بلکہ مفید اور دلچسپ مضامین بھی ترجمہ کرکے شائع کرتے رہتے تھے[3] ان کی ان کوششوں کا مقصد اپنے ہم وطنوں کے دائرہ معلومات کو وسیع کرنا اور انھیں ان افکار و نظریات سے روشناس کرنا تھا جن تک ان میں سے اکثر کی رسائی کے ذرائع تقریباً مفقود تھے۔ اس طرح انھوں نے جو عہد آفریں کارنامہ انجام دیا وہ رہتی دنیا تک ان کا نام باقی رکھنے کے لیے کافی ہے۔

---

[1] ہندوؤں میں اردو ص ۲۰۱

[2] اردو مضمون کا ارتقاص ۲۹

[3] خطبات گارساں دتاسی ص ۱۸۵

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

تالیفات وتصنیفات :

(۱) عجائباتِ روزگار۔ یہ کتاب سماجی، سیاسی اور اخلاقی موضوعات پر مصنف کے مضامین کا مجموعہ ہے یہ پہلی مرتبہ ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ بعض مصنفین نے اس کا نام "عجائبِ روزگار" بھی لکھا ہے۔

(۲) تذکرۃ الکاملین۔ یونان، روم، انگلستان اور مشرقی ممالک کے علماء وفضلا کا تذکرہ ہے۔

(۳) بھوت نہنگ۔ بقول گارسن ڈی ٹسی اس کتاب کا مقصد ہندوستانیوں کو بھوت پریت پر عقیدہ رکھنے سے باز رکھنا ہے[۱]

(۴) اصولِ گورمنٹ کے۔ یہ کتاب جی۔ نورٹن (G. Norton) کے انگریزی لکچروں کا ترجمہ ہے۔ اس کے ترجمے میں پتمبر نے بھی مدد کی تھی۔ مولوی سید محمد کی اصلاح کے بعد اس کی طباعت واشاعت عمل میں آئی۔ یہ کتاب مشرقی شعبے کے نصاب میں داخل تھی۔

(۵) علم مثلث وتراش ہائے مخروطی وعلم ہندسہ بالجبر۔ یہ کتاب متعدد کتابوں کی مدد سے ترتیب دی گئی تھی بعض لوگوں نے اس کا نام "اصول علم مثلث بالجبر وتراش ہائے مخروطی" بھی لکھا ہے۔

(۶) علم ہندسہ بالجبر۔ یہ سائنس کی کتاب ہے، جس میں جابجا شکلیں اور خاکے ہیں

(۷) اصول علم حساب جزئیات وکلیات۔ یہ کتاب علم حساب اور علم نجوم پر مشتمل ہے۔ حرکات اجرام اور حساب فلکی اس سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

(۸) سریع الفہم۔ ریاضی کے مبتدیوں کے لیے یہ کتاب لکھی گئی تھی۔

(۹) علم طبیعی۔ یہ طبعیات (Physics.) سے متعلق بڑی مفید کتاب ہے۔

(۱۰) رسالہ اصول کلوں کے باب میں۔ یہ ٹی ٹٹس (Tates) کی کتاب "Elements of Mechanism" کا اردو ترجمہ ہے۔

(۱۱) A Treatise on The Problems of Maxima And minima (رسالہ مسائل کلیات وجزئیات) اس کے متعلق گذشتہ صفحات میں بحث آچکی ہے۔

---

[۱] خطبات گارساں دتاسی ص ۱۸۷

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

(۱۲) A specimen of a New Method of The Differential caeulus, called the Method of constant Radio. (تفرقی احصار کا ایک نیا طریقہ)
۱۸۶۲ء میں یہ مختصر رسالہ کلکتہ سے شائع ہوا۔ یہ کلیات وجزئیات سے مختلف نوعیت کا ہے۔

(۱۳) **اعجاز قرآن یا اعتراض قرآن** ۔ رام چندر کے مذہبی تعصب کی یہ پہلی کڑی ہے۔ کتاب کے مشتملات کا اندازہ اس کی فصلوں کی اس تفصیل سے لگایا جا سکتا ہے۔
فصل اول۔ معجزۂ وحی کی تفتیش میں، (دوم) خاص تذکرہ ان لوگوں کا جن سے محمد صاحب نے تعلیم پائی اور اجزائے قرآن مرتب ہوئے (سوم) جبرئیل قرآن کے بیان میں (چہارم) اس دین کے بارے میں جو جبرئیل نے محمد صاحب کو سکھایا یعنی دین ابراہیم (پنجم) اس بیان میں کہ کس معنی میں قرآن ایک معجزہ ہے (ششم) اس بیان میں کہ موافق قرآن و حدیث کے یہ عقیدہ محمدیوں کا کہ فصاحت قرآن ایک معجزہ ہے، باطل ہے۔

(۱۴) **مسیح الدجال** ۔ اس کتاب میں مصنف کا روئے سخن پیغمبر اسلام کی جانب ہے۔

(۱۵) رسالہ تحریف قرآن ۔ یہ کتاب مولوی حامد حسین صاحب لکھنوی کی کتاب "استفصار الافحام" کے جواب میں لکھی گئی تھی۔

(۱۶) بدعات عیسائی مذہب ۔ اس کتاب میں عیسائیوں کے مذہبی بدعات واختراعات کا ذکر کیا گیا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ رام چندر نے دو رسالے بھی جاری کیے تھے، ایک "فوائد الناظرین" جو پہلی بار ۲۲، مارچ ۱۸۴۵ء کو شائع ہوا۔ دوسرا "خیر خواہ ہند" جو بعد میں "محب وطن" ہو گیا۔ ان دونوں رسالوں میں رام چندر نے علمی وادبی مضامین کے ساتھ ساتھ مذہبی مسائل پر بھی مضامین لکھتے رہے۔ اور اسی مذہبی تعصب کی بنا پر ان کے یہ دونوں رسالہ بند بھی ہو گئے۔

مولوی ذکاء اللہ :

مولوی ذکاء اللہ اردو کے نثر نگاروں میں ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے ادبیات، اخلاقیات، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، ریاضی، ہیئت اور طبعیات جیسے متنوع اور مختلف فیہ موضوعات پر متعدد قابل قدر تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

اسی لیے مولانا حالی نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "مولوی ذکاءاللہ کا دماغ ایک بنیے کی دکان ہے جس میں ہر قسم کی جنس موجود رہتی ہے^ل" اور مولوی محمد یحیٰی تنہا کے بقول امام غزالی کا روزانہ اوسط تصانیف چار صفحے ہوتا ہے، قریب قریب یہی اوسط مولوی ذکاءاللہ صاحب کی دماغی کاوشوں کا ہے[2] اس طرح سے دیکھا جائے تو ان کی علمی سرگرمیوں نے اردو کے نثری سرمائے میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔

ذکاءاللہ خاں یکم اپریل ۱۸۳۲ء کو دہلی میں کوچہ بلاقی بیگم میں پیدا ہوئے[3] ان کے والد کا نام حافظ ثناءاللہ تھا، جو نہ صرف یہ کہ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، بلکہ دینی امور اور اسلامی شعائر پر نہایت سختی کے ساتھ عمل بھی کرتے تھے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق مولوی ذکاءاللہ کی تعلیم گھر سے شروع ہوئی اور جب بارہ برس کے ہوئے تو دلی کالج میں داخلہ لیا جہاں مولوی نذیر احمد اور مولوی محمد حسین آزاد تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ذکاءاللہ کو ریاضیات سے خاص شغف تھا۔ ماسٹر رام چندر ریاضی کے استاد تھے۔ اپنے لائق وفائق شاگرد مولوی ذکاءاللہ کی طرف ان کی خاص توجہ نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ چنانچہ دوران تعلیم ریاضی میں اکثر اول آتے رہے۔ اور قابلیت کے وظیفے بھی حاصل کرتے رہے۔ انھیں کالج کی طرف سے اعلیٰ قابلیت کے دو تمغے بھی عطا کیے گئے تھے۔

ذکاءاللہ جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو اسی کالج میں ریاضی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیے گئے۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک انھوں نے آگرہ کالج میں فارسی اور اردو کے پروفیسر کی خدمات انجام دیں۔ ۱۸۵۵ء میں وہ بلند شہر میں "ڈپٹی انسپکٹر مدارس" کے عہدے پر مامور ہوئے۔ بلند شہر اور مراد آباد میں گیارہ سال تک اس عہدے پر فائز رہنے کے بعد ۱۸۶۶ء میں دلی نارمل اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنائے گئے۔ چونکہ ان کا تعلق سرسید کی تحریک سے بڑا گہرا تھا اس لیے جب سائنٹفک سوسائٹی وجود میں آئی۔ تو وہ اس کے ممبر بنے۔ اور جب "دہلی سوسائٹی" کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کے بھی رکن منتخب ہوئے۔ جنوری ۱۸۷۱ء میں چندولال

---

[1] بحوالہ تاریخ ادب اردو حصہ نثر از رام بابو سکسینہ ص ۹۲، اور مختصر تاریخ ادب اردو از اعجاز حسین ص ۲۶۳

[2] سیر المصنفین جلد دوم ص ۲۰۶

[3] ایضاً ص ۲۰۶

کے عہدۂ معتمد سے مستعفی ہونے کے بعد ذکاء اللہ کو دہلی سوسائٹی کا سکریٹری منتخب کیا گیا۔[1]
۱۸۶۹ء میں اورینٹل کالج لاہور اور میور سنٹرل کالج الہ آباد کی پروفیسری کا پروانہ ساتھ ساتھ
آیا، لیکن انھوں نے الہ آباد کو ترجیح دی۔ الہ آباد میں پندرہ برس تک عربی و فارسی کے پروفیسر رہ
کر ۱۸۸۵ء میں پنشن لی۔ عمر کے باقی ۲۴ برس دلی میں رہ کر تالیفی و تصنیفی مشاغل میں بسر کیے۔
۱۷ر نومبر ۱۹۱۰ء کو دلی ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

ذکاء اللہ کو شروع سے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ اتفاق سے
ملازمت بھی ایسی ملی کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہوگئے۔
علم ریاضیات سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ اسی لیے وہ اپنے ریاضی کے استاد ماسٹر رام چندر
کے منظور نظر بھی تھے۔ بعض لوگ اسی تعلق کی بنا پر رام چندر کے عیسائی مذہب اختیار کر
لینے کے بعد انھیں شبہے کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو وہ عیسائیت سے
کبھی مرعوب ہوئے اور نہ ماسٹر رام چندر کی معیت ان کے عقائد و نظریات میں کسی قسم کی تزلزل
پیدا کر سکی۔ وہ تاحیات سچے مسلمان اور پکے موحد رہے۔

ذکاء اللہ نے انگریزی زبان کسی استاد کی مدد کے بغیر خود ہی سیکھی تھی اور اس میں انھیں
اتنا درک حاصل ہو گیا تھا کہ انگریزی کی کتابیں بہ آسانی پڑھنے اور سمجھنے لگے تھے۔ اس کا اندازہ
اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے بہت سے مضامین انگریزی کتابوں یا رسالوں کے ترجمے ہیں۔
لیکن اس کے باوجود انگریزیت ان پر کبھی غالب نہیں ہوئی۔ ان کی ظاہری وضع قطع اور بود و باش
سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ انھیں انگریزیت سے کوئی تعلق رہا ہے۔ سر سید سے ان کا خاص
تعلق رہا۔ لیکن انھوں نے کبھی ان کی وضع قطع کی تقلید نہیں کی۔ وہ آزادانہ غور و فکر کے عادی تھے۔
دوسروں کی خوشنودی کے خیال سے یا کسی کی صحبت و معیت کے زیر اثر اپنی روش بدل دینے
کے قائل نہیں تھے۔ ذکاء اللہ کی طبیعت میں اختراع و ابداع کا مادہ کم تھا، ان کی تحریروں میں
صفائی، روانی اور سلاست تو ضرور ہے لیکن طرز بیان میں کوئی خاص کیف و لطف نہیں۔ تحقیق و تلاش
ان کا مزاج تھی، جو کچھ اس سے معلوم ہوتا اسے سیدھے سادے اسلوب میں قلم بند کر دیتے تھے۔

---

[1] سجن لال، نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۵۲ء ص ۸۲

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

ان ہی خصوصیات کی وجہ سے ان کی تصانیف ان کے زمانے میں کافی مشہور و مقبول ہوئیں۔ ان میں سے بیشتر کتابیں درسی ضروریات کے تحت لکھی گئی تھیں اور مختلف امتحانات کے نصاب میں داخل تھیں، اس لیے ان کی طباعت و اشاعت کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا۔ اب چوں کہ اردو ذریعہ تعلیم نہیں رہی ہے، اس لیے ان کتابوں کی اہمیت و اشاعت بھی کم ہو گئی ہے۔ تاہم ان کے متعدد مضامین اب بھی درسی کتابوں میں شامل ہیں۔

مضمون نگاری میں ذکاءاللہ کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ ان کے زمانے کے ایڈیٹر ان کے مضامین و مقالات اپنے جرائد میں اشاعت کی غرض سے حاصل کرنے کے متمنی رہتے تھے اور ان کا بھی یہ معمول تھا کہ وہ کسی کو مایوس نہیں کرتے تھے۔ چناں چہ مختلف النوع موضوعات پر ان کے بہ کثرت مضامین معاصر رسالوں میں شائع ہوئے۔ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مخزن۔ لاہور، زمانہ۔ کانپور، رسالہ حسن، حیدرآباد، شمس۔ کلکتہ، صبح بہار۔ میسور اور "خاتون" و "ادیب" فیروزآباد تو خاص طور سے ان کے رشحات قلم سے فیض یاب ہوتے رہے۔ کچھ مضمون انھوں نے انگریزی کتابوں کی مدد سے لکھے لیکن اکثر و بیشتر مضامین طبع زاد ہوتے تھے، جو زمانے کے ماحول و مزاج سے مطابقت رکھتے تھے۔ کثرتِ مطالعہ اور استقلال کا یہ عالم تھا کہ اپنے دولت کدے پر جہاں تکیہ لگا کر بیٹھتے تھے، وہاں دیوار میں گڑھا ہو گیا تھا۔ ابھی تک ان کے جتنے مضامین دریافت ہوئے ہیں ان کی مجموعی تعداد ستر سو بتائی جاتی ہے[1]

ان کی بعض تخلیقات کے صلے میں گورنمنٹ نے انھیں پندرہ سو روپیے کا نقد انعام عطا کیا، اور خان بہادر اور شمس العلما جیسے معزز خطابات سے ان کی عزت افزائی کی۔ جب وہ ڈپٹی انسپکٹر تھے اس زمانے میں تعلیم نسواں کی توسیع و ترقی کے صلے میں حکومت نے انھیں خلعت بھی عطا کیا تھا۔

تصانیف :

ذکاءاللہ کی تصانیف کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے۔ ان کی موضوع وار تفصیل کسی

---

[1] آج کل (اردو نمبر) اگست ۱۹۶۸ء ص ۱۶

اخبار میں شائع ہوئی تھی جسے محمد یحییٰ تنہا کی تصنیف "سیر المصنفین" کے جلد دوم کے حوالے سے سطور ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

مضمون	مطبوعہ	غیر مطبوعہ	جملہ
ریاضیات	۸۱	۶	۸۷
تاریخ وجغرافیہ	۱۷	۱	۱۸
علم ادب	۱۶	x	۱۶
علم اخلاق	۶	x	۶
طبیعات	۷	۲	۹
سیاست مدن	۲	۵	۷
میزان	۱۲۹	۱۴	۱۴۳

اس مقالے کی محدود گنجائش کے پیش نظر یہاں ان تمام تصنیفات سے متعلق ضروری تفصیلات کی فراہمی دشوار ہے، اس لیے اختصار کے ساتھ چند اہم اور مشہور کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) تاریخ ہند۔ اس کے اٹھارہ حصے ہیں جن کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۶۹۷ ہے اور یہ دس جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس میں خاص طور پر عہد سلطنت اور دور مغلیہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، جو تحقیق سے معرا نہیں۔

(۲) آئین قیصری۔ اس کتاب میں ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں ہندوستان کے انتظامی امور میں ہونے والی تبدیلیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تین جلدوں میں ہے۔

(۳) کرزن نامہ۔ یہ گورنر جنرل لارڈ کرزن کی سوانح عمری ہے۔

(۴) فرہنگ فرنگ۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے جن میں ملکہ وکٹوریہ اور ان کے شوہر کے حالات زندگی اور یورپی تہذیب اور معاشرے کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکاء اللہ ملکہ وکٹوریہ کے بڑے مداح تھے اور ان سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

(۵) تاریخ عہد انگلشیہ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام سے اپنے عہد تک کی ہندوستانی تاریخ ہے۔

(۶) سوانح عمری مولوی سمیع اللہ۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب مولوی سمیع اللہ خاں بہادر سی۔ ایم۔ جی۔ کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔

(۷) مضامین ذکاءاللہ۔ یہ ان کے مختلف النوع مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے زیادہ تر مضامین طبع زاد ہیں، لیکن بعض مضامین انگریزی سے اخذ کیے گیے ہیں۔ ہر مضمون اس قدر مدلل اور مفصل ہے کہ موضوع کا حق ادا ہو گیا ہے۔

مولوی کریم الدین :

دلی کالج کے طلبہ کی اگر کوئی مختصر سے مختصر فہرست بھی مرتب کی جائے تو اس میں مولوی کریم الدین کا نام نہ صرف یہ کہ شامل کیا جائے گا بلکہ نمایاں طور پر لکھا جائے گا۔ انھوں نے منطق، فلسفہ، ہندسہ، ہیئت، پیمائش، مناظرہ، جبر و مقابلہ اور تاریخ کے علاوہ طب، فقہ، اصول فقہ اور حدیث کی بھی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ زبانوں میں عربی و فارسی پر کامل دستگاہ کے پہلو بہ پہلو وہ انگریزی زبان سے بھی بقدر ضرورت واقفیت رکھتے تھے۔ وہ بڑے نیک، ذہین و فطین اور منکسر المزاج شخص تھے۔ کالج کی تعلیم و تربیت اور علمی ماحول نے ان میں علمی ذوق اور تالیف و تصنیف کا شوق پیدا کر دیا تھا۔

کریم الدین بقول خود عین عید کے دن بوقت نماز فجر ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء کو پانی پت میں افغانیوں کے محلے میں مسجد لشکر خاں کے متصل پیدا ہوئے[1] ان کے والد کا نام شیخ سراج الدین تھا۔ ان کی ولادت بھی پانی پت ہی میں ہوئی تھی۔ دادا پیلی بھیت کے متوطن تھے اور بادشاہی جاگیر کی وجہ سے بڑے متمول تھے، اسی بنا پر اکثر ملکوں کی انھوں نے سیاحت بھی کی تھی۔ لیکن جب نادر شاہ کے حملے میں دلی کا سہاگ لٹا تو ان کی جائداد اور املاک بھی اسی تباہی و بربادی کی نذر ہو گئی اور بجز خدا کے کوئی سہارا باقی نہیں رہا، حتیٰ کہ بدرجۂ مجبوری مسجد نشینی اور امامت اور مدرسی پر قناعت کرنا پڑی۔ کچھ دن بعد جب لیک صاحب پانی پت کے جاگیر داروں کو ان کی جاگیریں واپس کرنے کے لیے آئے تو کریم الدین کے دادا کو بھی بلایا گیا۔

[1] کریم الدین طبقات الشعرائے ہند طبقہ چہارم ص ۷۹

لیکن کچھ تو جنونی کیفیت کی وجہ سے اور کچھ ورع و اتقا میں غلو کی بنا پر وہ لیک صاحب کی خدمت میں حاضری کے لیے تیار نہیں ہوئے، جس کی وجہ سے ان کی جاگیر ہمیشہ کے لیے ضبط ہوگئی کریم الدین کے خاندان کے لیے یہ ایام بڑے پریشان کن تھے۔ چوں کہ زہد و تقویٰ ان کے خاندان کا نشان امتیاز بن چکا تھا، اس لیے کریم الدین کے دادا کے انتقال کے بعد ان کے " سراج الدین کو بھی مسجد کا امام مقرر کر دیا گیا۔ چناں چہ وہ بھی اپنے والد کی طرح طلبہ کی تعلیم و تربیت سے گزر اوقات کرتے رہے۔ شیخ صاحب کو شعر و شاعری سے بھی شغف تھا اور سراج تخلص کرتے تھے۔ مولوی کریم الدین نے "طبقات شعرائے ہند" میں ان کی چار تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ جن میں ایک قصۂ حاتم طائی کا منظوم اردو ترجمہ بھی ہے[1]

کریم الدین کی تعلیم کی ابتدا ان کے والد اور دادا کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ شروع میں فارسی کی دو چار کتابیں پڑھیں، پھر عربی کی تعلیم شروع کی۔ ذہنی پراگندی، طبعی ناآسودگی اور معاشی بدحالی نے انھیں پانی پت کو خیرباد کہنے پر مجبور کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دلی علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کے ایک مرکز کی حیثیت سے چار دانگ عالم میں مشہور تھی۔ ہر طرف علوم و فنون کے چشمے جاری تھے۔ کریم الدین نے دلی آنے کے بعد مختلف عالموں سے صرف و نحو، طب فلسفہ، فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ گذر اوقات کے لیے انھوں نے کتابت کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ دلی کالج میں داخل ہو گیے۔ گارسن ڈی تسی کا خیال ہے کہ کریم الدین تقریباً ۱۸۱۲ء میں دلی کالج میں داخل ہوئے[2] لیکن یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ڈی تسی کو یہ غلط فہمی دراصل کریم الدین ہی کی ایک تحریر کی بنا پر ہوئی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ"...

درمیان ۱۸۱۲ء کے جناب مستطاب طامین صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر نے بند و بست مدرسہ دہلی کا بخوبی کیا اور نئے طالب علم تالاش (کذا ۔ تلاش) کر کے اس میں واسطے تحصیل کے رکھے گیے، چنانچہ میں بھی اٹھارہ برس کی عمر (میں) اس میں داخل ہوا[3]" کریم الدین کا مذکورہ بالا بیان

---

[1] کریم الدین، طبقات الشعرائے ہند طبقہ چہارم ص ۵۱۴

[2] خطبات گارساں دتاسی ص ۲۱

[3] طبقات الشعرائے ہند طبقہ چہارم ص ۵-۷۶

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

مبہم اور پیچیدہ ضرور ہے، لیکن ڈی ٹسی کا اس سے یہ مطلب نکالنا کہ کریم الدین قریب ۱۸۱۲ء میں دلی کالج میں شامل ہوئے درست نہیں۔ بقول کریم الدین کے اگر اس بیان کو تسلیم کر لیا جائے کہ وہ اٹھارہ برس کی عمر میں کالج میں داخل ہوتے تو ان کے داخلے کا زمانہ ۴۰ - ۱۸۳۹ء کے قریب قرار پائے گا۔ داخلے کے ساتھ ہی سولہ روپیہ ماہانہ ان کا وظیفہ مقرر ہوا۔ وہ کم و بیش چار سال یعنی ۱۸۴۴ء تک دلی کالج کے طالب علم رہے[۱] انھوں نے اس دوران میں مشرقی و مغربی علوم و فنون میں خاصی دست رس بہم پہنچائی۔ تصنیف و تالیف کا کام طالب علمی ہی کے زمانے سے شروع کر دیا تھا۔

تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد کریم الدین نے دلی ہی میں شادی کر لی۔ اس کے بعد بعض دوستوں کے تعاون سے "رفاہ عام" کے نام سے ایک مطبع قائم کیا جس کے لیے محلہ قاضی حوض میں مبارک النسا بیگم کی حویلی کرائے پر لی۔ اسی اثنا میں انھوں نے اپنے مکان پر مشاعرے کی محفلیں منعقد کیں۔ ان مشاعروں کے انعقاد کا اصل مقصد معاصر شعرا کا ایک تذکرہ مرتب کرنا تھا۔ یہ مشاعرہ مہینے میں دو بار بڑے اہتمام سے ہوتا تھا اور جو اشعار اس میں پڑھے جاتے تھے انھیں بعد میں "پرچۂ مشاعرہ" کے نام سے ایک گلدستہ کی صورت میں شائع کر دیا جاتا تھا۔ یہ مشاعرہ ان کے مکان پر ۱۴ رجب ۱۲۶۱ھ بروز اتوار مطابق ۲۰ جولائی ۱۸۴۵ء سے شروع ہوا، اور اسی سال میں درمیان ماہ ذلیقعدہ (۱۲۶۱ھ) نومبر ۱۸۴۵ء میں اس کا سلسلہ ختم ہو گیا[۲]

اس مشاعرے کا دوسرا مقصد کریم الدین کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ ان کے مطبع کو قبول عام حاصل ہو، اس لیے وہ اس کی روداد "پرچۂ مشاعرہ" میں شائع کرتے تھے۔ چوں کہ مشاعرہ مہینے میں دو بار ہوتا تھا اسی لیے "پرچۂ مشاعرہ" بھی مہینے میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ لیکن مطبع حسب دل خواہ نہ چل سکا۔ کیوں کہ جن دوستوں کے تعاون سے انھوں نے مطبع قائم کیا تھا وہ مار آستین نکلے۔ بعد میں ان ہی دوستوں نے کریم الدین کے بعض مخالفین کے

---

[۱] ڈاکٹر احمد لاری، مقدمہ گلدستۂ نازنیناں ص ۷

[۲] ڈاکٹر محمد الٰہی، بازیافت ص ۲۷۰ اور مقدمہ طبقات شعرائے ہند ص ث

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ساتھ مل کر مطبع بھی ان کے قبضے سے چھین لیا۔ لیکن اسی معاملے میں کریم الدین نے کوئی نالش یا چارہ جوئی نہیں کی۔ بہرحال مطبع "رفاہ عام" اور کریم الدین کے قائم کردہ متذکرہ بالا مشاعرے نے اردو کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ یہ مشاعرے تاریخ ادب اردو میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس سے دلی میں شعر و شاعری کے فروغ میں بڑی تقویت ملی۔ دلی کے تقریباً سبھی معاصر شعرا اس مشاعرے میں شرکت کرتے تھے۔

اکبر حیدری کا یہ بیان خلاف واقعہ ہے کہ ۱۷ اپریل ۱۸۴۸ء کو کریم الدین دلی سے کوہ لندور (مسوری) کے لیے روانہ ہوئے[1] کیوں کہ خود اپنے بیان کے مطابق وہ ۱۸۴۷ء میں سوری میں اقامت گزیں تھے[2]۔ مسوری ہی کے قیام کے دوران انھوں نے طب کی ایک عربی کتاب کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے کوہِ لندور پر محفل مشاعرہ بھی منعقد کی تھی۔ جن شعرا نے اس میں شرکت کی، اپنا کلام سنایا اور کریم الدین سے ملاقات کی ان میں محمد پیر باز خاں شاد، شیخ محمد بخش اللہ ہاشمی مسرور، شیخ محی الدین شور اور محمد علی عاشق کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے جس کا کلام کریم الدین نے پسند کیا اس کا انتخاب "طبقات شعرائے ہند" میں درج کیا ہے۔

۱۸۵۰ء کے قریب کریم الدین آگرہ کالج سے وابستہ ہو گیے، جہاں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے تک مدرس اول اردو کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان کی تین کتابیں "کہربائی بالمس"، "موضح اللسان" اور "قواعد ہندی" اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ جون ۱۸۶۱ء سے قبل وہ پنجاب چلے گئے، جہاں محکمۂ تعلیمات میں سررشتہ دار کے عہدے پر ان کا تقرر ہو گیا۔ ۱۸۶۱-۶۲ء کے درمیان ترقی کر کے وہ ڈپٹی انسپکٹر مدارس، بعد میں انسپکٹر مدارس کے معزز عہدے پر پہنچ گئے۔ اور غالباً اسی عہدے پر کام کرتے ہوئے ملازمت سے سبکدوش بھی ہوئے۔ ۱۸۷۹ء میں ان کا انتقال ہو گیا[3]۔

---

[1] تحقیقی جائزے حصہ اول ص ۱۰۱

[2] طبقات الشعرائے ہند طبقہ چہارم ص ۹،

[3] ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، سہ ماہی صحیفہ لاہور، جولائی ۱۹۶۰ء ص ۱۴

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

تذکرہ نگاری کی تاریخ میں مولوی کریم الدین کی شخصیت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اگرچہ انھوں نے مذہب سے لے کر جغرافیہ تک، علوم وفنون کے مختلف شعبوں میں اپنی کارگزاری کا مظاہر کیا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ مورخ تھے۔ اور ہر واقعے کو اس کی اصلی حالت میں دیکھنا چاہتے تھے۔

قاضی عبدالودود نے گارسن ڈی تاسی کے حوالے سے کریم الدین کی تصانیف کی تعداد ۲۵ بتائی ہے۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر محمود الٰہی نے "خط تقدیر" کے مقدمے میں انھیں ۴۹ کتابوں کا مصنف قرار دیا ہے[1]۔ راقم السطور کو ان میں سے صرف ۲۰ کتابوں ہی کا پتا چل سکا ہے، جن کی تفصیلات بالاختصار سطور ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) **طبقات شعرائے ہند**۔ بعض تاریخ نویسوں نے اس کا نام "طبقات الشعرائے ہند"[2] اور "تذکرۂ شعرائے ہند" بھی لکھا ہے۔ لیکن اس کا اصل نام بہ قول کریم الدین "طبقات شعرائے ہند" ہے[3]۔ اس کا ماخذ گارسن ڈی تاسی کی تاریخ ہے۔ حامد حسن قادری کا یہ خیال کہ کتاب کے بعض حصے کریم الدین کے لکھے ہوئے ہیں اور بعض ڈاکٹر فیلن کے[4]، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ چونکہ گارسن ڈی تاسی کی کتاب فرانسیسی زبان میں ہے اور کریم الدین فرانسیسی نہیں جانتے تھے اس لیے انھوں نے اس کی تالیف میں فیلن سے ترجمہ کی حد تک مدد لی تھی۔ ڈاکٹر فیلن ترجمے کا کام انجام دیتے تھے، جسے کریم الدین اپنی زبان میں لکھتے جاتے تھے۔ یہ غلط فہمی لوگوں میں اس لیے بھی پیدا ہوئی کہ جب یہ پہلی بار شائع ہوئی تو اس کے خاص سرورق پر انگریزی اور اردو میں حسب ذیل

---

[1] بحوالہ اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ص ۳۲۰

[2] عطا کاکوروی نے اسے چار حصوں میں (طبقات الشعرائے ہند طبقہ اول تا طبقہ چہارم) علاحدہ علاحدہ ۱۹۶۴ء میں شائع کیا ہے۔ شروع میں اسی سے استفادہ کیا ہے، چنانچہ حاشیے میں میں نے بھی طبقات الشعرائے ہند ہی لکھا ہے۔ جہاں "طبقات شعرائے ہند" لکھا گیا ہے وہاں اکادمی ایڈیشن سے رجوع کیا گیا ہے۔

[3] دیباچہ طبقات شعرائے ہند، اکادمی ایڈیشن ص ۲ لیکن جہاں انھوں نے اپنی کتابوں کی تفصیلات درج کی ہیں وہاں اس کا نام "تذکرہ شعرا ہند" ہی لکھا ہے۔ (طبقات شعرائے ہند ص ۴۷۱)

[4] داستان تاریخ اردو ص ۷۷

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

عبارت لکھی ہوئی تھی۔

A HISTORY OF URDU POETS

CHIEFLY TRANSLATED FROM GARCAN DE TASSY'S HISTORIES

DE LA LITERATURE HINDOUSTANIE

By

F FALLON ESQR. AND MOULVI KAREEMOODDEEN

WITH ADDITION

"شعرائے اردو کا (کذا) مسٹر ایف۔ فیلن صاحب بہادر اور مولوی کریم الدین نے کارسند تسی (کذا) کی تاریخ سے ۱۸۴۷ء میں ترجمہ کیا اور نوسو چونسٹھ شاعروں اردو گو کے اشعار اور حال بھی دواوین مختلف میں سے منتخب کر کے اس میں مندرجہ کر دیا گیا"

مندرجہ بالا عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شامل شعرا کی تعداد ۹۶۴ ہے لیکن علما کاکوروی ان شعرا کی تعداد ایک ہزار چھ بتاتے ہیں[1]

طبقات شعرائے ہند گارسن ڈی تاسی کی تاریخ کا صرف ترجمہ ہی نہیں ہے بلکہ کریم الدین نے اس میں بہت اضافے کیے ہیں۔ انھوں نے تذکرۂ حکیم قدرت اللہ اور "گلشن بے خار" سے بھی استفادہ کیا ہے[2] اس کے علاوہ انھوں نے دلی کالج کے اساتذہ کے حالات بھی، طبقہ چہارم میں قلم بند کیے ہیں چنانچہ خود گارسن ڈی تاسی نے اسے ایک علاحدہ تصنیف قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

"طبقات الشعرا مصنفہ کریم الدین ۱۸۴۸ء میں دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اسے میری تاریخ کی پہلی جلد کہا جاتا ہے لیکن یہ ایک بالکل جداگانہ تصنیف ہے[3]

مولوی کریم الدین نے اسے اشپرنگر کی فرمائش پر تالیف کیا تھا۔ تاریخ ادب اردو میں پروفیسر

---

[1] دیباچہ طبقات الشعرائے ہند طبقہ چہارم ص ج

[2] دیباچہ طبقاتِ شعرائے ہند ص د

[3] ایضاً ص د

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں جا بجا تاریخی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ بہ قول اکبر حیدری "طبقا الشعرا سے بڑھ کر اور کوئی غیر مستند تذکرہ دیکھنے میں نہیں آیا۔"[۱] لیکن اسکی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اردو میں اس کے حوالے متداول ہیں۔

(۲) تعلیم النسار ۔ یہ آٹھ تعلیمات پر مشتمل ہے اور خاص طور سے لڑکیوں کے پڑھنے کے لائق ہے۔

(۳) گلستان ہند ۔ یہ بھی آٹھ باب پر مشتمل ہے، جس میں بالترتیب لطائف وظرائف، حکایات اور قصے نقلیات، ضرب الامثال، افسانے، عورتوں کا چلتر، پندواخلاق اور منتخب اشعار درج ہیں۔

(۴) گلدستۂ نازنیناں ۔ کریم الدین کی صراحت کے مطابق "گلدستۂ نازنیناں" تذکرے کی اس شاخ سے تعلق رکھتا ہے جسے "انتخاب دواوین" کہا جاتا ہے[۲] اسے کریم الدین نے اپنے ایک دوست کی فرمائش پر ۱۸۴۴ء میں مرتب کیا تھا۔ یہ ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں اردو کے ۲۷ شعرا اور دس شاعرات کا ذکر ہے۔ حالات زندگی نہایت مختصر اور کلام کے انتخابات خاصے طویل ہیں۔

(۵) عجالتہ العلالہ ۔ یہ علم عروض پر ایک مفید رسالہ ہے، جسے شعرا نے بہت پسند کیا۔ یہ ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا۔

(۶) رسالۂ فرائض ۔ یہ علم میراث سے متعلق مختصر رسالہ ہے، جو ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا۔

(۷) فرائدالدہر ۔ یہ عربی زبان میں عربی شعرا کا تذکرہ ہے، یہ ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا۔

(۸) روض الاجرام ۔ فن حساب، فن پیمایش، الجبرا، ہیئت اور جغرافیہ پر مشتمل ہے۔

(۹) تذکرۃ النسار ۔ یہ دنیا کی ہر فن میں ماہر و مشہور خواتین کا تذکرہ ہے۔

(۱۰) تاریخ شعرائے عرب ۔ ڈاکٹر اشپرنگر کے حکم سے کریم الدین نے "فرائدالدہر" کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام "تاریخ شعرائے عرب" رکھا۔ اس میں ۳۷۳ شعرائے عرب کا ذکر ہے۔ یہ

---

[۱] تحقیقی جائزے حصہ اول ص ۱۱۳

[۲] بحوالہ مقدمہ گلدستۂ نازنیناں ص ۱۲

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

بھی ۱۸۴۷ء کے اواخر میں شائع ہوئی۔

(۱۱) ترجمہ الوالفدا۔ یہ عربی کتاب ’’ابوالفدا‘‘ کا جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے، کا اردو ترجمہ ہے۔ تیسری جلد کا ترجمہ مولوی محمد امیر نے باقی پانچ جلدوں کا کریم الدین نے کیا۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ابتدائے آفرینش عالم سے ۷۲۹ھ تک کے حالات درج ہیں[1]

(۱۲) مخط الحمی۔ اس میں عربی زبان میں بہت ہی دلچسپ قصے بیان کیے گئے ہیں۔

(۱۳) ترجمہ کتاب ڈاکٹری۔ اصل کتاب فرانسیسی زبان میں ہے۔ محمد علی شاہ والی مصر نے اس کا ترجمہ عربی میں کرا کے ۱۲۵۰ھ میں شائع کیا۔ ۱۸۴۷ء میں کریم الدین نے اس کے عربی ترجمے سے اردو میں ترجمہ کیا۔

(۱۴) تسہیل القواعد۔ اردو میں صرف و نحو کی ایک مفید کتاب ہے، جو پنجاب کے مدرسوں میں رائج تھی۔

(۱۵) کریم اللغات۔ عربی و فارسی کے معنی اردو میں دیے گئے ہیں۔

(۱۶) انشائے اردو۔ اس کے چار حصے ہیں۔ پہلے حصے میں خطوط نویسی، دوسرے میں عرائض نویسی، تیسرے میں دفتری مراسلات اور عدالتی دستاویزات اور آخری حصے میں درباری مراسلت کے نمونے درج ہیں۔ اور ان کے لکھنے کے قاعدے بھی بیان کیے گئے ہیں۔

(۱۷) پندسودمند۔ اس کتاب میں ڈیڑھ سو قدیم و جدید مقولے نقل کیے گیے ہیں۔

(۱۸) خط تقدیر۔ یہ کتاب ناول کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے ’’خط تقدیر اردو کا پہلا ناول‘‘ کے مقدمے میں اسے اردو کا پہلا ناول ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۱۹) واقعات ہند۔ یہ ہندوستانی تاریخ ہے جسے کریم الدین نے اے۔ آر۔ فلر کے حکم سے لکھا تھا۔ اس کی تسوید میں انگریزی اور ہندوستانی دستاویزات سے مدد لی گئی ہے۔

(۲۰) مفتاح الارض۔ یہ جغرافیہ کی کتاب ہے جسے کریم الدین نے مدرسے کے لیے لکھا تھا۔

(۲۱) موضح اللسان۔ (۱۸۵۱ء) ۲۲۔ کہربائی بالمس (۱۸۵۲ء) ۲۳۔ قواعد المبتدی (۱۸۵۷ء)

---

[1] کریم الدین، طبقات الشعرائے ہند طبقہ چہارم ص ۷۹

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

(۲۴) تشہیر ظہوری (۱۸۶۱ء) ۲۵۔ قصۂ پنجاب سنگھ (۲۶) کریم ظہوری، (۲۷) اشارات تعلیم ۲۸۔ سنن اسلام ۲۹۔ جامع القواعد فارسی ۳۰۔ کریم اللغات (فارسی)

مولانا محمد حسین آزاد:

محمد حسین آزاد دلی کالج کے ان طلبہ میں سے تھے جن پر کالج کے اساتذہ کو فخر تھا۔ کالج میں مضمون نویسی کے مقابلے میں وہ اکثر اول آتے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اساتذہ ان کے مضامین پڑھ کر، مواد کی فراہمی اور طرز تحریر انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔ ان کی تحریریں زبان و بیان کے اعتبار سے دوسرے طلبہ کی تحریروں سے یکسر مختلف اور ممتاز ہوتی تھیں۔ یہ تو نو مشقی کا حال تھا اور اب ان کی نثر سے نظم کا ساحظ ملتا ہے اور کبھی کبھی وہ شعر سے بھی کہیں زیادہ موثر اور دل آویز معلوم ہوتی ہے۔ آزاد کی زبان میں وہ تاثیر اور بیان میں وہ گھلاوٹ ہے کہ قادری عبارت کی دل کشی سے مسحور ہو جاتا ہے۔ آزاد کی نثر نگاری کے لئے کسی سہارے کی ضرورت نہیں بقول مہدی افادی "آزاد اردوئے معلی کا ہیرو ہے۔۔ جس طرح تاریخ میں فلسفہ کا رنگ سب سے پہلے شبلیؒ نے جمایا اردو کو انشا پردازی کے درجے پر جس نے پہنچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہیں۔۔۔ سرسید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے، شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب وہ کورے رہ جائیں گے، حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے، سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ آقائے اردو پروفیسر آزاد صرف ایسے انشا پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔[1] اسی لیے تو کوئی آزاد کو "آقائے اردو" کا درجہ دیتا ہے تو کسی کی رائے کے مطابق یہ اردو کے عناصر اربعہ میں اولیت کے حقدار ہیں۔

مولانا آزاد کی ولادت ۱۰ر جون ۱۸۳۰ء کو دہلی میں ہوئی تھی[2] ابھی وہ کم سن ہی تھے کہ والدہ (امانی بیگم) کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد ان کی پھوپی نے ان کی پرورش و پرداخت کی۔ گھر پر ابتدائی تعلیم کے بعد انھیں دلی کالج میں داخل کیا گیا۔ ان کے والد مولوی باقر اور ذوق میں بڑی گاڑھی چھنتی تھی محمد باقر نے آزاد کو ذوق کے سپرد کر دیا۔ وہ چھٹیوں میں

---

[1] افادات مہدی ص ۲۲۲-۲۲۲ [2] ڈاکٹر اسلم فرخی، محمد حسین آزاد حصہ اول ص ۸۱

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ان کے یہاں جایا کرتے تھے اور دن دن بھر ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ ان ہی صحبتوں میں انھوں نے فن عروض کی تحصیل کی اور ان کے مذاقِ شعرگوئی کو جلا حاصل ہوئی استاد کی معیت میں انھیں بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کے مواقع ملے، جن کی بدولت اپنے عہد کے مشاہیر شعرا سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں اور ان کی نکتہ رس طبیعت پر زبان و بیان کی نزاکتوں اور لطافتوں کے اسرار و رموز منکشف ہونا شروع ہوئے۔

آزاد نے ابھی اپنی عمر کے ستائیس برس بھی پورے نہیں کیے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے ہلاکت خیز ہنگاموں نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان کے والد مولوی محمد باقر سیاسی سرگرمیوں میں کھل کر حصہ لیتے تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار کا نام "دہلی اردو اخبار" سے بدل کر "اخبار الظفر" کر دیا تھا، جس کی وساطت سے وہ ہم وطنوں کو انگریزوں کے خلاف مستعد کرتے رہتے تھے۔ اتفاقاً اس ہنگامے میں ان کے دوست مسٹر ٹیلر نے ان کے مکان میں آکر پناہ لی۔ دوسرے دن جب یہ بات محلے والوں کے علم میں آگئی تو مولوی صاحب نے انھیں ہندوستانی کپڑے پہن کر نکل جانے کا مشورہ دیا تاکہ کسی طرح وہ کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں۔ لیکن لوگوں نے انھیں پہچان لیا اور وہیں ان کا کام تمام کر دیا۔ اس جرم کی پاداش میں ۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کو محمد باقر سرِ راہ پھانسی پر چڑھا دیے گیے۔ اور آزاد کے نام بھی وارنٹ جاری ہو گیا۔ یہ بے چارے ڈر کے مارے راتوں رات سر پہ پاؤں رکھ کر گھر سے نکل بھاگے۔ اور چار برس تک ادھر ادھر کی خاک چھانتے پھرے۔ جب حکومت کی طرف سے عام معافی کا اعلان ہوا تو دہلی واپس آئے۔ یہاں آنے کے بعد کسب معاش کی فکر لاحق ہوئی۔ چنانچہ کچھ دنوں تک ایک فوجی مدرسے میں مدرسی کے عہدے پر کام کیا، بعد میں اس سے دست کش ہو کر پھرتے پھراتے ۱۸۶۱ء میں لاہور پہنچے۔ اور یکم فروری ۱۸۶۴ء کو محکمۂ تعلیم میں ۲۵ روپیے ماہوار پر اہل مد کی حیثیت سے ملازم ہو گیے[1] لیکن اس معمولی عہدے کی وجہ سے ان کی اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ کسی بڑے افسر سے مل کر اور اپنی قابلیت و لیاقت کا ثبوت فراہم کر کے کسی بڑے عہدے پر پہنچ سکیں۔ حسن اتفاق سے ایک بار سررشتۂ تعلیم کے ڈائرکٹر میجر فلر لفظ "ایجاد" کو مونث لکھنے کے بعد اس

---

[1] ڈاکٹر جعفر رضا، مقدمہ نیرنگ خیال ص ۸

کی تذکیر و تانیث کے متعلق شبہے میں مبتلا ہو گیے اور انھوں نے پیارے لال آشوب کو بلا کر ان سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ آشوب نے کہا کہ آپ کے یہاں ایک ایسا شخص موجود ہے جو زبان اردو میں عالم عمر کی حیثیت رکھتا ہے، اسے بلا کر پوچھ لینا چاہیے۔ چناں چہ آزاد بلائے گئے اور ان سے معلوم کیا گیا تو انھوں نے بتایا کہ لفظ "ایجاد" مذکر ہے اور جب ان سے اس کی سند مانگی گئی تو انھوں نے سودا کا یہ شعر پڑھ دیا۔

ہائے کس بھڑوے کا ایجاد ہے نسخہ میں معجون زرنباد ہے

اس طرح اپنے محکمے کے اعلیٰ ترین افسر تک ان کی رسائی ہو گئی اور ایک معمولی ماواقعہ قرار واقعی ترقیوں کا پیش خیمہ بن گیا۔

میجر فلر کی سرپرستی حاصل ہونے کے بعد آزاد کو مدارس کے نصاب کے لیے اردو اور فارسی کی درسی کتابیں مرتب کرنے کی خدمت سپرد کی گئی۔ بعد ازاں اگست ۱۸۶۹ء میں وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیے گیے۔ لیکن کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر (Dr. Leitner) سے جو ان کے پرانے رفیق تھے، زیادہ عرصے تک ان کے تعلقات خوش گوار نہ رہ سکے۔ چناں چہ وہ کالج کی ملازمت سے ترک تعلق کر کے پنجاب یونیورسٹی سے وابستہ ہو گیے۔ یہاں ۱۸۸۴ء سے ۱۸۹۰ء تک مامور رہے[1]

سررشتۂ تعلیم پنجاب کی ملازمت آزاد کی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہیں سے ان کے عہد ساز ادبی کارناموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۴ء میں آزاد نے کرنل صاحب کو اس بات پر آمادہ کیا کہ انجمن پنجاب کے زیر اہتمام ایک ایسے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جائے جو اردو شاعری کو مبالغہ آمیزی اور تصنع سے پاک کر کے اس میں حقیقت اور فطری سادگی کا رنگ پیدا کر دے۔ کرنل ہالرائڈ کو آزاد کی یہ رائے پسند آئی۔ چناں چہ انجمن کی طرف سے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ اس مشاعرے میں آزاد نے "نظم اور کلام موزوں" کے عنوان پر ایک تقریر کی۔ ان کی اس تقریر کی نقلیں مختلف ریاستوں کے تعلیمی محکموں کو ارسال کی گئیں۔ اور درخواست کی گئی کہ وہ اس

---

[1] وحید قریشی، یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی ادبی اور درسی سرمایہ ص ۲

آواز کو مختلف مدارس تک پہنچائیں، تاکہ ایک نئی طرح کی شاعری کی بنیاد پڑ سکے[1] یہ مشاعرہ مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ بقول حالی "اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دربست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہو گئی ہے، اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے۔"[1]

۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کے جشن جبلی کے موقع پر آزاد کو ان کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کے صلے میں شمس العلما کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، یہ پہلا اعزاز تھا جو انگریزی حکومت کی طرف سے کسی ہندوستانی شاعر و ادیب کو عطا کیا گیا تھا۔ عمر کے آخری مراحل میں آزاد پر کچھ جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے بعد وہ کسی کام کے لائق نہیں رہ گئے تھے، لیکن آغا محمد باقر کے بقول "ان ایام وارفتگی میں بھی وہ پورے انہماک کے ساتھ تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف رہے۔ اس طویل مدت میں انھوں نے سیکڑوں ہی رسائل تصنیف کیے اور ان کے مسودات بڑی جزم و احتیاط سے لکھے۔"[2] اسی حالت جنون میں ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو لاہور ہی میں ان کی وفات ہوئی۔

تاریخ ادب اردو میں محمد حسین آزاد ایک عہد ساز شخصیت کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان سے قبل اردو ادب خیال آرائی، مبالغہ آمیزی، تکلفات و تصنعات اور دماغی ورزشوں کے زیر سایہ پروان چڑھ رہا تھا، اسے نہ حقیقت و واقعیت سے کوئی سروکار تھا اور نہ انسانی زندگی کے مسائل سے۔ آزاد نے اسے افادیت و مقصدیت سے ہم آہنگ کیا اور انسانی زندگی کے متنوع و گوناگوں مسائل سے روشناس کرایا۔

انجمن پنجاب کے زیر سرپرستی جدید شاعری کی اس تحریک نے جس میں آزاد، حالی کو روح رواں اور سالار کارواں کی حیثیت حاصل تھی، اردو شاعری کی دنیا ہی بدل دی۔ ادب برائے ادب سے ادب برائے زندگی کی طرف پیش رفت کے سلسلے کا یہ پہلا اقدام تھا، جو تاریخ ساز ثابت ہوا۔ اور جس کی بدولت آزاد کا نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔

---

[1] جہاں بانو بیگم نقوی، محمد حسین آزاد ص ۹۰ [1] بحوالہ سیر المصنفین جلد دوم ص ۱۶۷

[2] مقالات مولانا محمد حسین آزاد جلد اول ص ۷

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

تصنیفات ۔ آزاد کے تصنیفی کارناموں کی فہرست کافی طویل ہے۔ ان میں جو کتابیں علمی و ادبی حیثیت سے اہم ہیں وہ اس قدر مشہور ہو چکی ہیں کہ ان کا تفصیلی تعارف تضیع اوقات کے مترادف ہوگا، اس لیے صرف نام شماری پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔

(۱) آب حیات
(۲) سخن دان فارس
(۳) نگارستان فارس
(۴) دربار اکبری
(۵) نیرنگ خیال
(۶) ڈرامہ اکبر
(۷) خم کدہ آزاد
(۸) مجموعۂ نظم آزاد
(۹) نصیحت کا کرن پھول
(۱۰) قصص ہند
(۱۱) قند پارس
(۱۲) آموزگار پارس
(۱۳) اردو ریڈریں (قدیم) تین حصے
(۱۴) اردو ریڈریں (جدید) دو حصے
(۱۵) فارسی ریڈریں، دو حصے
(۱۶) جامع القواعد
(۱۷) قواعد فارسی
(۱۸) تذکرۂ علمائے کائنات عرب
(۱۹) شہزادہ ابراہیم کی کہانی
(۲۰) حکایات آزاد
(۲۱) سپاک دناک
(۲۲) فلسفۂ الٰہیات
(۲۳) جانورستان
(۲۴) سیر ایران
(۲۵) مکاشفات آزاد
(۲۶) مکتوبات آزاد
(۲۷) بیاض آزاد

غیر مطبوعہ ۔ (۲۸) تاریخی مقامات (۲۹) ترکی قواعد (۳۰) عربی قواعد ۔ اس کے علاوہ عالم جنوں کی بہت ساری یادگاریں بھی ان کے اخلاف کے پاس محفوظ ہیں۔ انھوں نے ذوق کے دیوان کی ترتیب وتدوین بھی کی تھی۔

ڈپٹی نذیر احمد :

نذیر احمد دلی کالج کے ایک ممتاز طالب علم تھے اور علی گڈھ تحریک سے بھی ان کا بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ ان دونوں اداروں کا ان کی شخصیت کی تعمیر وتہذیب میں بڑا حصہ ہے۔ دلی کالج سے ان کی وابستگی زندگی کے ابتدائی حصے میں رہی جس نے انھیں حب الوطنی اور آداب زندگی سکھائے۔ کالج کے اس احسان کا انھوں نے بہ بانگ دہل اعتراف کیا ہے۔ اور جہاں تک علی گڈھ تحریک کا سوال ہے تو نہ صرف یہ کہ اس تحریک سے کچھ سیکھا بلکہ ان کی کوششوں نے اس تحریک کے مقاصد کو بروئے کار لانے میں مسیحا نفسی کا کام کیا۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

نذیر احمد کے سبھی سوانح نگار اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی ولادت ۱۸۳۶ء میں ہوئی لیکن اشفاق احمد اعظمی نے اپنے تحقیقی مقالے "نذیر احمد شخصیت اور کارنامے" میں "فسانۂ مبتلا" کے حوالے سے لکھا ہے کہ "نذیر احمد ۱۸۳۱ء میں اپنے ننہال موضع ریہڑ (پرگنہ افضل گڈھ تحصیل نگینہ ضلع بجنور) میں پیدا ہوئے"[۱] چار سال تک وہ اپنے والد کے ساتھ ننہال ہی میں رہے۔ اس کے بعد ان کے والد مولوی سعادت علی آپ کو اپنے ہمراہ بجنور لے آئے۔ چونکہ مولوی سعادت علی عربی و فارسی کے جید عالم تھے اس لیے آپ کی ابتدائی تعلیم ان ہی کے زیر نگرانی شروع ہوئی۔ اس کے بعد نصر اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر سے عربی، منطق اور فلسفہ کی تحصیل کی۔ پھر دلی آئے اور مولوی عبد الخالق اورنگ آبادی کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا۔ اس کے بعد ۱۸۴۵ء میں وہ دلی کالج میں داخل ہوئے۔ دلی کالج میں ان کے داخلے کا واقعہ یہ ہے کہ ایک روز جبکہ کالج میں تقسیم انعام کا جلسہ ہو رہا تھا یہ بھی اتفاقاً ادھر جا نکلے اور تماشائیوں میں شامل ہو گیے، چوں کہ اس وقت ان کی عمر چودہ سال تھی اس لیے بھیڑ بھاڑ میں خود کو سنبھال نہ سکے اور گر کر زخمی ہو گیے۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اشپرنگر نے انھیں گرا ہوا دیکھ کر اٹھا لیا اور پوچھا کہ کیا پڑھتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ابو الفضل اور شرح ملا جلیے کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب موصوف کے حسب ایما مفتی صدر الدین آزردہ نے ان کا امتحان لیا، وہ ان کے جوابات سے بے حد متاثر ہوئے۔ اس طرح یہ دلی کالج میں داخلے کے لیے منتخب کر لیے گیے۔ نذیر احمد ابھی کالج میں زیر تعلیم ہی تھے کہ وہ ہمیشہ کے لیے شفقت پدری سے محروم ہو گیے۔

کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد نذیر احمد گجرات کے ایک اسکول میں چالیس روپیے ماہانہ مشاہرہ پر مدرس مقرر ہو گیے۔ دو سال کے بعد مدرسی چھوڑ کر کان پور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بعد میں وہاں سے ان کا تبادلہ الٰہ آباد ہوا۔ الٰہ آباد کے قیام کے زمانے ہی میں انھوں نے انگریزی سیکھی۔ اور اس میں اس قدر استعداد بہم پہنچائی کہ حکومت نے تعزیرات ہند کے اردو ترجمے کے لیے ان کا انتخاب کیا۔ نذیر احمد نے اس کام کو اس قدر

---

[۱] نذیر احمد شخصیت اور کارنامے ص ۱۱

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

ملازمانہ انداز میں پایۂ تکمیل تک پہنچا پاکر اس کے صلے میں لفٹننٹ گورنر نے آپ کو کان پور کا تحصیل دار بنایا۔ اسی ملازمت کے دوران آپ نے "انکم ٹیکس" اور "ضابطۂ فوجداری" کے اردو ترجمے کیے۔ ۱۸۶۴ء میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر ترقی پائی۔ اس وقت تک آپ کی شہرت آسمان کی بلندیاں چھونے لگی تھی۔

جب نذیر احمد نے سرکاری ملازمت سے پنشن لی تو سالار جنگ اول نے انھیں حیدرآباد بلایا۔ وہاں مولانا اپنی قابلیت اور محنت وجانفشانی کی بدولت برابر ترقی کے مدارج طے کرتے گیے، حتیٰ کہ سترہ سو روپیے ماہانہ تنخواہ پانے لگے اور بورڈ آف ریونیو کے رکن نامزد ہو گیے۔ سالار جنگ کی وفات کے بعد آپ پنشن لے کر دلی چلے آئے اور خود کو ہمہ وقت علمی وادبی کاموں کے لیے وقف کر دیا۔

نذیر احمد کی علمی خدمات کی حکومت کی طرف سے کافی قدر افزائی ہوئی۔ ان کی متعدد کتابیں درسی نقطۂ نظر سے قابلِ تعریف قرار دے کر داخلِ نصاب کی گئیں اور انھیں نقد انعامات سے نوازا گیا۔ ۲۲ جون ۱۸۹۷ء کو وہ شمس العلما کے خطاب سے سرفراز ہوئے[۱] ۳ اپریل ۱۹۰۲ء کو ان کے دوست سی۔ ایف۔ اینڈریوز کی تحریک پر ایڈنبرا یونیورسٹی نے انھیں ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری اور ۲۸ دسمبر ۱۹۱۰ء کو پنجاب یونیورسٹی نے ڈی۔ او۔ ایل۔ کی۔ اعزازی ڈگری عطا کی[۲]

عمر کے آخری ایام میں مولانا کی عمر بیشتر خراب رہنے لگی تھی۔ چلتے چلاتے بصارت نے بھی جواب دے دیا تھا۔ اسی عالم میں ۱۹۱۲ء میں انھوں نے اس جہان فانی کو خیرباد کہا۔

اردو ادب کی تاریخ میں نذیر احمد ایک ستون کی حیثیت رکھتے ہیں، خصوصاً ناول نگاری کی ابتدا اور اس کے فروغ میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اردو میں ناول اپنی موجودہ شکل میں انگریزی ادب کے زیرِ اثر رائج ہوا، اور اس صنف کو سب سے پہلے اہلِ اردو سے روشناس کرانے کا فخر نذیر احمد کو حاصل ہے۔ سرسید اور ان کے رفقا نے جب اردو ادب اور مسلم معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تو نذیر احمد نے بھی اس مقصد کے حصول میں ان

۱۔ اشفاق احمد، نذیر احمد شخصیت اور کارنامے ص ۲۳۔

۲۔ ایضاً ص ۲۳

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ انھوں نے جادو ٹونے، دیو پری اور عشق و محبت کے خارق العادات اور محیر العقول افسانوں کو مخرب اخلاق اور مذہب سے لاتعلق سمجھ کر ایسے اخلاقی اور اصلاحی قصے لکھنا شروع کیے، جو انسانی زندگی سے قریب ہونے کے ساتھ ساتھ اسے سنوارنے اور ایک صالح معاشرہ تشکیل دینے میں ممد ثابت ہوں۔ اس سلسلے میں ان کی پہلی کوشش ۱۸۶۹ء میں "مراۃ العروس" کے نام سے منظر عام پر آئی۔ یہ ناول خاص طور سے لڑکیوں کے لیے لکھا گیا تھا۔ مذہب چوں کہ نذیر احمد کی سرشت میں داخل تھا اس لیے ان کے قصوں میں مذہبی عنصر کافی نمایاں ہے۔ انھوں نے معاشرے کی اصلاح اور مذہبی خیالات و افکار کی تبلیغ کو بہر حال دوسرے تمام مقاصد پر مقدم رکھا ہے۔ لیکن اس خشک میدان میں بھی زور بیان کے ذریعے قاری کی توجہ اپنے مطمح نظر کی طرف مبذول کر لینے میں انھیں جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ قابل تحسین ہے۔

نذیر احمد کے ناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مسیح الزماں نے ان میں متعدد عیوب گنائے ہیں، مثلاً "نذیر احمد کے کرداروں میں ارتقا نہیں ہوتا وہ سب کے سب بنے بنائے ہیں، کسی کا اثر قبول نہیں کرتے"[1] اسی قسم کے کچھ اور نقائص بھی ہیں جن کی طرف ڈاکٹر موصوف نے اشارہ کیا ہے۔ لیکن یہ مولانا کی تصانیف ہی پر موقوف نہیں، ادب کی ہر صنف کی ابتدائی تخلیقات میں بعض خامیوں کی موجودگی ایک فطری امر ہے۔ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں نذیر احمد کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ایک اچھے ناولسٹ کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اس صنف کے مروج اور بانی کی حیثیت سے ہے۔ ان کا یہ شرف کچھ کم نہیں کہ انھوں نے اردو میں ناول نگاری کی داغ بیل ڈالی اور متعدد ناول لکھ کر نہ صرف یہ کہ ادب کے سرمائے میں اضافہ کیا، بلکہ اردو کے ادیبوں کو ایک شعور عطا کیا، اور ایک ایسی شاہراہ تیار کر دی جس پر چل کر بعد کے ادیبوں نے گراں قدر کارنامے انجام دیے، اور ناول کا رواج عام ہوا۔ یہ انھی کا فیضان ہے کہ اردو کے داستان نویس اور افسانہ نگار جو آکاش اندر پاتال میں بسنے والے دیوؤں اور پریوں کے بعید از عقل اور لایعنی قصے سنانے کے عادی تھے اسی کرۂ ارض پر رواں دواں بنی نوع انسان خصوصاً محنت

---

[1] معیار و میزان ص ۱۴۴

کشوں اور مزدوروں کے مسائل کے متعلق باتیں کرنے لگے ہیں۔ اور غیبی طاقتوں کے ذریعے مشکلات کے حل اور کامیابی کے حصول کی روایات اپنی قوت بازو پر اعتماد اور حسن عمل کی ترغیب جیسے صالح رجحانات کے لیے جگہ چھوڑنے پر مجبور ہوگئیں۔

نذیر احمد نے چھوٹی بڑی متعدد تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کتابیں ان کے اہم کارناموں میں شمار کی جاتی ہیں:۔

مذہب:۔

(۱) ترجمۂ قرآن (۲) الحقوق والفرائض (تین حصے مصنفہ ۱۹۰۶ء) (۳) ادعیۃ القرآن۔ اس میں قرآن کی تمام دعائیں یکجا ہیں۔ (۴) امہات الامۃ۔ حضور اکرم کی ازواج مطہرات کے حالات (۵) الاجتہاد (مطبوعہ ۱۹۰۸ء)

ناول:۔

(۶) مراۃ العروس۔ اس کا ذکر پچھلے صفحے میں آچکا ہے۔

(۷) بنات النعش۔ (مراۃ العروس کا دوسرا حصہ) اس میں لڑکیوں کو دست کاری اور علمی زندگی کی ترغیب دی گئی ہے۔ مطبوعہ ۱۸۷۳ء

(۸) توبۃ النصوح۔ یہ اسلامی تعلیم پر مشتمل ہے، جس پر مولانا کو ایک ہزار روپیے انعام ملے تھے۔ یہ ۱۸۷۷ء میں شائع ہوئی۔

(۹) محصنات یا فسانۂ مبتلا۔ مطبوعہ ۱۸۸۵ء۔ اس میں مولانا نے اپنے حالات بھی درج کیے ہیں۔

(۱۰) ابن الوقت۔ غدر کے زمانے کے حالات کے پہلو بہ پہلو انگریزی، ہندوستانی اور اسلامی معاشرت کا مقابلہ بھی کیا گیا ہے۔

(۱۱) رویائے صادقہ۔ دلی کے ایک قدیم اور شریف خاندان کی زندگی کے حالات افسانوی انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

(۱۲) ایامی۔ اس کتاب میں بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کی ضرورت اور اس کے فوائد سے بحث کی گئی ہے۔

متفرق:۔

(۱۳) منتخب الحکایات (۱۴) چند پند (۱۵) مواعظ حسنہ۔ یہ تینوں کتابیں اخلاق سے متعلق ہیں۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

(۱۶) **مبادی الحکمت** ۔ یہ کتاب علم منطق سے متعلق ہے۔ جس میں علم منطق کی تعلیم کا جدید اور دلچسپ طریقہ بیان کیا گیا ہے۔

(۱۷) **سماوات** ۔ یہ انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جس پر حکومت نے ایک ہزار روپیے کا انعام دیا تھا۔ علم ہیئت سے متعلق یہ کتاب پہلی بار ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

(۱۸) مانیفیک فی صرف (۱۹) صرف صغیر ۔ دونوں [illegible]

(۲۰) رسم الخط (۲۱) نصاب خسرو (۲۲) ف [illegible]

ان کتابوں کے علاوہ ان کی تقریروں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

رائے بہادر پیارے لال آشوب :

پیارے لال آشوب ۱۸۳۸ء میں بمقام دلی پیدا [illegible] ٹوڈرمل سے ملتا ہے، جو اکبر اعظم کے نورتنوں میں شامل [illegible] دلی میں مقیم تھا۔ آشوب ابتدائی تعلیم [illegible] جہاں انھیں مولانا امام بخش صہبائی اور رام چندر [illegible] ہوا۔ بقول تنہا دلی کالج کے تمام درجے پاس کر [illegible] وہاں سے فراغت کی سند حاصل کرنے کے بعد وہ [illegible] دلی میں ملازم [illegible] کے ایک سال بعد گڑگانوں میں بحیثیت ہیڈ ماسٹر [illegible] مقرر کیے گئے۔ ۱۸۶۸ء کے اواخر میں وہ لاہور بک ڈپو [illegible] پر مامور ہوئے۔ ۱۸۸۴ء میں جب پنجاب بک ڈپو [illegible] اسپکٹری کا عہدہ دینے کا فیصلہ کیا گیا تو آشوب اپنا [illegible] پر فائز ہوئے۔ قیام لاہور کے زمانے میں [illegible] میجر فلر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم ان سے [illegible] آیا کرتے تھے اور اس کے جواب کے لیے وہ آشوب [illegible]

لہ تنہا، سیر المصنفین جلد دوم ص ۱۶۱

لہ ایضاً ص ۱۶۱

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

۱۸۹۵ء میں سرکاری ملازمت سے پنشن لی۔

نارمل اسکول کے ہیڈماسٹر کی حیثیت سے دہلی میں آشوبؔ کا قیام ان کے سفرِ زندگی میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی زمانے میں ۲۸ جولائی ۱۸۶۵ء کو کمشنر دہلی کرنل ہیملٹن نے "دہلی سوسائٹی" کی داغ بیل ڈالی[1]۔ یہ ایک فعال علمی و ادبی انجمن تھی جس کا مقصد لوگوں میں ادبیات، تاریخ، آثارِ قدیمہ، سکہ شناسی اور ادبِ لطیف کا ذوق پیدا کرنا تھا۔ آشوبؔ نے چونکہ اس سوسائٹی کی تشکیل میں غیر معمولی دلچسپی لی تھی، اس لیے وہ اس کے پہلے سکریٹری مقرر ہوئے اور جب تک دلی میں رہے برابر اس عہدے پر فائز رہے۔ اور سوسائٹی کا پرچہ بھی ان ہی کی ادارت میں چھپتا تھا۔ ۱۸۶۸ء میں وہ لاہور بک ڈپو کے کیوریٹر مقرر ہوئے تو انھوں نے سکریٹری کے عہدے سے استعفا دے دیا[2]۔

دلی کے شعرا و ادبا اور اربابِ علم و فضل سے آشوبؔ کے بڑے اچھے تعلقات تھے اور غالبؔ کے تو وہ منظورِ نظر ہی تھے۔ مرزا غالبؔ کو ان سے جو تعلقِ خاطر تھا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعے سے لگایا جا سکتا ہے، جسے مولانا غلام رسول مہرؔ کے الفاظ میں نقل کیا جا رہا ہے۔

"۱۸۶۶ء میں پنجاب کے لفٹننٹ گورنر ڈونلڈ میکلوڈ نے دہلی میں دربار منعقد کیا تو اس میں غالبؔ بھی شریک ہوئے لیکن ضعیفی کے باعث سہارے کے بغیر چل پھر نہ سکتے تھے۔ رائے بہادر پیارے لال بھی دربار میں شریک تھے۔ غالبؔ لفٹننٹ گورنر سے ملاقات کے لیے اٹھے تو رائے بہادر سہارا دینے کے لیے ان کے ہمراہ ہو گیے۔ صاحب نے پوچھا کہ یہ تمہارا بیٹا ہے؟ غالبؔ نے جواب دیا، نہیں، مگر بیٹے سے زیادہ عزیز ہے۔"[3]

آشوبؔ کو اردو، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں پر بڑی اچھی دست رس تھی۔ انھوں نے بالواسطہ اور براہِ راست اردو ادب کی جو خدمات انجام دیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ حالیؔ، آزادؔ

[1] سجن لال، نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۲ء ص ۲۰
[2] "دہلی سوسائٹی" اور آشوبؔ کی سرگرمیوں کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو چوتھا باب بعنوان "دہلی سوسائٹی"
[3] خطوطِ غالب ص ۵۶۶

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

امو جان ولی، مرزا اشرف بیگ خاں اشرف، منشی درگا پرشاد، مولوی سید احمد صاحب مصنف "فرہنگ آصفیہ" اور مرزا ارشد گورگانوی وغیرہ کو انھوں نے ہی لاہور بلا کر لاہور بک ڈپو میں ملازمت دلوائی، جس کے نتیجے میں اردو زبان و ادب کو کافی فروغ ملا۔ ان لوگوں کی انتھک کوششوں سے پنجاب میں اردو کی ترویج و ترقی میں بڑی مدد ملی۔ آشوب ان لوگوں میں سے تھے، جن پر مولانا حالی اور آزاد کو فخر تھا۔ ان کا دوسرا بڑا کارنامہ اردو ادب میں انگریزی افکار و خیالات کی اشاعت ہے۔ اردو میں جدید شاعری کی بنیاد انھیں کی ترغیب و تشویق سے پڑی۔ رام بابو سکسینہ کے الفاظ میں "آشوب ہی کی توجہ اور مدد سے مولانا آزاد اور حالی نے جدید رنگ کی شاعری اختیار کی اور انھوں نے مولانا حالی کو اکثر انگریزی چیزیں ترجمہ کر کے دیں تاکہ وہ ان کو اردو کا جامہ پہنائیں۔"[1]

آشوب کی علمی و ادبی خدمات کی گورنمنٹ کی طرف سے شایان شان قدر افزائی ہوئی۔ ۱۸۹۲ء میں انھیں رائے بہادر کا خطاب عطا ہوا، غالباً اسی سال وہ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو بھی مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو وہ ایک کامیاب استاد، لائق مترجم و ادیب، دیدہ ور مصلح قوم اور درد مند خادم خلق کی حیثیت سے شہرت و مقبولیت کی تمام منزلیں سر کر چکے تھے۔ آشوب کی تصانیف میں "اتالیق پنجاب" میں شائع شدہ متعدد مضامین کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں:-

(۱) **قصص ہند**۔ (دو حصوں میں) اس سلسلے کی دو کتابیں مولانا محمد حسین آزاد نے بھی مرتب کی تھیں۔

(۲) **رسوم ہند**۔ اس کتاب کے ابتدائی تین ابواب آشوب کے لکھے ہوئے ہیں۔ تکمیل شمس العلما مولوی ضیاء الدین نے کی۔

(۳) **تاریخ انگلستان**۔ }
(۴) **دربار قیصری**۔ } یہ دونوں کتابیں انگریزی سے ترجمہ کی گئی تھیں۔

خان بہادر میر ناصر علی:

---

[1] تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص ۸۷

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

میر ناصر علی دلی کالج کے ایسے طالب علم ہیں، جن کی شہرت و مقبولیت محض مضمون نگاری اور صحافت کی رہین منت ہے۔ ان کی کوئی مستقل تصانیف نہیں، پھر بھی اردو کے خادموں میں انھیں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔

میر صاحب ۱۸۴۷ء میں دلی میں پیدا ہوئے[1] ان کے والد مولوی سید ناصر الدین محمد ابوالمنصور بلند پایہ عالم اور مبلغ تھے۔ بڑے بھائی میر نصرت علی "نصرت الاخبار" کے مدیر اور مالک تھے۔ ان کے دادا اور نانا ریاست بھوپال میں اعلا عہدوں پر فائز تھے۔

ناصر علی نے دستور زمانہ کے مطابق متداول علوم معقول و منقول کی تحصیل کے بعد بزرگوں کی مخالفت کے باوجود انگریزی پڑھنا شروع کی اور ۱۸۶۷ء میں دلی کالج سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا، جس میں وہ اول آئے۔ امتحان میں کامیابی کے فوراً بعد وہ نان پارہ ضلع بہرائچ کے سرکاری اسکول میں مدرس مقرر ہو گیے۔ بعد میں ان کی خدمات نمک کے محکمے میں منتقل کر دی گئیں۔ اس ملازمت کے دوران مسلسل سولہ سال تک وہ فرخ نگر (ضلع گڑگانو) کی میونسپل کمیٹی کے نائب صدر بھی رہے۔ اور انسداد قحط سالی اور دوسری مختلف النوع خدمات کے صلے میں وہ ۱۸۹۷ء میں خان بہادر کے خطاب سے سرفراز کیے گیے۔ ۱۹۰۸ء میں محکمہ نمک سے پنشن لی۔ اس کے بعد تین سال تک دلی میں آنریری مجسٹریٹ کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۱۳ء میں ریاست پاٹودی کے دیوان (چیف منسٹر) مقرر ہوئے اور ۱۹۲۲ء تک اس معزز عہدے پر فائز رہے۔ یہاں سے سبکدوشی کے بعد عمر کے باقی ایام دلی میں گزارے۔ چھیاسی برس کی عمر میں ۱۲ر جنوری ۱۹۳۳ء کو دلی ہی میں ان کی وفات ہوئی[2]

میر ناصر علی کا میدان صرف صحافت رہا ہے۔ ان کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز مضمون نگاری سے ہوا۔ ابتدا میں ان کے مضامین مختلف رسائل میں چھپتے رہے۔ اس کے بعد ۱۸۷۷ء میں انھوں نے آگرہ سے "تیرھویں صدی" کے نام سے اپنا ایک رسالہ نکالا۔ اس زمانے میں سرسید احمد خاں "تہذیب الاخلاق" کے ذریعے افہام و تفہیم اور تاویلات و توجیہات کی ایک نئی روایت قائم

---

[1] حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو ص ۱۷۷

[2] انصار ناصری، نقوش لاہور شخصیات نمبر جنوری ۱۹۵۵ء ص ۹۰

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کرنے میں مصروف تھے۔ میر صاحب نے اس رسالے میں ان کے مضامین پر انتقاد کا سلسلہ شروع کیا، جو بہت مقبول ہوا۔ ان کے پوتے انصار ناصری کے بقول "سرسید احمد خاں کے مشن سے میر صاحب کو کوئی تعرض نہ تھا، وہ محض ان کے علمی و ادبی کارناموں پر سخن گسترانہ تنقید کرتے تھے اور اس طرح داد سخن دیتے تھے کہ سرسید علیہ الرحمہ بھی انھیں ناصح مشفق کہتے رہتے تھے"

"تیرھویں صدی" چار پانچ سال تک جاری رہنے کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے بعد میر صاحب نے آگرہ ہی سے "زمانہ" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ لیکن یہ بھی چار پانچ سال سے زیادہ نہ چل سکا۔ "افسانۂ ایام" میر صاحب کے اہتمام اور ادارت میں شائع ہونے والا تیسرا رسالہ تھا جو انھوں نے اپنے بھائی میر نصرت علی کے "نصرت المطابع" دہلی سے شائع کرنا شروع کیا تھا۔ اس کے بند ہونے کے کچھ عرصے بعد اسی مطبع سے رسالہ "ناصری" کا اجرا عمل میں آیا۔ اس رسالے کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں طنز و مزاح کا عنصر غالب رہتا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد "صلائے عام" کے ساتھ میر صاحب کی صحافت نگاری کا آخری اور تابناک ترین دور شروع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ وہ اپنے ذاتی پریس "مطبع ناصری" سے نکالتے تھے۔ "صلائے عام" کو ادبی حلقوں میں غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، حتیٰ کہ میر ناصر علی اور "صلائے عام" اس طرح لازم و ملزوم ہو گئے کہ کسی بھی ایک کا نام آتے ہی دوسرے کا نام ذہن میں رقص کرنے لگتا ہے۔ یہ رسالہ ان کی وفات تک برابر شائع ہوتا رہا۔

میر ناصر علی کی تحریریں عموماً نہایت شگفتہ، رنگین اور مدلل ہوتی تھیں۔ [illegible] جس روایت کو مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنایا اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک [illegible] حیثیت عطا کی، اس کی ایجاد کا سہرا دراصل میر ناصر علی کے سر ہے۔ [illegible] میں "یونانیوں کی سی لطافت خیال" کا احساس ہوتا تھا۔ [illegible] انشا پردازی کو چمکایا جب بہتوں نے قلم بھی ہاتھ میں نہیں لیے تھے۔ [illegible] خاص طرح کا مادۂ اختراعی دراصل آپ کے اولیات میں داخل ہے۔ [illegible]

---

[1] انصار ناصری، نقوش لاہور۔ شخصیات نمبر جنوری ۱۹۵۵ء ص ۹۱

[2] افادات مہدی ص ۱۵۵

مختصر یہ کہ سید وقار عظیم کے الفاظ میں "ان (امیر صاحب) کی عبارتیں جہاں ایک طرف آزاد کی طرح رنگین و مسرت افزا ہیں وہاں شبلی کی طرح شگفتہ اور مدلل بھی، لیکن ان باتوں کے باوجود بھی بات کو آسان سے آسان زبان میں پیش کرتے ہیں اس طرح کہ حسن بھی برقرار رہے اور علمیت میں بھی کمی نہ آئے"[1]

۱۹۵۵ء میں ناصر علی کے منتخب مضامین ومقالات کا ایک مجموعہ "مقالات ناصری" کے نام سے زیر ترتیب تھا۔ یہ مجموعہ ان کے پوتے انصار ناصری اشاعت کے لیے مرتب کر رہے تھے[2]۔ فی الحال ہم اس کام کی تکمیل یا عدم تکمیل کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر ہیں۔

مولوی شیخ ضیاء الدین :

ضیاء الدین کے والد کا نام محمد بخش تھا جو بسئی پور سے ترک سکونت کر کے دلی میں بس گئے تھے۔ ضیاء الدین کی پیدائش دلی میں ہوئی اور انھوں نے دلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ مولانا مملوک العلی اور مفتی صدر الدین آزردہ سے تعلیم حاصل کی۔ یہاں سے فارغ ہو کر دہ دلی نارمل اسکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ۱۸۶۴ء میں دلی کالج میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر اور بعد ازاں پروفیسر بنائے گئے[3]۔ دلی کالج ٹوٹنے کے بعد ۱۸۶۷ء میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (دہلی) مقرر ہوئے۔ اس دوران انھیں شمس العلما کا خطاب عطا کیا گیا۔ عربی کے علاوہ وہ فارسی اور اردو میں بھی کمال رکھتے تھے۔ علم طبیعات سے انھیں خاص شغف تھا۔ منشی، فاضل اور مولوی فاضل امتحانات کے ممتحن مقرر ہوتے رہے۔ پنشن لے کر جامع مسجد کے نزدیک چاہ رہٹ میں سکونت اختیار کی۔ ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں زیارت حرمین شریفین کے لیے گئے[4] اور سرزمین مکہ ہی میں ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) میں انھوں نے وفات پائی[5]۔

دلی جیسے علمی وادبی شہر میں اپنے علم واتقا کی بدولت انھوں نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ جولائی ۱۸۶۵ء میں جب دہلی سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا تو اس کے پہلے ہی جلسے میں

---

[1] بحوالہ "نقوش" لاہور شخصیت نمبر ص ۱۰۱

[2] ایضاً ص ۱۰۲

[3] پرواز اصلاحی، مفتی صدر الدین آزردہ ص ۱۲۳

[4] ایضاً ص ۱۲۴۔ [5] محمد ایوب قادری، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء واقعات وشخصیات ص ۴۱۲

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

انھیں نہ صرف اس کارکن بلکہ مجلس منتظمہ کا ممبر بھی منتخب کیا گیا، اس وقت یہ دلی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کا کام کر رہے تھے۔ موصوف کے علمی مرتبے اور معاشرتی حیثیت کا اندازہ اس واقعے سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب وہ غالب کے مقدمہ "ازالۂ حیثیت عرفی"[۱] میں بہ حیثیت گواہ پیش ہوئے، تو حاکم عدالت نے کسی شخص کی اس تحریک پر کہ "یہ بڑے معزز آدمی ہیں انھیں کرسی ملنی چاہیے"[۲]، انھیں غالب کے مقابلے میں کرسی پر بیٹھایا۔ اڈمبرا یونیورسٹی نے انھیں ایل۔ ایل۔ ڈی۔ کی اعزازی ڈگری بھی عطا کی تھی[۳] جو ان کی فضیلت علمی کے اعتراف کا ایک اور ثبوت ہے۔ حسب ذیل تصانیف انھی کے رشحات قلم کی رہین منت ہیں۔

(۱) انشائے اردو۔ (حصہ اول دوم) یہ کتاب انگریزی فوج کے افسروں کو اردو سکھانے کی غرض سے لکھی گئی تھی۔

(۲) معرعۃ العلمہ او رمدارس۔ یہ کچہری کے اہل کاروں کی ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی تھی۔

(۳) مخزن الطبیعات۔ (دو حصوں میں) ضیاء الدین نے میجر فلر کی فرمائش پر ترتیب دی، جسے ۱۸۶۵ء میں شائع کیا گیا۔

(۴) رسوم ہند۔ یہ کئی حصوں میں تھی لیکن اب اس کا ایک ہی حصہ دستیاب ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصے کے ابتدائی تین ابواب آشوب کے لکھے ہوئے ہیں۔

(۵) منتخبات اردو۔ یہ انگریز طلبہ کے لیے لکھی گئی تھی۔

(۶) مفتاح الارض۔ اس کے موضوع کا پتا نہیں چل سکا۔

موتی لال دہلوی:

کریم الدین کے اس بیان سے کہ "عمر اس کی سنہ ۱۸۴۷ء میں قریب ۱۹ برس کی ہے"[۴]

---

[۱] غالب نے دسمبر ۱۸۶۰ء میں "قاطع قاطع" کے مصنف مولوی امین الدین کے خلاف ... نے اس مقدمے میں غالب کے خلاف اور مولوی امین الدین کے حق میں شہادت دی تھی۔

[۲] بحوالہ احوال غالب از مختار الدین ص ۱۴۱

[۳] بحوالہ خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر ص ۷۱۰

[۴] طبقات شعرائے ہند ص ۴۶۷

موتی لال کی ولادت کا زمانہ ۱۸۳۸ء کے آس پاس قرار پاتا ہے۔ اُن کا تعلق کشمیری برہمنوں کے ایک خاندان سے تھا۔ زمانۂ طالب علمی میں یہ کالج کے ممتاز طلبہ میں شمار کیے جاتے تھے اور سینیر اسکالرشپ پانے والوں میں شامل تھے۔ وظیفے کی توسیع کے لیے ان کی درخواست پر متعلقہ محکمے کی طرف سے یہ نوٹ لکھ کر ان کی استعدادِ علمی اور کارگزاری کی تصدیق اور منظوری کی سفارش کی گئی تھی۔

"وہ اس رعایت کا خاص طور پر مستحق ہے۔ کیوں کہ انگریزی زبان کی تحصیل میں اس نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اور اپنی فرصت کا وقت ترجمہ کرنے اور رسالوں کے اڈٹ (مرتب) کرنے میں صرف کرتا ہے۔"[1]

جیسا کہ مندرجہ بالا نوٹ سے ظاہر ہوتا ہے، موتی لال نے طالب علمی کے دوران ہی انگریزی زبان اور انگریزی سے اردو میں ترجمے کے کام میں غیر معمولی مہارت پیدا کرلی تھی، چنانچہ تعلیم سے فراغت کے بعد بہ تدریج ترقی کے منازل طے کرتے گیے۔ سب سے پہلے ۱۸۵۰ء میں انھیں لاہور میں بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کا فارسی مترجم مقرر کیا گیا۔ بعد میں وہ اکسٹرا جوڈیشنل مجسٹریٹ اور پھر ڈسٹرکٹ جج ہو گیے۔ اس عہدے سے پنشن لینے کے بعد انھوں نے گجرات میں سکونت اختیار کرلی تھی۔

موتی لال تاعمر ایسے عہدوں پر فائز رہے، جن کی مصروفیات بالعموم تالیف و تصنیف کے مشاغل جاری رکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس کے باوجود انھوں نے اس دوران اپنے اس ذوق کو جو زمانہ طالب علمی ہی میں پروان چڑھ چکا تھا، بڑی حد تک برقرار رکھا اور کئی رسلے تصنیف اور ترجمہ کیے۔ طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے "تذکرۂ ہندو شعرا" مرتب کیا تھا، جو بہت مشہور ہوا۔ بعد میں مسمریزم کے موضوع پر دو کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیں۔ ان میں سے ایک "علم دنیا کی کنجی" جو فلیب کی کتاب کا ترجمہ تھی۔ دوسری کتاب کا نام "مرایا و مناظر" تھا یہ نیئل کی کتاب سے ترجمہ کی گئی تھی۔ ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے ایک کتاب اور بھی لکھی تھی جس کا نام "تذکرۂ مسمریزم" ہے۔ یہ سبھی کتابیں دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی نے شائع کی تھیں۔

---

[1] بحوالہ مرحوم دہلی کالج ص ۱۶۵

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

"ریشم کا کیڑا" کے نام سے صنعت وحرفت کے موضوع سے متعلق ان کی ایک اور کتاب لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ نثر نگاری کے علاوہ موتی لال کو شعر گوئی سے بھی شغف تھا۔ شاعر کی حیثیت سے وہ بسمل تخلص کرتے تھے۔

پنڈت دھرم نارائن:

پنڈت دھرم نارائن پنڈت لشن نارائن کے بیٹے تھے۔ یہ کالج کے ذہین اور مونہار طلبہ میں سے تھے۔ یہ فارسی کے بلند پایہ عالم تھے ساتھ ہی ساتھ اردو اور انگریزی میں بھی کافی دست گاہ رکھتے تھے۔ انھوں نے انگریزی کی کئی مفید کتابوں کے اردو میں تراجم کیے ہیں۔ کچھ دن اندور میں میر منشی کے عہدے پر فائز رہے۔ جب دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ہوئی تو انھوں نے اس کے لیے مل کر انگریزی کتاب "پولیٹکل اکونومی" کا اردو میں ترجمہ کیا، جس کا نام "سیاست انتظام مدن" ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن اردو اخبار پریس دہلی سے ۱۸۴۶ء میں شائع ہوا، اس کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن سائنٹفک سوسائٹی نے قریب ۱۸۷۰ء میں شائع کیا۔

دھرم نارائن جب دلی کالج کے طالب علم تھے تو انھوں نے انگریزی کتابوں کے اردو ترجمے کے کام میں کئی مترجموں کی مدد کی تھی اور خود بھی "تاریخ انگلستان" کا ترجمہ کیا تھا۔

حکم چند:

حکم چند کے والد کا نام رام دیال تھا۔ وہ ذات کے اہیر تھے اور کھاری میں رہتے تھے لیکن بعد میں انھوں نے دلی کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ حکم چند دلی ہی میں پیدا ہوئے۔ اس لیے وہ دہلوی کہلائے۔ ان کے ایک بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۳۲ء کے قریب پیدا ہوئے تھے[۱]۔ حکم چند کالج کے ذہین اور قابل طلبہ میں سے تھے۔ کالج کے امتحانات میں ہمیشہ اول درجے میں کامیاب ہوئے اور جب کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ایم۔ اے۔ کے امتحانات دیئے تو وہاں بھی دلی کالج کی اپنی شاندار روایات قائم رکھیں۔ غالب کے خاص ارادت مندوں میں سے تھے، چنانچہ "ازالۂ حیثیت عرفی" کے مقدمے میں ان کے گواہ کی حیثیت سے پیش

---

[۱] غالب کے "ازالۂ حیثیت عرفی" کے مقدمے میں ۱۲ مارچ ۱۸۶۸ء کو بیان دیتے ہوئے انھوں نے اپنی عمر ۲۶ برس بتائی تھی۔ (احوالِ غالب ص ۱۴۰)

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

ہوئے تھے۔ جب دہلی سوسائٹی قائم ہوئی تو وہ اس کے باقاعدہ رکن بنے۔ سوسائٹی کے ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۷ء کے جلسے میں انھوں نے اپنی کتاب "قصۂ بہمن" [1] کے دو نسخے سوسائٹی کے کتب خانے کے لیے نذر کیے تھے۔

کالج سے فراغت کے بعد کچھ دنوں وہیں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد ۱۸۷۰ء میں امرت سر میں تحصیل دار مقرر ہوئے اور ترقی کر کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر پہنچ گیے۔ ۱۸۸۱ء کے بعد حیدر آباد چلے گیے، جہاں کئی اعلا عہدوں پر سرفراز رہے، آخیر میں مجلس وضع قانون کے نائب معتمد مقرر ہوئے۔ حیدر آباد ہی میں تقریباً ۶۸ برس کی عمر میں وفات پائی۔

حکم چند قانون میں خاص دستگاہ رکھتے تھے۔ دوران قیام حیدر آباد اس سلسلے کی کئی کتابیں لکھیں، جنھوں نے ان کی شخصیت میں چار چاند لگا دیے۔ ان کتابوں میں "Res Judicata" نے شہرت دوام حاصل کی ہے۔

منشی شیو نارائن اور پنڈت سروپ نارائن:

یہ دونوں کالج کے ممتاز طلبہ میں سے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد دونوں ایک ساتھ کالج کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ دونوں فارسی اور انگریزی میں اچھی صلاحیت کے حامل تھے۔ ہم نے ان کا ذکر ایک ساتھ اس لیے کیا ہے کہ ایک ایک کتاب کے علاوہ دونوں کے تمام تصنیفی و تالیفی کارنامے باہمی معاونت ہی سے معرض وجود میں آئے ہیں۔ انفرادی طور پر منشی شیو نارائن نے "تذکرۂ ڈیموستھنیز" ایک انگریزی کتاب کی بنا پر مرتب کیا اور پنڈت سروپ نارائن نے "تذکرۂ سکندر اعظم" لکھا۔ یہ دونوں کتابیں "دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی" نے علی الترتیب ۱۸۴۴ء اور ۱۸۴۷ء میں شائع کی تھیں۔ جو کتابیں ان دونوں نے باہمی اشتراک اور تعاون سے مرتب کیں، ان کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) خلاصۃ التواریخ حصہ اول (ابتدائے آفرینش سے حضرت عیسیٰ کے زمانہ ولادت تک)

" حصہ دوم (حضرت عیسیٰ کی ولادت سے شاہ شارلمین کے عہد تک) یہ دونوں

---

[1] غالب کی کتاب "قاطع برہان" کے جواب میں متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں سے کسی کتاب کے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی تھی۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

مارشمین کی کتاب "Brief Survey of History" کا ترجمہ ہیں۔

(۲) تشریح اور تتمیم علم طبیعی کی۔ یہ آرنوٹ کی "Physics" کا ترجمہ ہے۔

(۳) جغرافیہ ہند۔ یہ مرے (Murray) کی کتاب "Encyclopaedia of Geography" کا ترجمہ ہے

پتمبر:

پتمبر کا شمار کالج کے ذہین طلبہ میں ہوتا ہے۔ وہ ماسٹر رام چندر کے ہم جماعت اور سنیر اسکالر شپ پانے والوں میں شامل تھے۔ ۱۸۴۵ء میں یہ کالج کی طرف سے انجینیرنگ کی تعلیم کے لیے بھیجے گیے اور شاید ہندوستان کے سب سے پہلے سول انجینیر بنے تعلیم سے فراغت کے بعد ان کا پہلا تقرر دلی ہی میں ہوا تھا۔

پتمبر طالب علمی ہی کے زمانے سے ترجمہ و تالیف کے کام میں دوسرے مصنفین کی مدد کرتے رہے۔ انھوں نے نارٹن کی کتاب "Principles of Government" کا اردو میں ترجمہ کیا تھا، جس میں ماسٹر رام چندر بھی ان کے شریک کار تھے۔

مدن گوپال:

مدن گوپال پیارے لال آشوب کے چھوٹے بھائی تھے۔ ابھی ان کی تعلیم مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ دلی کالج توڑ دیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایم۔ اے۔ پاس کیا۔ پھر الہ آباد ہائی کورٹ سے وکالت کی سند حاصل کی اور دلی میں پریکٹس کرنے لگے شوقِ علم اس کے بعد بھی دل میں موج زن رہا، چناں چہ وکالت چھوڑ کر ولایت چلے گیے اور وہاں سے بیرسٹری کی اعلا ڈگری لے کر واپس آئے۔ بعد ازاں لاہور میں وکالت شروع کی اور غیر معمولی محنت و تندہی کی وجہ سے جلد ہی شہرت و کامیابی کے اعلا مدارج تک پہنچ گیے۔ علمی کاموں کے سلسلے میں مدن گوپال نے پروفیسر جیوانز کی منطق کا اردو میں ترجمہ کیا اور قانون کی چند کتابیں تصنیف کیں، جن میں "Revenue Act" اور "Panjab Tenancy Act" بہت مشہور ہوئیں۔ لاہور کے زمانۂ قیام میں ڈاکٹر لائیٹنر سے ان کے بے حد مخلصانہ مراسم رہے۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

پیرزادہ محمد حسین:

یہ بھی دلی کالج کے ممتاز طالب علموں میں سے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے اور ترقی کر کے سشن جج کے عہدے تک پہنچے۔ اپنے زمانے میں انھوں نے بڑا نام کمایا۔ ادیب کی حیثیت سے آپ کا سب سے بڑا کارنامہ "سفر نامۂ ابن بطوطہ" کا اردو ترجمہ ہے، جو علمی حلقوں میں کافی قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اس ترجمے پر انھوں نے جابہ جا حاشیہ آرائی بھی کی ہے، جس سے ان کی وسعت نظر اور قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

دلی کالج کے دوسرے لائق اور صاحب علم طلبہ میں بھیروں پرشاد، پنڈت من پھول، اکرار ناتھ، ماسٹر جانکی پرشاد اور ہند کشور کے نام قابل ذکر ہیں۔

مولوی محمد باقر دلی کالج کے معلم تھے نہ حالی متعلم

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اپنے ایک مضمون میں مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کو بھی دلی کالج کے اساتذہ میں شمار کیا ہے[1] لیکن موصوف کا یہ خیال سراسر خلاف واقعہ ہے۔ کیوں کہ دلی کالج سے بہ حیثیت استاد انکے تعلق کی کوئی ضعیف شہادت بھی موجود نہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے "مرحوم دہلی کالج" میں دلی کالج کے اساتذہ کی جو طویل فہرست دی ہے مولوی محمد باقر کا نام اسمیں شامل نہیں اور نہ تو "قدیم دلی کالج" میں مالک رام ہی نے ان کا ذکر کیا ہے۔

ہو سکتا ہے مولوی صاحب موصوف اپنے دوست مسٹر ٹیلر سے ملاقات کے لیے یا اپنے بیٹے محمد حسین آزاد سے ملنے کی غرض سے کبھی کبھار دلی کالج جاتے رہے ہوں اور مسٹر ٹیلر از راہ قدر دانی انھیں کسی درجے میں پڑھانے کے لیے بھیج دیتے ہوں کیوں کہ مولوی صاحب اور مسٹر ٹیلر کے درمیان دوستانہ تعلقات کے علاوہ استادی و شاگردی کا رشتہ بھی موجود تھا۔ مسٹر ٹیلر نے ان سے فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی[2] اس سے زیادہ دلی کالج سے ان کے تعلق کی کسی معتبر ذریعے سے تائید نہیں ہوتی۔

اسی طرح سے بعض حضرات کو مولانا حالی کے سلسلے میں بھی یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ وہ دلی کالج کے طالب علم رہے تھے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ دلی کالج کے حالات کے تحت

---

[1] چراغ رہ گزر ص ۱۴۱

[2] ایضاً ۱۴۱-۱۴۲

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

رقم طراز ہیں کہ

" دلی کالج سے پڑھ کر مشہور مشہور لوگ نکلے جنھوں نے زبان اردو کی آئندہ توسیع و ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا مثلاً مولوی نذیر احمد، ماسٹر پیارے لال آشوب، مولانا آزاد مولانا حالی اور مولوی ذکاء اللہ کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔" [1]

ایک جگہ اور لکھتے ہیں

" دلی کالج کے مشہور پروفیسر عربی مولوی مملوک علی کے اصرار سے وہ (نذیر احمد) دلی کالج میں داخل ہوئے۔۔۔ اس زمانے میں ان کے ہم سبق حالی، آزاد، منشی کریم الدین، مولوی ذکاء اللہ اور پیارے لال آشوب تھے۔" [2]

دلی کالج کے نامور طلبہ کی اس فہرست میں حالی کے نام کی شمولیت کہاں تک درست ہے اس کا اندازہ خود حالی کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے:-

" دلی پہنچ کر جس مدرسے میں مجھے شب و روز رہنا پڑا وہاں سب مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔۔۔ ڈیڑھ برس دلی میں رہنا ہوا، اس عرصے میں کبھی کالج (دلی کالج) کو جا کر آنکھ سے نہ دیکھا اور نہ ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اس کالج میں تعلیم پاتے تھے۔" [3]

حالی کا یہ بیان اس دور سے متعلق ہے جب کہ وہ طالب علم کی حیثیت سے دلی میں مقیم تھے اور اس سے بڑھ کر کوئی معتبر شہادت اس امر کی نہیں ہو سکتی کہ اس زمانے میں انھیں دلی کالج سے کوئی تعلق نہیں رہا حتی کہ اس عرصے میں انھوں نے کبھی کالج کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔

---

[1] تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص ۸۰

[2] تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص ۵۶-۵۵

[3] مقالات حالی حصہ اول ص ۲۶۴

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

مفتی صدرالدین آزردہ اور دلی کالج

علم وادب کی دنیا میں مفتی صدرالدین آزردہ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ وہ وحید عصر، یکتائے زمانہ اور نادرۂ روزگار ہی نہیں بلکہ گم گشتگان صراط مستقیم کے لیے بحر ظلمات میں روشنی کا مینار بھی تھے۔ وہ اپنے گوناگوں و متنوع ذوق وجستجو کی بدولت نہ صرف دلی کے ارباب وکمال کے حلقے میں مشہور تھے بلکہ ہندوستان کے اہل علم عام طور پر انھیں سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے۔ فقہ، حدیث اور دیگر مذہبی علوم وفنون میں فاضلانہ مہارت کے علاوہ معاصر شعرا میں بھی انھیں ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ مغل دور حکومت میں مسند افتا اور انگریزوں کے عہد میں صدرالصدور کے ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ یوں تو آزردہ عربی وفارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ لیکن اردو شعروسخن میں ان کی استادی مسلم البنوت ہے۔ اردو شعروادب کا کوئی مورخ مفتی صدرالدین سے دامن کشاں نہیں گزر سکتا۔

آزردہ کے جد اعلیٰ خواجہ بہارالدین خوارزمی فاروقی اکبر کے دور حکومت میں دلی آئے[۱] اور اس کے مصاحبوں میں شامل ہوگیے۔ ان کے خاندان کا پیشہ تجارت تھا لیکن آگے چل کے خاندان کے ایک بزرگ مولوی خیرالدین نے آبائی پیشہ چھوڑ کر علمی دنیا میں قدم رکھا۔ آزردہ کے والد کا نام لطف اللہ تھا۔ آزردہ ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ء میں دلی میں پیدا ہوئے، جب کہ دلی کی باگ ڈور اکبر شاہ ثانی کے ہاتھ میں تھی[۲]۔ ان کی تعلیم کی ابتدا ان کے والد ماجد کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ اس کے بعد شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، شاہ محمد اسحاق اور مولانا فضل امام خیرآبادی جیسے مسلم اساتذہ سے انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ ان کے دوستوں میں غالب، شیفتہ اور صہبائی اور شاگردوں میں سرسید احمد خاں اور مولوی کریم الدین کے نام قابل ذکر ہیں۔ مفتی صاحب کا انتقال ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء، پنج شنبہ کو چار بجے دن میں ہوا[۳]۔

---

[۱] معارف اعظم گڈھ ۱۹۴۷ء[۶] جلد ۶ ص ۵۹

[۲] عبدالرحمٰن پرواز، مفتی صدرالدین آزردہ ص ۱۳

[۳] اکمل الاخبار ۲۲ جولائی ۱۸۶۸۔ بحوالہ مفتی صدرالدین آزردہ ص ۹۶

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۱۸۲۷ء کے قریب انگریزوں نے اکبر شاہ ثانی کے مشورے کے بعد آزردہ کو دلی کا صدر امین اعلیٰ مقرر کیا، بعد میں ترقی کر کے صدر الصدور ہو گئے[1] ان کے اہم کارناموں میں سے مدرسہ دارالبقا کا قیام بھی ہے۔ یہ مدرسہ شاہ جہاں کے عہد میں قائم ہوا تھا۔ اس کی عمارت بعد میں شکستہ ہو گئی تھی اور تعلیم وتعلم کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا، آزردہ نے اسے از سرِ نو تعمیر کرایا اور درس وتدریس کا نظم دوبارہ قائم کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مفتی صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس جنگ میں مسلمانوں کے شامل ہونے کے لیے جامع مسجد دہلی سے جہاد کا جو فتویٰ شائع ہوا تھا اس تاریخی فتوے پر مفتی صاحب کے بھی دستخط تھے[2]

دلی کالج ہی سے ہماری زبان وادب میں مغربی علوم وفنون کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کالج نے ہماری زبان وثقافت کی ترقی میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کی فلاح وبہبود کے لیے ملک کے مایہ ناز علما وفضلا کو اس کالج میں ملازم رکھا۔ کالج کے قیام کے وقت کالج کمیٹی صرف چار ارکان پر مشتمل تھی۔ ۱۸۴۲ء میں جب اس کے ارکان میں اضافہ کیا گیا تو مفتی صدرالدین کو، جو اس وقت دلی کے صدر امین تھے اس کا رکن منتخب کیا گیا۔ آزردہ کالج کی فلاح وبہبود میں پیش پیش رہے۔ کالج کے طلبہ کی ہمت افزائی کے لئے دلی کے شرفا وامرا جو طور پر تمغے دیتے تھے۔ مفتی صاحب کا تمغا اردو میں بہترین مضمون لکھنے والے کو دیا جاتا تھا۔ "دہلی اردو اخبار" آزردہ کی دریا دلی اور قابلیت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> "ہم نہایت درست اپنی تحقیق سے لکھتے ہیں کہ حقیقت میں ہمارے صدر الصدور صاحب کی ذات مجمع الصفات بھی نہایت ارفع ہے، یکتائے روزگار ہے۔ اس حکومت وریاست وعظمت فضل اللہ دلی پر حسن اخلاق اور پاس منعت وقدر علمیت جو کہ نتیجہ کمال علم ہے اس زمانے میں بہت کم ہے۔ ہمارے ہندوستانی صاحبوں میں ایسا جامع کمالات مفقود پایا جاتا ہے"[3]

---

[1] انگریزوں کے عہد میں یہ عہدہ تنخواہ اور منصب کے لحاظ سے جج کے برابر ہوتا تھا۔

[2] عبدالرحمٰن پرواز، مفتی صدرالدین آزردہ ص ۲۰

[3] دہلی اردو اخبار، ۲۶ دسمبر ۱۸۵۲ء، حوالہ مفتی صدرالدین آزردہ ص ۲۶

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

دلی کالج کے انتظامی و تعلیمی امور میں مفتی صاحب کا بڑا دخل تھا مشرقی شعبے میں اساتذہ کی تقرری اور ان کی تنخواہ کے اضافے وغیرہ میں نہ صرف ان کی رائے لی جاتی تھی بلکہ ان کے عندیہ کو ترجیح دی جاتی تھی ۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ "نواب حامد علی خاں (متولی) نے مولوی جعفر علی کو سو روپیے ماہوار پر کالج میں ملازم رکھ لیا اور کوشش یہ کی کہ ان کو صدر مدرس مقرر کر دیا جائے ۔ مولانا مملوک العلی پندرہ سولہ برس سے کالج میں ملازم تھے، ان کی حق تلفی ہوتی تھی۔ کالج کے ارباب حل و عقد نے مفتی صدر الدین سے اس مسئلے میں رائے طلب کی ۔ انھوں نے مولانا مملوک العلی کے علم فضل کو سراہا اور ان کی سفارش کی [1] چناں چہ مولوی جعفر علی صدر مدرس نہیں بنائے گئے ۔

آزردہ کالج میں عربی و فارسی کے امتحانات بھی لیتے تھے ۔ جب ۱۸۴۴ء میں امتحانات ہوئے تو "مسعودی، تاریخ یمینی، قدوری، میر قطبی، حماسہ اور حسینی کے پرچے گورنمنٹ نے بھیجے اور سنی و شیعہ طلبہ کی اعلا جماعت کو دیے گیے، ان کے تحریری جواب مفتی صدر الدین نے معائینہ کیے ۔ ۔ ۔ فارسی جماعت کا امتحان بھی انھوں نے ہی لیا ۔" [2]

بہر حال آزردہ کی شخصیت اور ان کی کوششوں و کاوشوں سے دلی کالج نے بڑا عروج پایا ۔ ان کی ذات بابرکات کی سرپرستی نے کالج میں مشرقی زبان و ادب کی تعلیم و ترقی میں چاند لگا دیے ۔ دلی کالج کے سلسلے میں ان کی خدمات سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی ۔

---

[1] مفتی صدر الدین آزردہ ص ۲۷

[2] مولوی عبد الحق، مرحوم دہلی کالج ص ۴۵-۴۴

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

تیسرا باب

سائنٹفک سوسائٹی

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

سائنٹفک سوسائٹی

قیام کے محرکات اور اغراض و مقاصد

سلطنت مغلیہ کے زوال کا سلسلہ یوں تو اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد ہی شروع ہوگیا تھا، لیکن انیسویں صدی کے آتے آتے اس کی حالت چراغ سحری جیسی ہوچکی تھی جس کی ضیا پل پل اور لمحہ بہ لمحہ سمٹتی جاتی ہے۔ ارباب اقتدار خود غرضی اور مفاد پرستی کے شکار اور سازشوں اور خانہ جنگیوں میں مصروف تھے ان کی اس باہمی کشمکش کے نتیجے میں سیاسی و اقتصادی نظام کا شیرازہ روز بروز منتشر تر ہوتا جارہا تھا۔ عوام کی زندگی سے نہ صرف امن و سکون ختم ہوچکا تھا بلکہ تنگ دستی اور پس ماندگی کے سبب ان کے دل و دماغ ماؤف ہوچکے تھے اور فلاح و بہبود کی تمام راہیں ان کی نظر سے اوجھل ہوکر تاریکیوں میں گم ہوگئی تھیں۔ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کا دائرہ برابر وسیع اور اس کی گرفت مسلسل مضبوط ہوتی جاتی تھی۔ یہ حالات تھے جن میں ملک کے چند بہی خواہوں نے ۱۸۵۷ء میں پرچم حریت ہاتھ میں لے کر نعرۂ انقلاب بلند کیا۔ ملک کی آبرو اور آزادی کے یہ رکھوالے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر سر بہ کفن نکلے تھے، لیکن افسوس کہ دیس کے باسیوں نے ان جاں نثار وطن پرستوں کی کما حقہ معاونت نہ کی۔ چنانچہ انگریز اپنی منظم اور مستحکم فوجی طاقت اور سیاسی حکمت عملی کے بل بوتے پر انھیں پسپا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

۱۸۵۷ء کی یہ جنگ ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس جنگ کے بعد سلطنت مغلیہ کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا ہے۔ اس کے آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کرکے رنگون میں مقید کیا گیا جہاں بعد میں جیل ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ عوام میں سے ہزاروں

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

افراد بغاوت کے جرم میں تختۂ دار پر چڑھا دیے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستانیوں کو اشارے اور کنایوں میں بات کرنے پر موت کی سزا دی جاتی تھی۔ چونکہ انگریزوں نے غدر کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی تھی اس لیے وہ خاص طور پر ان کی چیرہ دستیوں کے شکار ہوئے۔ ان پر عرصۂ حیات اس حد تک تنگ ہوگیا تھا کہ بہت سے لوگ خود مسلمان کہتے ہوئے ہچکچانے لگے گویا بقول مولانا محمد قاسم نانوتوی "مسلمان ہونا ہی جرم ہوگیا تھا"[1]

غدر ختم ہوگیا تھا لیکن انگریزوں کے انتقامی جذبات کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی مسلمان نہ صرف ایک ایک کر کے سرکاری ملازمتوں سے نکالے جا رہے تھے بلکہ ان پر تعلیم کے دروازے بھی مسدود کیے جانے لگے تھے، حتٰی کہ مسلمان امراء و نوابین کے اوقاف کی آمدنیاں جو صرف مسلمانوں کی تعلیم کے لیے مخصوص تھیں، دوسرے کاموں میں صرف کی جانے لگی تھیں۔ فوجی اور سول محکموں میں جہاں مسلمانوں کا عمل و دخل بہت زیادہ تھا اب رفتہ رفتہ ان کی تعداد گھٹتی جارہی تھی۔ پنجاب کا سررشتہ تعلیم غدر سے پہلے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، غدر کے بعد وہاں سرکاری مدرسوں میں مسلمان مدرس نام کو نہ رہے اور ۱۸۶۶ء میں بنگال کے کمشنر نے ایک ایسا حکم جاری کیا جس کی رو سے مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے محروم کر دیا گیا۔[2] ڈاکٹر ہنٹر نے لکھا ہے کہ

"۱۸۶۹ء میں اسسٹنٹ انجینیروں کے تین درجوں میں ۱۴ ہندو اور مسلمان صفر۔ امیدواروں میں چار ہندو دو انگریز اور مسلمان صفر۔۔۔۔ وکالت کے لیے ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۸ء تک جن ہندوستانیوں کو لائسنس دیا گیا ان میں ۲۳۹ ہندو تھے اور ایک مسلمان"۔[3]

حکومت کی اس بے اعتنائی اور نظر اندازی کے باعث مسلمان ہر شعبۂ زندگی میں ناقدری اور بے اطمینانی کے ماحول سے دوچار تھے۔ جمیس اوکینلی نے کلکتہ ریویو میں لکھا تھا کہ

[1] بحوالہ دارالمصنفین اعظم گڈھ کی ادبی خدمات از ڈاکٹر خورشید نعمانی ص ۱۹

[2] بحوالہ علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز از نسیم قریشی ص ۱۴

[3] بحوالہ اسباب بغاوت ہند، مقدمہ از فوق کریمی ص ۶۹-۶۸

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

"ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کی بے اطمینانی بے بنیاد ہے۔ سالہا سال سے مسلمانوں کو نظر انداز کیا جارہا ہے یا انھیں ایسی رعایا سمجھا جارہا ہے جن کی اطاعت مشتبہ ہے۔ ان کی تعلیم کی طرف سے غفلت کی جارہی ہے۔ حتیٰ کہ ان کے اوقات کی آمدنیوں کو جو اسلامیہ کالجوں کے قیام کے لیے تھیں دوسرے کاموں میں صرف کیا جارہا ہے۔"[۱]

یہ تھے غدر کے طوفان کے تھپیڑے جو مسلمانوں ہی کی کشتی سے ٹکراتے تھے اور اسے زیر وزبر کر رہے تھے۔ یہ شکستہ کشتی اس پر آشوب طوفان میں ہچکولے کھا رہی تھی اور اسے کوئی ایسا ناخدا میسر نہیں تھا جو اسے نئی سمتوں اور نئے ساحلوں سے آشنا کرتا اور منزل مقصود تک پہنچاتا۔ اس ابتری کے احساس میں مبتلا حال اور مستقبل سے بے نیاز مسلمانوں کے لیے اپنے شاندار ماضی کے ماتم کے سوا کوئی اور کام باقی نہیں رہ گیا تھا۔ مسلمانوں کے برخلاف ہندوؤں میں متعدد ایسی جماعتیں معرض وجود میں آچکی تھیں جو ان کی علمی و معاشرتی اصلاح کے لیے سرگرم تھیں۔ اس ضمن میں راجا رام موہن رائے کی "برہمو سماج" اور دیانند سرسوتی کی "آریہ سماج" کی کوشش بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ حالات متقاضی تھے کہ مسلمانوں میں بھی کوئی ایسا رہنما پیدا ہو جو ان میں علمی و معاشرتی میدان میں مسابقت کا شوق اور ولولہ پیدا کرے، تاکہ وہ بدلے ہوئے حالات سے کماحقہٗ نبرد آزما اور عہدہ برآ ہو سکیں۔

ان دنوں سرسید کی شخصیت دوج کے چاند کی طرح نہیں رہ گئی تھی کہ کسی نے دیکھا اور کسی نے نہیں دیکھا، بلکہ اب وہ ہندوستانی افق پر چودھویں کے چاند کی شکل اختیار کر چکے تھے جس میں یہ اثر ہوتا ہے کہ سبھی کے دلوں کو رام کر لیتا ہے۔ سرسید کی مقناطیسی شخصیت سے ہندوستانی مسلمان آشنا ہونے لگے تھے اور ان کی آواز پر ان کے کان بھی کھڑے ہونے لگے تھے۔

سرسید بڑے دور اندیش اور زمانہ شناس تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ جب تک مسلمانوں میں تعلیم خصوصاً جدید تعلیم عام نہ ہوگی، وہ نہ تو زندگی کے اعلا مقاصد سے واقف ہو سکیں گے اور نہ ان کے اندر ملک اور معاشرے کے بدلے ہوئے تقاضوں کے مطابق تمام اہم مسائل کو حسن و خوبی حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے گی۔ اس لیے انھوں نے مغربی علوم و فنون کی اشاعت کو انگریزی تعلیم سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم قرار دیا۔ اس زمانے میں مسلمان انگریزی پڑھنا گناہ

---

[۱] بحوالہ علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز از نسیم قریشی ص۔ ۳۵-۳۴

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کبیرہ سمجھتے ہیں اور دوسری قوموں کے لئے بھی اس میں کوئی خاص کشش نہ تھی جس کی وجہ سے وہ اس کی طرف راغب ہوتیں کیوں کہ تمام عدالتوں میں اردو زبان کا رواج تھا اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ جو اس وقت کسی ہندوستانی کو مل سکتا تھا اس کے لئے مشرقی زبانوں کی تعلیم کافی تھی۔ سرسید مغربی علوم و فنون کی تعلیم کی اشاعت اس لئے بھی ضروری سمجھتے تھے کہ اس سے حاکم و محکوم یعنی انگریزوں اور ہندوستانیوں کے نظریات و خیالات میں اتفاق و اتحاد اور یگانگت و قربت پیدا ہوگی جس سے نہ صرف انگریزوں کو فائدہ پہنچے گا بلکہ ہمارے وطن کے بھائی بھی مستفیض ہوں گے ان کا خیال تھا کہ انگریز جیسی طاقت ور قوم سے براہ راست ٹکر لینا ہوا میں ہاتھ پیر مارنے کے مترادف ہوگا۔ انہیں انہی کے ہتھیاروں سے شکست دی جا سکتی ہے، جن سے لیس ہو کر ہندوستان آئے تھے۔ ۱۸۶۳ء میں جب کہ وہ غازی پور میں صدر امین تھے، انھوں نے اپنی ایک تحریر میں جو "التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی لکھا تھا کہ

"دنیا کے اس دور میں جس میں ہم اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں ملک کے دور کا وہ زمانہ ہے جب ہم اس پر بہ لحاظ مضمون تعلیم کے لحاظ کرتے ہیں تو اس کو چمکتا ہوا نہیں پاتے۔ ایسی بدبخت حالت کے علاج کی راہ نکالنی اور ہمارے ہموطنوں ہندوؤں اور مسلم قوموں میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لئے ایک سوسائٹی کا مقرر ہونا تجویز ہوتا ہے جس کا مقصد یہ ہوگا، اول تلاش کرنا اور چھاپنا ہمارے قدیم مصنفوں کی بہت عمدہ کتابوں کا، دوسرے انگریزی زبان سے اور اور زبانوں سے ایسی کتابوں کا ترجمہ کرنا اور چھاپنا جو سب کے لئے مفید ہوں" [۱]

اس کے بعد عملی طور پر بھی انھوں نے لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور سوسائٹی

---

[۱] بحوالہ سرسید کی صحافت از ڈاکٹر اصغر عباس، ص ۵۲

کے قیام کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ اس کے اغراض و مقاصد سے روشناس کرانے اور لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی غرض سے سرسید نے کلکتہ کا سفر بھی کیا اور وہاں ۴ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو "مجلس مذاکرۂ علمیہ" میں تقریر کی[1] کلکتہ کی واپسی کے دوران جن مقامات پر ان کا قیام ہوا انھوں نے وہاں کے لوگوں سے سوسائٹی کا ذکر کیا اور اس کے قیام کے لیئے ان کی مدد طلب کی۔

کلکتہ سے واپسی کے تین چار مہینے بعد ۹ جنوری ۱۸۶۴ء کو جب کہ سرسید غازی پور ہی میں تھے انہوں نے اپنے مکان پر ایک جلسہ منعقد کیا[2] اس جلسے میں ہندوستانیوں اور انگریزوں نے شرکت کی۔ اس کا مقصد سوسائٹی کے قیام کو روبہ عمل لانا اور اس کے اغراض و مقاصد بیان کرنا تھا۔ اس جلسے میں سرسید اور ان کے رفقائے کار کے علاوہ غازی پور کے پولس سپرنٹنڈنٹ لفٹننٹ کرنل گرہیم نے بھی جو سرسید کے دوستوں میں تھے سوسائٹی کے قیام کی تائید میں تقریر کی تھی۔ سرسید نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ جدید علوم کی اشاعت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں۔

اس جلسے میں سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا اور حاضرین جلسہ کے مشورے سے اسے "سائنٹیفک سوسائٹی" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ سوسائٹی کا دستور بھی اسی دن مرتب ہوا، جس کے مطابق اس کے دو اہم مقاصد قرار پائے۔

(۱) ان علوم و فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان یا یورپ کی کسی زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے، ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہیں۔

(۲) ایشیا کے قدیم مصنفوں کی کمیاب اور نفیس کتابیں تلاش کر کر کے بہم پہنچانا اور شائع کرنا۔

---

[1] حالی، حیات جاوید حصہ اول ص ۱۲۱

[2] مولوی عبدالحق، مطالعہ سرسید احمد خاں ص ۱۶۷

[3] دستور سینٹیفک سوسیٹی غازی پور ۱۸۶۴ء بحوالہ سرسید کی صحافت ص ۵۳ [illegible]

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

زمانۂ قیام کی تاریخ

سائنٹفک سوسائٹی کی داغ بیل ۹ جنوری ۱۸۶۴ء کو پڑی۔ دور دراز صوبوں کے معزز ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس کی رکنیت قبول کی۔ اس کے پہلے ہی جلسے میں ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی جو حسب ذیل ارکان پر مشتمل تھی۔

(۱) پیٹرن (نگراں)۔ ڈیوک آف ارگل

(۲) وائس پیٹرن۔ ڈرمنڈ لفٹنٹ گورنر شمال مغرب اور میکلوڈ لفٹنٹ گورنر پنجاب

(۳) سکریٹری۔ سرسید احمد خاں آنریری سکریٹری اور سکریٹری گراہم۔[1]

سوسائٹی کی علی گڈھ منتقلی

۱۸۶۴ء ہی میں سرسید کا تبادلہ علی گڈھ ہوگیا۔ چنانچہ سوسائٹی کے دستور کے مطابق سرسید سوسائٹی کا سارا سامان اور عملہ بھی اپنے ساتھ علی گڈھ لے آئے تھے[2]

جب سوسائٹی علی گڈھ منتقل ہوئی تو مسٹر ولیم جنکسن جو اس وقت علی گڈھ میں جج تھے، اس کے پریسیڈنٹ مقرر ہوئے ان کے دور صدارت میں سوسائٹی نے کافی ترقی کی اور اس کے ارکان میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اسی زمانے میں سوسائٹی کا دستور از سرنو مرتب کیا گیا، جس کی ایک دفعہ کے مطابق یہ طے پایا کہ سوسائٹی کی طرف سے ایک اخبار نکالا جائے گا اور ایک عجائب خانہ کی بنیاد ڈالی جائے گی جس میں جہاں تک ممکن ہوگا ہر قسم کی

---

[1] بعد میں سرسید سکریٹری منتخب ہوئے۔

[2] سوسائٹی کی دفعہ ۲ میں مرقوم تھا مستقل مقام سوسیٹی کا انجام تو الہ آباد ہوگا مگر جب تک کہ سوسیٹی بخوبی نہ چل نکلے اسوقت تک ان مقاموں میں ہوگا جہاں جہاں سید احمد خاں صدر الصدور کا قیام ہوتا رہے گا۔ ([illegible]ید کی صحافت ص ۲۵۲)

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

عجیب عجیب چیزیں جمع کی جائیں گی اور ان چیزوں کے حالات وقتاً فوقتاً مشتہر کیے جائیں گے
اس ترمیم شدہ دستور میں ارکان کے لئے دو روپیہ فیس بھی مقرر کی گئی تھی[۱]

کتابوں کی تالیف اور ترجمے کے منصوبے :

سوسائٹی کے قیام کا اصل مقصد جدید علوم و فنون کی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کرنا تھا۔ یکم فروری ۱۸۶۴ء کے جلسے میں سرسید رولن کی کتاب تاریخ مصر اور مل کی کتاب پولیٹکل اکونومی کے ترجمے کی تجویز منظور کرا چکے تھے[۲] ۱۲ مارچ ۱۸۶۴ء تک تاریخ مصر کا ترجمہ ہو چکا تھا[۳] ۶ جون ۱۸۶۴ء کے جلسے میں سوسائٹی کی "کونسل مشیر" کے ارکان کی کثرت رائے سے بالترتیب مندرجہ ذیل کتابوں کا ترجمہ شروع کرنے کی تجویز منظور ہوئی۔

(۱) ایک مختصر رسالہ بیان میں یورپ کے علوم و فنون کے جو مانڈ صاحب کے خزانہ علم میں سے ہے، تالیف کیا جائے گا۔

(۲) پہلا، دوسرا، تیسرا اور چوتھا باب آدم اسمتھ صاحب کی کتاب کا جو قوموں کی ترقی دولت کے بیان میں ہے

(۳) تاریخ ہندوستان مولفہ الفنسٹن صاحب

(۴) رسالہ بھاپ کی کلوں کے بیان میں مصنفہ ڈبلیو۔ جے۔ ایم کورین کا ہین صاحب

(۵) تاریخ جدید ہندوستانی مولفہ مارشمین صاحب

(۶) ایک اچھا بڑا نسخہ جغرافیہ کا جو کئی انگریزی جغرافیوں سے تالیف کیا جائے گا۔

(۷) رسالہ یورپ کے آلات کاشتکاری کے بیان میں

---

[۱] عبدالحق، مطالعہ سرسید احمد خاں ص ۱۷۰ - ۱۷۱
[۲] روئداد سائنٹیفک سوسائٹی نمبر ۷۔ بحوالہ سرسید کی صحافت ۵۷
[۳] ایضاً نمبر ۲ ایضاً

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

(۸) تاریخ چین زبان فارسی ترجمہ محمّد زماں عرف فرنگی خاں، اصل انگریزی مصنفہ ایک پادری کے، جس میں بیان ہے چین کی صورت اور پیداواریوں اور علوم وفنون اور مذہب اور رسومات سلطنت مورخہ چھٹی صدی

(۹) ایک کتاب بطور فہرست کے جس میں عمدہ عمدہ مشرقی کتابوں کے نام، تاریخ تصنیف اور نام زبان جس میں وہ کتاب ہو، درج ہوں گے

(۱۰) رسالہ اثر کہربائی مصنفہ بیکول

(۱۱) تاریخ ایران مصنفہ سرجان مالکم

(۱۲) رسالہ جیالوجی مصنفہ جان فلپس صاحب

(۱۳) تاریخ بھوپال مصنفہ جان مالکم

(۱۴) مسلمانوں کے عہد کی تاریخ اسپین کانڈ، شیخ ابی العباس المقری اور رکالی کٹ کی کتابوں تاریخ عربوں کا اسپین، اسپین کے عربوں کی تاریخ اور تاریخ اسپین سے، تالیف کی جائے گی

(۱۵) رسالہ علم فلاحت یعنی کشتکاری مصنفہ لابئی صاحب

(۱۶) تاریخ اسکندر اعظم مصنفہ ایرین صاحب

(۱۷) مغلیہ دربار کا بیان مصنفہ برنیر صاحب

(۱۸) رسالہ علم طبیعات جو پسندیدہ اور آزمودہ ہے مصنفہ جے. گریفن صاحب

(۱۹) کلک صاحب کے آخری نسخہ چوتھی اور پانچویں فصل

(۲۰) واٹلی صاحب کی کتاب منطق

(۲۱) متعدد رسالہ حکمت قدرت، ویل صاحب کے سلسلے میں سے

(۲۲) جنرل کننگھم صاحب کی رپورٹ ان تلاشوں کی جو انھوں نے صوبہ بہار اور گورکھپور میں کیں

(۲۳) رسالہ علم ہیئت یا کئی دنیاؤں کا ثبوت، مصنفہ ویول صاحب

(۲۴) رسالہ پہاڑوں کی شہادت مصنفہ ملر صاحب

(۲۵) بکل صاحب کی دوسری جلد کا چھٹا باب، جس میں نتیجے نکالنے کی حکمت کی عظمت کا بیان ہے۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

(۲۶) میکس میولر صاحب کی کتاب دربارِ علم سنسکرت

(۲۷) مواعظ سکندر مصنفہ ارسطو

(۲۸) پولیٹیکل اکونومی یعنی انتظام مدن مصنفہ سپنسر صاحب [1]

علاوہ بریں مولوی عبد الغفور نسّاخ نے جو محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ کے سکریٹری اور سائنٹفک سوسائٹی کے رکن تھے ۸ جنوری ۱۸۶۵ء کو سوسائٹی کے نام لکھے ہوئے ایک خط میں اٹھارہ کتابوں کے تراجم شائع کرنے کی تجویز پیش کی تھی [2]

سوسائٹی کیلئے عمارت کی تجویز اور تعمیر:

چونکہ سوسائٹی کا کوئی نجی مکان نہیں تھا اس لئے گریہم ہی کے زمانے میں سوسائٹی کے ایک جلسے میں اس کے لئے ایک مستقل عمارت تعمیر کرنے کی حسب ذیل تجویز منظور کی گئی

(۱) "اول یہ کہ مکان وسیع واسطے اجلاس سوسائٹی بنایا جائے کہ جس میں سوسائٹی کا اجلاس ہوا کرے اور تمام کتابیں اور اسباب متعلق سوسائٹی کا بہ حفاظت اور آراستگی کے ساتھ اس میں رکھا جائے۔

(۲) دوسرے یہ کہ سوسائٹی کے متعلق ایک عام ذخیرہ ہر قسم کے علوم و فنون کی کتابوں انگریزی اور فارسی اور عربی اور اردو اور سنسکرت کا کیا قلمی کیا چھاپا (ہوا) جمع کرنا چاہئے اور یہ کتب خانہ بطور عام کتب خانہ کے رہے گا۔ اور ہر شخص کو بموجب ان قواعد کے جو کونسل کارپرداز مقرر کرے گی، ان کتابوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل رہے گا۔

---

[1] اصغر عباس، سرسید کی صحافت ص ۵۶ - ۵۵

[2] ان کتابوں کی فہرست کے لئے ملاحظہ ہو ضمیمہ ج

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

(۳) تیسرے یہ کہ جمیع قسم کے علوم و فنون کے آلات جو یورپ میں مروج
ہیں اور جن کے ذریعہ سے طالب علموں کو ہر قسم کے علوم و فنون کے
تجربے دکھائے جاتے ہیں، سوسائٹی کو جمع کرنا چاہئیں۔ کیونکہ ابتدا سے
سوسائٹی کی خواہش ہے کہ ہر مہینہ میں دو تین دفعہ بذریعہ لکچروں
کے اور دکھانے تجربوں کے ہندوستانیوں کو یورپ کے علوم و فنون
کی نئی تحقیقات بخوبی سمجھائی جاویں۔"[1]

چنانچہ ۳ر نومبر ۱۸۶۴ء کو صوبہ شمال مغرب کے لفٹنٹ گورنر ڈرمنڈ کے ہاتھوں
مجوزہ عمارت کی بنیاد رکھی گئی اور سرسید کی نگرانی میں اس کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔
ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں نے فراخ دلی کے ساتھ چندے دیے اور سال ڈیڑھ
سال کے اندر یہ عمارت بن کر تیار ہو گئی۔ عمارت کی تعمیر، آرایش و زیبایش، کتب خانہ اور
جدید قسم کے آلات پر تقریباً بتیس ۳۲ ہزار روپئے صرف ہوئے تھے۔

عمارت کا جشن افتتاح:

عمارت تیار ہونے کے بعد ۱۴ر فروری ۱۸۶۶ء کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ اس
کا جشن افتتاح منایا گیا[2] مسٹر ولیس کمشنر قسمت نے اس کا افتتاح کیا۔ موصوف نے اپنی
افتتاحی تقریر میں سرسید کے کاموں کی بڑی تعریف کی۔ حاضرین جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے
انھوں نے کہا تھا کہ۔

"سرسید احمد خاں کے اس کام کی عظمت میں مبالغہ کرنا فضول
ہے تم صاحبوں کو معلوم ہے کہ یہ انہی کا کام ہے اور وہی
اس جلسے کے بڑی ترقی دینے والے ہیں۔ اور اس عمدہ عمارت
کے جس کے کھولنے کے لئے ہم سب جمع ہوئے ہیں، وہی بانی

---

[1] روئداد سائنٹفک سوسیٹی نمبر ۳، بحوالہ سرسید کی صحافت ص ۵۸
[2] اصغر عباس، سرسید کی صحافت ص ۵۸

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ہیں ..... آخیر کلام میرا یہ ہے کہ سید احمد نے جو محبت لوگوں کے ساتھ ظاہر کی۔ ہے سب کے دلوں پر اس کا اثر مزد رہو کا خدا کرے یہ انسٹی ٹیوٹ اس بات کا سبب ہوئے، ہم سب ہندوستانی اور انگریز ایسے بھلے کاموں میں دل سے شریک ہوا کریں اور یہی سید احمد خاں کی بڑی خواہش ہے۔ پس آؤ ہم سب ان کی مدد کریں اور ان کا شکریہ ادا کریں۔ اے خدا! اس انسٹی ٹیوٹ کو سرسبز کر۔" [۱]

کتب خانے کی تنظیم :

۲۸ جنوری ۱۸۶۵ء کو سوسائٹی کے کتب خانے کا قیام عمل میں آیا، جس کے لئے سب سے پہلے سرسید نے چھ سو روپئے کی کتابیں پیش کیں۔ بعد ازاں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، میر اشرف علی، کیمسن صاحب، عبداللہ عبیدی، منشی نول کشور، ڈیم ناسوس، عبدالرحمٰن، کپتان فلر اور مسٹر گریہم نے اپنے عطیات سے اس علمی ذخیرے میں اضافہ کیا۔ ۱۸۶۶ء کے لگ بھگ انگریزی کے اٹھارہ اخبارات اور میگزین اور اردو، فارسی عربی اور سنسکرت کے ۲۶ اخبار ہند اور بیرون ہند سے سوسائٹی کے کتب خانے میں آتے تھے۔ [۲]

کتابوں کی تصنیف کیلئے گورنمنٹ سے امداد کی اپیل :

۳۰ ستمبر ۱۸۶۵ء کو سرسید نے گورنمنٹ صوبہ شمال مغربی کو ایک درخواست دی جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ سوسائٹی اس صوبے کے کاشتکاروں کیلئے کاشتکاری سے متعلق مفید کتابیں تصنیف کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اگر گورنمنٹ کچھ امداد کرے تو

---

[۱] حیات جاوید حصہ اوّل ص ۱۲۵

[۲] ایضاً ص ۱۲۵ [۳] ایضاً ص ۱۲۶

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کا وعدہ کرے تو اس کام کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اگست ۱۸۶۶ء میں گورنمنٹ نے سوسائٹی سے پانچ سو روپے سالانہ کی کتابیں خرید نا منظور کیا۔ لیکن کام کی وسعت اور دقت طلبی کی وجہ سے اس موضوع پر کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوسکی۔ حالانکہ اس نوعیت کی کتابیں لکھنے کی ذمہ داری خود سرسید نے لی تھی۔

سوسائٹی کے جلسوں میں لکچروں کا سلسلہ:

سوسائٹی کا ماہانہ جلسہ اس کی عمارت میں ہوا کرتا تھا۔ ان جلسوں میں مختلف علمی موضوعات پر مباحثوں کے علاوہ تقریریں بھی ہوا کرتی تھیں۔ سب سے پہلے سرسید نے کچہری کے مختاروں کے لئے قانون پر لکچر دینا شروع کیا تھا جس کے لئے برائے نام فیس بھی لی جاتی تھی اس رقم کو سوسائٹی کے فنڈ میں جمع کر دیا جاتا تھا ڈاکٹر کلکی ہر مہینے نیچرل سائنس پر لکچر دیتے تھے اور سوسائٹی کے جمع کردہ آلات کی مدد سے حاضرین کو practically بھی کر کے دکھاتے تھے۔ ۲۸ جون ۱۸۶۷ء سے علی گڈھ انگریزی اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے علم طبیعات پر تقریر شروع کی تھی۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً تاریخ جغرافیہ اور انگریزوں اور ہندوستانیوں کے رسم و رواج اور تہذیب و تمدن، تعلیم نسواں اور دیگر اخلاقی و علمی موضوعات پر بھی لکچر ہوتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں سوسائٹی پانچ سو روپے ماہوار خرچ کرتی تھی۔ اس رقم میں سے دو سو پینتالیس روپئے مطبع کے عملے پر اور ۲۱ روپئے دوسری ضروریات اور مکان کے انتظام پر صرف ہوتے تھے۔ [1]

سوسائٹی کی امداد

سرسید کا عطیہ:

سوسائٹی کا اصل مقصد جدید علوم و فنون کی کتابوں کے اردو ترجمے شائع کرنا تھا۔ سوسائٹی کے دستور میں بھی مرقوم تھا کہ سوسائٹی اپنا ایک "آرگن" اخبار یا جریدے

---

[1] سوسائٹی اخبار ۱۳ دسمبر ۱۸۶۷ء، بحوالہ حیات جاوید ص ۱۲۵

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کی شکل میں شائع کرے گی۔ ان سب کاموں کے لئے ایک پریس کی موجودگی اشد ضروری تھی، لیکن سوسائٹی کا بجٹ اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ پریس خریدا جائے چنانچہ سرسید احمد خاں نے اپنا ذاتی پریس، جسے انھوں نے "تبیین الکلام" کی طباعت کے۔ لئے آٹھ ہزار روپے میں خریدا تھا اور جس میں اب تک سوسائٹی کی روداد اور کاغذات چھپتے رہے تھے، بطور عطیہ سوسائٹی کے حوالے کر دیا۔ سوسائٹی کے جس ماہانہ جلسے میں انھوں نے اپنا پریس دینے کا وعدہ کیا تھا، اس کے چیرمین جارج ہنری لارنس تھے۔ سرسید کی اس دریادلی اور فیاضی پر انہوں نے کہا تھا کہ " اگرچہ سوسائٹی سید احمد خاں کی فیاضی کی پہلے سے ہی مقروض ہے مگر اب اس احسان کو اس عالی شان عطیہ نے اور زیادہ کر دیا[1] نواب سکندر جہاں بیگم صاحبہ فرماں روائے بھوپال نے جب یہ سنا کہ احمد خاں نے اپنے ہم وطنوں کی فلاح وبہبود اور خیر سگالی کے لئے ایک انجمن قائم کی ہے تو انھوں نے جون ۱۸۶۶ء میں انہیں ہیرے کی ایک انگوٹھی اور ایک ہزار روپئے بطور اظہار خوشنودی مرحمت فرمائے۔ سرسید نے ایک جلسۂ عام میں یہ بیش بہا انگوٹھی سوسائٹی کو وقف کر دی

گورنمنٹ کی امداد:

گورنمنٹ نے سوسائٹی کی امداد کے لئے پانچ سو روپئے سالانہ کی کتابیں خریدنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ تین ایکڑ تین روڈ اور تیس پول زمین تعمیر مکان کے لئے اور ایک باغ علم فلاحت کی ترقی، تجربے اور امتحان کے لئے سوسائٹی کو تفویض کیا تھا۔

نوابین اور مہاراجوں کے عطیات:

ہندوستان کے فیاض اور مخیر نوابوں اور مہاراجوں نے بھی اپنی بساط کے مطابق گراں قدر عطیات سے سوسائٹی کی اعانت کی اس ضمن میں مندرجہ ذیل حضرات کے نام

---

[1] بحوالہ حیات جاوید ص ۱۲۵

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

بطور خاص قابل ذکر ہیں

(۱) مہاراجہ جودھ پور	سو روپئے سالانہ
(۲) مہاراجہ کپور تھلہ	پچاس روپئے سالانہ
(۳) مہاراجہ جے پور	" " "
(۴) نواب رام پور	سو روپئے "

فرماں روائے رام پور نواب کلب علی خاں نے سالانہ عطیہ کے علاوہ بارہ سو روپئے کی ایک نقرئی کرسی بھی عطا کی مسٹر ڈریمنڈ لفٹنٹ گورنر پنجاب مسٹر میکلوڈ نے چندے دیئے مہاراجہ الور اور مہاراجا اندور نے بھی مدد کی اور نواب عنایت اللہ خاں رئیس بھیکم پور نے خاص طور سے تعمیر چاہ کے لئے دو سو روپئے عنایت فرمائے۔ اس طرح سالانہ چندے اور اخبار کی قیمت سے سوسائٹی کی سالانہ آمدنی دس ہزار آٹھ سو پچاس روپئے تک پہنچ گئی تھی[1]

سوسائٹی کیطرف سے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا قیام

۱۰ مئی ۱۸۶۶ء کو سوسائٹی کے ماہانہ جلسے میں سرسید نے ہندوستانیوں کی بھلائی کے لئے ایک اور تجویز پیش کی۔ اس جلسے میں علی گڈھ کے متعدد معزز ہندوستانی اور چند یورپین موجود تھے۔ سرسید نے اپنی تقریر میں کہا تھا۔

> ہندوستانیوں کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کیلئے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری میں بڑی دقت ہندوستان کو یہ تھی کہ اس کے تقریباً تمام معاملات صرف گورنمنٹ اور ڈائرکٹرز تک پہنچتے تھے اور پارلیمنٹ سے بہت کم ہی تصفیہ پاتے تھے، مگر اب حکومت ہندوستان کی ملکہ معظمہ نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ اور اب ہندوستان کے

---

[1] مولوی عبدالحق، مطالعہ سرسید احمد خاں ص ۱۷۵

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

امورات کو زیادہ تر پارلیمنٹ سے تعلق رہے گا۔ پس اس غرض کے لئے کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہمارے خیالات اور معلومات سے بخوبی واقفیت حاصل کریں، ہم کو ایسی تدبیر کرنی چاہئے جس سے ہم اپنے صحیح حالات اور مناسب خواہشوں سے ان کو مطلع کر سکیں تمام اضلاع شمال مغرب کی طرف سے ایک ایشوسی ایشن اپنے ملک میں قائم کریں اور اس کے ذریعہ اپنے تمام مطالبات اور مقاصد گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں[1]

سرسید کی اس تجویز کو سبھی لوگوں نے پسند کیا اور اسی جلسے میں "علی گڈھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کی داغ بیل پڑی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس رکنیت قبول کی۔ راجہ جے کشن داس اس کے سکریٹری اور سرسید آنریری سکریٹری قرار پائے[2] اس ایسوسی ایشن نے ہندوستانیوں کے حق میں بڑے مفید کام انجام دیے، لیکن سرسید کے بنارس کو تبادلہ کے بعد اس کا خاتمہ ہو گیا۔

سوسائٹی کی طرف سے اخبار کا اجرا:

۱۴ فروری ۱۸۶۶ء کو سوسائٹی کے جلسے میں ایک اخبار نکالنے کی تجویز منظور ہوئی۔ ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء کو اس اخبار کا پہلا شمارہ سید احمد خاں پرائیوٹ پریس میں چھپ کر باہتمام محمد یار خاں شائع ہوا[3] شروع میں اس کا نام "اخبار سائنٹیفک سوسیٹی علی گڈھ" رکھا گیا تھا اور اس کے سرورق پر انگریزی اور اردو کی حسب ذیل عبارت لکھی رہتی تھی۔

---

[1] بحوالہ حیات جاوید حصہ اوّل ص ۱۲۷ - ۱۲۶

[2] مشتاق حسین، مکاتیب سرسید احمد خاں ص ۱۴

[3] عابد رضا بیدار، اردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار ص ۷

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

"LIBERTY OF THE PRESS IS A PROMINENT DUTY OF THE GOVERNMENT AND A NATURAL RIGHT OF THE SUBJECTS."

"آزادی چھاپہ خانہ کی ہے ایک بڑا فرض گورنمنٹ کا اور ایک اصل اور جبلی حق رعیت کا" [1]
لیکن جولائی ۱۸۷۰ء میں اس کا نام بدل کر "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" مع پرد گرس" کر دیا گیا۔
جنوری ۱۸۹۰ء میں "مع پردگرس" کے الفاظ خارج کر دیے گئے اور یہ اخبار صرف "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے موسوم ہوا۔ شروع میں یہ اخبار ہفتے میں ایک بار جہارشنبہ کو نکلتا تھا۔ بعد میں اسے سہ روزہ کر دیا گیا۔ بعض لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں کہ یہ اخبار صرف سرسید کی زندگی تک نکلتا رہا۔ جنوری ۱۸۹۷ میں اسے اور "تہذیب الاخلاق" کو ملا کر شائع کیا جانے لگا تھا اور اس مناسبت سے اس کا نام "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ معہ تہذیب الاخلاق" رکھ دیا گیا تھا جو جنوری ۱۹۰۱ کے بعد تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا لیکن جب وقار الملک نے ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے آنریری سکریٹری کا عہدہ سنبھالا تو وہ گزٹ کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ اخبار ان کی ادارت میں ہفتہ وار شائع ہونے لگا [2] اس طرح سے بعض لوگوں کا یہ خیال بھی حقیقت پر مبنی نہیں کہ جب تک یہ اخبار جاری رہا سرسید ہی اس کے ایڈیٹر رہے۔ بالکل ابتدائی زمانے میں اس کی ادارت کے فرائض منشی محمد یار خاں کے سپرد تھے اور منشی چھکن لال انگریزی اخبار سے ترجمہ کرتے تھے [3] چند مہینے بعد ادارت کی ذمہ داری سرسید نے اپنے ہاتھ میں لے لی' بعد ازاں اکتوبر ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۷ء تک مولوی اسمٰعیل خاں اس کے مدیر رہے [4] ان کے بعد ادارت کی

---

[1] ایضاً
[2] ڈاکٹر منظر عباس' وحید الدین سلیم حیات اور ادبی خدمات ص ۱۸۵
[3] مولوی عبدالحق' مطالعہ سرسید احمد خاں ص ۱۷۴
[4] مشتاق حسین' مکاتیب سرسید احمد خاں ص ۵۴

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ذمہ داریاں دوبارہ سرسید کے سپرد ہوئیں جنھیں وہ اپنی زندگی کے آخری ایام تک انجام دیتے رہے۔ اس اخبار میں اداریے کے علاوہ بیشتر مضامین بھی سرسید ہی کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔

اس اخبار کے ذریعے ہندوستانیوں کو نئی نئی اطلاعات فراہم کی جاتی تھیں اور جدید ایجادات سے متعلق مفید معلومات بہم پہنچائی جاتی تھیں۔ سیاسی امور میں اسی اخبار نے گورنمنٹ کے نزدیک بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ دوسری خصوصیت جو اسے دوسرے اخباروں سے ممتاز کرتی ہے یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور دوسرا اردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین انگریزی اور اردو میں الگ الگ بھی چھاپے جاتے تھے۔ چنانچہ انگریزی داں اور اردو داں طبقے یکساں طور پر اس سے مستفیض ہوتے تھے۔ مولانا حالی نے اس اخبار کے مقاصد اور اس کی خصوصیت پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے ان کے الفاظ میں

"اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات و معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولٹکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔ اس کی ابتدائی جلدیں دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کر کے دونوں قوموں کو ملانا چاہتا تھا۔"[1]

مولانا آگے چل کر مزید تحریر فرماتے ہیں کہ

"..... اس نے اپنی طرز تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہم عصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقہ یا کسی خاص شخص کی دلآزاری روا نہیں

---

[1] حیات جاوید حصہ اوّل ص ۱۲۹

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

رکھی۔ اس نے اپنے گاہکوں کو خوش کرنے کیلئے، جو ہمیشہ نوک جھوک اور چھیڑ چھاڑ سے خوش ہوتے ہیں سنجیدگی اور متانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس نے ہندوستان کی کسی قوم کو نسبت دوستی اور خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا۔ کبھی کسی غیر قوم کے عہدہ دار کی ترقی سے ناراضگی یا خوشی ظاہر نہیں کی۔ کبھی کسی ہندو یا مسلمان ریاست یا اس کے اہل کاروں کے خلاف زہر نہیں اگلا۔ ہندؤں اور مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے ہمیشہ بے تعلق رہا اور اگر کبھی کچھ بولا تو دونوں کو صلح و آشتی کی نصیحت کی۔[1]

انھی خصوصیات کی بنیاد پر "Pillars of The Indian Empire" کے مصنف نے لکھا ہے کہ "علی گڈھ گزٹ"... شمالی ہندوستان میں سب سے عمدہ اخبار ہے۔[2]

راجہ جے کشن داس: سوسائٹی کے نگران اور سکریٹری:

۱۵ر اگست ۱۸۶۷ء کو سرسید اسسٹنٹ جج کے عہدے پر ترقی پاکر بنارس چلے گئے جانے وقت انھوں نے سوسائٹی کی ساری ذمہ داری راجہ جے کشن داس ڈپٹی کلکٹر علی گڈھ کو سونپ دی۔ موصوف نے بڑی تندہی اور لگن سے سوسائٹی کا کام سرانجام دیا۔ اور سوسائٹی کی عمارت کا جو حصہ زیر تعمیر تھا، اسے ابھی پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ خاص طور پر کتابوں کے ترجمے میں انھوں نے کافی دلچسپی لی۔ رسالہ علم برقی، تاریخ ایران اور اصول سیاست مدن کی طباعت کا کام ان ہی کے زمانۂ نظامت میں انجام پایا۔ موصوف نے ترجموں کے علاوہ مستقل تصانیف کی اشاعت پر بھی توجہ مبذول فرمائی اس سلسلے میں انھوں نے ملک کے مختلف مصنفین کی خدمات حاصل کیں۔ اور ابتدائی

---

[1] ایضاً ص ۱۳۱ [2] بحوالہ ایضاً ص ۱۳۱

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

اوراعلیٰ درجات کی نصابی مزوریات پوری کرنے کیلئے مندرجہ ذیل موضوعات پر کتابوں کی تیاری کا ایک خاکہ مرتب کیا۔

(۱) فقرہ جات اردو۔ یہ آسان اور چھوٹے محاوروں کا مجموعہ ہوگا

(۲) صرف اردو

(۳) شرح صرف اردو (مع مثالوں کے)

(۴) نحو اردو

(۵) شرح نحو اردو

(۶) صرف فارسی (اردو میں)

(۷) شرح صرف فارسی

(۸) فقرہ جات فارسی۔ مجموعہ ایسے فقروں کا جو اردو میں مستعمل ہیں

(۹) شرح فقرہ جات فارسی

(۱۰) نحو فارسی و اردو

(۱۱) نظم اردو۔ قدیم شعرا کے کلام کا انتخاب

(۱۲) شرح نظم اردو

(۱۳) نظم فارسی و اردو۔ آسان فارسی و اردو اشعار کا انتخاب

(۱۴) عروض (اردو میں)

(۱۵) خالص علم زبان اردو۔ اس کے چار حصے ہوں گے (۱) اخلاق (۲) طبیعات (۳) علم انتظام مدن اور (۴) مضامین کا انتخاب

(۱۶) فن تصنیف۔ تصنیف کے قواعد اور مثالیں درج ہوں گی۔

(۱۷) عربی منطق کے قواعد (اردو میں)

(۱۸) سنسکرت منطق کے قواعد " "

(۱۹) انگریزی منطق کے قواعد " "

(۲۰) تاریخ یمینی

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

(۲۱) تاریخ خواجہ ابوالفضل بیہقی

(۲۲) تاریخ المآثر

(۲۳) طبقات ناصری

(۲۴) تاریخ فیروز شاہی

(۲۵) تاریخ تیمور اور تاریخ ابن خلدون کا انتخاب

کتابوں کی تالیف و اشاعت کے اس منصوبے میں راجہ صاحب کی غیرمعمولی دلچسپی کے باوجود ان میں سے کوئی کتاب مرتب اور شائع نہیں ہوسکی اور اس سے قبل تیار شدہ فہرستوں میں بھی پندرہ کتابوں کے علاوہ جن کے نام آخیر میں دیے گئے ہیں، باقی کتابوں کی تالیف اور ترجمے کا کام مکمل نہیں ہوا۔

سوسائٹی کی آمدنی کی ایک اور تدبیر:

اکتوبر ۱۸۶۷ء میں سرسید دُسہرے کی تعطیل میں بنارس سے علی گڈھ آئے اور مقامی زمینداروں اور رئیسوں کو یکجا کرکے ان کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ سوسائٹی کی مستقل آمدنی کے لئے کوئی تدبیر کرنا چاہیئے چند زمینداروں نے مشورہ دیا کہ ضلع کے ہر گانو سے ایک روپیہ سالانہ سوسائٹی کے لئے مقرر کیا جائے اور یہ شرط بندوبست کے وقت واجب العرض میں درج کر دی جائے تاکہ ہمارے اخلاف دور تابعد میں کوئی عذر پیش نہ کرسکیں۔ چنانچہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۷ء کو سرسید نے یہ تجویز سوسائٹی کے ماہانہ جلسے میں پیش کی اور زمینداران درخواست دہندہ کی ایک فہرست مع ان کے عرضیوں اور ۱۳۳ دیہات کی تفصیل کے اپنے سفارشی خط کے ساتھ ضلع کلکٹر جارج ہنری لارنس کی خدمت میں روانہ کر دی۔[1] کلکٹر نے تمام کاغذات اپنی رپورٹ

---

[1] حالی، حیات جاوید حصہ اوّل ص ۱۲۷

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کے ساتھ گورنمنٹ کو بھیج دیے۔ گورنمنٹ سکریٹری کا جو خط سرسید احمد خاں کو ۱۸ اکتوبر ۱۸۶۷ء کو موصول ہوا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وائسرائے اس کے لئے رضامند ہو گئے تھے۔ لیکن اس پر کس حد تک عمل ہوا اس کا سراغ ہمیں نہیں مل سکا۔

سرسید کو سوسائٹی سے بے حد محبت تھی وہ جب تک زندہ رہے اور جہاں بھی رہے سوسائٹی کی تعمیر و ترقی میں سرگرم عمل رہے۔ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو وہ ولایت کے لئے روانہ ہوئے۔ عدن سے انگلینڈ روانہ ہوتے وقت انھوں نے محسن الملک کے نام جو خط تحریر کیا تھا اس کے مطالعہ سے سوسائٹی سے ان کی والہانہ محبت کا اندازہ ہوتا ہے انھوں نے اس خط میں لکھا تھا کہ

"مجھے علاوہ مفارقتِ احباب یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ علم کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریں گے... میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اس کے سنبھالنے اور ممبروں کو بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں"[1]

انگلینڈ سے مراجعت کے وقت جدید علوم و فنون کی بہت سی انگریزی کتابیں وہ اپنے ساتھ لائے، جن میں بعض کے اردو تراجم سوسائٹی نے شائع کیے۔

کتابوں کی تصنیف کیلئے گورنمنٹ سے امداد کی مکرر اپیل:

۹ مئی ۱۸۶۸ء کو سوسائٹی نے سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر صوبہ شمال مغربی سے یہ درخواست کی کہ کتابوں کی اشاعت میں گورنمنٹ کو اس کی مدد کرنا چاہئے [illegible] ۱۸۶۸ء کو گورنمنٹ کی طرف سے ایک اشتہار شائع کیا گیا جس میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ جو کتابیں دیسی زبان میں تالیف یا ترجمہ کی جائیں گی گورنمنٹ ان کی مدد کرے گی اگرچہ لوگوں نے اس ترغیب سے بہت زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا کیونکہ اس وعدے کی میعاد صرف

---

[1] بحوالہ حیات جاوید حصہ دوم ص ۴۶-۴۷

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

چند برسوں کی تھی، تاہم مذکورہ اعلان نے دیسی مصنفوں کے دلوں میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا کر دیا۔ نتیجے کے طور پر دیسی زبانوں میں بیش بہا کتابیں معرض وجود میں آئیں۔

راجہ جے کشن داس کا استعفا

راجہ جے کشن داس نے آٹھ سال تک سوسائٹی کی نظامت کے فرائض انجام دینے کے بعد علی گڈھ سے الہ آباد تبادلہ ہو جانے کے باعث ۲۱ فروری ۱۸۷۷ء کو اپنے منصب سے استعفا دے دیا۔ اس کے بعد انھیں ان کی خدمت اور محنت کے پیش نظر آنریری لائف کو پریسیڈنٹ بنایا گیا

سوسائٹی کا زوال اور خاتمہ:

راجہ صاحب کے بعد مولوی سمیع اللہ خاں کو سوسائٹی کا سکریٹری منتخب کیا گیا ۱۱ جون ۱۸۷۷ء کو وہ عارضی طور پر نظامت کے فرائض سے سبکدوش ہو گئے [۵۱] اور مولوی زین العابدین اور پنڈت رادھا کشن سوسائٹی کے کرتا دھرتا مقرر ہوئے۔ ۲۵ اگست ۱۸۷۷ء کو سمیع اللہ خاں نے دوبارہ اس عہدے کا چارج لیا۔ ۲ مئی ۱۸۷۷ء تک مولوی سمیع اللہ اور پنڈت رادھا کشن سوسائٹی کی نظامت کے فرائض انجام دیتے رہے اس زمانے میں سرسید ملازمت سے پنشن لے کر مستقل طور پر علی گڈھ آ گئے تھے، چنانچہ سکریٹری کی ذمہ داریاں مکرر ان کے کندھوں پر آ پڑیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ علی گڈھ میں انگلو اورینٹل کالج کی داغ بیل ڈالی جا چکی تھی۔ اور سرسید اور انکے رفقا پوری طرح کالج کی تعمیر و ترقی کیلئے سرگرم عمل تھے اسلئے سوسائٹی کی طرف سے ان کی توجہات روز بروز کم ہوتی جاتی تھی۔ سوسائٹی قرض کے بارے دبتی جا رہی تھی اور اس کے اراکین کی تعداد بھی برابر گھٹتی جاتی تھی۔ کتابوں کے ترجے کا کام راجہ صاحب ہی کے زمانے میں بند ہو گیا تھا [۵۲] اس صورت حال سے نپٹنے کیلئے سرسید احمد خاں

---

[۵۱] اصغر عباس، سرسید کی صحافت ص ۶۳

[۵۲] تاریخ ایران حصہ اول سوسائٹی کا آخری ترجمہ ہے، جو راجہ صاحب کی نظامت کے زمانے میں ۱۸۷۷ء میں شائع ہوا تھا۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

نے ستمبر ۱۸۷۸ء میں سوسائٹی کے قواعد و ضوابط میں کچھ نرمی پیدا کرنے کیلئے اس کا دستور مرتب کیا۔ اس کے باوجود سوسائٹی کی حالت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا، اور زوال کا عمل بدستور جاری رہا۔

اسی زمانے میں سرسید وائسرائے کی کونسل کی ممبر نامزد ہوئے۔ چنانچہ ۱۸۷۰ء کے اواخر میں محمد یوسف کو سوسائٹی کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ لیکن اس نئی نظامت میں بھی اس کی حالت میں کوئی بہتری رونما نہیں ہوئی۔ ۱۸۸۲ء میں اس کے صرف دس باقاعدہ ممبر اور چار آنریری ممبر رہ گئے تھے جب کہ اس کے ابتدائی زمانے میں اس کے ارکان کی تعداد ڈھائی سو تھی۔ ۱۸۸۶ء میں ارکان کی تعداد گھٹتے گھٹتے صرف تین رہ گئی اور ۱۸۸۷ء میں کوئی رکن باقی نہ رہا۔[۱]

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ سائنٹفک سوسائٹی علی گڈھ تحریک کا نقطۂ آغاز تھی، جس کی تاسیس کا مقصد ہندوستان میں جدید علوم و فنون کا فروغ تھا اور انگلو اورینٹل کالج کا قیام اس تحریک کا نقطۂ عروج تھا، جو اسی مقصد کے پیش نظر عمل میں آیا تھا۔ سرسید اور ان کے رفقا اس کالج کو یونیورسٹی کا روپ دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں کالج کی تعمیر و ترقی پر مبذول کر دی تھیں۔ اس کے مقاصد کی تکمیل میں سوسائٹی کے مقاصد کا حصول بھی مضمر تھا۔ چنانچہ جب سوسائٹی کا کوئی رکن باقی نہیں رہا تو ۱۰ جولائی ۱۸۸۷ء کو اسے مدرستہ العلوم میں ضم کر دیا گیا۔ اور ۲ نومبر ۱۸۹۰ء کو اس کی عمارت میں ایک کلب قائم ہو گیا۔[۲]

---

[۱] ایضاً، ص ۱۰۰، معز عباس، سرسید کی صحافت، ص ۹۶

[۲] ایضاً، ص ۹۳

سائنٹفک سوسائٹی: تنقیدی جائزہ

سائنٹفک سوسائٹی ہندوستان کا تیسرا وقیع اور قابل تقلید تصنیفی وتالیفی اور اشاعتی ادارہ تھا جو سرسید احمد خاں کی فکر رسا کے نتیجے کے طور پر معرض وجود میں آیا۔ اس سے قبل فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج انگریزوں نے قائم کئے تھے جن کی خدمات اظہرمن الشمس ہیں۔ دلی کالج کی ٹرانسلیشن سوسائٹی اور سائنٹفک سوسائٹی کا مقصد دیسی زبانوں میں مغربی ومشرقی علوم وفنون کی کتابوں کی طباعت واشاعت تھا اور اس میدان میں دلی کالج نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس کی خدمات یقیناً قابل فخر ومباہات ہیں۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے انتقاماً اسے بند کر دیا۔ چنانچہ جو مفید کام اردو زبان کی ترویج وترقی کے لئے سرانجام پارہا تھا آناً فاناً بند ہوگیا۔ دلی کالج کے اس مبارک کام سے متاثر ہو کر حیدرآباد کے شمس الامرا امیر کبیر ثانی نے اپنے حلقۂ اثر میں یورپ کے علمی خزانے کو اردو زبان میں منتقل کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا لیکن ان کی کوششوں کے اثرات محدود رہے۔ عوام ان کتابوں سے مستفیض نہ ہو سکے۔

انیسوی صدی میں سب سے پہلے مغربی علوم وفنون کے ورثے کو جذب کرنے کا باقاعدہ عمل دلی کالج نے شروع کیا تھا جسے ہم اس روایت کا نقطۂ آغاز کہہ سکتے ہیں۔ انہی خطوط پر سائنٹفک سوسائٹی نے اس مفید کام کو آگے بڑھایا۔ سوسائٹی کا مقصد بھی دیسی زبانوں میں ایسی کتابیں تیار کرنا تھا۔ جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر ہندوستانیوں کے ذہنوں کو منور کر سکیں، چنانچہ ان کتابوں نے ہندوستان میں نئے افکار وخیالات کی اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سوسائٹی نے پندرہ علمی کتابیں تالیف یا ترجمہ کر کے اردو کے خزانے کو مغربی علوم وفنون سے مالا مال کیا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے ان کاموں کیلئے، جو مغربی علوم سے ناواقفیت کی بنا پر رکے ہوئے تھے، راہ ہموار ہوگئی۔ مولانا حالی سوسائٹی کی اس افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

> "اگر غور سے دیکھئے تو یہ (سوسائٹی) ہمارے ان مقاصد جدیدہ میں سے ہے جن کے حاصل ہونے کی توقع ہم کو اس سے پہلے گورنمنٹ کے سوا کسی سے نہ تھی اور جن پر ہمارے وہ کام اٹکے ہوئے ہیں جن کے نہ ہونے سے ہم پر انسان بالفعل کا اطلاق اب تک صحیح نہیں ہوا"[۱]

سوسائٹی نے جو کتابیں ترجمہ کرائیں ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے حواشی میں متن کے بعض الفاظ اور اشارات و اصطلاحات کی تشریح و توضیح کا التزام کیا گیا ہے۔ جن سے ہندوستانی عام طور سے ناواقف ہوتے تھے سوسائٹی کی کتابیں تعداد کے لحاظ سے کم سہی لیکن کیفیت کے اعتبار سے غیر معمولی افادیت و اہمیت کی حامل ہیں ان تصانیف نے انیسویں صدی میں شمالی ہند میں جدید تعلیم کی تشویق و ترغیب میں دم عیسیٰ کام کیا۔ ڈاکٹر اصغر عباس کا یہ خیال مبالغہ آمیز نہیں کہ

> "انیسویں صدی میں شمالی ہند میں ترجموں کے سلسلے میں سائنٹفک سوسائٹی کی یہ آخری کوشش تھی جو بر دئے کار آئی ....ان کتابوں نے ملک کو قرون وسطیٰ کے اندھیرے سے نکالنے کیلئے جو فضا تیار کی اس کی اہمیت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی کے منصوبوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ تحریک کا خواب بھی سرسید نے اس کام کے دوران دیکھا گویا اس کے تمام خط و خال ان کے ذہن میں پورے طور پر انگلستان کے سفر کے بعد متعین ہوئے۔ اس لئے علی گڑھ تحریک کو سمجھنے کیلئے بھی سائنٹفک سوسائٹی کا مطالعہ ازبس ضروری ہے کہ یہی سوسائٹی علی گڑھ تحریک کا نقطۂ آغاز ہے"[۲]

---

[۱] مقالات حالی حصہ اول ص ۶

[۲] سرسید کی صحافت ص ۶۹

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

بہرحال سوسائٹی کی کتابوں اور اسی کے اخبار کی تحریروں سے ہندوستانیوں کے اذہان وافکار میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ انگریزوں کا جو خوف اور رعب ہم پر طاری تھا وہ رفتہ رفتہ زائل ہونے لگا اور ہمیں بدلے ہوئے ماحول اور معاشرے میں سانس لینے کا ایک انداز نصیب ہوا۔ مولوی عبدالحق نے ایک جگہ سوسائٹی کے قیام کے ان اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"ان (سرسید) کا سب سے بڑا کارنامہ تعلیمی وعلمی تھا اور اس کا ایک جزو سائنٹفک سوسائٹی کا قیام تھا خود یہ نام اس تغیر کی خبر دے رہا تھا جو اس وقت عمل میں آرہا تھا۔"[1]

اس سوسائٹی کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس کے اتباع میں ہندوستان میں اس نوعیت کی بہت سی اصلاحی انجمنیں اور سوسائٹیاں وجود میں آئیں جنھوں نے ملک کی ہمہ جہت ترقی میں کلیدی رول ادا کیا بنارس انسٹی ٹیوٹ، آگرہ ریڈنگ اینڈ ڈبیٹنگ کلب، سائنٹفک سوسائٹی مظفرپور بہار، انجمن تہذیب لکھنؤ، سارو جنک سبھا پونا، کٹک سوسائٹی اڑیسہ اور انجمن راجپوتانہ وغیرہ کا قیام سائنٹفک سوسائٹی ہی کے اثرات کا رہون منت تھا۔ سوسائٹی کے نام اس قسم کے متعدد خطوط موجود ہیں جن میں اس امر کا واضح طور پر اعتراف کیا گیا ہے۔ مولانا حالی کا مندرجہ ذیل بیان بھی اس کی تائید کرتا ہے۔

"قطع نظر ان اہم مقاصد کے جن کیلئے یہ سوسائٹی قائم ہوتی تھی اس سے اور بہت سے ضمنی فائدے نہ صرف شمالی ہندوستان میں بلکہ ملک کے اکثر حصوں میں پہنچے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے کوئی قومی انسٹی ٹیوشن یا قومی مجلس جو ذکر کے قابل ہو اس سوسائٹی سے پہلے قائم نہیں ہوئی تھی پھر ۳۵ برس کے عرصے میں جس

---

[1] رسالہ اردو، جولائی ۱۹۳۵ء

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

قدر سوسائٹیاں، انجمنیں اور سبھائیں تمام ملک میں پھیلیں وہ سب اسکے اور اسی کی ریس سے قائم ہوئیں۔“ [1]

سوسائٹی سے اخبار سے پہلے ہندوستانی اخبارات کا یہ حال تھا کہ وہ محض قارئین کی تفریح طبع اور دلگی کا ذریعہ سمجھے جاتے تھے حیرت انگیز اور خوشی کن خبروں سے اپنے پڑھنے والوں کو مسحور اور مسرور کرنا ان کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ ان میں علمی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی مضامین شاذ و نادر ہی چھپتے تھے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے اپنے پیش رو اخباروں کے اس انداز اور روایت سے ہٹ کر صحافت کا ایک نیا معیار قائم کیا اور صحیح خبروں کے پہلو بہ پہلو علمی، تہذیبی، سیاسی اور اخلاقی مضامین شائع کر کے اپنے ہم وطنوں کی رہنمائی اور ذہنی تربیت کا فریضہ انجام دیا، جس کی وجہ سے اسے جلد ہی اپنے ہم عصر اخباروں میں ایک ممتاز مقام حاصل ہو گیا حتی کہ گورنمنٹ بھی اس کی آواز کو عوام کی آواز سمجھ کر اس کا وزن محسوس کرنے لگی۔ چنانچہ اس کا دیکھا دیکھی دوسرے اخباروں نے بھی اپنا انداز بدل کر یہی روش اختیار کرنا شروع کر دی جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی آواز جو صدا بہ صحرا کے مصداق تھی عوام کے دلوں میں گھر کرنے اور گورنمنٹ کے کانوں میں پہنچنے لگی۔

سوسائٹی اپنے اجلاسوں میں عورتوں کی تعلیم پر برابر زور دیتی رہتی تھی اگرچہ اس زمانے میں سوسائٹی کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ لیکن اسکی اس ہوشمندانہ تبلیغ کا نتیجہ ہم آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اسکے علاوہ سوسائٹی نے کسانوں کی فلاح و بہبود کیلئے بھی کوششیں کیں۔ اس نے نہ صرف علم فلاحت پر کتابیں تصنیف کرائیں بلکہ اسکی نگرانی میں کاشتکاری سے متعلق مختلف علمی تجربے بھی کئے گئے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سوسائٹی کی قیادت نے ہماری زبان کے علمی ذخیرے میں قابل ذکر اضافہ کیساتھ ساتھ ملک میں جدید خیالات کو فروغ دینے میں بڑا حصہ لیا۔ اسکی کوششوں کی بدولت سائنس سے دلچسپی کا رجحان عام ہوا اور تعلیمی، علمی معاشرتی اور سیاسی اعتبارات سے ترقی کی نئی راہ ملی۔ مختصر یہ کہ ہندوستان کی ہمہ جہت ترقی میں سوسائٹی کی خدمات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] حیات جاوید حصہ دوم ص ۴۴

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

سائنٹفک سوسائٹی کے تراجم

مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ سائنٹفک سوسائٹی نے تقریباً چالیس کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں[1] لیکن انھوں نے اپنے اس بیان کی تائید میں چالیس کتابوں کی فہرست پیش کرنے کی بجائے صرف اکتیس[2] کتابوں کے نام گنائے ہیں۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر اصغر عباس کی تحقیق کے مطابق سوسائٹی سے صرف پندرہ کتابیں شائع ہوئیں۔ عبدالحق کے بیان کی تردید کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مولوی ذکاء اللہ کی ترجمہ کردہ سترہ کتابوں کو بھی سائنٹفک سوسائٹی کی مطبوعات میں شامل کر دیا ہے۔ لیکن ان سے ذہول ہوا ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ یہ کتابیں سائنٹفک سوسائٹی کے مقاصد کی تائید میں "مطبع مرتضوی دہلی" میں طبع ہوئیں اور ان کا ٹائٹل پیج انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڈھ میں چھپا[2]۔ اصغر عباس نے اپنی پیش کردہ فہرست میں صرف مصنفین کے نام لکھے ہیں مترجمین کے نہیں۔ کیوں کہ ان کتابوں پر مترجم کا نام درج نہیں ہوتا تھا اس لئے اب ان ناموں کا سراغ لگانا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ حامد حسین قادری کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ گنگا پرشاد اور مولوی فیض الحسن (سوسائٹی کے) مترجم کتب تھے[3]۔ ذیل میں ان پندرہ کتابوں کی فہرست پیش کی جا رہی ہے، جنھیں سوسائٹی نے شائع کی تھیں۔ کتابوں کے وہی نام درج کئے گئے ہیں جو ان کے سرورقوں پر لکھے ہوئے ہیں۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	پریس کا نام	سال طباعت	کیفیت
۱	مصر کی قدیم تاریخ	ردلن		۱۸۶۴ء	ردلن کی کتاب "Ancient History of Egypt" کے علاوہ چند مفید مضامین کا اضافہ بھی شامل تھا اسکا دوسرا ایڈیشن ۱۸۷۰ء میں انسٹی ٹیوٹ پریس سے شائع ہوا۔

[1] سرسید احمد خاں حالات و افکار ص ۱۵۱ [2] سرسید کی صحافت ص ۶۷ [3] مطالبہ سرسید احمد خاں ص ۱۷۴

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۲	تاریخ چین	پادری ایکوس	کلکتہ بال پٹسٹ مشن پریس	۱۸۶۴ء	محمد زماں عرف فرنگی خاں کی فارسی کتاب کا ترجمہ ایکوس نے کیا تھا۔ یہ اسی کا ترجمہ ہے
۳	یونان کے قدیم زمانہ کی تاریخ	ردلن	سرسید احمد پرائیوٹ پریس	۱۸۶۵ء	Ancient History of Greece کے مفید حصے کا ترجمہ حاشیے کیساتھ دوسرے
۴	"	"	"	"	حصے کا ترجمہ مع حاشیے کے
۵	"	"	"	"	تیسرے حصے کا ترجمہ اور مفید حاشیہ
۶	رسالہ علم فلاحت	رابرٹ اسکاٹ برن	"	"	یہ باتصویر بھی اور حاشیہ آرائی بھی کی گئی تھی
۷	رسالہ علم انتظام مدن	ولیم سینیر	"	"	بہ اضافہ حاشیوں کے
۸	تاریخ ہندوستان	اسٹورٹ الفنسٹن	"	۱۸۶۶ء	ابتدا سے ۱۸۶۱ء تک مع حواشی کے
۹	رسالہ علم برقی	ولیم اسنومیرس	علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ پریس	۱۸۶۵ء	مع حاشیہ
۱۰	اصول سیاست مدن	اسٹورٹ مل	—		اسکا ترجمہ دھرم نرائن نے کیا تھا مل کی کتاب کے علاوہ دوسرے ماخذ سے بھی استفادہ کیا گیا تھا۔ صحیح معنوں میں دھرم نارائن اسکے مولف تھے
۱۱	تاریخ ایران حصہ اول	جان مالکم	علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ پریس	۱۸۷۲ء	سوسائٹی کا آخری ترجمہ ہے۔ اس میں قدیم زمانے سے حال تک کے حالات درج ہیں۔ اسکے چار حصے الگ الگ شائع ہوئے تھے۔
۱۲	رسالہ علم جغرافیہ	ولکنسن			
۱۳	رسالہ نیچرل فلاسفی	چارلس ٹامس			
۱۴	رسالہ علم آب وہوا				
۱۵	رسالہ جرثقیل				

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

سرسید احمد خاں اور انکے نامور رفقا

سرسید احمد خاں

سرسید کے بارے میں بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ جب تک اردو زبان باقی رہے گی ان کا نام بھی زندہ رہے گا۔ خوب سے خوب تر کی تلاش ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے انھوں نے تن تنہا جتنا بڑا کام کیا وہ کئی انجمنیں بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ انھوں نے صرف مسلمانوں کی مذہبی و تہذیبی اصلاح کا بیڑا ہی نہیں اٹھایا تھا بلکہ اردو کے حال اور مستقبل کو بھی سنوارا اور اسے مستحکم بنیادوں پر قائم کیا۔ تاریخ میں آج ایسی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی جس نے ان کی طرح اپنی پوری زندگی جدید علوم و فنون کی ترویج و تشویق اور اردو زبان کی اشاعت و حمایت کیلئے وقف کر دی ہو۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع و عمیق اور نظر انتہائی دقیقہ رس، دور بین اور حقیقت شناس تھی۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں کے اذہان و قلوب کو متاثر کیا، ان کے اندر اپنے اسلاف سے محبت اور جدید علوم سے دل چسپی پیدا کی اور بحیثیت مجموعی انھیں خوش آئند مستقبل کی راہ پر لگا دیا۔

سرسید ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلی میں اپنے نانا خواجہ فرید الدین کی حویلی میں پیدا ہوئے[1]۔ ان کے والد میر متقی قلعہ دہلی میں بادشاہ کے مقربین بارگاہ میں تھے۔ سرسید بھی گاہ بگاہ ان کے ہمراہ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے دربار میں جایا کرتے تھے۔ میر متقی کا موروثی مکان جامع مسجد کے قریب جنوب مشرق واقع تھا، جو نادری اور مرہٹی یورش و یلغار میں کئی بار لٹ چکا تھا جس کے کچھ حصے مسمار بھی ہو چکے تھے۔

سرسید کا خاندان شاہ عبدالعزیز کا معتقد تھا۔ ان کی والدہ شاہ غلام علی کی مریدنی تھیں چنانچہ انھوں نے ہی سرسید کو بسم اللہ پڑھائی گھر پر قرآن ختم کرنے کے بعد سرسید نے دیگر اساتذہ وقت سے عربی و فارسی درسیات کی کتابیں پڑھیں۔ عربی میں شرح ملا، شرح تہذیب۔

---

[1] حالی، حیات جاوید حصہ اول ص ۱۵

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

میبذی مختصر معانی اور مطوّل ما انا ملّت تک اور فارسی میں کریما خالق باری" آمدنامہ وغیرہ کتابیں پڑھیں اس کے بعد اپنے ماموں زین العابدین سے موروثی علم ریاضی و ہندسہ کی تعلیم حاصل کی۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر میں تعلیمی سلسلہ ختم ہو گیا۔

سرسید کی جوانی نہایت زندہ دلی اور رنگین صحبتوں میں گزری۔ انھوں نے اپنے والد سے تیر اور تیراندازی سیکھی تھی، جو اس فن میں ماہر و کامل تھے۔ سرسید میلوں اور جھرنوں کی سیر کے ساتھ ساتھ عورتوں کی رنگین اور پرکشش محفلوں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ ان محفلوں میں وہ اپنی حاضر جوابی، قادرالکلامی اور بذلہ سنجی کی سند بھی لیتے رہے۔ اس زمانہ میں وہ طبع آزمائی کرتے تھے اور آہی تخلص کرتے تھے[1] حالی نے ان کی قادرالکلامی اور بذلہ سنجی کا ایک واقعہ حیات جاوید میں نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"دلی میں ایک مشہور طوائف شیریں جان نامے نہایت حسین تھی۔ مگر سنا ہے کہ اس کی ماں بھدی اور سانولے رنگ کی تھی۔ ایک محفل میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مجرے کیلئے آئی تھی سرسید بھی موجود تھے۔ اور وہیں ان کے ایک قندھاری دوست بھی بیٹھے تھے وہ اس کی ماں کو دیکھ کر بولے "مادرش بسیار تلخ است" سرسید نے یہ مصرعہ پڑھا گرچہ تلخ است ولیکن برشیریں دارد"[2]

اس زمانے میں سرسید نے صہبائی، غالب، مولانا مملوک العلی آزردہ اور شیفتہ جیسی ہستیوں سے کسب فیض کیا۔ ان کی شادی سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں ہو چکی تھی جس سے وہ متاہلانہ زندگی گزار رہے تھے۔

سرسید نے اپنی عمر کی اکیسویں منزل طے کی تھی کہ ۱۸۳۸ء میں والد کے دست شفقت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے[3] جس کی وجہ سے قلعہ کی آمدنی کا سہارا بھی ختم ہو گیا۔ چنانچہ فکر معاش ہوئی۔ اپنے خالو مولوی خلیل اللہ خاں صاحب سے جو اس زمانے میں دلی میں صدر امین تھے عدالت کا

---

[1] نثار اعظمی نیا دور ستمبر ۱۹۸۰ء ص ۳۶

[2] حیات جاوید حصہ اول ص ۴۸۔ ۴۹

[3] بحوالہ سرسید اور علی گڑھ تحریک ص ۱۵

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کام سیکھ کر ان ہی کے پاس سر رشتہ دار ہو گئے۔ بعد ازاں ۱۸۳۹ء میں آگرہ میں نائب منشی کے عہدے پر ان کا تقرر ہو گیا۔

یہیں سے سرسید کی علمی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ جلد ہی انھوں نے قوانین مال سے واقفیت حاصل کی اور ایک دستور العمل تمام دفتر کمشنری کا مرتب کیا۔ اس کے بعد فارسی میں ایک فہرست بطور نقشہ کے ترتیب دی جو "جام جم" کے نام سے ۱۸۴۰ء میں شائع ہوئی۔ اس زمانے میں قوانین دیوانی و منصفی کا ایک خلاصہ اس امید پر مرتب کیا کہ شاید اس کی وجہ سے انھوں منصفی کا عہدہ ملجائے اس کے لئے کمشنر آگرہ نے گورنمنٹ سے سفارش بھی کی اور یہ طے پایا کہ جہاں بھی منصفی کا عہدہ خالی ہو وہاں سرسید کا تقرر کیا جائے۔ لیکن اس حکم کے معاً بعد اس عہدے کے لئے امتحان پاس کرنا ناگزیر قرار دیا گیا چنانچہ منصفی کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اپنے خلاصے کو ۱۸۴۰ء میں "انتخاب الاخوین" کے نام سے شائع کیا۔

۱۸۴۱ء میں مین پوری میں منصفی کے عہدے پر سرسید کا تقرر ہوا ۱۸۴۲ء میں ان کا تبادلہ فتح پور سیکری ہو گیا اور ۱۸ فروری ۱۸۴۶ء کو وہ وہاں سے تبدیل ہو کر دتی چلے آئے۔ دلی کے زمانہ قیام میں انھوں نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب "آثار الصنادید" لکھی جو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی اس زمانے میں انھوں نے نوازش علی سے کچھ درسی کتابیں پڑھیں اور بہادر شاہ ظفر نے انہیں جواد الدولہ عارف جنگ کے خطاب سے سرفراز کیا۔

سرسید ۱۲ جنوری ۱۸۵۵ء کو صدر امین کے عہدے پر ترقی پا کر بجنور چلے گئے۔ یہاں انھوں نے ضلع کلکٹر کے ایما سے "تاریخ بجنور" لکھی اور "آئین اکبری" کی تصحیح فرمائی۔ یہاں آئے ابھی تین سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ ۵۷ء کا قیامت خیز ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں صدر الصدور کے عہدے پر ترقی دے کر انھیں مراد آباد بھیج دیا گیا ۱۸۵۹ء میں باغیوں کیلئے تین ارکان پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس کے ایک رکن سرسید بھی تھے۔ یہیں سے انھوں نے "تاریخ سرکشی بجنور"، اور "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر شائع کیں مراد آباد میں انھوں نے فارسی کا ایک مدرسہ قائم کیا مئی ۱۸۶۲ء میں ان کا تبادلہ غازی پور کے لئے ہو گیا۔

اس کے بعد کے حالات کی کسی قدر تفصیل گذشتہ اوراق میں آ چکی ہے۔ لہذا اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ سرسید جولائی ۱۸۷۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر علی گڈھ

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

چلے آئے۔ ان پر ۱۸۹۵ء میں کالج کے فنڈ میں غبن کا جھوٹا الزام لگایا گیا، جسے وہ حین حیات نہ بھول سکے۔ ۲۴ مارچ ۱۸۹۸ء کو احتباس بول کا عارضہ لاحق ہوا، ۲۷ مارچ کو صبح سے درد سر میں مبتلا ہوئے اور شام کو شدید رعشہ کے ساتھ بخار چڑھا اور رات دس بجتے سر سید مسلمانان ہند کو سوگوار چھوڑ گئے۔ بابائے قوم کو کالج کے احاطے میں آسودۂ خاک کیا گیا۔

سر سید کی شخصیت شش جہت نگینے کی طرح تھی۔ جس کے ہر پہلو میں ایک نیا رنگ اور ایک نئی کشش دکھائی دیتی ہے۔ اپنی ہنگامہ خیز زندگی میں انھوں نے علمی و ادبی، مذہبی و تہذیبی، تحقیقی و تنقیدی اور سیاسی و معاشرتی میدانوں میں اپنے نقوش و اثرات چھوڑے ہیں۔ ان کے مذہبی و معاشرتی و سیاسی کارناموں پر تبصرہ ہمارے موضوع سے خارج ہے اس موقع پر ہمیں ان کے ان کارناموں کا تذکرہ مقصود ہے۔ جس کا تعلق اردو زبان و ادب سے ہے۔

یوں تو بنیادی طور پر سر سید ایک سیاسی رہنما تھے۔ انھوں نے براہ راست اردو ادب کے موضوع پر ایک قلم نہیں اٹھایا لیکن پھر بھی انھیں جدید اردو نثر کے معماروں میں شمار کیا جاتا ہے کیوں کہ بالواسطہ طور پر ان کی اردو خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ چنانچہ ان کا یہ دعوا حق بجانب ہے کہ۔ جہاں تک ہم سے ہو سکا ہے ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی[1]۔ شبلی نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "سر سید کے جس قدر کارنامے ہیں اگرچہ ریفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے لیکن جو چیز خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئی ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے"[2]

سر سید نے قدیم روایات سے ہٹ کر، مادیت، اقلیت، نیچریت، اور حقائق نگاری کی طرف خاص توجہ کی۔ بلاشبہ سادہ نثر نگاری کی بنیاد فورٹ ولیم کالج میں پڑی، لیکن اس کے موضوعات و مضامین محدود تھے۔ اس طرح دلی کالج کی خدمات تسلیم کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے

---

[1] بحوالہ نصاب ص ۶۱

[2] نصاب ص ۵۸

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

ہیں کہ اس کا مقصد بھی جدید علوم و فنون کی اشاعت پر موقوف تھا ۔ اور جہاں تک غالب کی نثر نگاری کا تعلق ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اردو نثر کو ایک نئی راہ دکھائی ۔ لیکن ان کی نثر میں بھی زندگی کے متنوع و گوناگوں مسائل کا فقدان ہے اور پھر اس کا حلقہ اثر بھی ان کے دوستوں کی محفلوں سے باہر نہیں بڑھ سکا ۔ زندگی کے متنوع اور فطری و عصری مسائل سے جس نے سب سے پہلے اردو ادب کو روشناس کرایا وہ سرسید ہیں ۔ انھوں نے سب سے پہلے ادب کا رشتہ زندگی کے ساتھ قائم کیا مسعود حسین خاں لکھتے ہیں ۔

"کہنے کو جدید نثر فورٹ ولیم، مرحوم دہلی کالج اور غالب کے خطوط میں فروغ پا چکی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جدید نثر جس کے دامن میں علوم جدید سمائی ہو، جو روح عصر اور نئی فکر سے آشنا ہو، سرسید ہی کی صاف و شفاف، کھری بلکہ بعض اوقات کھردری عبارت میں ملتی ہے ۔ "تہذیب الاخلاق" ہی کے صفحات پر نئی علمی نے جنم لیا ہے، وہ نثر جس میں سیاسی، اصلاحی اور علمی خیالات کے اظہار کی توانائی تھی " ۔ [1]

مذہب ہو یا معاشرت، معشیت ہو یا سیاست، تاریخ ہو یا علمی مباحث گویا تمام شعبہ ہائے زندگی پر سرسید نے اپنے تراش قلم کا جوہر دکھایا اور اسے انتہا تک پہنچایا ۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ نے چند لفظوں میں ان کی خدمات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے، وہ لکھتے ہیں ۔

ہمارے ملک میں سرسید ہی وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے فکر و ادب میں روایت کی تقلید سے ہٹ کر آزادی موضوع اور آزادی اسلوب کی رسم جاری کی اور ایک ایسے مکتب کی بنیاد رکھی جس کے عقائد میں عقل نیچریت اور تہذیب اور مادی ترقی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے " ۔ [2]

اردو صحافت نگاری کا آغاز اگرچہ انیسویں صدی کے روائل ہی سے ہو چکا تھا ۔ جام جہاں نما ۱۸۲۲ء

---

[1] اردو کا المیہ ص ۱۱ - ۲۱۰

[2] میرامن سے عبدالحق تک ص ۹۵ - ۹۴

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

شمس الاخلاق (۱۸۲۳ء) اور دہلی اردو اخبار (۱۸۳۶ء) وغیرہ ملا جلا کر اردو اور فارسی کے اخبار تھے
"سید الاخبار" سر سید کے بھائی سید محمد نے ۱۸۳۷ء میں جاری کیا تھا جس میں سرسید بھی کبھی کبھار مضامین لکھا
کرتے تھے۔ یہ ان کا ابتدائی تجربہ تھا جو ان کے لئے بڑا مفید ثابت ہوا۔ ۱۸۴۵ء میں ماسٹر رام چندر کی
ادارت میں دلی سے ایک پرچہ "فوائد الناظرین" کے نام سے جاری ہوا۔ اس میں خبروں کے پہلو بہ پہلو انگریزی
کتابوں اور رسالوں کے تراجم بھی شائع ہوتے تھے۔ اردو صحافت کی تاریخ میں "فوائد الناظرین" کو یقیناً
بار حاصل ہے لیکن اس میں انسانی زندگی کے مسائل کا فقدان تھا۔

سر سید نے سوسائٹی کے اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور "تہذیب الاخلاق" کے
ذریعے اردو صحافت کو ایک نیا موڑ اور ایک نیا اسلوب عطا کیا۔ انھوں نے سادہ اور سہل نثر کی بنیاد
ڈالی اور اسے ایسے ڈانڈے سے روشناس کرایا جس پر دیو پری نہیں بلکہ بنی نوع انسان رواں دواں
تھے اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ انسانی زندگی کی غمازی، ترجمانی اور عکاسی کرنے لگی۔

ہمیں یہ معلوم ہے کہ "تہذیب الاخلاق کے اجرا کے تین چار مہینے بعد ہی سرسید کی مخالفت
شروع ہوگئی اور "تہذیب الاخلاق" کے جواب میں متعدد رسالے جاری کئے گئے جن کا مقصد سرسید
کے نظریات و خیالات کی تردید کرنا تھا۔ اس طرح جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔
مباحثانہ اور مناظرانہ انداز نے اس زمانے کے اکثر مضمون نگاروں کو بلند پایہ مضمون نگار بنا دیا۔ چونکہ
سرسید کی زبان نہایت صاف شستہ، عام فہم اور لفظی تکلفات سے مبرا و معرا ہوتی تھی اس لئے ان کے
مخالفین کو بھی ان کے جواب میں ان ہی جیسا انداز تحریر اختیار کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح سرسید کی غیر شعوری
تقلید سے ان کے ہم عصر مضمون نگاروں نے اردو نثر کو شکل پسندی اور لفظی گورکھ دھندوں سے
آزاد کرنے میں اہم رول کیا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور معترف ہیں۔

سرسید کے دوستوں اور طرف داروں کے کارناموں کے علاوہ ان کے
مخالفوں اور بد خواہوں نے بھی نادانستہ طور پر اس رسالہ کی تقلید میں
کئی پرچے اس کے جواب میں لکھے اور لطف یہ کہ ان میں اس قسم کی
زبان استعمال کی گئی جیسی کہ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں استعمال کی
تھی اس طرح اردو انشا پرداز غیر ارادی طور پر سادہ نثر نگاری کی

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

طرف مائل ہوگئے اور انھیں محسوس بھی نہیں ہوا کہ ہم قدیم ڈگر سے ہٹ کر
چل رہے ہیں۔ چنانچہ چند ہی سال کے عرصے میں اردو زبان میں سادہ اور بے
تکلف نثر کا اتنا ذخیرہ اور نثر نگاروں کی اس قدر فراوانی ہو گئی کہ اگر اس
کے متعلق باضابطہ طور پر تعلیم دی جاتی یا اہل ملک کو اس طرف بار بار متوجہ کرایا
جاتا تو نصف صدی سے کم میں اس قدر کامیابی قطعی ناممکن تھی۔[۱]

بہر حال اردو زبان وادب پر سرسید کے ملاں قدر احسانات ہیں۔ ان کا قدم اگر بساط صحافت
پر نہ پڑا ہوتا تو شاید اردو نثر اتنی کم مدت میں اجتماعی زندگی کی ترجمان نہ بنتی اور نہ علمی و تحقیقی
مطالب و مفہوم کے اظہار کا وسیلہ بنتی۔

تصانیف سرسید کی تصانیف جو کتابوں اور رسالوں کی صورت میں شائع ہوئی ہیں وہ تین حصوں
میں تقسیم کی جاسکتی ہیں، مذہبی، تاریخی، اور علمی جن کی مجموعی تعداد ۳۳ ہے۔ ان
کتابوں میں سے بعض اہم کتابوں کا ذکر گذشتہ اوراق میں آچکا ہے یہاں ان کا تفصیلی ذکر تضیع اوقات
کے مترادف ہوگا[۲] چنانچہ صرف نام شماری پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ہر کتاب کے بعد قوسین میں
سال اشاعت بھی درج کیا گیا ہے۔

مذہبی ۱۔ جلاء القلوب بذکر المحبوب (۱۸۴۲ء) ۲۔ تحفۂ حسن (۱۸۴۴ء) ۳۔ کلمۃ الحق (۱۸۴۹ء) ۔
۴۔ راہ سنت و درد بدعت (۱۸۵۰ء) ۵۔ نمیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ (۱۸۵۲ء)
۶۔ کیمیائے سعادت کے چند اوراق کا ترجمہ (۱۸۵۳ء) ۷۔ تبیین کلام (۱۸۶۲ء) ۸۔ رسالہ تعام
اہل کتاب[۳] (۱۸۶۸ء) ۹۔ خطبات احمدیہ (۱۸۷۰ء) ۱۰۔ تفسیر القرآن (۱۲۹۶ھ تا ۱۳۰۹ھ)
۱۱۔ رسالہ ابطال غلامی ۱۲۔ النظر فی بعض مسائل الامام الغزالی (۱۲۹۷ھ) ۱۳۔ جواب امہات المومنین

تاریخی ۱۴۔ جام جم (۱۸۴۰ء) ۱۵۔ آثار الصنادید (۱۸۴۷ء) ۱۶۔ سلسلۃ الملوک (۱۸۵۲ء)

---

[۱] اردو کے اسالیب بیان ص ۳۷

[۲] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "حیات جاوید" از حالی" اور "اردو نثر کی تاریخ میں سرسید کا
مقام" از سلیمان محمود حسین

[۳] بعض مصنفوں نے اس کا نام "احکام طعام اہل کتاب" بھی لکھا ہے۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۱۸۔ تاریخ ضلع بجنور (۱۸۵۶ء) تاریخ سرکشی بجنور (۱۸۵۸ء) ۱۹۔ اسباب بغاوت ہند (۱۸۵۹)
۲۰۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو (۱۸۷۲ء)

علمی: ۲۱۔ انتخاب الاخوین (۱۸۴۰ء) ۲۲۔ تسہیل فی جر الثقیل (۱۸۴۴ء) ۲۳۔ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار (۱۸۶۴ء) ۲۴۔ قول متین در ابطال حرکت زمین (۱۸۴۸ء) ۲۵۔ علاج ہومیو پیتھک (۱۸۹۷ء)

متفرق: ۲۶۔ سفرنامہ لندن ۲۷۔ سیرت فریدیہ (۱۸۹۴ء) ۲۸۔ تحقیق لفظ نصاریٰ ۲۹۔ ہندوستان کے طریقۂ تعلیم پر اعتراض (۷۲ء) ۳۰۔ رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا ۔ ۱۸۶۰ تا ۱۸۶۱ء)
۳۱۔ انشاء اللہ ۳۲۔ نادان خدا پرست ۳۳۔ سفرنامۂ پنجاب (۱۸۸۴ء) اس کے علاوہ سرسید نے آئین اکبری" کی تصحیح کی تھی

سرسید احمد خاں کے نامور رفقا

وہ لوگ بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں جنھیں اپنے مشن کو فروغ دینے کیلئے اولو العزم اور باحوصلہ دانشوروں کی رفاقت وحمایت حاصل ہو جاتی ہے۔ سرسید احمد خاں ایسے ہی خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جنھیں وسیع النظر اور باشعور عالموں، ادیبوں، شاعروں اور مدبروں کی ایک معتدبہ جماعت مل گئی تھی، جس نے دامے، درمے، سخنے اور قدمے ان کی مشن کی کامیابی کے لئے کوشش کر کے اسے زندگی اور توانائی عطا کی اور نہ صرف ان کی زندگی میں ان کا ساتھ دیا بلکہ ان کے مرنے کے بعد بھی ان کی تحریک کو زندہ رکھا اور اسے ترقی دینے کے لئے کوشاں رہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی تصنیف سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا میں سرسید کے ان ساتھیوں کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے جن میں مجموعی طور پر ستائیس نام شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر کے مطابق اس فہرست میں مزید ناموں کے اضافے کی گنجائش ہے۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا ص ۸۴۔۸۳

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

لیکن ہم یہاں صرف ان ہی لوگوں کا ذکر کریں گے جنھوں نے سوسائٹی کے مشن کی تکمیل میں ان کی معاونت کی اور اس محاذ پر پوری تندہی سے ان کے ساتھ سرگرم عمل رہے ہے۔ محسن الملک وقار الملک، مولوی چراغ علی، مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاءاللہ، مولوی سمیع اللہ خاں، مولانا وحید الدین سلیم اور راجہ جے کشن داس وغیرہ اسی زمرے میں آتے ہیں۔ مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکاءاللہ کے کارناموں پر دلی کالج کے ضمن میں تبصرہ کیا جا چکا ہے اس لئے ان کا ذکر دوبارہ نہ کیا جائے گا۔

نواب محسن الملک

نواب محسن الملک سرسید کے مشن کے سب سے بڑے مؤیدادران کی تحریک کے زبردست مبلغ تھے جس سال سائنٹفک سوسائٹی وجود میں آئی وہ اسی سال اس کے رکن بنے۔ ان کی تصانیف کو کوئی بلند مرتبہ حاصل نہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کے وہ مضامین ہیں جو علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" اور "تہذیب الاخلاق" میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ مضامین صحافت نگاری کے اعلا نمونہ ہیں، جن سے اردو صحافت کو ایک نئی راہ ملی ہے۔

نواب محسن الملک کا نام سید مہدی علی خاں تھا۔ وہ ۹ ستمبر ۱۸۳۷ء کو اٹاوہ کے ایک شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے[1] انھوں نے عربی و فارسی کی تعلیم اٹاوہ میں ہی حاصل کی۔ تحصیل علم سے فراغت کے بعد ان کے ذہن میں دینی امور سے متعلق نئے نئے خیالات ابھرنے لگے۔ اس ضمن میں وہ شیعہ اور سنّی مذاہب کے اختلافات پر غور و فکر کی طرف مائل ہوئے اور آخیر کار کافی تفحص و تحقیق کے بعد انھوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کر کے سنی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے "آیات بنیات" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو شیعہ عقائد کی تحقیق و تنقید کے موضوع پر اس زمانے کی اہم ترین تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

محسن الملک نے ضلع کلکٹری میں دس روپیہ ماہوار تنخواہ پر محرر کی حیثیت سے

---

[1] محمد یحییٰ تنہا، سیر المصنفین حصہ دوم ص ۱۰۱

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

سرکاری ملازمت کا آغاز کیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد ضلع کلکٹر مسٹر ایلن ہوم نے ان کے کام سے خوش ہو کر اہلمد کے عہدے پر ان کا تقرر کر دیا۔ اس کے بعد ہی غدر کا واقعہ پیش آیا جس میں انھوں نے انگریزوں کی کافی مدد کی۔ چنانچہ امن و امان کی بحالی کے بعد وہ اسی ضلع میں پہلے سررشتہ دار اور بعد ازاں تحصیلدار بنائے گئے۔ اٹاوہ کا مدرسہ اور منصفی و کوتوالی کی عمارتیں ان ہی کے زیر نگرانی تعمیر ہوئی ہیں۔ اس زمانے میں سرسید سے ان کی ملاقات ہوئی۔ رفتہ رفتہ یہ ملاقات دوستی میں تبدیل ہوئی اور پھر یہ دوستی یک جان و دو قالب کی مصداق بن گئی، حتیٰ کہ کبھی کبھی سرسید ان سے ساتھ اپنے تعلقات کے اظہار کے لئے "مخدوم و مکرم" اور "محب و محبوب" کے الفاظ استعمال کیا کرتے تھے[۱] اور وہ بھی اکثر "انا احمد و احمد نا (میں احمد (سرسید احمد) ہوں اور احمد ہمارا ہے) کہہ کر اس ارتباط کی توثیق کرتے رہتے تھے۔

۱۸۶۳ء میں محسن الملک نے ڈپٹی کلکٹر کا امتحان پاس کیا، جس کے نتیجے میں وہ ۱۸۶۷ء میں مرزاپور میں ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے ۔ ۱۸۶۹ء میں کمشنر الہ آباد کی سفارش پر گورنمنٹ نے انھیں خلعت عطا کیا۔ اس اعزاز پر سرسید نے انھیں ولایت سے تہنیتی خط بھیجا تھا۔ ۱۸۷۴ء میں ان کی خدمات ریاست حیدرآباد نے حاصل کر لیں۔ ۱۸۷۶ء میں وہ سالار جنگ کے سکریٹری مقرر ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد ریاست کے معتمد اور سکریٹری بنائے گئے بعد میں انھیں اپنی کارکردگی کی بنا پر ریاست کی طرف سے محسن الملک محسن الدولہ منیر نواز جنگ مہدی علی خاں بہادر کا خطاب اور سہ ہزاری منصب عطا ہوا، اور تین ہزار روپئے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی[۲] ریاست حیدرآباد کے بعض معاملات طے کرانے کی غرض سے انھوں نے انگلینڈ کا سفر کیا جو ان کے لئے کئی اعتبار سے نہایت مفید ثابت ہوا۔ اس سفر کے دوران ان کی انگلستان کے متعدد عمائدین اور دانشوروں سے ملاقات ہوئی اور مسٹر گلیڈسٹون وزیراعظم انگلینڈ سے ایسے دوستانہ روابط قائم ہوئے کہ دونوں کے درمیان تاحیات خط و کتابت جاری رہی۔

---

[۱] حیات محسن ص ۱۴-۲۱۳، بحوالہ سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا ص ۹۰

[۲] تنہا، سیر المصنفین جلد دوم ص ۱۰۳

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

۱۸۹۳ء میں محسن الملک ملازمت سے پنشن لے کر مستقل طور پر علی گڑھ چلے آئے یہاں وہ سرسید کے انتقال کے بعد کالج کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اپنی سکریٹری شپ کے زمانے میں انھوں نے کالج کی گرتی ہوئی حالت کو سنبھالا اور اپنی پرجوش اور سحر آفریں تقریروں سے اتنا روپیہ جمع کرایا کہ تمام قرضے ادا کرنے کے بعد بھی اس کی تحویل میں کافی رقم باقی رہ گئی ۱۹۰۶ء میں گورنمنٹ نے انھیں "قیصر ہند" کا طلائی تمغہ عطا کیا۔ ۱۹۰۷ء میں کالج کے کام سے وہ شملہ گئے ہوئے تھے کہ ۱۶ اکتوبر کو وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے جسد خاکی کو شملہ سے علی گڈھ لاکر سرسید کے مقبرے کے پاس سپرد خاک کیا گیا حالی نے ان کے انتقال پر ایک رباعی اور ایک قطعہ کہا تھا۔ قطعہ کا آخری شعر یہ ہے۔

مہدی کے لئے قوم عزادار ہے ساری
کہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

سرسید کے بعض مذہبی خیالات سے اختلاف رکھنے کے باوجود ان کے عقلی افکار کے اثرات کو قبول کرنے والوں میں محسن الملک کو اولیت حاصل ہے انھوں سے سرسید کی عقلیت میں اعتدال و توازن پیدا کیا۔ سرسید کے ساتھ رفاقت کی ایک اہم اساس نیچر کی اہمیت کا ادراک و اعتراف تھا۔ محسن الملک نے بھی نیچر کو تسلیم کیا۔ لیکن سرسید کی طرح اس کی ہمہ گیری کو قبول نہیں کیا۔ ان کے نزدیک نیچر سے مراد طبیعت اور طبائع موجودات ہے۔ اور قانون فطرت اس باقاعدہ ترتیب کا اظہار ہے۔ جو قدرتی اشیا میں پائی جاتی ہے اور جس کو ارباب نظر کی ایک کافی تعداد نے دیکھا ہے[1]

حالی اور شبلی نے محسن الملک کے طرز نگارش کی بڑی تعریف کی ہے[2] لیکن اس کے باوجود ان کی تصانیف کو کوئی ادبی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ البتہ ان کے مضامین جو "تہذیب الاخلاق" میں برابر شائع ہوتے رہتے تھے۔ طرز ادا اور سلاست و صفائی کے لحاظ سے قابل تعریف ہیں۔ اور بیان اور منطقی استدلال تو ان کی ان تحریروں میں معراج کمال

---

[1] ڈاکٹر سید عبداللہ، سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا ص ۳۲۵

[2] ملاحظہ ہو تاریخ ادب اردو حصہ نثر از رام بابو سکسینہ ص ۴۸

کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ بحیثیت مجموعی اردو صحافت کو ترقی دینے میں سرسید کے بعد ان کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔

تصانیف

(۱) رسالہ میلاد شریف، مصنفہ ۱۸۶۰ء

(۲) آیات بنیات (۱۸۷۰ء)

(۳) تقلید عمل بالحدیث

(۴) کتاب المحبت

(۵) والشوق مکاتیب

(۶) مسلمانوں کی تہذیب

(۷) مکاتیب الخلان۔ یہ محسن الملک اور سرسید کے ان خطوط کا مجموعہ ہے۔ جو ایک دوسرے کو لکھے گئے تھے۔

(۸) مکمل مجموعہ لیکچرز۔ یہ ان کے لیکچروں کا مجموعہ ہے۔

اس کے علاوہ ان کے وہ مضامین ہیں جو انھوں نے "تہذیب الاخلاق" اور "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں لکھے تھے۔ انھوں نے "خطبات احمدیہ" کی تصنیف میں سرسید کی مدد کی تھی۔

نواب وقار الملک:

سرسید کے زیر اثر ملک میں بے شمار شخصیتیں ابھریں، جنھوں نے قوم کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ وقار الملک بھی سرسید کے ان ہی رفقا میں شامل ہیں جن کی زندگی کا مقصد قوم کی خدمت اور معاشرے کی اصلاح تھا۔ وہ سرسید کے تعلیمی تحریک کے اخلاقی پشت پناہ اور روح رواں تھے۔ انھوں نے اپنی مساعی نفسی سے اس تحریک کے دائرہ اثر و نفوذ کو وسعت و ہمہ گیری عطا کی۔

وقار الملک کے والد فضل حسین مرادآباد کے قصبہ سنبھل کے رہنے والے تھے وہ ملازمت کے واسطے سراوہ ضلع میرٹھ میں مقیم تھے کہ ۲۹ محرم ۱۲۵۰ھ مطابق

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

۲۴ /مارچ ۱۸۴۱ء کو ان کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کی تاریخی نام چراغ علی رکھا گیا[1] یہی لڑکا بڑے ہونے پر مشتاق حسین کے نام سے مشہور ہوا اور اب وقارالملک کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ابھی مشتاق حسین چھ ماہ کے بھی نہ ہوئے تھے کہ ۲۸ اگست ۱۸۴۱ء کو ان کے سر سے باپ کا سایہ ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا[2] ان کی والدہ بتول النساء بیگم اپنے دریتیم کو ساتھ لے کر امروہہ میں اپنے والد مولوی انور علی کے یہاں چلی آئیں۔ قدیم دستور کے مطابق جب مشتاق حسین چار سال چار ماہ اور چار دن کے ہوئے تو حافظ غلام نبی قریشی نے رسم بسم اللہ ادا کی۔ اس کے بعد انھیں محلہ کے مکتب میں بیٹھایا گیا، جہاں انھوں نے اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مکتب سے فارغ ہونے کے بعد عربی کی کتابیں تفسیر جلالین تک مولوی واقف علی سے پڑھیں، ۱۸۵۴ء میں وہ امروہہ تحصیل کے اسکول میں داخل ہوئے پانچ سال تک وہاں زیر تعلیم رہنے کے بعد ۱۸۵۹ء میں انھوں نے رڑکی انجینیرنگ کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن انجینیرنگ میں دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے ایک سال بعد بغیر سند حاصل کیے تعلیمی سلسلہ ختم کر دیا۔

اس کے بعد وہ اپنے پھوپا امام الدین کے پاس جو مرادآباد میں تحصیلدار تھے عدالت کا کام سیکھنے کی غرض سے چلے آئے اور کلکٹری میں امیدوار کی حیثیت سے کام کرنے لگے اسی زمانہ میں ان کے پھوپا نے اپنی منجھلی لڑکی سے ان کا نکاح کر دیا۔ ستمبر ۱۸۶۰ء میں مشتاق حسین تحصیل مرادآباد میں بیس روپئے ماہوار پر انکم ٹیکس کے عارضی محرر مقرر ہوئے لیکن سات ماہ بعد جب کام ختم ہو گیا تو ان کی ملازمت بھی ختم ہو گئی۔

اسی زمانے میں سرسید بھی بحیثیت صدرالصدور مرادآباد ہی میں متعین تھے۔ چنانچہ یہیں منشی امام الدین کی وساطت سے مشتاق حسین کی ان سے پہلی بار ملاقات ہوئی کچھ دنوں کے بعد ۱۲/ مئی ۱۸۶۲ء کو سرسید کا غازی پور تبادلہ ہو گیا۔ اور ۱۵/ مئی ۱۸۶۲ء کو مشتاق حسین تحصیل میں اطلاق نویسی پر مامور ہو کر امروہہ چلے گئے۔ یکم جولائی ۱۸۶۸ء کو

---

[1] محمد اکرام اللہ خاں، وقار حیات ص ۱

[2] محمد اکرام اللہ خاں، وقار حیات ص ۳

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

انھیں منصرم کے عہدے پر ترقی دے کر علی گڈھ بھیج دیا گیا، جہاں وہ ۲۱ مئی ۱۸۶۲ء تک اسی عہدے پر مامور رہے[1] علی گڈھ میں انھیں پہلی بار سرسید کی ماتحتی میں کام کرنے اور ان سے زیادہ قریب آنے کا موقع ملا۔ ۱۸۶۸ء میں جب سرسید علی گڈھ سے تبدیل ہو کر بنارس جانے لگے تو انھوں نے ۱۸ اگست ۱۸۶۸ء کو مشتاق حسین کی سروس بک پر مندرجہ ذیل ریمارک لکھا:۔

> منشی مشتاق حسین سر رشتہ دار عدالت ہذا نہایت لائق، نہایت محنتی اور نہایت کارگزار ..... افسر ہے۔ اس افسر کی دیانت داری پر مجھ کو ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ اپنی موت پر .... جس عہدے پر یہ شخص نوکر ہے اس سے بہت زیادہ بڑے عہدے کی نہایت عمدہ لیاقت اس میں موجود ہے۔"[2]

۱۸۷۳ء کے شروع میں مشتاق حسین کول (علی گڈھ) میونسپلٹی کے ممبر منتخب ہوئے یہاں بھی انھوں نے بہترین کارکردگی کی سند حاصل کی۔ بالآخر سرسید کے دوسرے رفقا کی طرح وہ بھی ۱۸۷۵ء میں ریاست حیدرآباد سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں انھوں نے سولہ برس تک مختلف عہدوں پر مامور رہ کر ریاست کی نمایاں خدمات انجام دیں۔ جن کے صلے میں انھیں وقارالملک کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۸۹۱ء میں انھوں نے نواب سرآسمان جاہ کی خدمت میں اس بنا پر اپنا استعفا پیش کر دیا کہ صاحب موصوف کو ان پر پہلے جیسا اعتماد نہیں رہ گیا تھا۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۹۲ء تک ان کے وظیفے وغیرہ کا تصفیہ ہو گیا اس کے بعد ۲۳ اکتوبر کی رات کو انھوں نے حیدرآباد کو خیرباد کہا اور مستقل سکونت کے ارادے سے علی گڈھ چلے آئے یہاں وہ سرسید کی تحریک میں شامل ہو کر پوری تندہی کیساتھ اس کی کامیابی کے لئے سرگرم عمل رہے۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۰۷ء میں وہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج

---

[1] ایضاً ص ۹

[2] بحوالہ وقار حیات ص ۹

کے سکریٹری مقرر ہوئے۔[1] اور جب تک علی گڈھ میں رہے کالج کی باگ ڈور ان ہی کے ہاتھ میں رہی۔ ۲۲ر اپریل ۱۹۰۸ء کو لارڈ منٹو وائسرائے اور گورنر جنرل ہند کالج کے معائینے کے لئے علی گڈھ تشریف لائے تو انھوں نے وقارالملک کو نواب کا خطاب عطا کیا۔ ۱۰ جنوری ۱۹۱۱ء کو مسلم یونیورسٹی کے قیام کو روبہ عمل لانے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تو وہ اس کے آنریری سکریٹری منتخب ہوئے۔ اس انتخاب کے بعد انھوں نے ایک اپیل شائع کی جس میں ملت کے دردمند اصحاب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ۔

میرے بھائیو! میری آخری عمر کی صرف ایک بڑی تمنا یہ ہے کہ اب تم میں سے ایک شخص اپنا یہ فرض سمجھ کر کہ اسلامی یونیورسٹی کو مکمل کرنا ہے اپنی پوری کوشش چندہ کی فراہمی میں صرف کرے اور تاج پوشی کے مبارک جشن سے پہلے کم از کم بیس لاکھ روپیہ فراہم کرے اپنی قومی زندگی کا عمل ثبوت دے دے۔[2]

کالج اور مجوزہ یونیورسٹی کے سلسلے میں غیر معمول مصروفیات کی وجہ سے وقارالملک کی صحت بری طرح متاثر ہوئی اور ان کی طبیعت مستقلاً خراب رہنے لگی۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں وہ یونیورسٹی کمیٹی کے معتمد اعزازی کے عہدے سے مستعفی ہو کر اپنے وطن واپس چلے گئے صحت کی بحالی و تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے کبھی کبھی وہ مسوری اور دہرہ دون کا سفر کر لیا کرتے تھے ایک بار شملہ گئے ہوئے تھے۔ کہ فالج کا حملہ ہوا، اس کے بعد وہ فوراً امروہہ چلے گئے۔ تقریباً سال بھر علاج ہوتا رہا، لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی اور ۲۷ جنوری ۱۹۱۷ کو شب کے دس بجے ان کی شمع حیات ہمیشہ کے لئے گل ہو گئی۔[3]

ان کی وفات پر مدیر معارف نے انھیں ان الفاظ میں خراج تحسین

---

[1] خلیق احمد نظامی، پیش لفظ خطوط وقارالملک ص ۵

[2] بحوالہ وقار حیات ص ۵۶۶

[3] ایضاً ص ۷۰۰

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

پیش کیا تھا۔

"نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبر و سیاست کا ماتم کیا
مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا
مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے فقدان پر نوحہ کہا۔ مولانا حالی کو
رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخن وری اور دقیقہ سنجی پر نالہ کیا۔ لیکن
وقارالملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور اولوالعزمانہ اخلاق
کی گم شدگی پر فریاد۔ وہ ہمارے کار فرما قافلے کا آخری مسافر تھا
اس کے بعد وہ دور جو انقلاب ہند کے بعد شروع ہوا تھا ختم ہو گیا"[1]

نواب صاحب کی شخصیت ہماری قومی تاریخ میں علمی و ادبی اعتبار سے نہیں تہذیبی و سیاسی نقطۂ نظر سے اہمیت کی حامل ہے۔ وہ ہماری تہذیب کے اعلا قدروں کے امین اور آئینہ دار تھے انھوں نے ہماری تہذیب کے ان عناصر کو جو جدید علوم وفنون کے شانہ بہ شانہ چل سکتے تھے پروان چڑھایا اور ان کی افادیت و برتری کو ثابت کیا۔ ان کی کوئی مستقل و طبع زاد تصنیف موجود نہیں۔ لیکن تہذیب الاخلاق کے مضامین اس بات کے شاہد ہیں کہ اگر نواب صاحب باقاعدہ طور پر لکھنے کا سلسلہ جاری رکھتے تو اردو ادب کو یقیناً ایک نیا آہنگ اور اسلوب عطا کر جاتے۔

مضامین تہذیب الاخلاق کے علاوہ ان کی ایک اہم علمی یادگار "مرگزشت نپولین بوناپارٹ" ہے جو قیام علی گڈھ کے زمانے میں انگریزی کی ایک کتاب "فرنچ ریویوشن اینڈ نپولین" سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۷۱ء میں نول کشور پریس سے شائع ہو چکی ہے۔

۱۸۷۰ء میں وقارالملک نے سرسید کے بعض سوالوں کے جواب میں ایک ضخیم رسالہ بھی لکھا تھا جس کی تصنیف پر انھیں انعام ملا تھا۔ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۹۰۶ء میں "خطوط وقارالملک" کے نام سے ان کے خطوط کا ایک مجموعہ بھی شائع کر دیا ہے۔

[1] بحوالہ خطوط وقارالملک ص ۴

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی :-

سرسید کے افق عظمت کا ایک روشن ستارہ مولوی چراغ علی بھی تھے۔ وہ شروع ہی سے مذہبی تحقیقات اور مناظرے سے خاص دلچسپی رکھتے تھے اور معترضین اسلام کے رد میں مضامین اور رسالے لکھتے رہتے تھے۔ سرسید سے ملاقات کے بعد وہ ان کے دست و بازو بن گئے اور اپنی تمام تر صلاحیتیں ان کے مشن کی کامیابی کے لئے وقف کر دینے کا عزم ارادہ کر لیا۔

مولوی صاحب کا تعلق سرزمین کشمیر تھا۔ وہ ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے تھے[1] ان کے والد کا نام مولوی محمد بخش تھا۔ ان کے چار بیٹے "چراغ علی، عنایت علی، ولایت علی اور منصب علی تھے[2] ان میں چراغ علی سب سے بڑے تھے۔ مولوی محمد بخش اردو، فارسی اور عربی میں اچھی استعداد رکھنے کے علاوہ انگریزی سے بھی بخوبی واقف تھے۔ وہ میرٹھ، سہارنپور اور پنجاب میں سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ اور دوران ملازمت ۱۸۵۶ء میں فوت ہوئے۔

والد کے انتقال کے وقت چراغ علی کی عمر گیارہ برس کے قریب تھی۔ ان کی تعلیم ان کی دادی اور والدہ کے زیر نگرانی میرٹھ میں ہوئی۔ لیکن حالات کی ناسازگاری کے باعث وتعلیم کی تکمیل نہ کر سکے اور ضلع بستی میں بیس روپئے ماہوار پر بحیثیت محرر ملازم ہو گئے۔ اس ملازمت کے درمیان انھوں نے درسی کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رکھا اور محنت شاقہ سے نہ صرف عربی، فارسی، اور انگریزی پر عبور حاصل کر لیا۔ بلکہ عبرانی اور سریانی میں بھی بقدر ضرورت دستگاہ بہم پہنچائی۔ اسی زمانے میں ان کے والد کے ایک دوست محمد ذکریا بہ سلسلۂ ملازمت بستی آئے اور انھوں نے چراغ علی کے سرپرست شفقت رکھا۔ جب وہ

---

[1] حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو ص ۲،۳۔ لیکن سکینہ نے سال پیدائش ۱۸۴۴ء لکھا ہے (تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص ۵)

[2] عبدالحق، چند ہم عصر ص ۳۸

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

بمبئی سے تبدیل ہو کر لکھنؤ پہونچے تو انھوں نے چراغ علی کو ایک خط لکھا کہ لکھنؤ کے جوڈیشیل کمشنر مسٹر گورا و سلی آپ کے والد کے دوست ہیں اگر آپ لکھنؤ آ کر ان سے ملیں تو بعید نہیں کہ وہ آپ کو کوئی معقول جگہ دلا دیں۔ چنانچہ ۷۲-۱۸۷۳ء کے قریب چراغ علی نے لکھنؤ پہنچ کر کمشنر موصوف سے ملاقات کی۔[1] انھوں نے چراغ علی کا تقرر منصرم کے عہدے پر کرا دیا۔ بعد میں مو[illegible] صاحب کا تبادلہ سیتاپور کو ہو گیا۔

اس وقت چراغ علی نہ صرف سرسید کی تحریک سے واقف ہو چکے تھے بلکہ غائبانہ طور پر ان کے معتقد بن چکے تھے۔ انھوں نے سرسید سے خط و کتابت بھی شروع کر دی تھی اور تہذیب الاخلاق میں مضامین بھی بھیجنے لگے تھے اسی دوران سرسید لکھنؤ آئے تو چراغ علی نے سیتاپور سے لکھنؤ پہنچ کر ان سے ملاقات کی۔ کچھ دنوں کے بعد جب ریاست حیدرآباد کی طرف سے ترجمے کا کچھ کام سرسید کے سپرد کیا گیا تو انھوں نے اس کے لئے مولوی چراغ علی کا انتخاب کیا۔ چنانچہ ۱۸۷۶ء میں وہ سرکاری ملازمت سے رخصت لے کر علی گڑھ چلے آئے اور ترجمے کا کام انجام دینے لگے، جس کی انھیں اجرت ملتی تھی۔ ۱۸۷۷ء میں جب نواب سالار جنگ نے سرسید کو خط لکھ کر مخصوص قسم کی صلاحیتوں کے حامل ایک ہونہار اور معقول شخص کی تلاش میں مدد کی درخواست کی تو انھوں نے چراغ علی کو حیدرآباد بھیج دیا۔ وہ وہاں چار سو روپیہ ماہوار مشاہرے پر اسسٹنٹ ریونیو سکریٹری (مددگار معتمد مالگذاری) مقرر ہوئے۔[2] اس وقت ریونیو سکریٹری کے عہدے پر محسن الملک متمکن تھے۔ جب وہ پولیٹیکل اینڈ فائننس ڈپارٹمنٹ کے سکریٹری مقرر ہوئے تو چراغ علی [illegible] سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر محکمہ مالگزاری کے معتمد مامور کر دئے گئے۔ محسن الملک کی سبکدوش ہونے کے بعد انھیں سکریٹری پولیٹیکل اینڈ فائننس ڈپارٹمنٹ مقرر کیا گیا۔

چراغ علی کا انتقال ۱۱ جون ۱۸۹۵ء کو بمبئی میں ہوا جہاں وہ [illegible] تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر صرف پچاس سال تھی اپنی [illegible] انھوں نے اسلام

---

[1] مولوی عبدالحق، چند ہم عصر ص ۴۰

[2] ایضاً

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کی حمایت و صیانت میں صرف کیا اور اپنے زورِ قلم اور قوتِ استدلال سے اسلام اور پیغمبرِ اسلام پر انگریزوں کے الزامات کے منھ توڑ جواب دیئے۔ وہ وقت کی بے حد قدر کرتے تھے تاہم معصوم بچوں سے باتیں کرنے اور ان کے درمیان وقت گذارنے میں انھیں بڑا لطف آتا تھا۔ تعلیمِ نسواں کے فروغ سے بھی انھیں کافی دلچسپی تھی۔ "تہذیب الاخلاق" کے اکثر و بیشتر مضامین ان کے اسی دینی و اصلاحی جذبے اور جوش کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی دوسری تصانیف سے بھی اپنی حمیت اور ملی غیرت و دردمندی کی شعاعیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ جہاں تک طرزِ نگارش کا تعلق ہے ان کی تحریریں تعقیدِ لفظی، پیچیدگی بیان اور عبارت آرائی سے پاک و صاف ہوتی ہیں۔ وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے تھے، پورے غور و فکر اور تحقیق و تفحص کے ساتھ اس کا حق ادا کر دیتے تھے انھوں نے انگریزی باقاعدہ نہیں پڑھی تھی تاہم ذاتی کوشش سے اتنی استعداد بہم پہنچا لی تھی کہ عیسائیوں کی کتابوں کے جواب انگریزی ہی میں لکھے ہیں۔ مندرجہ ذیل تصانیف ان سے یادگار ہیں

دینی :۔

(۱) **تعلیقات** ۔ پادری عماد الدین (مرتد) نے اپنی کتاب "تاریخ محمد" میں اسلام پر متعدد اعتراضات کیے تھے، اس رسالے میں ان کے جوابات دیے گئے ہیں، یہ ۱۸۷۲ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔

(۲) **(تحقیق جہاد)** Critical Exposition of popular JEHAD مولوی صاحب کی یہ معرکۃ آرا کتاب انگریزی میں ہے عیسائیوں کی طرف سے اسلام پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ اسے بزورِ شمشیر فروغ حاصل ہوا ہے، یہ کتاب اسی اعتراض کے رد میں لکھی گئی ہے۔

(۳) Reform Under Muslim Rule

مولوی صاحب نے یہ کتاب پہلے انگریزی میں لکھی تھی بعد میں انھوں نے اس کے چودہ صفحات کا اردو میں ترجمہ کرکے "اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام" کے عنوان سے شائع کیا

(۴) (محمد صلعم نبی برحق) Mohammad the True prophet

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

اس تصنیف میں حضور اکرم کے عادات و اطوار سے متعلق تمام اعتراضات و شبہات کا محققانہ اور عالمانہ طور پر ازالہ کیا گیا ہے۔

(۵) **اسلام کی دینوی برکتیں** اس رسالے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اسلام سے کیا کیا برکتیں حاصل ہوتی ہیں۔

(۶) **قدیم قوموں کی مختصر تاریخ** "ایام الناس" نامی ایک مختصر اردو رسالے میں اس کے مصنف نے قرآن پر یہ اعتراض کیا تھا کہ اس میں بعض ایسی قوموں کا ذکر ہے، جو دنیا میں کبھی موجود نہیں تھیں اس کتاب میں اس اعتراض کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔

سرکاری تصانیف:۔

(۷) **بجٹ**۔ (میزانیہ) ریاست حیدرآباد کا میزانیہ کتابی شکل میں سب سے پہلے مولوی چراغ علی نے مرتب کیا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جو صفائی اور اختصار موصوف کے میزانیہ میں ہے وہ بعد کے میزانیہ میں نہیں۔

(۸) **ایڈمنسٹریشن رپورٹ** (رپورٹ نظم ونسق) سال ۸۵-۱۸۸۴ء کی رپورٹ جو چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

(۹) **حیدرآباد دکن اینڈ سالار جنگ**:۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے

بی بی ہاجرہ، ماریہ قبطیہ اور "العلوم الجدید والاسلام" ان کی نامکمل تصنیف ہیں۔ ا[illegible] مرزا غلام احمد قادیانی کی کتاب "براہین احمدیہ" کی تصنیف میں بھی مدد کی تھی۔ علاوہ بریں بے شمار مضامین جو "تہذیب الاخلاق" میں شائع ہوئے ان کی یادگار ہیں۔

مولانا وحیدالدین سلیم:۔

سرسید کے رفقا میں وحیدالدین سلیم کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ وہ جدید شاعری

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

میں نہ صرف اپنا ممتاز مقام رکھتے ہیں بلکہ ماہر لسانیات، صاحب نظر صحافی اور صاحب کمال انشاپرداز کی حیثیت سے بھی جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ کئی برسوں تک انھیں سرسید، حالی اور شبلی کی صحبت نصیب رہی جس نے ان کے جوہر کو جلا بخشی۔ بقول خود ان کے "مجھے تو سید صاحب نے انسان بنایا، ورنہ میں نرا ملا ٹا رہتا۔ کہیں میاں جی گری کرتا یا کسی مسجد میں مؤذنی کرتا ہوتا"۔[1]

وحیدالدین کی تاریخ پیدائش ابھی تک پردۂ خفا میں ہے۔ ڈاکٹر منظر عباس نقوی نے مختلف ماخذ سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، اس حساب سے ان کا سال ولادت ۱۸۵۹ء قرار پاتا ہے۔[2] سلیم نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن پانی پت میں ہی حاصل کی۔ وہاں انھوں نے ایک شریف خاتون شمس النساء سے قرآن حفظ کیا بعدازاں میر علی تقی حزیں سونا پتی سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اس کے بعد باپ حاجی فریدالدین کا سایہ ہمیشہ کے لئے سر سے اٹھ گیا، چنانچہ حضرت غوث علی شاہ نے جن کے یہاں ان کی والدہ کام کیا کرتی تھیں، ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ موصوف نے سلیم کا داخلہ میونسپل بورڈ کے ایک مقامی اسکول میں کرایا۔ اسی زمانے میں وہ شاعری کی طرف بھی راغب ہوئے اور شاہ صاحب کی مدح میں ایک سو ایک اشعار کا ایک قصیدہ لکھا جس کے صلے میں انھوں نے ایک جے پوری اشرفی اور ایک زرتار بنارسی چادر عطا کی۔[3]

وحیدالدین ۱۸۸۲ء میں میڈل کا امتحان پاس کیا اور پنجاب میں اول آئے۔ اس کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا جہاں دو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ لیکن جب سالانہ امتحان میں اول آئے تو وظیفے کی یہ رقم بڑھ کر پانچ روپئے ہو گئی۔ لاہور میں انھوں نے فقہ، حدیث، منطق اور فلسفہ کی تعلیم مولانا عبداللہ ٹونکی سے اور عربی ادب اور تفسیر کی تعلیم مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے حاصل کی۔ فاضل کے امتحان میں اردو مضمون نگاری کا پرچے کا جواب ایک طویل نظم میں لکھا، اس پر ممتحن بڑا خوش ہوا اور اسے اخبار میں شائع کرایا

---

[1] بروایت ڈاکٹر قاضی عبدالستار: رسالہ نوائے ادب اپریل ۱۹۷۱ء بحوالہ فکر و نظر دوسرا کارواں ۱۹۸۷ء ص ۱۷۱

[2] وحیدالدین سلیم حیات اور ادبی خدمات ص ۱۲

[3] ایضاً ص ۱۵

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

اور لکھا کہ" دنیا میں اس قابلیت کے لوگ بھی موجود ہیں کہ فاضل کے امتحان میں مضمون کے جواب میں ایسی پاکیزہ اور برجستہ نظم لکھ سکتے ہیں[۱] انگریزی تعلیم کے سلسلے میں منظر عباس نے درد بریلوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ سلیم نے لاہور میں منشی فاضل کے علاوہ انٹرنس کا امتحان بھی پاس کیا تھا[۲] رام بابو سکسینہ نے بھی لکھا ہے کہ مولانا سلیم نے لاہور میں زبان انگریزی میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا[۳] لیکن مولوی عبدالحق جن کی ماتحتی میں انھوں نے دارالترجمہ حیدرآباد میں کئی برسوں تک کام کیا تھا، لکھتے ہیں" انگریزی نہیں جانتے تھے[۴] وحیدالدین جدید تعلیم سے واقف تھے۔ بقول مولوی عبدالحق ..... مغربی تعلیم کا جو منشا ہے اس سے ایسے واقف تھے کہ بہت کم جدید تعلیم یافتہ واقف ہوں گے[۵] سلیم کے ایک خط سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے لاہور میڈیکل کالج سے طب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی[۶] اپنے ماموں کے مشورے پر انھوں نے قانون کی تعلیم شروع کی، لیکن ماموں کے انتقال کے بعد تعلیم کا یہ سلسلہ ختم کر کے وہ پانی پت چلے آئے۔

مولانا سلیم کی ملازمت کا آغاز تقریباً ۱۸۸۰ء میں ایجرٹن کالج بھاول پور سے ہوتا ہے یہاں قریب ساڑھے تین برس تک السنۂ شرقیہ کے استاد رہے اس کے بعد جنرل عظیم الدین خاں کے اصرار پر ۱۸۹۰ء کے اواخر میں انھیں رام پور کے ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی کا عہدہ قبول کرنا پڑا، لیکن اس کے چھ مہینے بعد جب عظیم الدین خاں کا قتل (۱۸۹۱ء) میں ہوا تو وہاں کی ملازمت سے دست بردار ہو کر وہ پانی پت چلے آئے اور کچھ دنوں کے بعد وہیں طبا۔

۱۔ بحوالہ وحیدالدین سلیم حیات اور ادبی کارنامے ص ۱۵

۲۔ ایضاً ص ۱۷

۳۔ تاریخ ادب اردو حصۂ نثر ص ۸۵۔۸۴

۴۔ چند ہم عصر ص ۱۲۳

۵۔ ایضاً ص ۱۲۳

۶۔ نقوش (مکاتیب نمبر) ص ۶۹۸

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

شروع کی۔

حالی نے سرسید سے سلیم کی قابلیت کی بڑی تعریف کی تھی۔ چنانچہ ۱۸۹۴ء میں سرسید نے تار دے کر انھیں علی گڈھ بلایا۔ وہ مولانا حالی کے ساتھ علی گڑھ چلے آئے۔ یہاں پچاس روپئے ماہوار پر سرسید کے ادبی معاون (لٹریری اسسٹنٹ) کی حیثیت سے وہ سرسید کی وفات (۲۷، مارچ ۱۸۹۸ء) تک کام کرتے رہے[۱]۔ اس زمانے میں "علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کی ادارت میں بھی وہ سرسید کی مدد کرتے رہے[۲]۔ دریں اثنا وہ سرسید کے مضامین کے لئے مواد فراہم کرتے اور "تہذیب الاخلاق" میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ درحقیقت یہی وہ زمانہ تھا جبکہ سرسید، حالی اور شبلی کے علاوہ دوسرے اہل علم اور عالی ظرف بیش واؤں کی صحبت میں رہ کر انھوں نے اپنی علمی استعداد اور اپنے ادبی ذوق کو پروان چڑھایا۔

سرسید کے انتقال کے بعد وحیدالدین نے علی گڈھ ہی سے ایک رسالہ "معارف" کے نام سے جاری کیا۔ اس رسالے کا پہلا شمارہ مئی ۱۸۹۸ء میں منظرِ عام پر آیا۔ لیکن علی گڈھ کی آب وہوا ان کی صحت کو راس نہ آئی۔ چنانچہ نومبر ۱۹۰۰ء میں وہ پانی پت چلے آئے اور ساتھ میں "معارف" کا دفتر بھی لیتے آئے۔ لیکن دسمبر ۱۹۰۱ء میں اسے اس لئے بند کرنا پڑا کہ اس کے خریداروں کی تعداد کم ہو گئی تھی۔

اس کے بعد سلیم کتابوں کی تجارت کرنے لگے، لیکن جب اس تجارت میں کوئی منفعت نظر نہیں آئی تو محسن الملک کی دعوت پر وہ دوبارہ علی گڈھ چلے آئے۔ محسن الملک نے سو روپیہ ماہانہ پر "علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کا تقرر کر دیا۔ ۱۳، اپریل ۱۹۰۷ء کے شمارے سے مولانا کا نام گزٹ میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے چھپنے لگا۔ نواب محسن الملک کی وفات کے بعد وہ گزٹ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں حمیدالدین اور چند نوجوانوں کے تعاون سے انھوں نے "انجمن مترجمین" قائم کی جس کا مقصد انگریزی کی علمی کتابوں کو اردو کے قالب میں ڈالنا تھا۔

---

[۱] منظر عباس نقوی، وحیدالدین سلیم حیات اور ادبی خدمات ص ۲۹

[۲] ایضاً ص ۱۸۵

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

سلیم اور حمیدالدین اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، جن کا کام ترجمہ شدہ کتابوں کی اصلاح کرنا تھا۔ جون ۱۹۰۹ میں وہ شدید بیمار پڑے تو رخصت لے کر پانی پت چلے آئے اور وہیں سے جولائی ۱۹۰۹ء میں اپنا استعفا بھیج دیا۔

۱۹۱۲ء میں لکھنؤ کے سید میر جان نے مولانا شبلی کے مشورے سے "مسلم گزٹ" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا[1] مولانا شبلی کسی تقریب کے سلسلے میں پانی پت گئے تو انھوں نے اس اخبار کی ایڈیٹری کے لئے مولانا سلیم کو راضی کر لیا۔ چنانچہ لکھنؤ آکر انھوں نے "مسلم گزٹ" کی ردارت کا قلم دان اپنے ہاتھ میں لیا، لیکن آزاد نگاری کے سبب اگست ۱۹۱۳ میں انھیں اس کی ادارت سے دست بردار ہونا پڑا[2] وہ پانی پت چلے آئے۔ چند ہی دنوں کی بے کاری کے بعد وہ لاہور کے "زمیندار" اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد اس اخبار کی تعداد میں دن دونا رات چوگنا اضافہ ہونے لگا۔ اور کچھ دنوں میں اس کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی، لیکن موصوف کی آزاد منشی کی وجہ سے اس اخبار کی ضمانت ضبط ہو گئی اور تین چار سال تک وہ بے کار رہے۔

۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانیہ کی داغ بیل ڈالی گئی۔ تو اردو میں نصابی و درسی کتابیں تیار کرنے کی غرض سے "دارالترجمہ" کا ایک شعبہ بھی قائم کیا گیا مولوی عبدالحق اس کے نگراں قرار پائے۔ انھوں نے شمالی ہند سے چیدہ چیدہ صاحب علم حضرات کو بلا کر اس کام کے لیے مامور کیا، جن میں ایک سلیم بھی تھے۔

۱۸ نومبر ۱۸۱۹ء کو حیدر آباد پہنچ کر انھوں نے اپنے عہدے کا چارج لیا۔ بعد میں ان کی خدمات شعبۂ اردو میں اسسٹنٹ پروفیسری کے عہدے پر مستقل کر دی گئیں

دسمبر ۱۹۲۶ء میں سلیم کے دانتوں میں پایریا کی وجہ سے درد پیدا ہوا ڈاکٹروں کے مشورے سے گیارہ بارہ دانت نکلوائے گئے لیکن اس کی وجہ سے جو زخم ہوئے وہ جان لیوا ثابت ہوئے

---

[1] مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی ص ۶۱۱

[2] ایضاً ص ۶۱۳

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کیوں کہ اس کی وجہ سے وہ کھانا نہیں کھا سکتے تھے، کسی طرح سے مشروبات حلق کے نیچے اتار لیتے تھے۔ بالآخر ۲۹ جولائی ۱۹۲۸ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

وحیدالدین کی زندگی کا بیشتر حصہ صحافت نگاری میں گزرا۔ وہ ایک نڈر اور بیباک صحافی تھے، جس کی وجہ سے انھیں کئی بار پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس کے باوصف ان ان کے پہاڑ جیسے عزم و ارادے میں کوئی لغزش نہیں آئی وہ ساری عمر اردو کی خدمت کرتے رہے۔ اپنے رشحات قلم سے انھوں نے اردو میں نئے نئے الفاظ و اصطلاحات وضع کئے ہیں۔ دوران قیام حیدرآباد سیکڑوں الفاظ و اصطلاحات ایجاد کیں۔ وہ انگریزی کم جانتے تھے لیکن جب انگریزی سے اردو الفاظ بنانے کی ضرورت پڑتی تو وہ فوراً ایک موزوں لفظ ایجاد کر دیتے تھے۔ ان کی اس زود ایجادی کے متعلق مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔

> "وہ الفاظ کے کینڈوں اور ان کی فطرت کو خوب سمجھتے تھے اور لفظوں کی تلاش یا نئے لفظوں کے بنانے میں کمال رکھتے تھے اور لفظ ایسے موزوں اور جلد بناتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دماغ میں سانچے بنے بنائے رکھے ہیں، جن میں سے الفاظ ڈھلتے چلے آ رہے ہیں۔"[1]

سلیم اردو زبان و اردو ادب کے ایک مایۂ ناز ستون تھے۔ وہ جہاں بھی رہے اردو کے شیدائی رہے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ جدید علوم و فنون سے متعلق سیکڑوں بلکہ ہزاروں نئے الفاظ اور اصطلاحات جو ہم تک پہونچے ہیں، ان میں سے بیشتر کے موجد وہی ہیں اس سلسلے کی ان کی کتاب "وضع اصطلاحات علمیہ" اس کی بین دلیل ہے۔

مولوی سمیع اللہ خاں :-

سرسید کے رفقا میں مولوی سمیع اللہ کی شخصیت اپنی سیرت کی پاکیزگی، اخلاق کی بلندی اصولوں کی پختگی اور قومی خدمات میں بے لوث اور پرخلوص انہماک کے باعث ایک امتیازی

---

[1] بحوالہ چند ہم عصر ص ۱۲۳

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

شان وحیثیت کی حامل تھی۔ علی گڑھ تحریک کے تعلیمی منصوبوں کو بروئے کار لانے میں ان کا نام سرفہرست ہے۔

وہ دلی میں ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے[1] وہ بچپن میں میاں محمود خاں کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے والد کا نام عزیز اللہ خاں تھا انھوں نے مولانا مملوک العلی اور صدر الدین آزادہ جیسے علمائے عصر سے تعلیم حاصل کی۔ وہ دلی علی گڑھ اور آگرہ میں جج رہے[2] ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) میں وہ علی گڑھ میں صدالصدور تھے۔ ۱۳۰۲ھ (۸۶-۱۸۸۵ء) میں لارڈ نارتھ بروک کے ساتھ انھوں نے مصر کا سفر کیا۔ واپسی کے بعد انھیں سی۔ ایم۔ جی کا خطاب عطا کیا گیا۔ ۱۳۱۰ھ (۹۳-۱۸۹۲ء) میں انھوں نے ملازمت سے پنشن لی[3]

سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کے وقت ہی سے وہ اس کے رکن منتخب ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے ان کی وضع قطع مولویانہ تھی۔ لیکن سرسید کی صحبت و معیت اور ان کی تحریک کا یہ اثر ہوا کہ کوٹ پینٹ اور ترکی ٹوپی پہننے لگے جس زمانے میں مدرستہ الاسلامیہ کی بنیاد پڑی وہ علی گڑھ میں صدرالصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ سرسید کے ایما سے انھوں نے مدرسے کی خشت اول رکھی اور اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر معتدبہ رقم جمع کی' جس کی وجہ سے مدرسے کو مالی مشکلات سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ اس کے علاوہ بھی دامے' درمے' سخنے اور قدمے مدرسے کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ سائنٹفک سوسائٹی کے وہ ۱۸۶۵ء اور ۱۸۷۷ء میں دوبار سکریٹری مقرر ہوئے۔ مئی ۱۸۷۷ء میں وہ اور پنڈت راد ھاکشن سکریٹری تھے[4]

لیکن شبلی کی طرح مولوی سمیع اللہ بھی بہت دنوں تک سرسید کا ساتھ نہ دے سکے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جب کالج میں انگریزوں کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا تو مولوی سمیع اللہ

---

[1] ڈاکٹر اصغر عباس' سرسید کی صحافت ص ۱۷۱

[2] مولوی عبدالحی حسنی' نزہتہ الخواطر جلد ۷' ص ۱۷۰

[3] ایضاً ص ۱۷۱

[4] ڈاکٹر اصغر عباس' سرسید کی صحافت ص ۶۳

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

نے اس کی شکایت سرسید سے کی جس پر انھوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی ۔ چنانچہ یہ بدظن ہو کر سرسید سے علاحدہ ہو گئے، لیکن عبدالحیٔ حسنی نے لکھا ہے کہ انھوں نے سید محمود کی جانشینی سے مسئلے پر اختلاف کے باعث علاحدگی اختیار کی تھی [1] الہ آباد یونیورسٹی کا مسلم بورڈنگ ہاؤس ان ہی کے فیاضانہ و مخیرانہ جذبات اور قومی محبت کی ایک زندہ مثال ہے ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) میں انھوں نے دلی میں انتقال کیا [2]

وہ بڑے علمی مرتبے کے آدمی تھے انھوں نے عربی زبان میں کچھ اہم کارنامے انجام دیے ہیں اردو میں " مسافران لندن " کے عنوان سے ان کے جو مضامین گزٹ میں شائع ہوئے تھے، ان کی فہرست ذیل یہ ہے ۔

(۱) مسافران لندن		۳۱ اگست	۱۸۸۰ء
(۲) " "	(۲)	۳ اور ۱۱ ستمبر	۱۸۸۰ء
(۳) " "	(۲)	۱۵ اور ۱۹ اکتوبر	۱۸۸۰ء
(۴) " "	(۲)	۴ اور ۷ دسمبر	۱۸۸۰ء [3]

راجہ جے کشن داس :

راجہ جے کشن داس بندرابن داس رئیس مراد آباد کے منجھلے بیٹے تھے ۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ سرکاری ملازمت میں خزانچی کی حیثیت سے داخل ہوئے بعد ازاں تحصیلدار، ڈپٹی کلکٹر کے عہدے سے ترقی کرتے ہوئے اسسٹنٹ جج کے منصب تک پہونچے ۔ زمانۂ غدر میں انھوں نے انگریزوں کی بڑی مدد کی، چنانچہ صلے کے طور پر انگریزی حکومت نے انھیں میوٹنی میڈل عطا کیا اور سی، ایس، آئی کے خطاب سے سرفراز کیا ۔

---

[1] نزہتہ الخواطر، جلد ۷، ص ۱۷۱

[2] ایضاً ص ۱۷۱

[3] بحوالہ سرسید کی صحافت ص ۱۷۳

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

جے کشن داس کے سرسید سے خصوصی روابط تھے۔ سرسید انھیں بھائی جے کشن داس کہا کرتے تھے۔ سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کے ساتھ ہی وہ اس کے رکن بنے۔ سرسید کی کوششوں اور کاوشوں سے جب ۱۸۶۶ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا' تو وہ اس کے سکریٹری منتخب ہوئے [۱] اگست ۱۸۷۰ء میں جب سرسید تبدیل ہو کر بنارس آئے تو راجہ صاحب سائنٹفک سوسائٹی کے سکریٹری و نگراں منتخب ہوئے اور فروری ۱۸۷۴ء تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔ ان کے سکریٹری شپ کے زمانے میں سوسائٹی نے بڑی ترقی کی۔

راجہ جے کشن داس نے ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے قیام میں بڑی مدد کی اور جب اس کالج کو یونیورسٹی بنانے کی تجویز رکھی گئی تو انھوں نے اس تجویز کی زبردست حمایت کی' چنانچہ مسلم یونیورسٹی میں ان کی یادگار کے طور پر" راجہ جے کشن داس جوبلی میور گولڈ میڈل اور" راجہ جے کشن داس جوبلی میور سلور میڈل کے نام سے دو انعامات سال کے دو کامیاب ہندو طلبہ کو دیے جاتے ہیں۔

حاجی محمد اسمٰعیل خاں: تاریخ شاہد ہے کہ سرسید کے فیضان نظر نے کتنے حذف ریزے کو درِ شہوار بنا دیا انھیں میں حاجی محمد اسماعیل خاں بھی تھے وہ سائنٹفک سوسائٹی کے معاونین میں ایک اہم رکن کی حیثیت رکھتے ہیں وہ اکتوبر ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۰ء تک "علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے ایڈیٹر رہے۔

محمد اسمٰعیل خاں کی ولادت ۱۲۷۰ھ (۵۴-۱۸۵۳ء) میں رناولی میں ہوئی۔ [۲] انھیں علوم متداولہ کے علاوہ ترکی زبان میں بھی عبور حاصل تھا۔ چنانچہ طبع زاد مضامین کے ساتھ ساتھ ترکی کے بلند پایہ مضامین کو اردو کا جامہ پہنا کر وہ گزٹ میں شائع کرتے تھے۔ ذکاء الدین نے ۱۹۰۰ء

---

[۱] خط ماخوذ علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مطبوعہ ۲۳ اگست ۱۸۶۶ء ص ۵۲۹
بحوالہ مکاتیب سرسید احمد خاں ص ۱۴

[۲] علی گڈھ گزٹ' ۴ جولائی ۱۹۲۷ء' بحوالہ سرسید کی صحافت ص ۱۰۳

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

میں "معارف" کے نام سے ایک رسالہ علی گڈھ سے جاری کیا، تو محمد اسماعیل خاں کو اس کا سب ایڈیٹر مقرر کیا۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ وہ ملکی سیاست میں بھی حصہ لیتے تھے اسی دلچسپی کے بنا پر انھیں صوبۂ شمالی مغرب کی کونسل کا رکن منتخب کیا گیا تین برس تک وہ اس کے رکن رہے۔

سرسید کے سیاسی افکار و نظریات کی تبلیغ کے لئے محمد اسماعیل خاں نے "افادہ" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا۔ "جوش مذہبی" کے علاوہ ان کی کسی اور تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، البتہ گزٹ میں ان کے مضامین بکثرت شائع ہوئے ہیں ان میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں

(۱) ہندستانی اور مناکحت یوروپین لیڈیوں سے	۲۶ مئی ۱۸۹۱ء
(۲) گذشتہ اور موجودہ زمانے کے مسلمان	۹ اپریل ۱۸۹۵ء
(۳) تجارت اور مسلمان	۲۸ مئی ۱۸۹۵ء
(۴) زمینداری اور اس کی تباہ حالت	۹ اگست ۱۸۹۵ء
(۵) خوش اقبالی یا بداقبالی یا اقتضائے وقت	۱۶ اگست ۱۸۹۵ء
(۶) علوم و فنون	۸ مئی ۱۸۹۷ء
(۷) یورپ کے اخبارات	۵ جون ۱۸۹۷ء
(۸) فرانس، انگلینڈ اور جرمنی میں علمی طوفان	۲۱ اگست ۱۸۹۷ء
(۹) جہل مرکب	۲۸ اگست ۱۸۹۷ء

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

چوتھا باب

متفرق ادارے

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس۔ ۱۸۱۲ء

کمپنی کے اعلیٰ افسران ابتدا ہی سے اس بات کی فکر میں تھے کہ کمپنی کے ملازمین خصوصاً سول اور فوجی ملازمین کو دیسی زبانوں کی تعلیم دی جائے، لیکن ہندوستانی لڑائیوں میں ملوث اور اپنی تجارت اور اقتدار کی توسیع و ترقی میں منہمک رہنے کی وجہ سے وہ اس کی طرف توجہ نہیں کر سکے۔ مدراس کے گورنر مسٹر جوزف کلیکٹ (Joseph Collett) نے ۱۷۱۰ء میں "فورٹ سینٹ جارج اسکول" کی بنیاد ڈالی[1] جو بعد میں "رائٹرس کالج" کے نام سے مشہور ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا یہ پہلا ادارہ تھا جس میں مدراس پریسیڈنسی کے سول ملازمین دیسی زبانوں کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ کالج قلعہ سینٹ جارج میں برسوں قائم تھا۔

۱۰ر جولائی ۱۸۰۰ء کو فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا، جس میں کمپنی کے سبھی ملازمین (سول ملازمین) کو تین سال تک کیلئے تعلیم حاصل کرنا لازمی قرار دیا گیا چنانچہ کلکتہ، مدراس، اور بمبئی احاطوں کے ملازمین اس میں تعلیم حاصل کرنے لگے، لیکن کورٹ کے حکم کے بموجب گورنمنٹ سکریٹری ٹامس براؤن نے ۱۶ر مئی ۱۸۰۵ء کو کالج کونسل کو ایک خط لکھا جس میں مدراس اور بمبئی کے طلبہ کو واپس بھیجنے کی ہدایت دی گئی تھی[2] چنانچہ مدراس اور بمبئی کے طلبہ واپس بھیجدیے گئے اور ان کی تعلیم کا انتظام ان ہی احاطوں میں کیا گیا۔ افسوس کہ بمبئی کے اس تعلیمی ادارے سے متعلق ہماری معلومات نہیں کے برابر ہیں۔ البتہ مدراس کے ادارے کے بارے میں اتنا معلوم ہے کہ ۱۸۱۲ء میں فورٹ سینٹ جارج اسکول کو از سر نو قائم کیا گیا اور[3] اس کا نام "فورٹ سینٹ جارج کالج" رکھا گیا۔

---

[1] ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، مدراس میں اردو زبان و ادب کی نشو و نما ص ۲۰۲

[2] وارشنے، فورٹ ولیم کالج، ص ۶۴

[3] ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، اور ڈاکٹر بی بی مشرا نے سال قیام ۱۸۰۰ء لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال کی تحقیق کے مطابق قیام کا سال ۱۸۱۲ء ہے۔
(جامعہ ۵ جنوری ۱۹۰۲ء)

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

فورٹ سینٹ جارج کالج آٹھ سال تک فورٹ سینٹ جارج کے احاطے میں چلتا رہا۔ ۱۸۱۶ء میں جبکہ طلبہ کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا تو مسٹر گارو (Garrow) کا مکان دس سال کے لئے ٹھیکے پر لیا گیا، بعد ازاں ایک تاجر مسٹر مورا بیٹ (Moorat) کا مکان نو ہزار روپے میں خرید کر کالج کو اس عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔[۱] اس عمارت میں ایک وسیع و عریض کمرہ تھا جسے "کالج ہال" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اپنی آخری عمر تک کالج اسی عمارت میں چلتا رہا۔

تعلیمی شعبہ جات :-

فورٹ سینٹ جارج کالج میں دکنی، تامل، کنٹر اور ملیالم کے علاوہ عربی، فارسی، سنسکرت ہندوستانی اور ریاضی کے شعبے قائم تھے۔ یہ کالج فورٹ ولیم کے طرز پر قائم کیا گیا تھا لیکن اس اعتبار سے اسے فورٹ ولیم کالج پر تفوق و برتری حاصل تھی کہ یہاں صرف سول ملازمین ہی نہیں بلکہ وکلا بھی تعلیم حاصل کرتے تھے لہٰذا متذکرہ بالا شعبوں کے علاوہ قانون کا شعبہ بھی قائم تھا۔ پروفیسر سری نواس چاری لکھتے ہیں۔

"فورٹ ولیم کالج پر اس کالج کو اس لئے فوقیت حاصل تھی کہ یہاں ہندوستانی ادب زبان کے ساتھ ساتھ قانون اور دوسری ملکی زبانوں کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس لئے یہاں صرف منشی (Writers) ہی نہیں بلکہ وکلا اور ججوں کو بھی تعلیم دی جاتی تھی۔"[۲]

کالج کے اساتذہ :-

اس زمانے میں مدرسوں اور کالجوں میں درس و تدریس دینے والوں کو منشی کہا جاتا تھا۔ کالج میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کا انتظام تھا لیکن دکن میں ایسے منشیوں کا فقدان

---

[۱] ڈاکٹر افضل الدین اقبال، مدراس میں اردو زبان و ادب کی نشوونما۔ ص ۲۱۳

[۲] History of the city of Madras P. 216
بحوالہ مدراس میں اردو زبان و ادب کی نشوونما۔ ص ۲۱۳

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

تھا، جو مشرقی علوم والسنہ کی کما حقہ تعلیم دے سکیں۔ چنانچہ شمالی ہند سے ارباب علم کو مدعو کرکے اس کالج میں مامور کیا گیا۔ ان منشیوں کے نام جو اس کالج میں تعلیم و تعلم کی خدمات انجام دے رہے تھے، حسب ذیل ہیں۔

۱۔ تراب علی ناقی	شعبۂ ہندوستانی و فارسی
۲۔ حسن علی ماہلی	شعبۂ عربی، فارسی اور ریاضی
۳۔ جدمبراد	,, تامل
۴۔ سنوسوامی	,, ,,
۵۔ بی۔ جی۔ بابنگاون	,, کنڑ
۶۔ سی۔ ایم۔ دشی	,, ملیالم

منشی شمس الدین احمد، ابراہیم بیجاپوری، منشی مظفر، قاضی ارتضا علی خاں، مولوی مہدی واصف، سید شاہ حسین حقیقت، سید ودود عاشق، غلام حسین معاون، مرزا عبداللہ باقی وفا، عبدالقادر ممتاز، سید تاج الدین، غلام دستگیر، محمد خان اور میر حیدر بلگرامی وغیرہ برسوں اس کالج سے وابستہ رہے۔

کالج کا کتب خانہ :-

فورٹ سینٹ جارج کالج کا ایک بڑا کتب خانہ تھا۔ اس میں تامل، تلگو، کنڑ، مرہٹی، ملیالم، سنسکرت، بنگالہ، اڑیا، ہندی، برمی، اور جاوی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو کتابوں اور مخطوطوں کے وافر ذخائر موجود تھے جن میں شیخ عین الدین کے مذہبی رسالے "احکام و مسائل" کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا[1]۔ شمس العشاق اور شاہ برہان کی دکنی تصانیف کل باس اور جل ترنگ کے مخطوطے بھی تھے۔ ولیم ٹیلر نے اس کتب خانے کے جملہ مخطوطات کی فہرست دو جلدوں میں مرتب کرکے فورٹ سینٹ جارج گزٹ پریس سے شائع کی تھی۔ اسکی

---

[1] سید شمس اللہ قادری، اردوئے قدیم ص ۱۱۵

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

پہلی جلد بشمول ۸۰۰ صفحات، ۱۸۰۵ء میں اور دوسری جلد جو ۴۰۴ صفحات پر مشتمل ہے، ۱۸۰۰ء میں شائع ہوئی۔ ٹیلر کا بیان ہے کہ فورٹ سینٹ جارج کالج کے کتب خانہ میں مخطوطات کی تعداد تین ہزار تھی۔[1] یہ ذخیرے میکنزی (Mackenzie) کلکشن، انڈیا ہاؤس کلکشن، اور براؤن کلکشن کے ناموں سے موسوم تھے۔ کرنل میکنزی کا ذخیرہ بہت ہی قیمتی سمجھا جاتا تھا۔ ٹیلر نے اس کے بارے میں لکھا ہے:-

"The most valuable Collections of historical documents relative to India that ever was made by any individual in Europe or in Asia."[2]

ترجمہ: یورپ اور ایشیا کے کسی شخص نے بھی ہندوستان سے متعلق تاریخی دستاویزات کا اتنا قیمتی مجموعہ تیار نہیں کیا ہے۔

میکنزی کی وفات (۱۸۲۱ء) کے بعد ان کا گراں بہا ذخیرہ جو کتابوں اور مخطوطوں کے علاوہ متعدد نقشوں، سکوں اور مجسموں پر مشتمل تھا، کمپنی نے اس کی بیوی سے دس ہزار پونڈ میں خرید لیا۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے سکریٹری پروفیسر ولسن نے اس ذخیرے کی فہرست مرتب کر کے ۱۸۲۸ء میں کلکتہ سے شائع کی تھی۔ یہ فہرست بھی دو جلدوں میں ہے اور "میکنزی کلکشن" کے نام سے مشہور ہے۔ اس ذخیرے کے عربی، فارسی، سنسکرت، جاوی، برمی زبانوں کے مخطوطے، نقشے، سکے اور مجسمے دو قسطوں میں جنوری ۱۸۲۳ء اور جنوری ۱۸۲۵ء میں انگلینڈ روانہ کئے جا چکے ہیں۔[3] باقی ذخیرے جو دراوڑی زبان کی کتابوں اور دکنی مخطوطات پر مشتمل تھا ستمبر ۱۸۲۸ء میں فورٹ سینٹ جارج کالج کے کتب خانے کے حوالے کر دئے گئے۔[4]

---

[1] بحوالہ مدراس میں اردو زبان و ادب کی نشوونما ص ۲۲۱

[2] " " " " "

[3] " " " " " "

[4] ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، جامعہ جنوری ۱۹۸۳ء ص ۵۲

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

اس طرح انڈیا ہاؤس کلکشن اور براؤن کلکشن میں بھی ہندوستان کی تقریباً سبھی کلاسکی زبانوں اور مقامی زبانوں میں کتابیں موجود تھیں ان میں مخطوطات کی تعداد بالترتیب دو ہزار ایک سو چھ اور دو ہزار چار سو چالیس تھی۔[1]

شعبۂ تصنیف و تالیف :-

کالج کے نصاب کو مدنظر رکھتے ہوئے دکنی کے علاوہ عربی، فارسی، ہندوستانی، سنسکرت قانون اور ریاضی سے متعلق کتابیں لکھی گئیں اور شائع کی گئیں۔ دکنی زبانوں میں صرف و نحو اور لغت و قواعد کے علاوہ داستان، تاریخ، سوانح اور اخلاقیات سے متعلق کتابیں تصنیف کی گئیں۔ ڈاکٹر رفیعہ رقم طراز ہیں۔

"ایسٹ انڈیا کمپنی نے جنوبی ہند کی زبانوں میں اردو کی اس قدیم شکل کو "دکنی" نام دے کر اس کی توسیع و اشاعت میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ جہاں کلکتہ میں ہندوستانی کتابیں تیار کی جاری تھیں وہیں مدراس میں اردو کی قدیم شکل دکنی کو رواج دیا جا رہا تھا۔[2]

کالج کا نجی پریس تھا، جس میں کالج کی کتابیں طبع ہوتی تھیں۔ اس پریس میں سب سے پہلے "Harris's Grammar and Dictionary of Hindustani Language." ہندوستانی زبان کا تجزیہ اور اس کی قواعد و لغت، مصنفہ ڈاکٹر ہنٹر ہیرس ۱۷۹۰ء میں شائع ہوئی تھی۔

اساتذہ و طلبہ کو انعام :-

عمدہ اور کارآمد تصنیف پر کالج کا انتظامی بورڈ انعام کا اعلان ... ہمت افزائی کرتا رہتا تھا تاکہ مفید و وقیع کتابیں تیار ہو سکیں۔ نتیجے ... زبانوں میں

---

[1] ڈاکٹر افضل الدین اقبال، جامعہ جنوری ۱۹۸۳ء ص ۵۲-۵۳

[2] ہماری زبان علی گڑھ ۸ ستمبر ۱۹۰۰ء ص ۔

بہت سی گراں بہا کتابیں تصنیف، تالیف یا ترجمہ ہوئیں۔ کالج کے جن مصنفین کو عمدہ تصنیف پر داد و دہش سے نوازا گیا تھا ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔

نام مصنف	تصنیف	انعام کی رقم
(۱) قاضی ارتضا علی خاں خوشنود	نقود الحساب	ایک ہزار روپے
(۲) تراب علی نامی	وسیط النحو	سات ہزار روپے
(۳) مہدی واصف	حدیقۃ المرام فی تذکرۃ العلما و الاعلام	

کالج کے اساتذہ کے علاوہ غیر متعلق مصنفین کو بھی انعام و اکرام دیا جاتا تھا اور ان کی کتابیں شائع کی جاتی تھیں۔

مدراس گورنمنٹ نے ہندوستان کی زبانوں میں سے دو زبانیں سیکھ کر امتحان میں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کے لئے بھی انعام کا اعلان کیا تھا۔ یہ اعلان "یونیڈ سروس گزٹ" میں شائع ہوا تھا جسے مدراس کا اردو اخبار "اعظم الاخبار" نے بھی نقل کیا تھا، وہ لکھتا ہے۔

"یونیڈ سروس گزٹ میں لکھا ہے کہ مدراس کے گورنر جنرل سر ہنری پاٹنجر صاحب بہادر.... اس ملک کے تمام شمشیر بند سرداروں کو اطلاع دیتے ہیں کہ اگر کوئی سرداران سات زبانوں میں سے دو زبانیں یا زیادہ سیکھ کے امتحان دیوے تو اس کو سرکار کیطرف سے ایک مشت ہزار روپے انعام ملیں گے[1]

کالج کا خاتمہ:۔

شروع میں مدراس گورنمنٹ کالج کی ترقی کے لئے بڑی کوشاں تھی، لیکن مرور ایام کے ساتھ ساتھ اس کی دلچسپیاں کم ہوتی گئیں اس کے باوصف ۱۸۵۲ء تک درس و تدریس کے پہلو بہ پہلو تصنیفی و تالیفی سرگرمیاں کسی طرح برقرار رہیں لیکن اس کے بعد کالج کا زوال

---

[1] بحوالہ مدراس میں اردو زبان و ادب کی نشوونما ص ۲۱۹

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

شروع ہوگیا۔ آخر میں فائننس ڈپارٹمنٹ کی طرف سے بھی دو ٹوک جواب مل گیا کہ اب کالج کی امداد ممکن نہیں۔ چنانچہ ۱۸۵۴ء میں اسے ختم کرکے اس کا انضمام مدراس لٹریری سوسائٹی کے ساتھ کردیا گیا[1] اور طلبہ کے امتحان کے لئے بورڈ آف اکزامینیشنز قائم کردیا گیا۔

کالج کی تصانیف :-

کالج میں خاصی تعداد میں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں لیکن وہ سبھی کتابیں زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوسکیں۔ ہم ذیل میں صرف دکنی اردو کی مطبوعہ تصانیف کی فہرست پیش کررہے ہیں، لیکن وثوق سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ فہرست مکمل ہے۔ مزید تحقیق و تلاش سے اس میں اضافہ ممکن ہے۔

۱۔ وسیط النحو — تراب علی نامی
۲۔ حکایات الجلیلہ — منشی شمس الدین احمد
۳۔ اظہر الصلاح — تاج الدین حسین خاں بہجت
۴۔ مرصاد المشتاقین — ،،
۵۔ ایضاح و انکشاف — امیر حیدر بلگرامی
۶۔ فرائض ارتضیہ — ارتضا علیخاں خوشنود
۷۔ مجمع الامثال — از محمد واصف
۸۔ انگریزی ہندی اور فارسی لغت — ،،
۹۔ دلیل ساطع — ،،
۱۰۔ مناظر اللغات — ،،
۱۱۔ انوار سہیلی — منشی محمد بخش بیجاپوری[5]
۱۲۔ اصول فن زبانت — ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور

جن کتابوں کے مصنفین کے نام معلوم نہیں ہوسکے وہ حسب ذیل ہیں :-

۱۳۔ رسالہ حروف تہجی ۱۴۔ تعلیم نامہ، ۱۵۔ صنعت حریر ۱۶۔ میزان الحساب ۱۷۔ قانون خرید و فروخت ۱۸۔ گلستان سہ باب، ۱۹۔ قواعد شکری، ۲۰۔ عربی حکایات لطیفہ ۲۱۔ [illegible]

---

[1] ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ہماری زبان علی گڑھ، ۸ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۹

[5] نجیب اشرف نے اس کا سال اشاعت ۱۸۲۲ء درج کیا ہے۔
نوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۱ء ص ۲۰،
لیکن مسعود حسین خاں نے سنہ طباعت ۱۸۲۴ء لکھا ہے (دہلی [illegible])

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

۲۲۔ بکاولی، ۲۳۔ چہار درویش، ۲۴۔ گلستاں ہندی۔

جو کتابیں طباعت کے مراحل سے نہیں گزریں یہ ہیں۔

۲۵۔ ملکۂ زماں و کام کندلہ، ۲۶۔ سنگھاسن بتیسی، ۲۷۔ ترجمہ گلستاں، ۲۸۔ آئین و قوانین افواج کمپنی علاقہ مدراس، ۲۹۔ فوجی قوانین، ۳۰۔ قوانین تعلیم فوج۔ ۳۱۔ مقالات خمس یا ہندوستانی سلیکشن۔

فورٹ ولیم کالج کی پانچ کتابیں اخلاق ہندی، باغ و بہار، اخوان الصفا، گل بکاولی اور باغ اردو اس کالج میں پڑھائی جاتی تھیں، لیکن یہ کتابیں زیادہ دنوں تک نصاب میں شامل نہ رہ سکیں کیونکہ ان کتابوں کی زبان اور مدراس میں بولی جانے والی ہندوستانی زبان میں بڑا فرق تھا، جسکی وجہ سے طلبہ کو پڑھنے میں پریشانی ہوتی تھی۔ چنانچہ "مقالات خمس" کے نام سے دکنی زبان میں متذکرہ کتابوں کا ایک انتخاب مرتب کیا گیا۔ اس کا تیسرا ایڈیشن "ہندوستانی سلیکشن" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے مرتب کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ مرتب نے اس پر ایک بسیط مقدمہ بھی لکھا ہے، جس میں سبب تالیف کے علاوہ اپنے افسروں کی مدح میں قصائد بھی لکھے ہیں[۴]

ایجوکیشنل کمیٹی کلکتہ۔ ۱۸۳۵ء

ایجوکیشنل کمیٹی ایک سرکاری ادارہ تھا جسے ۱۸۳۵ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد دیسی زبانوں میں کتابیں تیار کرنا تھا، جیسا کہ کمیٹی نے ۱۸۳۵ء کے سالانہ اجلاس میں اعلان کیا تھا کہ "دیسی علم و ادب کا بنانا اس کمیٹی کا مقصد رہے گا اور اس کی مساعی اس جانب رہنی چاہئیں[۵]"، لیکن پانچ سال تک اس کمیٹی نے اس کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں کی جب گورنر جنرل آکلینڈ نے علمی کتابوں کو دیسی زبان میں منتقل کرنے کی طرف توجہ مبذول

---

[۴] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نجیب اشرف کا مضمون نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۶۱ء

[۵] بحوالہ مرحوم دھلی کالج ص ۱۲۰

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

کرائی تو یہ کمیٹی حرکت میں آئی اور ۱۸۴۱ء میں ایک ذیلی کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ ایڈورڈ ریان (Ryan) پرنسپ، ملٹ اور سدرلینڈ اسکے رکن منتخب ہوئے چونکہ گورنر جنرل اور کورٹ آف ڈائرکٹرز کا منشا یہ تھا کہ اس معاملہ میں تینوں احاطوں کو اتفاق سے کام کرنا چاہیئے، چنانچہ بمبئی اور مدراس کے بورڈ آف ایجوکیشن سے مراسلت کے بعد ذیلی کمیٹی نے ایک رپورٹ تیار کی۔ اس رپورٹ کے خاص امور حسب ذیل تھے۔

(۱) صرف دنحو پر کتابیں تیار ہونی چاہئیں۔

(۲) اس کام کے لیئے ایسے مصنفین کا انتخاب کرنا چاہیئے جو بلا معاوضہ یا کم تنخواہ پر کتابیں ترتیب دے سکیں۔

(۳) اس کے بعد علم کی ہر شاخ میں ایسی کتابیں تصنیف کی جائیں جو اخلاقی اور ذہنی ضرورتوں کو پورا کریں۔

(۴) جو کتابیں شائع کی جائیں گی مؤلف کو ان کی اجرت دی جائیگی[1]

اجرت کے سلسلے میں کمیٹی نے یہ تجویز ظاہر کی تھی کہ سائنس کی معمولی ضخامت کی کتاب پر ایک ہزار روپے تک دئے جا سکتے ہیں۔ حسب ذیل موضوعات کی کتابوں کی ترتیب کو اولیت دی گئی تھی۔

(۱) دیسی زبانوں کی ریڈریں۔

(۲) ہندوستان کے بعض اضلاع کے حالات۔

(۳) تاریخ بنگال

(۴) ہندوستان کی عام تاریخ۔

(۵) اخلاقی تاریخ و تعلیم پر ایک رسالہ

---

[1] مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج ص ۲۱-۱۲۰

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

(۷) سلطنتوں اور حکومتوں کے عروج و زوال کی تاریخ، اقوامی نقطہ نظر سے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کتابوں کی تالیف کا منصوبہ بڑا شاندار تھا، لیکن افسوس کہ اس منصوبے پر پوری طرح عمل نہیں ہو سکا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اسے گورنمنٹ کی خاطر خواہ اعانت حاصل نہ ہو سکی اور نہ تو باصلاحیت اور تجربہ کار مصنفین کم تنخواہ پر مل سکے۔ اس کے باوصف عربی، سنسکرت اور ہندوستانی زبانوں میں خاصی تعداد میں کتابیں تیار کی گئیں۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ٹیس (Tytler) نے ایک ریڈر تیار کی جو مدرسوں میں جاری کی گئی۔ مارشمین کی "تاریخ ہند" کے اردو اور بنگلہ ترجمے کے علاوہ دوسری علمی کتابوں کے تراجم بھی ہوئے لیکن سب سے اہم اور مفید کتاب جو اس کمیٹی نے تیار کرائی وہ "بنگالی انسائیکلو پیڈیا" ہے جو ریورنڈ کے۔ایم۔ بنرجی کے زیر نگرانی تصنیف کی گئی تھی۔

آرکیالوجکل سوسائٹی دہلی۔ ۱۸۴۷ء

آرکیالوجکل سوسائٹی ہندوستان کی پہلی سوسائٹی ہے، جسے انگریزوں نے خالص اپنے مفاد کے پیش نظر قائم کیا تھا اور شروع میں صرف انگریزوں کو اس کی ممبری کا حق بھی دیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں ہندوستانیوں کو بھی ایک محدود تناسب میں اس سوسائٹی کا آنریری رکن منتخب کیا گیا۔

دلی اور مضافات دلی کی قدیم عمارتوں سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی غرض سے ۲ر اپریل ۱۸۴۷ء کو آرکیالوجکل سوسائٹی کی داغ بیل ڈالی گئی[1] شروع میں جے۔ ٹامسن سرپرست اور ٹی۔ مٹکاف اس کے سرپرست منتخب ہوئے۔ سوسائٹی نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے خاکوں، نقشوں اور دیگر ذرائع سے دلی اور اس کے گرد و نواح کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی قدیم عمارتوں سے متعلق معلومات فراہم کرنا شروع کیں، لیکن چونکہ ابتدا میں ہندوستانی اس کے رکن نہیں بنائے گئے تھے اس لئے اس کام میں

---

[1] دیوا نیدر کمار گپتا، اردو کے تصنیفی و تالیفی ادارے (غیر مطبوعہ) ص ۸۸

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

دشواریاں پیش آئیں اور انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ ہندوستانیوں کے اشتراک و تعاون کے بغیر یہ کام رو بہ عمل نہیں لایا جا سکتا۔ چنانچہ ۱۸۵۰ء میں مسٹر تھامسن نے سوسائٹی کی تنظیم جدید کی اور ہندوستانیوں کو بھی اس کا ممبر منتخب کیا گیا۔ ان میں سے سرسید کا نام بطور خاص قابل ذکر ہے۔ اس کے بعد سوسائٹی کے ماہانہ جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ ان جلسوں میں قدیم عمارتوں سے متعلق مقالے پڑھے جاتے تھے اور ان مقالوں پر ہر پہلو سے بحث و مباحثہ بھی کیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے "آثار الصنادید" کے دوسرے ایڈیشن میں جو ترمیم و اصلاح کی ہے وہ سوسائٹی کے جلسوں سے حاصل شدہ معلومات پر مشتمل ہے۔

سوسائٹی اپنے زمانۂ قیام میں ایک رسالہ شائع کرتی تھی۔ جس میں سوسائٹی کی نشستوں میں پڑھے گئے مقالوں کو شائع کیا جاتا تھا۔

مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۸۵۸ء

انیسویں صدی کے نصف اوائل تک ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں کی طرح لکھنؤ میں بھی چھوٹے بڑے متعدد پریس قائم ہو چکے تھے لیکن ۱۸۵۷ء کے ہندوستان گیر ستخیز کی وجہ سے بیشتر مطابع چند ہچکیوں کے ساتھ دم توڑ چکے تھے۔ جو ایک دو باقی رہ گئے تھے ان کی حالت بھی کرمک شب تاب سے زیادہ نہ تھی۔ اس ہنگامۂ محشر نے نہ صرف ہماری سیاسی، معاشرتی اور معاشی زندگی کی بساط الٹ پلٹ دی بلکہ ہمارے ذہنی، علمی اور ذخائر کو بھی کافی نقصان پہونچایا، کیونکہ انگریزوں نے ہماری علمی درسگاہوں کو نقصان پہونچانے اور ہمارے علماء و فضلاء کو موت کے گھاٹ اتارنے کے ساتھ ساتھ سرکاری اور نجی کتب خانوں کو بھی جلایا اور ویران کیا۔ محمد ایوب قادری لکھتے ہیں۔

"۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے ہزاروں انسانوں کو قتل کیا اور ہزاروں عمارتوں کو ڈھایا اور منہدم کیا بہت سی درسگاہیں اور مدرسے ویران و برباد ہوئے

سینکڑوں علمار و فضلار اور شعرار و ادبار گولیوں کا نشانہ بنے۔ بہت سے کتب خانے برباد ہوئے۔

سلاطین دہلی کے سینکڑوں برس کے ذخیرے اور علمائے قدیم کی کتابیں برباد ہوگئیں شاہی قلعہ کے کتب خانے کی بربادی سب سے بڑا سانحہ تھا۔ یہ وہ کتب خانہ تھا جس میں ہمایوں کے ذخائر تھے جس میں اکبر کے حکم سے ترجمہ کی ہوئی اور جمع کی ہوئی اور جمع شدہ کتابیں تھیں۔[۱]

یہ دلی کے کتب خانوں کا حال تھا، خود لکھنؤ میں شاہان اودھ کے بیشتر کتب خانوں کو ملیامیٹ کر دیا گیا۔ غدر کے دست برد سے جو گراں بہا مخطوطات اور علمی نوادر بچ رہے وہ بھی ضائع ہو رہے تھے۔ یہ حالات تھے جبکہ منشی نول کشور (۱۹۳۶ - ۱۸۹۵ء) کو ایک مطبع قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس کیلیے انکی نگاہ انتخاب شاہان اودھ کی راجدھانی پر پڑی۔ اس سے قبل وہ کچھ دنوں تک "اخبار سفیر" آگرہ کے مہتمم کی حیثیت سے، بعدازاں چار سال تک منشی ہرسکھ رائے کی ماتحتی میں "مطبع کوہ نور" لاہور میں بھی کام کر چکے تھے۔

دوران قیام آگرہ اور لاہور انھوں نے صحافت اور چھاپہ خانہ کے کام میں کافی مہارت بہم کرلی تھی۔ غدر کے بعد مطبع کوہ نور کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر وہ آگرہ چلے آئے اور اس کے بعد لکھنؤ آکر نومبر ۱۸۵۸ء سے قبل انھوں نے ایک پریس قائم کیا۔ رام بابو سکسینہ کا بیان ہے یہ پریس منٹگمری اور رابیٹ کی سرپرستی میں قائم کیا گیا تھا۔[۲]

کاظم علی خاں پریس کی پہلی جائے قیام کوٹھی غالب جنگ بتاتے ہیں[۳] لیکن اس کے برخلاف مفتی عصمت اللہ لکھتے ہیں کہ منشی نول کشور نے اپنا پریس پہلے آغا میر کی سرائے میں قائم کیا تھا[۴]

---

[۱] جنگ آزادی ۱۸۵۷ء واقعات و شخصیات ص ۶۳-۳۶۲

[۲] تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص ۹۹

[۳] جامعہ، فروری ۱۹۸۱ء ص ۴۸

[۴] نیا دور، اپریل ۱۹۶۵ء ص ۶

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

جس کی تصدیق امیر حسن نورانی[۱] اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی[۲] کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ ابتدا میں منشی نول کشور نے چھوٹے چھوٹے ہینڈ پریس آغا میر کی سرائے (محلہ ڈیوڑھی) میں قائم کیے تھے۔ اس کے بعد انھیں گولہ گنج اور رکاب گنج لے گئے۔ ان دنوں انکے پریس میں سرکاری فارم چھپا کرتے تھے، جنھیں وہ خود اپنے کندھوں پر لاد کر کمشنری لے جایا کرتے تھے۔ جب کام بڑھ گیا اور کچھ رقم بھی جمع ہوگئی تو پریس کو مکتب خانہ سلیمان قدر کی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے بعد حضرت گنج میں مبارک منزل کی عمارت اور اس سے متصل کی زمینیں خریدیں اور ان میں مکانات تعمیر کرا کے پریس اور اس کا سارا دفتر ان عمارات میں منتقل کر دیا۔ اسی اثنا میں کاغذ کی کمی محسوس ہوئی تو کاغذ کا ایک کارخانہ (Paper Mill) بھی قائم کیا۔

منشی نول کشور کا اخبار:-

نول کشور نے اپنے پریس سے ۲۶ر نومبر ۱۸۵۸ء سے "اودھ اخبار" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ یہ اخبار بعد میں اتنا مقبول ہوا کہ ان کے مطبع کو "اودھ اخبار پریس" کے نام سے بھی موسوم کیا جانے لگا۔ اس اخبار کے ابتدائی دو شمارے پندرہ روزہ شائع ہوئے تھے کہ اسے ہفتہ وار کر دیا گیا۔ جو چہارشنبہ کو شائع ہوتا تھا۔ ۱۸۷۰ء سے ہفتہ میں دوبار چھپنے لگا، ۱۸۷۶ء سے سہ روزہ اور بعد میں روزنامہ ہوگیا۔[۳] یہ اخبار پہلے چار صفحات پر مشتمل تھا، بعد میں سولہ صفحے کا کر دیا گیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے خاص تہواروں مثلاً ہولی، دیوالی اور عید، بقرعید پر اس کے خاص نمبر شائع ہوتے تھے، جس کی ضخامت کبھی کبھی ۴۸ صفحات تک ہو جاتی تھی۔

اس اخبار کو اپنے عہد کے اخباروں میں ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ شمالی ہند میں

۱؎ تعمیر ہریانہ (نول کشور نمبر) جولائی اگست ۹۷۰ء ص ۲۹

۲؎ نیا دور (منشی نول کشور نمبر) نومبر دسمبر ۱۹۸۰ء ص ۶۲

۳؎ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ایضاً ص ۶۲

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

نکلنے والا کوئی اخبار اس سے زیادہ ثقہ و معتبر خبریں شائع نہیں کرتا تھا، کیونکہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے علاوہ بعض یوروپین ممالک میں بھی اس کے نامہ نگار موجود و مقرر تھے انگلینڈ میں اس کے لئے خبر رسانی کا کام مسٹر اے ایچ پارس کر رہے تھے، جو کیمبرج کے کسی کالج میں پروفیسر تھے۔ اس اخبار کی اہمیت اس لئے بھی تھی کہ مطبع نول کشور سے شائع ہونے والی علمی و ادبی کتابوں کے اشتہارات بھی شائع کئے جاتے تھے۔ اس اخبار کے متعلق سرسید احمد خاں کے بڑے اچھے تاثرات تھے اور گارسن ڈی ٹسی نے بھی اپنے خطبات میں اس کی بڑی تعریف و توصیف کی ہے۔

۸ جنوری ۱۸۶۲ء کو منشی نول کشور نے "اودھ اخبار" میں ایک مضمون شائع کیا، جس سے پریس کے تقسیم کار اور تنظیم کام پر روشنی پڑتی ہے۔ ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے (۱) ڈبلیو والٹر (سپرنٹنڈنٹ انگریزی پریس) (۲) راس مس (ہیڈ اکاؤنٹنٹ) (۳) مولوی محمد ہادی علی (مصحح مطبع) (۴) منشی شیو پرشاد (منیجر مطبع) (۵) شیخ نثار علی (داروغہ مطبع سیتھو گرافک) (۶) میر حشمت علی (مصحح سنگ) (۷) شیخ امیر علی (نقاش) (۸) علی محمد خاں (پرنٹر) منشی موصوف کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت مطبع میں تین سو آدمی کام کرتے تھے[۱] متذکرہ بالا اشخاص کے علاوہ جن کے نام انھوں نے اپنے مضمون میں دئے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

کلاڈیس، گومس، الیکزنڈر، منشی من پھول، منشی امیر اللہ تسلیم، منشی اشرف علی اشرف، منشی گوبند پرشاد فضا، (مصنف گلزار فضا) منشی جوالا پرشاد، منشی امداد حسین حافظ علی بخش، لالہ پیارے لال اور لالہ جانکی پرشاد[۲]

---

[۱] بحوالہ نیا دور (منشی نول کشور نمبر) نومبر دسمبر ۱۹۸۰ء ص ۱۷۔

[۲] بحوالہ نیا دور اپریل ۱۹۶۵ء ص ۸۔ صباح الدین بلال نے موصوف کے اسی مضمون کے حوالہ سے یہی نام درج کئے ہیں۔ لیکن ان میں کسی انگریز کا نام شامل نہیں (نیا دور منشی نول کشور نمبر نومبر دسمبر ۱۹۸۰ء ص ۷۱)

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

اس تفصیل سے اس امر کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ منشی نول کشور ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے تھے، انگریزی پریس کا نگراں انگریزی ہوا کرتا تھا۔

اخبار کے چند اہم ایڈیٹر:-

منشی نول کشور ہندوستان کے زیرک و عاقل اور لائق و فاضل لوگوں کو اودھ اخبار کا ایڈیٹر مقرر کرتے تھے۔ اخبار کی ۹۲ سالہ زندگی میں اس کے قریب تیس چالیس ایڈیٹر مقرر کیے گئے۔ ان میں منشی امیر اللہ تسلیم، قدر بلگرامی (شاگرد غالب)، پنڈت رتن ناتھ سرشار، نسیم دھلوی، مولانا عبدالحلیم شرر، مرزا حیرت دہلوی، شیو پرشاد، نوبت رائے نظر، دوارکا پرشاد داتق، پنڈت بشن نرائن در، مرزا یاس یگانہ چنگیزی، پیارے لال شاکر میرٹھی، منشی پریم چند، مرزا محمد عسکری، شوکت تھانوی اور امین سادنی کے نام قابل ذکر ہیں[1]۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار جب اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور ان کا "فسانہ آزاد" قسط وار اخبار میں چھپنے لگا تو اس کی شہرت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ بقول ضیاء الدین اصلاحی اس کی تعداد بڑھ کر بارہ ہزار تک پہونچ گئی تھی[2]۔

مطبع نول کشور کا شعبۂ تصنیف و تالیف:-

اس مطبع کی حیثیت محض ایک پریس کی نہ تھی، بلکہ اس کا سب سے اہم جزو اس کا شعبۂ تصنیف تھا۔ ہندوستان کے قابل اور مایۂ ناز قلم کار، شاعر اور مترجمین کسی نہ کسی طرح اس سے وابستہ تھے۔ اس شعبے کا مقصد تھا۔

---

[1] ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، نیا دور (منشی نول کشور نمبر)، نومبر ۱۹۸۰ء، ص ۴۳

[2] ضیاء الدین اصلاحی، ایضاً ص ۶۰

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

(۱) قدیم مستند کتابوں کے جو مسودات حاصل ہوں ان کی صحت اور حسب ضرورت مفید حواشی کا اضافہ، مصنف یا مؤلف کا تعارف وغیرہ لکھنا۔
(۲) مکاتب، مدارس اور اسکولوں کے بچوں کے لئے نصابی کتابیں تیار کرنا اور طلبہ کیلئے مفید اور غیر نصابی کتابیں، فرہنگ ولغات کی ترتیب وتالیف کرنا۔
(۳) قدیم فارسی، عربی اور سنسکرت کی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کرنا۔
(۴) اردو فارسی کتابوں کے ترجمے ہندی میں اور بعض اہم کتابوں کے ترجمے انگریزی میں کرنا۔
(۵) انگریزی زبان کی اچھی اور مفید کتابوں کے ترجمے اردو اور ہندی زبانوں میں کرنا[۱]

شعبۂ تصنیف وتالیف کے چند اہم ملازمین :-

منشی نول کشور نے مطبع کے شعبۂ تصنیف میں ایسے لوگوں کو ملازم رکھا تھا جو حاشیہ نگاری، تقریظ نگاری، دیباچہ نگاری، ترتیب، تصحیح اور ترجمے کے کام میں ماہر تھے، وہ لوگ شعبہ سے دو طرح سے وابستہ ہوتے تھے۔ اولاً وہ لوگ جو مستقل اور باضابطہ طور پر ملازم تھے اور پریس کی عمارت میں کام کرتے تھے، جن کا باقاعدہ مشاہرہ مقرر ہوتا تھا ثانیاً وہ لوگ جو اپنے گھروں پر کام کرتے تھے اور خط وکتابت کے ذریعے تالیف یا ترجمے کا معاملہ طے کرتے تھے۔ مولانا سید امیر علی ملیح آبادی[۲]، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا احتشام الدین مرادآبادی، مولانا فخر الدین، مفتی سرور لاہوری، مولانا فضل احمد، مولانا خرم علی، مرزا ہادی علی اشک، مولانا قطب الدین، طوطا رام شایاں، مولانا عابد حسین جعفری، تصدق حسین

---

[۱] ڈاکٹر انوار الحسن، نیا دور (منشی نول کشور نمبر)، ص ۵۷
[۲] یہ مدرسہ عالیہ کے صدر مدرس اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پرنسپل بھی رہ چکے تھے۔
[۳] ڈاکٹر انوار الحسن، نیا دور (منشی نول کشور نمبر)، ص ۵۷

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

مرزا محمد عسکری، امیراللہ تسلیم، منشی انوار حسین تسلیم، کالکا پرشاد موجد، رہبی، سید امین حسن، امجد حسین وغیرہ اس کے باضابطہ ملازم تھے۔ اپنے گھروں پر کام کرنے والوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ جن میں خواجہ عبدالمجید خاں، مولوی بشارت علی، مولوی محمد اسماعیل میرٹھی، مولانا عبدالحق بریلوی، منشی گوکل پرشاد، ڈپٹی نذیر احمد، سید مہدی حسن، مولوی امانت اللہ، غالب، مردان علی خاں وغیرہ کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

مطبع نول کشور کی چند ادبی کتابیں:-

مطبع نول کشور سے ہندو، مسلمان، عیسائی اور سکھوں کی مذہبی کتابیں ہندی، سنسکرت، اردو، عربی، فارسی، انگریزی اور گرمکھی میں ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوئیں۔ علاوہ بریں گنتی، پہاڑے، ابتدائی درسیات، لغات[1]، داستانیں[2]، شعرائے اردو کے دواوین اور ادب سے متعلق دوسری کتابیں اور مختلف علوم و فنون خاص طور پر طب کی کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہوئیں۔ ان کتابوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ جو مضمون کی طوالت کے پیش نظر درج نہیں کی جا سکتی۔ اردو ادب سے متعلق چند اہم اور غیر فانی کتابوں کے نام ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔

بحر الفصاحت مؤلفہ نجم الغنی، تاریخ ادب اردو مترجم مرزا محمد عسکری، رام بابو سکسینہ کی

---

[1] عربی فارسی اور اردو کے ۲۶ لغات اب تک شائع ہو چکے ہیں، یہ لغات طبی لغات کے علاوہ ہیں، ان میں بعض لغات منشی نول کشور نے مدون کرائے تھے مثلاً "لغات کشوری" جس کے اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

[2] اس مطبع سے متعدد داستانیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں سب سے ضخیم "داستان امیر حمزہ" ہے اس کے آٹھ دفتر ہیں۔ ہر دفتر میں صدہا صفحات کی کئی کئی جلدیں ہیں۔ اس کے علاوہ بوستان خیال، ہرمز نامہ، صندلی نامہ، توج نامہ، ایرج نامہ، طلسم ہوش ربا، بوستان مخفی، ترجمہ الف لیلہ (نظم و نثر) باغ و بہار، فسانۂ عجائب وغیرہ ہیں۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

انگریزی کتاب "History of Urdu Literature" کا ترجمہ جو اس موضوع پر پہلی جامع کتاب ہے، تذکرہ شمیم سخن، تذکرۂ خواتین، اردو شاعری کی مختصر تاریخ، تاریخ اردوئے قدیم۔ اس ضمن میں شعرائے اردو کے ضخیم کلیات و دواوین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مثلاً کلیات میر، کلیات آتش، دیوان ناسخ، کلیات سودا، دیوان میر حسن، کلیات نظیر اکبرآبادی، دیوان خواجہ میر درد، دیوان قلق، دیوان شہید، گلدستہ امانت، مراثی انیس، مراثی دبیر، مثنوی سحرالبیان، گلزار نسیم وغیرہ۔

مطبع کا اصل مرکز لکھنؤ تھا، لیکن الہ آباد، کانپور، آگرہ، دہلی، لاہور، پٹیالہ، اجمیر، جبلپور وغیرہ میں بھی اس کی شاخیں قائم تھیں۔ کتابوں کی طباعت کی دلکشی اور دیدہ ریزی کی وجہ سے بیرون ممالک مثلاً افغانستان، ایران، جاوا، سماترا، لندن، ٹرکی برما، عراق، بخارا اور افریقی ملکوں سے بھی کتابوں کی طباعت کے آرڈر آتے تھے۔ دنیا کے چھوٹے بڑے مشرقی کتب خانوں میں اس مطبع کی شائع شدہ کتابیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی کے بقول میں نے ان (نول کشور) کے مطبع کی چھپی ہوئی کتابیں تاشقند، سمرقند، تہران، لندن اور نیویارک میں دیکھی ہیں[1]

منشی نول کشور کی موت کے بعد ان کے بھتیجے اور متبنیٰ بیٹے منشی پراگ نرائن اور انکے بعد ان کے بیٹے منشی بشن نرائن اس مطبع کے وارث اور مہتمم رہے۔ آج بھی یہ مطبع ان ہی کے اخلاف کی ملک ہے لیکن اس کی حیثیت اب صرف پریس کی رہ گئی ہے۔ اس کا شعبۂ تصنیف و تالیف بہت پہلے ختم ہو چکا ہے۔

اردو زبان و ادب کی جتنی خدمت مطبع نول کشور نے کی ہے اتنی خدمت ہندوستان کے کسی پریس نے نہیں کی۔ اردو زبان و ادب کی کوئی تاریخ اس مطبع کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گی۔

---

[1] نیا دور (منشی نول کشور نمبر) نومبر دسمبر ۱۹۸۰ء ص ۱۲

محمڈن لٹریری سوسائٹی، کلکتہ ۱۸۶۳ء

اپریل ۱۸۶۳ء میں بنگال کی مجلس قانون ساز کے ایک رکن مولوی عبداللطیف خاں نے محمڈن لٹریری سوسائٹی کی داغ بیل ڈالی۔ اس سوسائٹی کی مجلس منتظمہ حسب ذیل اصحاب پر مشتمل تھی:-

(۱) سرپرست	سر ولیم گرے	بنگال کے لفٹننٹ گورنر
(۲) صدر	قاری عبدالباری	
(۳) نائب صدر	مولوی عباس علی خاں	
(۴) سکریٹری	مولوی عبداللطیف خاں	

محمد رحیم الدین، مولوی قاسم علی، مولوی عبدالرؤف، مولوی عبدالحکیم، شیخ عیسیٰ بن طاس، سید مرتضیٰ سہسائی، ڈاکٹر میر اشرف علی، مولوی سید علی، مرزا احمد بیگ اور منشی ...لطافت حسین اس کے اراکین منتخب ہوئے۔ اس سوسائٹی کا ایک جلسہ مولوی عبداللطیف ...قیام گاہ واقع تال تلہ لین پر ہوا کرتا تھا۔ بقول ڈی ٹی اس انجمن کا مقصد قومی ادبیات ...روغ دینا تھا۔ نیز ادب، سائنس اور عمرانیات پر تقریروں، مقالوں اور مباحثوں کے ...یعے مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ تک مفید معلومات بہم پہونچانا تھا۔ یہ تقریریں اور مباحثے اردو ...ی یا عربی میں ہوا کرتے تھے۔ علاوہ بریں اس کے سالانہ جلسے میں سائنس کے نئے نئے کرشموں ...ی ہندوستانیوں کو مبہوت و محظوظ کیا جاتا تھا۔

...ر حسین آزاد نے اس کا نام "انجمن اسلامی کلکتہ" لکھا ہے (مقالات آزاد ص ۱۱۲) بعض لوگوں نے اس کا نام "مجلس مذاکرۂ علمیہ" بھی لکھا ہے۔

...ن لال، نوائے ادب اپریل ۱۹۵۲ء ص ۲۰۔

...یات گارساں دتاسی ص ۵۰۰۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

۲ر اپریل ۱۸۷۰ء کو اس کا سالانہ جلسہ بڑے اہتمام کے ساتھ منایا گیا۔ جس میں بنگال کونسل کے ارکان کے علاوہ مدراس کے گورنر، مسلمان رؤسا و امرا اور ہندو، یہودی اور پارسی تجار بھی شریک جلسہ ہوئے۔ محمد حسین آزاد کے بقول شرکا کی تعداد دو ہزار آدمی سے کم نہ تھی[1] آزاد نے اس جلسے کی بڑی تعریف و توصیف کی ہے۔ وہ اس جلسے میں موجود تھے، چنانچہ انہی کی زبانی سنیئے۔

"..... طلسمات اور کیمیا کے عجیب عجیب طلسم دکھائے گئے۔ ایک کمرے میں سے دس بجے رات کے آفتاب نکلنا شروع ہوا۔ بعینہٖ صبح کا رنگ تھا۔ یعنی اول تو ہلکی ہلکی شعاعیں نکلیں پھر دھوپ کی درجہ بہ درجہ تمازت محسوس ہونی شروع ہوئی۔ اس آفتاب کی طرف دیکھنے سے اسی طرح آنکھوں کو خیرگی حاصل ہوتی تھی۔ ماہ نخشب سنتے تھے وہاں آنکھوں سے رات کو آفتاب نکلا دیکھا۔ دوسرے کمرے میں بادل گرجتے تھے، بجلی چمکتی تھی۔ غرض برسات کا سارا سماں تھا۔ مینہ اس سے (کذا = لیے) نہیں برسایا کہ اہل مجلس کو تکلیف ہو، نہیں تو یہ بھی ممکن تھا۔ ہر کمرے میں تار برقی لگا ہوا تھا جس کا جی چاہتا تھا دوسرے کمرے میں پیغام سلام بھیجتا تھا جو چاہتا تھا اس پر خبر بھیج دیتا اور منگا لیتا۔ کچھ کسی کو ممانعت نہ تھی۔ اس کے علاوہ ہر طرح کے گلبن اور انواع و اقسام کے تجربے ہو رہے تھے۔ ایک کمرے میں سامانِ ضیافت نعمت ہائے بوقلموں کا موجود تھا، جو جس کو مرغوب تھا بے تکلف کھاتا تھا۔[2]"

انجمن پنجاب اور اس سوسائٹی میں روابط پیدا کرنے کے لئے آزاد نے مراسلت شروع کی تھی، جس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ اس سوسائٹی نے نئے نئے ایجادات سے ہندستانیوں کو روشناس کرانے میں اہم رول ادا کیا ہے اس کے جلسوں میں پڑھے گئے مقالوں اور تقریروں کو اس عہد کے اخبارات بڑے شوق سے شائع کرتے تھے۔ انجمن کے مصنفین کی ہمت افزائی

---

[1] مقالات آزاد ص ۱۱۳

[2] ایضاً ۱۱۴

کے لئے چھ ہزار روپے سالانہ کی رقم مقرر تھی اور اس کے لئے "حیات اورنگ زیب" ہندی مسلمان، انجمن اور اس کے کل پرزے اور مطبع کی تاریخ اور تمدن پر اس کے اثرات کے عنوانات مقرر پائے تھے۔[1]

انجمن پنجاب، لاہور ۱۸۶۵ء

گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر اور پنجاب کے دوسرے اعلیٰ افسروں کے ایما سے پنڈت من پھول (اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر) نے ۲۱ فروری ۱۸۶۵ء کو شت سبھا کے دفتر (راجا دھیان سنگھ کی حویلی) میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ

"اے صاحبان! ہم کئی برسوں سے اس فکر میں تھے کہ مثل کلکتہ و لکھنؤ وغیرہ کے اس شہر میں بھی جو دارالسلطنت پنجاب ہے، ایک مجلس رئیسانِ نامی گرامی، عالم و فاضل شائق ہر علم و ہنر کے ایسی مقرر کی جائے کہ جس میں تنقیح مطالب مفیدۂ پنجاب و ترقیِ علم و ہنر کی تحریراً و نیز تقریراً عمل میں آکر بذریعہ چھاپہ منتشر ہوا کرے۔"[2]

دوران تقریر پنڈت موصوف نے ڈاکٹر لائٹنر کا تعارف بھی کرایا۔ اس کے بعد لوگوں کے مشوروں سے ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ اس انجمن کا نام پنڈت من پھول نے "انجمن مطالب مفیدۂ پنجاب" تجویز کیا، جسے سبھی لوگوں نے پسند کیا۔ لیکن بعد کے مصنفوں نے اس کا نام صرف "انجمن پنجاب" لکھا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۴۱ء ہی سے لاہور میں اقامت گزیں تھے اور فروری ۱۸۶۰ء سے وہ سررشتۂ تعلیم پنجاب میں ملازم بھی ہو گئے تھے۔ انھوں نے علمی کارکردگی کی وجہ سے ارباب بست و کشاد میں بڑی شہرت و مقبولیت حاصل کر لی تھی، چنانچہ انھیں اس انجمن کا

---

[1] ڈی۔ٹسی، خطبات گارساں دتاسی ص ۵۰۰

[2] بحوالہ مقالات آزاد ص ۱۰

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

سکریٹری منتخب کیا گیا۔ ڈاکٹر لائٹنر صدر مقرر ہوئے اور منشی ہرسکھ رائے جو اخبار "کوہِ نور" کے اڈیٹر تھے، شعبۂ فارسی کے سکریٹری اور انگریزی شعبہ کے سکریٹری بابو نوبین چندر منتخب ہوئے اور اس کے ساتھ اس کے اراکین کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔ اسی روز ایک کتب خانہ بھی قائم کیا گیا جس میں لوگوں نے کثیر تعداد میں کتابیں تفویض کیں۔

اس انجمن نے اہلِ وطن کی قابلِ رشک خدمات انجام دیں۔ اس کے اراکین کی کوششوں سے نہ صرف پنجاب بلکہ پورے ملک میں یہ روشنی کا مینار بن گئی اور ہر جگہ اسکی شاخیں بھی قائم ہو گئیں۔ آغا محمد باقر اس انجمن کی کوششوں اور سرگرمیوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس انجمن کے زیرِ اثر اہلِ پنجاب نے اپنی حالت سنوارنے کی جدوجہد شروع کی اور اراکین کی کوششوں سے بہت کم وقت میں اہلِ ملک میں بیداری کے آثار پیدا ہو گئے۔ عیش پسند اور جھول ذہنوں میں قوتِ عمل بیدار ہوئی اور اس نے بہت جلد ایک عہد آفریں جدوجہد کی صورت اختیار کر لی[1]"

انجمن کی اس شہرت و مقبولیت کے پیشِ نظر حکومتِ پنجاب اپنے انتظامی امور میں اس سے رائے طلب کرنے لگی۔ کوئی نیا قانون نافذ کرنے سے پہلے حکومت اس کے عندیہ سے آگاہ ہونا چاہتی تھی۔ بہر حال اس انجمن کی حیثیت آج کل کی قومی اسمبلی کی ہو گئی تھی جس کی صدائے بازگشت پورے ملک میں سنائی دیتی تھی۔

اس انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ "پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی" (Punjab Text Book Committee) اور "لاہور بک ڈپو" کا قیام ہے۔ اس بک ڈپو نے ملک کی تعلیمی ضرورتوں کے پیشِ نظر تصنیف تالیف اور ترجمہ کا سلسلہ شروع کیا۔ ملک کے چیدہ اور تجربہ کار قلم کار کو اس ڈپو میں ملازم رکھا گیا۔ آشوب اور مولانا حالی اس کے ملازم تھے۔ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حالی کے ذہن میں جو ادبی انقلاب پیدا ہوا وہ اسی کے ماحول کی رہینِ منت ہے۔

---

[1] مقالاتِ آزاد ص ۱۳

انجمن کا جلسہ مہینے میں ایک بار ہوتا تھا، جس میں اراکین انجمن تقریریں کرتے اور مقالے پڑھتے تھے۔ محمد حسین آزاد کے مقالے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ ادب کے علاوہ دوسرے علمی و معاشرتی موضوعات پر بھی تقریریں کرتے تھے۔ ان کے مقالے اور تقریریں انجمن کے رسالہ "رسالۂ انجمن پنجاب" میں شائع کی جاتی تھیں۔ اس رسالے کی ادارت بھی آزاد ہی کے سپرد تھی۔ انجمن پنجاب کے زیر اہتمام جدید مشاعرے کی بنیاد ڈالی گئی، جس نے اردو شاعری کو فرسودہ روش سے تعرض میں بڑی مدد کی۔ اس انجمن نے اپنے عہد میں اتنی مقبولیت حاصل کرلی تھی کہ بیرون ممالک کے اخبارات اس کی خبروں اور سرگرمیوں کو جگہ دینے لگے تھے۔ گارسن ڈی تاسی اس کا رکن اور "رسالۂ انجمن پنجاب" کا خریدار تھا۔ اس نے اپنے خطبات میں اس کی بڑی تعریف کی ہے۔

دھلی سوسائٹی ۱۸۶۵ھ

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ہندوستان میں خصوصاً شمالی ہند میں متعدد سوسائٹیاں معرض وجود میں آئیں، ان میں اکثر و بیشتر سوسائٹیاں ایک دوسرے کی ریس میں قائم ہوئی تھیں اس ریس ورشک اور ہم چشمی کے نتیجہ میں دھلی سوسائٹی بھی وجود میں آئی۔

۲۸ جولائی ۱۸۶۵ء کو کمشنر دھلی کرنل ہیملٹن نے اپنی کوٹھی پر ایک جلسہ منعقد کیا جس میں سرکاری افسروں کے علاوہ دلی کے ارباب علم اور یورپی باشندوں نے شرکت کی۔ مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے موصوف نے کہا کہ

" پنجاب اور لکھنؤ کی سوسائٹیوں کو مثالوں میں رکھتے ہوئے ہمیں [illegible] بنیادوں پر ایک سوسائٹی کی داغ بیل ڈالنی چاہئے جہاں ہم ایک ساتھ [illegible] تبادلۂ خیال کرسکیں یا مقالہ پڑھ سکیں۔ اور اس طرح علم کی شمع کو [illegible] تہذیب کے اس مرکز (دھلی) کو علمی اور ثقافتی سرگرمیوں میں پیچھے نہیں رہنا چاہئے"[1]

---

[1] بحوالہ نوائے ادب، اپریل ۱۹۵۲ء ص ۳۰

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

چنانچہ اس جلسے میں دھلی سوسائٹی کی داغ بیل ڈالی گئی۔ جس کے حسب ذیل مقاصد قرار پائے۔

"بحث ومباحثہ اور مشاعروں کے ذریعہ ادبیات تاریخ، آثار قدیمہ، علم سکہ، ادب لطیف کی توسیع وترقی اور لوگوں میں ان کے لئے ذوق پیدا کرنا۔"[۹]

اس کے علاوہ سوسائٹی کے مقاصد میں ایک کتب خانے کا قیام، ایک رسالے کا اجرا، انگریزی کتابوں کے تراجم تیار کرنا اور دیسی زبانوں کے مترجمین کو ترجمے کے کام میں مدد پہونچانا بھی داخل تھا۔

ابھی تک سوسائٹی کا نام متعین نہیں ہوا تھا اور نہ تو اس کے عہدے داروں کا انتخاب ہی عمل میں آیا تھا، کیونکہ مذکورہ بالا تجاویز کو قبول انام کی سند حاصل کرنے کیلئے یہ طے پایا کہ یکم اگست کو ایک عام جلسہ بلایا جائے، چنانچہ یکم اگست ۱۸۶۵ء کو ایک عام جلسہ منعقد کیا گیا جس میں سوسائٹی کا نام "دھلی سوسائٹی" قرار پایا اور حسب ذیل اشخاص اس کے عہدیدار منتخب ہوئے۔

(۱) سرپرست — کرنل ہمیلٹن کمشنر دھلی
(۲) صدر (الف) — لیلٹین مک موہن نائب کمشنر دھلی
(۳) صدر (ب) — مرزا الٰہی بخش
(۴) نائب صدر — لالہ صاحب سنگھ صاحب
(۵) معتمد اعزازی — ڈبلیو۔ کولڈ اسٹریم جج اسمال کاز کورٹ
(۶) معتمد — پیارے لال آشوب

اس کے علاوہ مزید اکیس ارکان مجلس منتظمہ کے منتخب ہوئے، جن میں دلی کالج کے پرنسپل مولوی ضیاء الدین مدرس دہلی کالج وغیرہ شامل تھے۔ ان ارکان میں مرزا غالب کا نام نہیں تھا، ان کا نام اس کے بعد کے اجلاس منعقدہ ۱۱ر اگست ۱۸۶۵ء کو شامل ہوا

---

[۹] سجن لال، نوائے ادب، اپریل ۱۹۵۲ء ص ۲۰

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

اس جلسے میں سوسائٹی کی رکنیت کے لئے آٹھ آنہ ماہانہ چندہ لازم قرار پایا۔ چنانچہ جو ممبر چندہ دینے سے احتراز کرتا تھا اس کا اخراج کر دیا جاتا تھا۔ شروع میں اس کے ارکان کو سوسائٹی کا رسالہ خریدنا پڑتا تھا، لیکن ۱۸۴۲ء سے انھیں بلامعاوضہ دیا جانے لگا۔ سوسائٹی نے اپنے قیام کے ابتدائی زمانے میں عطیات وچندہ وغیرہ سے دو ہزار روپے جمع کر لئے تھے۔ اگست ۱۸۶۲ء میں ۱۵سو روپے ایک فی صد سود کی در سے نائب صدر لالہ صاحب سنگھ صاحب کی تحویل میں دے گئے اور پانچ سو روپے سوسائٹی کے لوازمات اور کتابوں پر صرف کئے گئے۔

سوسائٹی کے اہم جلسے :-

سوسائٹی کے دو جلسے (۱) جلسۂ خاص اور (۲) جلسۂ عام ہفتہ میں ایک بار ہوا کرتے تھے اور دونوں جلسے ممکنہ طور پر منگل ہی کو رکھے جاتے تھے۔ جلسے کی کارروائی حسب ذیل طریقے پر انجام پاتی تھی۔

(۱) سابق جلسوں کی روداد اور اس کی منظوری
(۲) مقالہ خوانی اور ان پر بحث ومباحثہ
(۳) سکریٹری کی طرف سے پیش شدہ دیگر امور پر بحث

سوسائٹی کی یہ ایک روایت بن چکی تھی کہ حکومت کا کوئی اہم اور مقتدر شخص جب دلی تشریف لاتا تو سوسائٹی اس کی خدمت میں سپاسنامے اور ایڈریس پیش کیا کرتی تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ سوسائٹی کی مختصر تاریخ بھی بیان کی جاتی تھی۔

۲۳ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو سوسائٹی کے سرپرست دم[illegible] کرنل ہیملٹن نے سوسائٹی کے اراکین کو مطلع کیا کہ گورنر جنرل کی تشریف آوری متوقع ہے۔ چنانچہ سپاسنامہ پیش کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ گورنر جنرل میکلوڈ دلی تشریف لائے اور یہاں انھوں نے دربار عام بھی کیا۔ اس دربار میں سوسائٹی کی جانب سے ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ اس وقت سوسائٹی کے رجسٹر میں ۱۲۴ ممبروں کے نام تھے، جن میں ۹۰ ہندوستانی

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

اور باقی یورپین تھے[1] اس سپاسنامے میں ان عطیات کا ذکر ہے، جو مقالوں کی شکل میں سوسائٹی کے ارکان کی جانب سے پیش کئے گئے تھے۔ مقالہ نگاروں کے نام ہیں، منشی حکم چند، پنڈت بشیشور ناتھ، پیارے لال آشوب، احمد خاں، مولوی الطاف حسین، مرزا غالب مرزا شمس الدین احمد خاں، لالہ لکھمی نرائن اور منشی جیون لال۔

اس موقع پر سوسائٹی کے سکریٹری پیارے لال آشوب نے گورنر جنرل سے گذارش کی کہ وہ سوسائٹی کا مربی اعلا ہونا قبول کر کے سوسائٹی کی عزت افزائی فرمائیں اور اس کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کریں۔

جب سوسائٹی کا کوئی عہدہ دار استعفیٰ دیکر باہر جاتا، تو اس کی خدمت میں بھی اسی طرح کے سپاسنامے پیش کئے جاتے تھے۔ اس ضمن میں سب سے پہلا سپاسنامہ سوسائٹی کے آنریری سکریٹری کولڈ اسٹریم کی خدمت میں ۱۸۶۵ء ہی میں پیش کیا گیا جبکہ ان کا تبادلہ لاہور کے لئے ہو گیا تھا۔ سوسائٹی نے ان کے اعزاز میں ایک خاص جلسہ منعقد کیا، جس میں غالب کا لکھا ہوا یہ سپاسنامہ پیش کیا گیا۔

"صاحب جمیل المناقب.... جناب مستطاب ولیم کولڈ اسٹریم صاحب بہادر سے عرض کیا جاتا ہے کہ آج دہلی میں جو شخص حق گزار اور حق شناس ہے، آپ کے تشریف لے جانے سے بہت غمگین اور اداس ہے۔ آپ کے باعث سے اس شہر میں علم نے وہ رواج پایا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے دلی کو خطۂ یونان بنایا۔ انبیاء کے معجزوں میں بڑا معجزہ ہے مردے کو جلانا، مگر ہمارے نزدیک اس سے کم نہیں ہے جاہل کو عالم بنانا... روح، مربی جسم کی اور علم، مربی عقل کا ہے۔ دانش مند لوگ کیوں نہ جانیں کہ علم رتبے میں روح سے سوا ہے۔

آپ جس ملک میں تشریف لے جائیں گے، جیسا یہاں والوں نے آپ سے فیض پایا ہے وہاں والے بھی فیض پائیں گے۔ ....

---

[1] سجن لال، نوائے ادب، اپریل ۱۹۵۲ء ص ۲۳

معہذا، یہ بات بھی دل نشین ہے اور ہم کو یقین ہے کہ ہمارے حضرت کہیں رہیں گے ہم کو بھول نہ جائیں گے اور وہیں سے ہماری ترقی میں توجہ فرمائیں گے۔[1]"

خاتمے پر سوسائٹی کے صدر مرزا الٰہی بخش کا نام لکھا ہوا ہے اور اس کے نیچے ۴۳ ارکان کے دستخط ہیں، جن میں پچیس دستخط اردو اور اٹھارہ انگریزی میں ہیں۔[2]

جنوری ۱۸۶۷ء میں سوسائٹی کے بانی اور سرپرست کرنل ہیملٹن نے اپنا استعفا پیش کیا تو ان کے اعزاز میں بھی ایک جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں ایک الوداعی سپاسنامہ پیش کیا گیا تھا۔

سوسائٹی کے سکریٹری پیارے لال آشوب کا تقرر جب لاہور بک ڈپو میں ہو گیا تو انھوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ ۹ دسمبر ۱۸۶۸ء کے جلسے میں ان کا استعفا منظور ہوا۔[3] اور اسی جلسے میں سوسائٹی کی طرف سے ان کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا تھا، جس پر سوسائٹی کے ارکان کے دستخط تھے۔ مرزا غالب نے اپنی دستخط کے ساتھ یہ جملہ بھی لکھا تھا کہ

"فقیر اسداللہ خاں غالب کہتا ہے کہ بابو پیارے لال کی مفارقت کا جو غم و اندوہ ہے وہ میرا جی جانتا ہے۔ بس اب میں نے جانا کہ میرا دلی میں کوئی نہیں رہا۔[4]"

کتابوں کی ترتیب وطباعت میں سوسائٹی کا تعاون :-

سوسائٹی مشرقی کتابوں اور مخطوطوں کی ترتیب و تدوین میں حکومت کی مدد کرتی تھی۔ اس نے عطیات اور رکنیت کی فیس وغیرہ سے معتدبہ رقم جمع کر لی تھی، جس کا ایک

---

[1] اردوئے معلی، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین ص ۴۵-۱۱۴۴

[2] ایضاً ص ۱۱۴۵

[3] مختار الدین، احوال غالب ص ۱۹۰

[4] بحوالہ مرحوم دہلی کالج، ص ۱۶۷، اور احوال غالب ص ۱۹۲

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

حصہ انگریزی کتابوں کے تراجم کی طباعت و اشاعت کیلئے مخصوص تھا۔ سوسائٹی کے نائب سکریٹری لچھمن داس نے ولسن کی "رگ وید" اور رائیسری سنگھ نے "The History of America" کو اردو میں منتقل کیا۔ اس کے علاوہ سوسائٹی پرانی کتابوں اور مسودوں پر نظر ثانی کر کے ان کی طباعت و اشاعت کے لئے گورنمنٹ سے سفارش کیا کرتی تھی۔ اس کے تحت بہت سی کتابیں جو اب تک مراحل طباعت سے نہیں گزری تھیں یا نایاب تھیں، شائع کی گئیں۔ ان میں قصۂ مصنفہ، قصیدۂ ملکہ وکٹوریہ (نظم) اور تاریخ خاندان تیموریہ (نظم) کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔

سوسائٹی کے چند مباحث:-

سوسائٹی اپنے عہد کے اہم مسائل اور اخلاقی امور پر بھی بحث و مباحثہ کیا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ ہندو قانون تبنیت کو اس نے اپنے بحث کا موضوع بنایا تھا کیونکہ اس قانون میں بعض تبدیلیوں کی حکومت خواہش مند تھی۔

۱۸۶۷ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے وائسرائے کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی تھی، جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان میں ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس سے مشرقی علوم اور ہندوستانی زبانوں کی ہمت افزائی ہو سکے۔ اس عرضداشت کی ایک کاپی سوسائٹی کو بھی ارسال کی گئی تھی تاکہ وہ اس پر بحث و مباحثہ کر کے اپنے عندیے سے گورنمنٹ کو مطلع کر سکے۔ چنانچہ ۱۲/ نومبر ۱۸۶۷ء کو سوسائٹی کا ایک خاص جلسہ منعقد ہوا اور بحث کا موضوع یہ تجویز ہوا کہ "ہم ترجموں کے ذریعے یورپ کے علوم پر قادر ہو سکتے ہیں لیکن اس قدر نہیں جو انگریزی میں ان کا مطالعہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے[1]"۔ اس کی حمایت و مخالفت میں ارکان کی رائیں سامنے آئیں۔

پیارے لال آشوب نے اس موضوع پر بولتے ہوئے کہا تھا کہ

---

[1] بحوالہ ماسٹر رام چندر ص ۵۶

"یہ امر شاید خلاف واقعہ ہے۔ دیکھو مسلمانوں میں جس قدر علم ہے وہ سب ترجموں کے ذریعے سے عربی میں آیا۔ عربوں نے یونانیوں کی کتابیں ترجمہ کیں اور اس امر کی شاہد یہ بات ہے کہ علم طب جو آج تک مسلمانوں اور ایشیا کی قوموں میں پائی جا رہی ہے وہ یونانیوں کی ہی ایجاد ہے[1]۔"

عہدہ داران کی تبدیلیاں :-

سوسائٹی کے قیام کی ابتداء سے کیپٹن کولڈ اسٹریم اس کے اعزازی معتمد تھے بعد میں مسٹر بوائیلین جج دہلی نے ان کی جگہ سنبھالی، جب آگرہ میں ان کا بھی تبادلہ ہو گیا تو ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو مسٹر اسمتھ ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ مگر مئی ۱۸۶۷ء میں ان کا تبادلہ بھی مراد آباد کیلئے ہو گیا تو پادری وینٹلے ان کی جگہ کیلئے نامزد ہوئے۔ ایک سال بعد وہ بھی اس عہدے سے دستبردار ہو گئے۔ فروری ۱۸۶۸ء میں کارسٹیفن نے اس عہدے کو عزت بخشی[2] لیکن نائب صدر کی حیثیت سے سوسائٹی کے خاتمے تک لالہ صاحب سنگھ صاحب ہی سرفراز رہے۔

اسی طرح سے کسی نہ کسی وجہ سے سوسائٹی کے سکریٹری بھی بدلتے رہتے تھے ۱۸۶۹ء میں جب پیارے لال آشوب لاہور چلے گئے تو ان کی جگہ ہر چند ولال کو مقرر کیا گیا۔ سجن لال کا یہ خیال خلاف واقعہ معلوم ہوتا ہے کہ جب چند ولال کا تبادلہ کمشنری دفتر میں مترجم اعلیٰ کے عہدے پر ہو گیا تو ان کی جگہ پر مولوی ذکاء اللہ کو مقرر کیا گیا[3] کیونکہ سوسائٹی کا سکریٹری اس شخص کو بنایا جاتا تھا جس کا مستقلاً قیام دہلی میں ہوتا

---

[1] بحوالہ ماسٹر رام چندر ص ۷۵

[2] سجن لال نوائے ادب، اکتوبر ۱۹۵۲ء ص ۶۲

[3] ایضاً ص ۶۲

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

ذکاء اللہ ۱۸۶۹ء میں میور کالج الہ آباد کے پروفیسر کی حیثیت سے وہاں چلے گئے تھے۔[1]

سوسائٹی کے مقاصد میں کتب خانے اور دارالمطالعے کا قیام بھی شامل تھا چنانچہ سوسائٹی کی طرف سے ایک کتب خانے کا قیام عمل میں آیا۔ اراکین نے بطور عطیہ کثیر تعداد میں کتابیں پیش کیں۔ کچھ کتابیں خریدی گئیں۔ اس طرح کتب خانے میں اردو، ہندی فارسی اور انگریزی کتابوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اس کے علاوہ دوربین نقشے اور جغرافیہ سے متعلق دیگر آلات بھی فراہم کئے گئے۔ جن لوگوں نے سوسائٹی کو کتابیں تفویض کیں ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

کرنل ہیملٹن نے ۱۸۶۵ء میں ۶۹ اور ۱۸۶۶ء میں بیس کتابیں عنایت کیں۔ حکیم عبدالصمد خاں نے تیس اور منشی ہدایت اللہ نے گیارہ کتابیں مرحمت فرمائیں۔ مسٹر اسمتھ نے "دھرم شاستر" منشی حکم چند نے "دقتہ بہن" کی دو جلدیں (جن کے وہ خود بھی مصنف ہیں)، سوسائٹی کے محرر کاشی ناتھ نے "مہابھارت" کی ایک جلد پیش کی۔ خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امن نے "بوستان خیال" کی پہلی دو جلدوں کا ترجمہ "حدیق النظار" تفویض کی۔ ان حضرات کے علاوہ ٹامس سٹیفن نے ۶۷ کتابیں، پیارے لال آشوب نے اردو صرف ونحو سے متعلق کتابیں، چندو لال نے چار کتابیں، تارا چند نے مہابھارت کا ایک نسخہ، سر سید احمد خاں نے "رسالہ فقہ شافعی" مرزا غیاث الدین نے چند کتابیں اور مرزا غالب نے "سبد چین" کی چھ جلدیں بطور عطیہ پیش کیں۔

اس کا پتا نہیں چل سکا کہ یہ سوسائٹی کب تک قائم رہی، البتہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۸۷۹ء تک بحسن وخوبی خدمت علم وادب کے فرائض انجام دیتی رہی کیونکہ دسمبر ۱۸۷۹ء تک کے اس کے رسالے کا پتہ چلتا ہے اور شاید سوسائٹی کے رسالے کا یہ آخری شمارہ ہے۔

---

[1] حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو ص ۴۴۷

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

جلسۂ تہذیب لکھنؤ ۱۸۶۸ء

اردو شعر و ادب کی پرورش و پرداخت میں لکھنؤ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ روہیلوں، جاٹوں، سکھوں، مرہٹوں اور بیرونی حملہ آوروں نے دلی پر پے در پے حملے کیے، ان کی ریشہ دوانیوں اور چیرہ دستیوں سے یہاں کا نظم و نسق درہم برہم ہوگیا اور یہاں کے لوگوں کی زندگی اجیرن ہوگئی تو بیشتر صاحب کمال حضرات نے دلی کو خیر آباد کہہ کر لکھنؤ کو اپنا مستقر و مسکن بنایا۔ ارباب علم کے ورود سے لکھنؤ کی شان اور علمی فضا میں چار چاند لگ گئے، لیکن جلد ہی دوسرے علمی مراکز کی طرح لکھنؤ میں بھی علم و ادب کا چراغ بجھنے لگا۔ لکھنؤ کے چند ہوش مند اور اہل قلم حضرات نے اپنی زبان و تہذیب کی بقا و تحفظ کے پیش و نظر یکم فروری ۱۸۶۸ء کو "جلسۂ تہذیب لکھنؤ" کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی۔[1] اس انجمن کا مقصد خاص طور سے اردو زبان و ادب کی تعلیم و ترویج اور اردو کتابوں کی تصنیف و اشاعت تھا۔ شہر کے سربرآوردہ لوگ اس کے ارکان منتخب ہوئے۔

جلسۂ تہذیب کے تحت ایک کتب خانہ، ایک دارالمطالعہ اور دو مدرسوں کا قیام بھی عمل میں آیا۔ ان مدرسوں میں اردو زبان اور دوسرے علوم و فنون کے پہلو بہ پہلو صنعت و حرفت کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ اس جلسہ کی طرف سے "رسالہ جلسۂ تہذیب" کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا گیا تھا۔

اردو شعر و ادب کی ترقی اور اشاعت کا ایک ذریعہ مشاعرہ بھی ہے۔ جلسہ [illegible] کی جانب سے سال میں کئی مشاعروں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہاں [illegible] کوشش اور تگ و دو سے ۲، ۱۸۷ء سے ۱۸۷۴ء تک ہندوستان کے اکثر بڑے شہروں میں بزم مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ ان مشاعروں کی حیثیت تاریخی ہے۔ چنانچہ۔

---

[1] ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، تعارف تاریخ اردو ص ۳۵

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

گلدستۂ سخن" کے عنوان سے کانپور، دلی اور لکھنؤ میں ہونے والے مشاعروں کی روداد شائع ہو چکی ہے۔ اس سلسلے کا جو مشاعرہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۷۴ء کو لکھنؤ میں ہوا تھا وہ جلسۂ تہذیب ہی کے زیر اہتمام ہوا تھا[1]

جلسۂ تہذیب لکھنؤ لوگوں کی بے توجہی سے ختم ہو گیا، لیکن اس کا کتب خانہ اور دارالمطالعہ "رفاہ عام ایسوسی ایشن" کی عمارت میں اب بھی باقی ہے، جس کی وجہ سے اس انجمن کا نام بھی زندہ ہے۔ جلسۂ تہذیب کی جانب سے اردو کی چند مفید اور کار آمد کتابیں تصنیف کی گئی ہیں لیکن افسوس کہ ہمیں ان کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔

یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور۔ ۱۸۷۰ء

ڈاکٹر لائٹنر نے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام ایک جلسہ منعقد کیا، جس میں لاہور کے سربرآوردہ لوگوں نے شرکت کی۔ اس جلسے میں انھوں نے یہ تجویز رکھی کہ مشرقی و مغربی علوم کے فروغ کے لئے لاہور میں ایک یونیورسٹی قائم ہونا چاہیئے، تاکہ اس صوبے میں دیسی زبانوں کو فروغ حاصل ہو سکے۔ شروع میں ڈاکٹر موصوف نے اس یونیورسٹی کا نام "اورینٹل یونیورسٹی" یا "مشرقی دارالعلوم" تجویز کیا اور اس کی ہیئت کے متعلق بتایا تھا کہ

"یہ ہندوستان کا قومی دارالعلوم ہوگا، جو مشرقی علوم و ادب اور مغربی فنون کی اعلیٰ تعلیم کا ادارہ ہوگا جس کا خاص مقصد یہ ہوگا کہ ہندوستان میں مغربی علوم کی عمارت کو دیسی زبانوں کی عمارات پر اٹھانا چاہیئے۔"[2]

اس کی اہمیت واضح کرتے ہوئے موصوف نے یہ بھی کہا کہ اس یونیورسٹی کے قیام

---

[1] منشی نول کشور، سیر سیاح، گلدستۂ سخن ص ۳

[2] انجم رحمانی، برطانوی دور میں اردو کے فروغ میں پنجاب کے نظام تعلیم کا حصہ (غیر مطبوعہ) ص ۱۴۵

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

سے اس علاقے میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ جس سے علوم وفنون کی تعلیم عام لوگوں کی دسترس میں ہوگی۔ اس کے بعد امرتسر اور لاہور کے ۶۵ سربرآوردہ لوگوں کے دستخط سے ایک یادداشت لفٹننٹ گورنر پنجاب کی خدمت میں پیش کی گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس منصوبے کی تائید میں انگریزوں نے بھی کافی کوششیں کیں اور ایک کمیٹی بنا کر اس کے لئے رقمیں فراہم کیں۔ اس کے علاوہ انجمن پنجاب نے اپنے متعدد جلسوں میں اس مطالبے کو دہرایا۔ لیکن اس وقت یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ آخر میں عوام کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے انجمن پنجاب نے ۱۸۶۵ء میں ایک اورینٹل کالج قائم کیا۔ یہ کالج راجہ دھیان سنگھ کی حویلی کے ایک مقابل پاٹھ شالا میں چلنے لگا۔ بالآخر حکومت پنجاب نے ۲۷ر مئی ۱۸۶۸ء کو ایک کالج کے قیام کی منظوری دیدی۔[1] اس کے ایک سال بعد ۸ر دسمبر ۱۸۶۹ء کو اس کا قیام عمل میں آیا۔ شروع میں اس کا نام لاہور یونیورسٹی کالج تھا لیکن بعد میں اس کا نام تبدیل کرکے پنجاب یونیورسٹی کالج کر دیا گیا۔ اس کے قیام کے حسب ذیل مقاصد قرار پائے۔

(۱) دیسی زبانوں میں یوروپین سائنس کا فروغ

(۲) دیسی لٹریچر کی اشاعت

(۳) مشرقی کلاسیکی زبانوں کی توسیع وترقی کی ہمت افزائی[2]

۱۱ر جنوری ۱۸۷۰ء کو گورنر پنجاب میکلوڈ نے لاہور یونیورسٹی کا افتتاح کیا۔ اس کے پہلے رجسٹرار ڈاکٹر لائٹنر اور پہلے پریسیڈنٹ مسٹر اجرٹن مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۰ء ہی میں ڈاکٹر لائٹنر اس کے پرنسپل بھی مقرر ہوئے اور ۱۸۸۶ء تک وہ اس عہدے پر مامور رہے۔[3]

---

[1] انجم رحمانی، برطانوی دور میں اردو کے فروغ میں پنجاب کے نظم ونثر کا حصہ (غیر مطبوعہ) ص ۱۵۸

[2] ایضاً ص ۱۶۰

[3] بحوالہ یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی ادبی اور درسی سرمایہ ص ۵

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

اس کالج میں تعلیم کے دو شعبے قائم کئے گئے۔ مشرقی کلاسیکی زبانوں کی تحصیل اور دیسی زبانوں کی توسیع و ترقی کیلئے اورینٹل کالج قائم کیا گیا۔ دوسرا شعبہ جنرل کالج کا تھا، جس میں سائنس، انجینئرنگ اور طب کی تعلیم دی جاتی تھی۔

۲۷ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کالج کا الحاق یونیورسٹی سے کر دیا گیا اور اس کا نام یونیورسٹی اورینٹل کالج کر دیا گیا۔ اب یہ اورینٹل کالج کے نام سے مشہور ہے۔

اپنے قیام کے زمانے سے ابتک یہ کالج مشرقی تعلیم کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور ان زبانوں میں تحقیق کا کام انجام دے رہا ہے۔ اس کالج کے موجودہ پرنسپل محمد باقر کے بقول ۱۸۷۰ء میں جب اس کالج کی بنیاد پڑی تو ڈاکٹر لائٹنر اور ان کے رفقا تحقیق و تصنیف کا اعلا معیار قائم کیا.... تحقیق کا یہ رجحان اورینٹل کالج کو دوسرے تعلیمی اداروں سے ممتاز کرتا ہے[۱]

اس کالج میں سنسکرت، عربی، فارسی، پشتو اور گرمکھی زبانوں کی تعلیم دیجاتی ہے۔ اس کے اساتذہ کی ایک طویل فہرست ہے۔ مشرقی زبانوں کے اساتذہ جو انیسویں صدی تک اس کالج سے وابستہ تھے، کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) مولانا فضل الحسن سہارنپوری	ہیڈ مولوی	۱۸۷۰ء تا ۱۸۸۷ء
(۲) مولانا عبدالحلیم کلانوری	ہیڈ منشی	۱۸۷۲ء تا ۱۹۱۶ء
(۳) مولوی محمد دین	سکنڈ منشی	۱۸۷۳ء تا ۱۸۹۸ء
(۴) مولوی محمد دین مختار	"	۱۸۸۷ء تا ۱۹۲۲ء
(۵) قاضی ظفرالدین	"	۱۸۸۱ء تا ۱۹۰۵ء
(۶) مولانا عبداللہ ٹونکی	"	۱۸۸۳ء تا ۱۹۱۷ء
(۷) محمد حسین آزاد	"	۱۸۸۴ء تا ۱۸۹۰ء

---

[۱] بحوالہ یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی ادبی اور درسی سرمایہ ص ا (الف)

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

اورینٹل کالج میں مشرقی زبانوں کی تعلیم اردو یا ہندی میں دی جاتی تھی، لیکن بحیثیت مضمون اردو یا ہندی کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا، اردو اور ہندی تعلیم کا انتظام سب سے پہلے علی الترتیب ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء میں کیا گیا تو اردو تعلیم کے لئے سب سے پہلے محمود شیرانی کا تقرر بہ حیثیت اردو لکچرر کے ہوا۔ ان کی اردو خدمات محتاج بیان نہیں اس کے بعد جتنے بھی اردو لکچررز کا تقرر ہوا مثلاً ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید وقار عظیم، ڈاکٹر وحید قریشی وغیرہ نے اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اس طرح اردو سے متعلق ہزاروں کتابیں اس کالج کے اساتذہ نے تصنیف کی ہیں۔ ہم ان کتابوں کی فہرست پیش کر رہے ہیں۔ جو انیسوی صدی میں تصنیف یا تالیف کی گئی ہیں۔

نام کتاب		نام مصنف یا مترجم
(۱) تاریخ تیموریہ کا اردو ترجمہ		مولوی غلام
(۲) حدایق البلاغت	اردو ترجمہ	سید شاہ چراغ
(۳) ٹیلر کی قدیم تاریخ	(ایک حصے کا اردو ترجمہ)	لالہ بشن لال
(۴) ،،	(اقتباس کا اردو ترجمہ)	مولوی غلام مصطفےٰ
(۵) تاریخ انگلینڈ	اردو ترجمہ	محمد غضنفر
(۶) Tod Under Suraton	،،	لالہ گنگا رام
(۷) درنادرہ[1]	اردو ترجمہ	منشی عبد العزیز
(۸) واسکوگی کی کسٹری	،،	ڈاکٹر امیر شاہ
(۹) المنٹری فزکس	،،	،،
(۱۰) میڈیکل جورس پرڈی منس	،،	ڈاکٹر رحیم خاں
(۱۱) عمارتی سامان	(تصنیف)	لالہ گنگا رام

---

[1] یہ سات کتابیں ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کے پریس سے شائع ہوئیں۔

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

(۱۲) Saba Muallaqa	اردو ترجمہ	مولانا فضل الحسن
(۱۳) عربی بیان	"	"
(۱۴) منتخبات اخلاق ناصری کا	"	محمد دین
(۱۵) ہملٹن کی میٹا فزکس (جلد اول)	"	"
(۱۶) ٹرگنومیٹری	"	غلام مصطفےٰ
(۱۷) Varina اناٹوی	"	"
(۱۸) Epitom کی تاریخ انگلستان	"	محمد غضنفر
(۱۹) خلاصۃ الاخلاق (جلالی)	"	پنڈت جناردن
(۲۰) Hydrostatics	"	پیرزادہ محمد حسین
(۲۱) المنٹس آف جورسپرودنس	"	بابو سانسی جش مکرجی
(۲۲) گنسوٹ کی فزکس	"	امرناتھ

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

انجمنِ اسلام بمبئی ۔ ۱۸۷۴ء

سر سید احمد خاں کی طرح جنوبی ہند میں ایک ممتاز قانون داں بدرالدین طیب جی کو بھی مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی پسماندگی کا احساس ہوا۔ چنانچہ انھوں نے بمبئی کے چند روشن خیال، فیاض اور بہی خواہ مسلمانوں کے تعاون سے ۱۲ر فروری ۱۸۷۴ء کو "انجمن اسلام" کے نام سے بمبئی میں ایک ادارے کی داغ بیل ڈالی[1]۔ جدید تعلیم کی ترویج و ترقی کے پہلو بہ پہلو انجمن کا یہ مقصد بھی تھا کہ

"مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو سے متعلق ممتاز اسلامی کلچر کا تحفظ کیا جائے اور تبدیلیاں اور اصلاحات اس انداز سے روبہ کار لائی جائیں کہ وہ پیوند کے طور پر یا بے جوڑ ظاہر نہ ہوں بلکہ ایک فطری ارتقار کے طور پر رونما ہوں۔ ہم وہ سب کچھ سیکھنا اور حاصل کرنا چاہتے ہیں جو تمام دوسرے لوگوں کے طریقوں، مراسم اور زندگیوں میں قابل قدر ہے[2]۔"

بدرالدین طیب جی کے بھائی قمرالدین طیب جی اس انجمن کے صدر، ناخدا محمد علی روگھے نائب صدر اور منشی غلام محی الدین دیوائی ومنشی غلام محمد اعزازی سکریٹری منتخب ہوئے۔ اراکین میں منشی ہدایت اللہ، عبداللہ دھرمسی، رحمت اللہ سایانی، فتح علی شیخ احمد اور جیراج بھائی کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ بدرالدین طیب جی نے اس وقت کوئی منصب قبول نہیں کیا۔ بعد میں انھیں اعزازی سکریٹری مقرر کیا گیا۔ ۲۱ ارکان پر مشتمل اس انجمن نے اسی روز ۱۴۹۷ روپے کا فنڈ جمع کر کے اپنے کام کا باقاعدہ آغاز کیا۔

---

[1] ایس۔ ایس۔ دسنوی۔ مسلم انڈیا (اردو) جنوری ۱۹۸۷ء ص ۱۱
ڈاکٹر میمونہ دلوی کے بقول اس کے قیام کی تاریخ ۱۸ر اپریل ۱۸۷۶ء ہے، جو درست نہیں (بمبئی میں اردو ص ۲۴۰)

[2] بحوالہ مسلم انڈیا (جنوری ۱۹۸۷ء) ص ۱۱

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

انجمن کی سالانہ ممبری فیس بارہ روپے طے پائی۔ ۱۹۰۲ء تک اس فیس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

چونکہ "انجمن اسلام" کا اصل مقصد مسلمانوں میں علم و ادب کی اشاعت و ترویج تھا۔ اس لئے اس کے بانیوں نے اس کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔ بمبئی میں ہندوستانی زبان کی تعلیم کا رواج نہ تھا۔ لیکن انجمن کی کوششوں اور کاوشوں سے مبادیوی کے جی۔ٹی۔ سی اسکول میں یکم مارچ ۱۸۸۰ء سے ہندوستانی تعلیم کا آغاز ہوا۔ انجمن کی طرف سے ہر طالب علم کو مفت کتابیں فراہم کی گئیں اور پچیس روپے کا ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کیا گیا[۱] لیکن بعد میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اس کے بعد انجمن کی طرف سے بمبئی میں مسلمانوں کے زیر انتظام چلنے والے تعلیمی اداروں کا سروے کیا گیا اور ایک خط ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کو ارسال کیا گیا، جس میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے اسباب بیان کئے گئے تھے۔ اس میں ایک اہم سبب یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ

"بمبئی میں کوئی ایک بھی ایسا اسکول نہیں ہے جس میں محمڈن بچے انگلش تعلیم، (اردو) میڈیم سے حاصل کر سکیں، جو کہ ہندوستان میں محمڈن آبادی کے ایک عظیم ترحصے کی مادری زبان ہے[۲]"

اس کے بعد ٹاؤن ہال میں ایک میٹنگ بلائی گئی جس میں بمبئی کے سبھی فرقے کے مسلمان جمع ہوئے۔ اس جلسے میں ۳۶ ہزار روپے جمع کئے گئے جن میں سے دس ہزار ناخدا محمد علی روگھے ہی کے تھے، جس کا مقصد مسلمان بچوں کے لئے اسکول قائم کرنا تھا۔ حکومت کی جانب سے بھی پانچ سو روپے ماہانہ کا وعدہ کیا گیا۔ چنانچہ ۲۰ ستمبر ۱۸۸۰ء کو انجمن کا پہلا اسکول معرض وجود میں آیا۔ تین اساتذہ اور ۲۰ طلبہ سے اسکول میں درس

۱۔ بحوالہ مسلم انڈیا (اردو) جنوری ۱۹۸۰ء ص ۱۱

۲۔ " " " ص ۱۱

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

تدریس کا کام شروع ہوا اس میں ہندی، اردو، فارسی، گجراتی، مراٹھی اور انگریزی میں تعلیم دی جاتی تھی۔ اس اسکول کو جبل روڈ کے قریب حاجی زین العابدین کے امام باڑہ میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ اسکول بہت جلد مقبول انام ہوا۔ چنانچہ طلبا کی تعداد میں غیر معمولی اضافے کے پیش نظر ۹ کمروں پر مشتمل ایک مکان پایدھونی پولیس اسٹیشن کے مقابل نوے روپے ماہانہ کرائے پر دو سال کے لئے لیا گیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد یہ مکان بھی ناکافی ہوگیا۔ اس لئے ناگپاڑہ میں ۲۰ رجون ۱۹۰۲ء کو اس کی ایک شاخ قائم کی گئی۔ شروع میں محض سات بچوں نے داخلہ لیا، لیکن سال کے اختتام تک ان کی تعداد بڑھکر ۹۰ تک پہونچ گئی۔

انجمن کے بانی شروع ہی سے اسکول کی ذاتی عمارت کے لئے کوشاں وفکرمند تھے، اس کے لئے حکومت سے بھی کوشش کی جارہی تھی۔ بالآخر حکومت نے نہ صرف یہ کہ انجمن کو ایک قطع زمین فراہم کردی بلکہ اس کی عمارت کے لئے ۳۲ ہزار روپے بھی دینے کا وعدہ کیا۔ لہٰذا ایک لاکھ ۳۸ ہزار روپے کی لاگت کے تخمینہ سے اسکول کی عمارت کا کام شروع کیا گیا۔ ۳۱ر اگست ۱۹۰۸ء کو بمبئی کے گورنر لارڈ ڈری نے خشت اول رکھ کر سنگ بنیاد کی تقریب کا آغاز کیا۔ اس موقع پر انجمن کے بانی اور اعزازی سکریٹری بدرالدین طیب جی نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ

"میں سمجھتا ہوں کہ ہم اپنا اصل مقصد حاصل نہیں کرسکیں گے اگر ہم نے اپنی کوشش معیار تعلیم کو محض ہائی اسکول کی سطح تک پہونچانے تک محدود رکھا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس سے آگے بڑھتے جانا چاہیئے تاکہ ہم مسلمانوں کے لئے ایک کالج کے قیام کی پوزیشن میں آجائیں، جہاں سے ہم اپنے نوجوانوں کو یونیورسٹی میں بھیج سکیں[۱]"

جب اسکول کی عمارت بنکر تیار ہوئی تو ۲۹ر فروری ۱۹۰۲ء کو اس کا جشن افتتاح منایا گیا۔ اس پرمسرت موقع پر بھی بمبئی کے گورنر لارڈ بیرس کو مدعو کیا گیا تھا۔

---

[۱] بحوالہ مسلم انڈیا (اردو) جنوری ۱۹۰۰ء ص ۱۲-۱۱

انجمن کی طرف سے اردو، انگریزی اور گجراتی زبانوں میں ہفتہ وار اخبارات جاری کیے گئے۔ اردو میں "مراۃ الاخبار" کے نام سے جو اخبار ۱۸۹۵ء سے جاری کیا گیا تھا منشی خورشید حسن طپش اس کے ایڈیٹر اور جوائنٹ ایڈیٹر محمد امین زبیری مقرر ہوئے۔ انگریزی اور گجراتی میں جو اخبارات جاری کیے گئے تھے ان کے نام مانیٹر (Monitor) تھے۔

تعلیم نسواں کے سلسلے میں انجمن نے اہم رول ادا کیا ہے، پہلے اس نے سجانی پردہ پرائمری گرلس اسکول قائم کیا۔ ۱۹۲۵ء میں جب بمبئی میونسپل کارپوریشن نے تعلیم کی ذمہ داری قبول کی تو انجمن نے اپنا یہ اسکول کارپوریشن کے سپرد کر دیا اور اس سے ہونے والی بچت سے ۱۹۳۶ء میں کھادک محلہ میں ایک گرلس ہائی اسکول قائم کیا۔ یہ ریاست کا پہلا غیر سرکاری اردو سکنڈری اسکول تھا۔ اسے جون ۱۹۳۸ء میں بمبئی کے مرکزی محلہ بیلاسس روڈ پر سابو باغ کی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۴۱ء میں لڑکیوں کے لئے ایک دوسرا سکنڈری اسکول جاری کیا گیا۔ اس طرح شہر بمبئی میں ۱۹۴۷ء تک انجمن کے زیر انتظام چار اردو میڈیم اسکول قائم ہو چکے تھے۔

انجمن نے پیشہ وارانہ تعلیم (Vocational Education) کے میدان میں بھی مثبت قدم اٹھایا۔ ریاست میں اس کی جانب سے سب سے پہلا کامرس اسکول قائم کیا گیا۔ اس کے بعد ایم۔ ایچ۔ صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ میں، جس کا انجمن واحد ٹرسٹی تھا، ایک ٹکنیکل ہائی اسکول سیکشن کا اضافہ کیا گیا۔ اس ادارے کو بعد میں ڈگری کالج میں تبدیل کر دیا گیا، جس میں ڈگری اور ڈپلوما کورسیز آئی۔ ٹی۔ آئی طرز کے کورسز نیز جز وقتی (Part Time) ڈپلوما کورسز کا انتظام کیا گیا۔[1]

انجمن کی جانب سے پرائمری اسکول کے ٹیچروں (خاتون ٹیچروں) کی ٹریننگ کیلئے ایک ادارہ "جونیئر اسکول آف ایجوکیشن فار ووِمن" قائم کیا گیا۔ یہ اسکول اب گرلس اسکول میں قائم ہے۔ انجمن کے تحت بمبئی میں چھوٹے بڑے متعدد ادارے قائم ہو گئے ہیں، جو تعلیم کے تقریباً

---

[1] بحوالہ مسلم انڈیا (اردو) جنوری ۱۹۸۷ء ص ۱۲

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

سبھی میدانوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں۔

لیکن انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ" اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کا قیام ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۴۷ء میں وجود میں آیا۔ سید نجیب اشرف ندوی اس کے روح رواں تھے۔ اس کا الحاق بمبئی یونیورسٹی سے ہے۔ ڈاکٹر دیوانیدر کمار گپتا نے اس انسٹی ٹیوٹ کے حسب ذیل مقاصد بیان کیے ہیں۔

۱۔ ایم۔ اے کی تعلیم کا انتظام کرنا۔

۲۔ تحقیقی کام کرنے والوں کی اعانت کرنا۔

۳۔ کتب خانوں کا قیام اور ان کی امداد اور مختلف کتب خانوں کے اردو مخطوطات کی فہرست تیار کرنا۔

۴۔ نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت اور تحقیقی رسالے کا جاری کرنا۔[۱]

ایم۔ اے کی تعلیم کے لئے انجمن نے ۱۹۸۱ء میں جو ہائی اسکول قائم کیا تھا اسے پوسٹ گریجویٹ کالج میں منتقل کر دیا۔" کتاب نما" کے تحت اردو میں شائع ہونے والے علمی و تحقیقی مضامین کی نشان دہی کی جاتی ہے، تاکہ ریسرچ اسکالر اس سے استفادہ کر سکیں۔ انجمن کی طرف سے ایک کتب خانے کا قیام عمل میں آچکا ہے، جس کا شمار بمبئی کے ایک اہم ادر ہم کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ قاضی عبدالکریم پوربندری نے عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور دوسری زبانوں میں ۱۰۴۴ کا رآمد اور بیش بہا کتابیں انجمن کی لائبریری کو تفویض کی تھیں۔ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے حامداللہ ندوی نے جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے کے اردو مخطوطات کی فہرست مرتب کر کے شائع کر دی ہے۔ علاوہ بریں متعدد معیاری کتابیں بھی شائع کی جا چکی ہیں، جن میں سید ظہیرالدین کی" دلی گجراتی" انور... مظہر جانِ جاناں اور ان کا کلام" مصنفہ عبدالرزاق قریشی کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ دیوانِ غالب کے اردو اور ہندی ایڈیشن، انجمن کے تحت پریس" ادبی ٹریڈنگ پریس" سے چھپ کر شائع

---

[۱] اردو کے تصنیفی و تالیفی ادارے، غیر مطبوعہ، ص ۱۳۰

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کئے جا چکے ہیں، جن کی بہترین طباعت پر وزارت اطلاعات ونشریات نے ہندوستان میں طبع ہونے والی کتابوں میں پہلا انعام دیا تھا[۱] ۱۹۴۹ء سے ایک علمی و تحقیقی مجلہ "نوائے ادب" کے نام سے جاری ہے۔ اس کے پہلے مدیر سید نجیب اشرف ندوی تھے۔ بعد ازاں ادارت کا قلمدان عبدالرزاق قریشی کے سپرد کیا گیا۔ یہ رسالہ پہلے سہ ماہی تھا لیکن اب اسے ششماہی کر دیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یہ روشنی کا مینار ہے۔

سندھ مدرسۃ اسلامیہ، کراچی ۱۸۸۴ء

۱۸۸۲ء میں امیر علی کے ہاتھوں نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی بنیاد پڑی۔ اس ایسوسی ایشن کے تحت متعدد ادارے وجود میں آئے جن میں سندھ مدرسۃ اسلامیہ بھی شامل ہے۔ امیر علی کسی مقدمے کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے تھے کہ ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا، جس میں انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق تقریر کی اور باشندگان کراچی سے یہ اپیل کی کہ وہ اس مقصد کے پیش نظر اس عظیم شہر میں ایک مدرسہ قائم کریں۔ چنانچہ ان کی موجودگی ہی میں ۱۸۸۴ء میں "سندھ مدرسہ اسلامیہ" کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس مدرسے کا مقصد مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دینا تھا۔

یہ مدرسہ جو اب ایک کالج کی شکل میں موجود ہے اور اس کے زیر نگرانی متعدد اسکول اور کالج چل رہے ہیں، علم و ادب کی ضوفشانی سے مسلم طلبہ کے قلب و جگر کو منور کر رہے ہیں۔ یہ مدرسہ درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کے علاوہ تالیف و تصنیف کے کام میں اپنی خدمات پیش کر رہا ہے۔ نتیجے کے طور پر اردو میں متعدد مفید اور کارآمد کتابیں معرض وجود میں آئیں۔

---

[۱] ایس، ایس، دسنوی۔ مسلم انڈیا (اردو)، جنوری ۱۹۸۰ء ص ۱۳

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

انجمن حمایت الاسلام لاہور-۱۸۸۴ء

اسلام کی تبلیغ واشاعت کے پیش نظر لاہور کے چند دردمندوں نے مارچ ۱۸۸۴ء میں "انجمن حمایت الاسلام" کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن کا مقصد تھا۔

(۱) اسلام کے مخالفین کا جواب تحریری وتقریری طور پر دینا اور اس کے لئے واعظوں اور رسالوں کا جاری کرنا

(۲) مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا۔

(۳) مسلمانوں میں اصلاحِ معاشرت، دینی و دنیوی علوم کی تحقیق اور باہمی اتفاق کا شوق پیدا کرنا۔

اس مقصد کو پورا کرنے کیلئے سب سے پہلے ناظرین اور واعظوں کا تقرر عمل میں آیا۔ دو برس کی تگ وتاز کے بعد لاہور میں لڑکیوں کے لئے دس ابتدائی مدرسے قائم کئے گئے اور لڑکوں کے لئے بھی چند مدرسوں کا انتظام کیا گیا۔ ان تعلیم گاہوں میں، عربی، فارسی اور دینی تعلیم کے علاوہ اردو اور انگریزی زبانوں کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ انجمن نے ۱۸۸۵ء سے "حمایت الاسلام" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا تھا۔ یہ رسالہ ۱۹۲۶ء سے ہفتہ وار نکل رہا ہے۔

۱۹۲۹ء میں اس انجمن کی جانب سے لڑکوں اور لڑکیوں کے علاحدہ علاحدہ ڈگری کالج کھولے گئے۔ رفاہِ عام کے سلسلے میں اس کے کارناموں میں "یتیم خانہ" اور "ملی دارالامان" کا قیام ہے، جو تقسیم ہند کے بعد بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی پرورش وپرداخت کا کام انجام دے رہا ہے۔ فی الحال اس انجمن کے تحت ۴۲ ادارے ہیں، جن میں دو ڈگری کالج، ایک انٹرمیڈیٹ کالج، ایک طبیہ کالج، سات ہائی اسکول، پچیس جونیئر ہائی، تعلیم بالغاں کے لئے دو ادارے، ایک صنعتی مرکز، دو دارالشفقت اور ایک دارالاطفال شامل ہیں[1]

---

[1] دیوایندر کمار گپتا، اردو کے تصنیفی و تالیفی ادارے (غیر مطبوعہ)، ص ۱۳۵

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

درس وتدریس کے علاوہ یہ انجمن تصنیف وتالیف کے کام میں بھی ہاتھ بٹاتی ہے کتابوں کی طباعت واشاعت کے لئے اس نے ایک پریس اور ایک کتب خانہ بھی قائم کیا ہے دارالاشاعت کی جانب سے تاریخ، سیرت، سوانح، تعلیم وثقافت کے موضوعات پر بہت سی بلند پایہ کتابیں شائع کی جا چکی ہیں۔ سر محمد اقبال کئی برسوں تک اس انجمن کے صدر رہے۔ اس کے سالانہ جلسوں میں انھوں نے اپنی کئی نظمیں پڑھیں۔

ابتدا میں اس انجمن کا مقصد صرف تبلیغ مذہب تھا، لیکن رفتہ رفتہ تمام شعبہ ہائے زندگی کے مسائل اس کے دائرۂ عمل میں داخل ہو گئے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ۔ ۱۸۸۶ء

سرسید کی شخصیت بہت پہلو دار تھی، جس میں مصلح، ادیب، ناقد، مبلغ اور بالغ النظر صحافی وغیرہ کی حیثیتیں جمع ہو گئی تھیں، انھوں نے متعدد سوسائٹیاں اور مدرسے قائم کئے ابتدا میں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی بہ حیثیت ایک قوم کے، فلاح وصلاح کی کوشش کرتے رہے لیکن ۱۸۶۸ء میں جب بنارس کے چند سربرآوردہ ہندوؤں نے سرکاری عدالتوں اور دفتروں سے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کو موقوف کرنے اور اس کی جگہ پر ہندی زبان اور ناگری لپی کو جاری کرنے کی تحریک چلائی تو سرسید کی فکر و نظر میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سرسید کہتے تھے کہ "یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے مشترک کوشش محال ہے۔"[1]

اسی زمانے میں جبکہ بنارس میں اردو کو ہٹانے کا چرچا عام تھا، ایک روز سرسید بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیر سے مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں گفتگو فرما رہے تھے، گفتگو ختم ہونے کے بعد کمشنر نے کہا "آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال

---

[1] بحوالہ علی گڑھ تحریک ص ۲۵

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ظاہر کرتے تھے[1]، سرسید کے خالص مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کے بارے میں غور و فکر کرنے کے یہی محرکات تھے۔

سائنٹفک سوسائٹی جس کا ذکر بالتفصیل "تیسرے باب" میں کیا جا چکا ہے، ہندو اور مسلمان دونوں کی تعلیمی و معاشرتی ترقی کے پیش نظر قائم کیا گیا تھا۔ ۱۸۷۵ء میں ایم۔ اے۔ او کالج کی داغ بیل بھی ڈالی جا چکی تھی، جس کا مقصد بھی صرف مسلمانوں کی تعلیم و ترقی نہ تھا۔ لیکن ان دو اداروں کے برعکس انھوں نے ۲۰ دسمبر ۱۸۸۶ء کو علیگڈھ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی، جس کا مقصد مسلمانوں میں تعلیم کی ترویج و اشاعت تھا[2]

اس کانفرنس کی طرف سے اردو زبان و ادب میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں شائع کی گئیں۔ اس کا سالانہ اجلاس ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ہوا کرتا تھا۔ اس اجلاس میں قوم کے سربرآوردہ اور مشاہیر شخصیتوں کے علاوہ سرسید کے رفقا بھی شامل ہوا کرتے تھے اور وہ لوگ مسلمانوں کی تعلیم اور فلاح و بہبود سے متعلق تقریریں کیا کرتے تھے۔ بہت دنوں تک اس کے معتمد سید وقار الملک رہے۔ جب "انجمن ترقی اردو" قائم ہوئی تو اسے اس کانفرنس کا ایک شعبہ قرار دیا گیا۔ اب یہ کانفرنس صرف نام کے لئے باقی ہے اور اس کا دفتر آج بھی علی گڑھ میں موجود ہے۔ لیکن اب اس کی سرگرمیوں کا کچھ پتا نہیں چلتا۔

اردو لٹریری پروموٹنگ سوسائٹی بمبئی۔ ۱۸۹۴ء

بمبئی کے چند زبان پرور اور علم دوست حضرات نے اردو زبان و ادب کو فروغ دینے کیلئے ۱۸۹۴ء میں ایک انجمن "اردو لٹریری پروموٹنگ سوسائٹی" کے نام سے قائم کی[3] اس

---

[1] بحوالہ علی گڑھ تحریک ص ۳۵

[2] ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، تعارف تاریخ اردو ص ۵۰۱ - ۵۰۲

[3] ڈاکٹر میمونہ دلوی، بمبئی میں اردو ص ۲۴۰

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کے پہلے سکریٹری محمد علی شوق منتخب ہوئے، جو بمبئی کے قدیم خاندان "دلوی" سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سوسائٹی کو گورنمنٹ کی اعانت وحمایت حاصل نہ تھی۔ اس کے موسسین نے اپنے ذاتی خرچ سے اسے قائم کیا تھا۔ اردو میں علوم وفنون کی عمدہ اور کارآمد کتابیں تیار کرنا اس کا خاص مقصد تھا۔

سوسائٹی نے ایک پروگرام یہ بھی بنایا تھا کہ وقتاً فوقتاً انعامی مضامین لکھوائے جائیں اور جن کے مضامین عمدہ قرار پائیں گے انھیں دس روپے کا انعام دیا جائے گا۔ علاوہ بریں سوسائٹی نے انعام کے لئے منتخب مضامین کو شائع کرکے مضمون نگاروں کی ہمت افزائی کا بھی اعلان کیا تھا ۱۸۹۵ء کے مضامین کے لئے حسب ذیل عنوانات تجویز کئے گئے تھے۔

(۱) اردو لٹریچر کی ترقی

(۲) تاریخ اور ناول نویسی

(۳) اردو کی تصانیف اوران پر سنجیدہ ریویو

(۴) حالات خواجہ حافظ بلبل شیراز

(۵) سلطان محمود غزنوی کی مختصر لائف[۱]

لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ان عنوانات کے مضمون نگاروں میں کن لوگوں کو انعامات ملے تھے۔ عنوانات کے ملاحظہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے ارکان اردو زبان وادب سے کس قدر دلچسپی رکھتے تھے اور کتنا معلومات افزا مواد فراہم کرنا چاہتے تھے۔ سوسائٹی کا مقصد ایک پریس بھی قائم کرنے کا تھا۔

جیسا کہ کہا جاچکا ہے کہ اس سوسائٹی کا مقصد اردو زبان میں علمی کتابیں تیار کرنا تھا۔ چنانچہ سوسائٹی کے سکریٹری محمد علی شوق نے دو کتابیں "فوائد علم" اور "فردوسی اوراس کا شاہنامہ" لکھیں۔ جو علی الترتیب ۱۸۹۴ء اور ۱۸۹۵ء میں شائع کی گئیں۔ جنوری ۱۸۹۵ء میں ایک اور کتاب "عمارات اسلام" مصنفہ عبدالقادر شیدا شائع ہوئی۔

---

[۱] ڈاکٹر میمونہ دلوی، بمبئی میں اردو ص ۳۸ - ۳۲۷

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

گورنمنٹ کا تعاون حاصل نہ ہونے کی وجہ سے یہ سوسائٹی تین سال کے اندر ختم ہوگئی۔ شوق نے جنوری ۱۸۹۷ء میں ایک رسالہ "درافشاں" جاری کیا، جس میں انھوں نے اس سوسائٹی کے ختم ہونے پر اظہار افسوس کیا تھا۔[1] اگر یہ سوسائٹی کچھ دنوں تک اور زندہ رہتی تو بعید از قیاس نہیں کہ اردو زبان میں معتد بہ اور مفید کتابیں تصنیف کی جاتیں۔

---

[1] ڈاکٹر میمونہ دلوی، بمبئی میں اردو ص ۳۳۸

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

پانچواں باب

حاصل مطالعہ

انیسویں صدی ہندوستان کی سیاسی و تہذیبی تاریخ میں دور رس اور انقلابی تبدیلیوں کی صدی رہی ہے۔ اس صدی کے شروع ہوتے ہوتے ہماری قدیم قدروں کے انحطاط کی رفتار خاصی تیز ہوگئی اور ان کی جگہ نئی تہذیبی قدریں اپنا سکہ جمانے لگیں۔ مزید بریں صنعت و حرفت، تجارت و زراعت اور اس کے نتیجے میں سماجی اقدار و معیار کا ڈھانچہ بھی بڑی حد تک بدل گیا۔ اس لئے انیسویں صدی کے ادب میں گوناگوں اور ہمہ جہت تبدیلیوں کا ظہور بھی ایک فطری امر تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس وقت مغلوں کی حکومت رو بہ زوال تھی ٹھیک یہی وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی روز افزوں ترقی کا تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر انگریز افسروں کو اس بات کا پورا یقین ہوگیا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب یہاں صرف ہم ہی ہم ہوں گے اور ہندوستان جیسے عظیم ملک کی عنان حکومت ہمارے ہی ہاتھوں میں ہوگی۔ چنانچہ اب انھیں یہاں بہتر نظم و نسق قائم کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہاں کی زبانوں سے کامل واقفیت کے بغیر وہ اپنے مقصد میں کما حقہٗ کامیابی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے حفظ ماتقدم کے طور پر انھوں نے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا، تاکہ انگلینڈ سے جو ملازمین ہندوستان آئیں وہ یہاں کی زبانوں سے خاطر خواہ واقفیت بہم پہنچا کر مقامی باشندوں سے روابط استوار کریں اور کمپنی کی حکومت کو مضبوط و مستحکم بنائیں، لیکن یہ سیاسی "شر"، اردو زبان کے حق میں بہت بڑے "خیر" کا منبع بن گیا۔

چونکہ فورٹ ولیم کالج کو ہندوستانی زبانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان میں تصنیف و تالیف کا کام بھی بڑے پیمانہ پر انجام دینا تھا، اس لئے کالج میں ہندوستانی ادبا و شعرا کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔ کالج میں تصنیف و تالیف کا کام ہندوستان کی تقریباً سبھی زبانوں میں ہوا۔ لیکن اردو اس سلسلے میں سرفہرست ہے۔ یوں تو اردو میں نوشت و خواند کا آغاز چودھویں صدی عیسوی ہی سے ہو چکا تھا اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی طرح سے

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۱۸۰۰ء تک جاری بھی رہا۔ لیکن اس دور کی تصنیف شدہ کتابیں فارسی کے ادق الفاظ اور تراکیب سے گراں بار ہوتی تھیں، جنھیں پڑھنے اور سمجھنے کے لئے عوام تو عوام پڑھے لکھے لوگوں کو بھی عرق ریزی اور مغز پاشی سے کام لینا پڑتا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اردو نثر کے الجھے ہوئے گیسوؤں کی مشاطگی کا کام سب سے پہلے فورٹ ولیم کالج ہی میں شروع کیا گیا، چنانچہ اس کالج میں اردو کی تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں تصنیف، تالیف یا ترجمہ ہوئیں، جن میں لغات، قواعد، داستانیں، انتخابات اور پند و اخلاق سے متعلق کتابیں شامل ہیں، لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کتابیں ایک محدود مقصد اور مخصوص حالات کے تحت لکھی گئی تھیں اس لئے ان کا دائرہ کار بھی محدود تھا۔ البتہ چونکہ ان کا اسلوب سہل و سادہ اور عام فہم تھا اس لئے بعد کے مصنفین کیلئے یہ کتابیں مشعل راہ ثابت ہوئیں۔ دراصل یہی وہ کالج ہے جس کی داد و دہش اور اکرام و نوازش کی بدولت اردو نثر کی نشاۃ الثانیہ کا آغاز ہوا۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے دس بارہ سال بعد کمپنی کے ملازمین کی تعلیم کے لئے ہندوستان کے دو کلیدی شہروں بمبئی اور مدراس میں بھی کالج قائم کئے گئے۔ بمبئی کے تعلیمی ادارے کے بارے میں ہماری معلومات نہیں کے برابر ہے، البتہ مدراس کے "فورٹ سینٹ جارج کالج" کے متعلق مجھے اتنا معلوم ہے کہ اس کالج میں تعلیمی شعبے کے علاوہ تصنیف و تالیف کا شعبہ بھی قائم تھا، جس میں کثیر تعداد میں کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں اردو کی قدیم شکل "دکنی" کا اعلیٰ نمونہ قرار دی جا سکتی ہیں۔

اردو نثر کی تصنیف و تالیف کے دوسرے دور کا آغاز دلی کالج سے ہوتا ہے۔ اس کا قیام فورٹ ولیم کالج کے قیام کے کوئی پچیس سال بعد عمل میں آیا۔ لیکن اس کے قیام کے مقاصد فورٹ ولیم کالج کے قیام کے مقاصد سے یکسر جدا تھے۔ فورٹ ولیم کالج خصوصیت کے ساتھ انگریزوں کی تعلیم کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اس کے برخلاف دلی کالج کے قیام کا مقصد ہندوستانیوں کو جدید علوم و فنون سے روشناس کرانا تھا۔ یہاں مشرقی علوم و السنہ کے علاوہ مغربی علوم اور سائنس کی تعلیم بھی اردو میں دی جاتی تھی۔ لیکن چونکہ اس

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

وقت تک ان موضوعات پر اردو میں کتابیں نہیں لکھی گئی تھیں اس لئے دلی کالج کے ارباب حل وعقد کی کوششوں سے اس کالج کے تحت تصنیف وتالیف کا ایک شعبہ "دلی ٹرانس لیشن سوسائٹی" کے نام سے قائم کیا گیا۔ اس کالج میں مشرقی کتابوں کی تصنیف کے علاوہ مغربی علوم وفنون کو اردو میں منتقل کرنے کی کوششیں بھی کی گئیں۔ اس لحاظ سے مغربی علوم وفنون کی ترویج و اشاعت میں دلی کالج کا حصہ ناقابل فراموش ہے۔

دلی کالج کا دوسرا اہم کارنامہ اردو صحافت کو فروغ دینا بھی ہے۔ اگرچہ اردو صحافت کا آغاز ۱۸۲۲ء سے ہوا، لیکن اس وقت تک صحافت کا کوئی معیار متعین نہیں ہو سکا تھا۔ جب دلی کالج کے اساتذہ کے زیر اہتمام متعدد رسالے نکلنا شروع ہوئے تو ان ہی رسالوں کے ذریعے صحافت کا ایک معیار قائم ہوا۔ ان رسالوں میں خبروں اور طبع زاد مضامین کے علاوہ انگریزی رسالوں اور اخباروں کے تراجم بھی شائع ہوتے تھے۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ دلی کالج نے ایسے طلبہ پیدا کئے جنھوں نے اردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ چنانچہ ان کی کوششوں اور کاوشوں سے اردو میں ناول نگاری، سوانح نگاری اور تحقیق وتنقید کا آغاز ہوا نیز افادی ادب کی بنیاد ڈالی گئی۔ یہ طلبہ آگے چلکر ہماری زبان وادب کے معمار ثابت ہوئے۔ اردو زبان جب تک زندہ رہے گی انکا نام بھی درخشاں ستاروں کی طرح چمکتا رہے گا۔ ان میں محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد مولوی ذکار اللہ، مولوی کریم الدین، ماسٹر رامچندر، پیارے لال آشوب، موتی لال اور میر ناصر علی کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

---

[۱] "فوائد الناظرین" ۱۸۴۵ء سے اور "محب ہند" ۱۸۴۷ء سے ماسٹر رام چندر کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ کالج کے استاد منشی سید محمد نے ۱۸۴۸ء سے "تحفۃ الحدائق" شائع کرنا شروع کیا اور "قران السعدین" انگریزی کے استاد دھرم نرائن نکالتے تھے۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

انیسویں صدی کو اردو زبان و ادب کی تاریخ میں اس لئے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس صدی میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوئی۔ ۱۸۳۴ء میں فارسی زبان کو سرکاری مسند سے اتار کر اردو کو اس کا جانشین بنایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سرکاری سطح پر اسکولوں اور مکتبوں میں اردو کی تعلیم کا نظم کیا گیا اور ۱۸۳۵ء میں کلکتہ میں "ایجوکیشنل کمیٹی" کے نام سے ایک ادارہ اس غرض سے قائم کیا گیا کہ اسکولوں اور مکتبوں کے لئے دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی ریڈریں تیار کرے۔ چنانچہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے علاوہ اردو میں بھی ریڈریں تیار کی گئیں۔

اردو نثر کی اشاعت میں منشی نول کشور کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ موصوف نے ۱۸۵۰ء میں لکھنؤ میں ایک مطبع قائم کیا اور اس کی شاخیں ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں پھیلا دیں۔ اس پریس سے عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت اور گرمکھی کے علاوہ اردو میں ہزاروں کتابیں شائع کی گئیں۔ ان کتابوں میں گنتی، پہاڑے، ریڈریں، لغات، قواعد، داستانیں، اور شعرا کے دواوین و کلیات وغیرہ شامل ہیں۔

انیسویں صدی کا سب سے اہم واقعہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب ہے۔ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہوگئی اور ہندوستان کی زمام قیادت براہ راست برٹش پارلیمنٹ کے ہاتھوں میں آگئی تھی۔ چونکہ غدر کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالی گئی تھی اس لئے اس کے بعد حکومت نے مسلمانوں کا استحصال شروع کیا۔ ان کی تعلیم کے دروازے مسدود کئے جانے لگے، یہاں تک کہ جو جائدادیں مشرقی علوم و فنون کی توسیع و ترقی کے لئے وقف تھیں انکا استعمال بھی دوسرے کاموں میں کیا جانے لگا۔

ان حالات میں سرسید احمد خاں نے ہندوستانیوں کی تعلیم و ترقی کے پیش نظر سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اس سوسائٹی کے قیام کا اصل مقصد ہندوستانیوں میں مغربی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت تھا۔ اگرچہ سوسائٹی اپنے قیام کی پوری مدت میں محض پندرہ کتابیں شائع کرسکی، لیکن سوسائٹی کے دوسرے کارناموں کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا چنانچہ سوسائٹی کی طرف سے ایک اخبار جاری کیا گیا۔ اس کے علاوہ خود سرسید احمد خاں نے

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

"تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ سوسائٹی کے اخبار "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" اور "تہذیب الاخلاق" کو اردو نثر کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ دونوں رسالے اردو صحافت کی تاریخ میں روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ اگرچہ گزٹ سے پہلے اردو صحافت کا آغاز ہو چکا تھا اور اس نے ایک روایت کی شکل بھی اختیار کر لی تھی، لیکن ان اخباروں اور رسالوں میں صحافت کو معیاری اور معنی خیز بنانے والے عناصر مفقود تھے۔ گزٹ ہندوستان کا پہلا اخبار تھا، جو صحافت نگاری کے تقاضے کو کماحقہٗ پورا کرتا تھا، چنانچہ مذہب سے لے کر سیاست تک کو اس نے اپنا موضوع بنایا۔ گزٹ نے ہندوستان کو ازمنۂ وسطیٰ کی تاریکیوں سے نکالنے کے لئے جو فضا تیار کی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سوسائٹی کے دوسرے کارناموں میں اس کے جلسوں کے لکچرس اور ان موقعوں پر جدید مغربی آلات سے کئے جانے والے عملی تجربے (Practicals) بھی قابل ذکر ہیں۔ سوسائٹی کی جانب سے ایک مرتبہ گیہوں کی کاشت پر تجربہ کیا گیا تھا جس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ بہرحال عوام اور خواص کے لئے سوسائٹی کے یہ کارنامے بڑی اہمیت و افادیت کے حامل رہے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہندوستان کے مختلف حصوں میں متعدد سوسائٹیاں اور انجمنیں قائم کی گئیں، جن کا مقصد جدید خیالات اور علوم جدیدہ کو فروغ دینا تھا۔ ان سوسائٹیوں نے جدید تعلیم کی تشویق و ترغیب اور نشر و اشاعت میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ انیسویں صدی کے چھٹے اور ساتویں دہائی کے درمیان صرف شمالی ہند میں تقریباً بیس انجمنیں قائم تھیں، جن میں دلی سوسائٹی، انجمن پنجاب لاہور، جلسۂ تہذیب لکھنؤ، محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

یہ سوسائٹیاں مغربی علوم و فنون اور مغربی افکار و نظریات کو دیسی لباس میں پیش کرتی تھیں۔ یعنی ان سوسائٹیوں کے جلسوں کی کارروائیاں، مقالہ خوانی اور بحث و مباحثے وغیرہ سب اردو زبان ہی میں ہوا کرتے تھے۔ اردو زبان کے فروغ میں ان عناصر کی کارفرمائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس موقع پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

سوسائٹیوں کی جانب سے اردو میں اخبارات اور جرائد بھی شائع ہوتے تھے، جن میں ان سوسائٹیوں کی روداد اور ان میں پڑھے جانے والے مقالات کے علاوہ خبریں اور بعض علمی مضامین بھی اشاعت پذیر ہوتے تھے۔ ان میں بعض سوسائٹیوں نے اردو میں مستقل تصنیف و تالیف کا کام انجام دیا۔ اور بعض نے مشرقی کتابوں کی طباعت و اشاعت میں حصہ لیا۔

پنجاب کے دو تعلیمی ادارے "اورنٹیل کالج لاہور" (۱۸۷۰ء) اور "سندھ مدرسہ کراچی" نیز "انجمن حمایت الاسلام" لاہور نے اردو کے فروغ میں بڑا حصہ لیا ہے۔ ان میں اورنٹیل کالج کی خدمات سب پر بھاری ہیں۔ اس کالج نے اردو ادب سے متعلق متعدد بلند پایہ کتابیں شائع کیں۔

جنوبی ہند میں بمبئی کی دو انجمنیں "انجمن اسلام" اور "اردو لٹریری پرموٹنگ سوسائٹی" نے اردو نثر کی جو خدمات انجام دیں انھیں بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انجمن اسلام کے روشن کیے ہوئے چراغ کی ضیا پاشیوں سے آج بھی ہم سب مستفیض ہو رہے ہیں۔

ماحصل یہ ہے کہ انیسویں صدی کے ان تعلیمی اداروں اور علمی سوسائٹیوں نے اردو نثر کو جو فروغ بخشا ہے وہ ہماری آنکھوں سے مخفی اور پوشیدہ نہیں۔ اردو نثر کی ابتدا نظم کے پہلو بہ پہلو ہوئی اور اوائل عمری ہی سے اس میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا گیا، لیکن اردو نثر تقریباً اپنی پانچ سو سالہ زندگی کے بحیثیت مجموعی جمود و تعطل کا شکار رہی۔ اس لئے اس میں تصنیف و تالیف کا کوئی اعلا معیار بروئے کار نہ آسکا۔ لیکن انیسویں صدی کے تصنیفی و تالیفی اداروں نے اردو نثر کو ترقی کے معراج پر پہونچا دیا۔ شروع میں لغت، قواعد اور داستانیں لکھی گئیں اور چوتھائی عشرے تک انہی موضوعات پر توجہ مبذول رہی، لیکن ساتویں دہائی تک سیرت نگاری، سوانح نگاری، تحشیہ، بیاض نگاری، مقدمہ نگاری کے علاوہ نثر کے سبھی اصناف مثلاً ناول اور مختصر افسانے، تحقیق و تنقید، طنز و مزاح وغیرہ پر معتد بہ اور بلند پایہ تصنیفات و تخلیقات معرض وجود میں آگئیں، نیز اردو زبان کو علمی الفاظ و اصطلاحات کا وافر ذخیرہ دستیاب ہوا اور اسکی وجہ سے اس زبان میں اظہار و ابلاغ کی صلاحیتیں فروغ پاگئیں۔ اس لئے یہ دعویٰ

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

غلط نہیں کہ انیسویں صدی کے تصنیفی اداروں ہی کا یہ فیضان ہے کہ اردو، دنیا کی کلاسیکی زبانوں سے آنکھ ملانے لگی۔

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

ضمیمہ الف ۱

کالج کونسل کی تیار کردہ کتابوں کی فہرست

تعداد	نام کتاب	صفحوں کی تعداد چار صفحی	آٹھ صفحی	رسم الخط	تخمیناً خرچ روپیہ	آنا	کہاں چھپی
۵۰۰	چار درویش	ـ	۱۰۰	فارسی	۱۱۷۱	۱۴	ہرکارہ پریس
″	مثنوی میر حسن	۴۰	ـ	″	۱۱۲۵	ـ	کلکتہ گزٹ پریس
″	گلستاں	۳۰	ـ	″	۷۰۳	۲	میرر پریس
″	توتا کہانی	۳۰	ـ	″	۷۰۳	۲	ٹیلی گراف پریس
″	حکایات متفرقات	۳۰	ـ	″	۷۰۳	۲	کلکتہ گزٹ پریس
″	بتیسی سنگھاسن (کلکتا)	ـ	۶۰	ناگری	۷۰۳	۲	ہرکارہ پریس
″	مرثیۂ مسکیں	ـ	۳۲	″	۳۴۳	ـ	
″	شکنتلا ناٹک	۶۰	ـ	″	۱۴۰۶	۴	کلکتہ گزٹ پریس
″	اخلاق ہندی	۳۰	ـ	″	۷۰۳	۲	ٹیلی گراف پریس
″	بیتال پچیسی	۳۰	ـ	″	۷۰۳	۲	میرر پریس
″	مادھونل	۳۰	ـ	″	۷۰۳	۲	ہرکارہ پریس
″	ہفت گلشن	۳۰	ـ	فارسی	۷۰۳	۲	میرر پریس
		۲۱۰	۱۹۲		۹۹۷۱	۲	
	کل تعداد صفحہ	۵۰۲					

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

ضمیمہ الف ۲

گل کرسٹ کی انعام کے لئے ارسال کی ہوئیں تصانیف، ان کے مصنفوں کے نام اور سفارشات۔

ہندوستانی تصانیف (جو چھپ چکی ہیں)	مصنف	صفحوں کی تعداد چارپیجی	آٹھ پیجی	انعام روپیوں میں	خاص
گلستاں یا باغ اردو	میر شیر علی افسوس	-	۵۰۰	۴۰۰	کالج میں باقاعدہ ملازم ہونے کی وجہ سے میں نے مصنف کے لیے ایک ہزار روپیہ نہیں لکھا۔
نقلیات لقمانی	تارنی چرن، امانت اللہ، سدل مسر، بہادر علی، افسوس، للولال کوی اور غلام اشرف	-	۳۰۰	۶۰۰	ان مترجمین میں سے صرف پہلے تین بطور خاص اجرت کے مستحق ہیں کیونکہ بنگالی، عربی اور سنسکرت کا بار انہی پر پڑا اور تارنی چرن کے آگے سب سے زیادہ
پندنامہ (نظم میں)	مظہر علی خاں	-	۳۵	۱۰۰	
نقلیات حصہ اول (ہیریس میں)	میر بہادر علی	-	۶۸		انھوں نے ان کہانیوں کا انتخاب اپنے گھر اور کبھی کبھی دوسرے منشیوں کی مدد سے کیا اور ان کا موازنہ اور ترجمہ کیا۔
نقلیات حصہ دوم	″	-	۱۲۸		

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

قرآن شریف	بہادر علی، امانت اللہ فضل اللہ اور کاظم علی جواں	۵۰۰	-	۱۵۰۰	اگر انعام دینے میں کو اعتراض ہو توان میں سے دو مولویوں کو ۸۰۔۸۰ روپیہ تنخواہ ملنا چاہیئے اور مرزا جواں کو جو اس وقت ۸۰ روپیہ پاتے ہیں کم از کم ۱۰۰ روپیہ مشاہرہ ملنا چاہیئے۔ اس ترجمے سے میر بہادر علی کی حقیقی قابلیت کا اظہار ہوگا۔
حاتم طائی	حیدر بخش حیدری	۳۰۰	-	۴۰۰	یہ ایک اچھی تصنیف ہے ہر مستشرق کو پسند ہوگی۔
پریم ساگر	شری لال کوی	۲۵۰	-	۲۰۰	انعام اتنا کم اس لیے کہ مصنف ۵۰ روپیہ ماہانہ پاتا ہے۔
نثر بے نظیر	میر بہادر علی	۱۷۰	-	۱۵۰	دونوں نہایت کارآمد کتابیں ہیں۔
اخلاق ہندی	”	۱۶۰	-	۱۵۰	دوسری مشہور ہتوپدیش کے فارسی ترجمہ ”مفرح القلوب“ کا ترجمہ ہے۔
گلِ بکاولی (پریس بھیجنے کے لیے تیار)	نہال چند		۲۰۰	۱۵۰	
سنگھاسن بتیسی	مرزا کاظم علی جواں	۱۹۰		۲۰۰	
بارہ ماسا (نظم میں)	”	-	۱۴۰	۲۰۰	یہ ایک طبع زاد نظم ہے، اور اتنی اچھی بن پڑی ہے کہ مصنف [illegible]
شکنتلا ناٹک			۱۴۰	۲۰۰	سے انعام کا مستحق ہے
بیتال پچیسی	مظہر علی خاں ولا	۱۶۰		۲۰۰	تینوں مناسب تصانیف ہیں لیکن جن
مادھونل	”	-	۱۵۰	۹۰	کے لیے کوئی خاص بات نہیں کہی گئی انہیں
ہفت گلشن	”	-	۱۰۰	۸۰	کی طرح ان کے بارے میں بھی کوئی خاص بات نہیں کہی گئی ہے

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

کتاب	مصنف				کیفیت
تواریخ بنگلہ	غلام اکبر	۳۰۰	-	۲۰۰	یہ اور مندرجہ ذیل تین دوسری تاریخی کتابیں ہندوستانی درجہ کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔
بوستاں (نثر میں)	حاجی مرزا مغل				
(جو چھپ چکی ہیں)					
امیر حمزہ	خلیل خاں	۵۰۰	-	۵۰۰	
کائنات جو	؍	-	۱۰۰	۶۰	
خوانِ الوان	حمید الدین	-	۱۶۰	۸۰	
جذر ادقی	سدل مسر	-	۱۵۰	۶۰	
اخلاق محسن (گنج خوبی)	میر امن	۶۰۰	-	۴۰۰	
کلا کام	کندن لال	۲۰۰		۱۰۰	
راج نیتی	شری (للو) لال کوی	۲۰۰	-	۲۰۰	خالص برج بھاشا میں ہتوپدیش
گلدستہ (حیدری)	حیدر بخش	۳۰۰	-	۲۰۰	
حسنِ اخلاط	میر ابو القاسم	-	۱۰۰	۵۰	
گل و صنوبر	باسط خاں	-	۱۵۰	۷۰	
دل ربا	توتا رام	-	۱۱۰	۴۰	
فیروز شاہ	محمد بخش	-	۱۵۰	۵۰	
مسکین کا مرثیہ (نثر)	میر جعفر	-	۲۰	۲۰	
(جو پریس لے لیے تیار کی جارہی ہیں)					
تواریخ السلاطین	غلام شاہ بھیک	۲۰۰	-	۳۰۰	
قصۂ دل و حسن	؍	-	۹۰	۸۰	
قصہ فرعون	محمد بخش	-	۱۰۰	۵۰	
تواریخ عالمگیری	محمد عمر	۳۰۰	-	۴۰۰	
سیف الملوک	منصور علی	-	۲۰۰	۲۰۰	

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

الف لیلہ	شاکر علی	۲۰۰	-	۴۰۰	عربین نائیٹس
تواریخ تیموری	تصدق حسین	۶۴۰	-	۴۰۰	
اخلاق النبی	غلام اشرف	۳۰۰	-	۴۰۰	
پند نامہ مصنفہ فرید الدین (نظم میں)	معین الدین	-	۱۰۰	۱۵۰	
گل و ہرمز	غلام حیدر	-	۲۰۰	۱۰۰	
دہ مجالس	شیخ محمد بخش		۱۰۰	۸	
در مجلس	غلام سبحان	۲۵۰	-	۱۵۰	
جامع القوانین	حیدر بخش	۲۰۰	-	۱۰۰	

اس فہرست کو دیکھنے سے اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ ۱۹ اگست ۱۸۰۲ء تک ۴۵ سے زیادہ کتابیں تصنیف ہو چکی تھیں، کیونکہ ۴۔ اپریل ۱۸۰۲ء تک ہندوستانی سے متعلق ۳۲ کتابیں تیار کی جا چکی تھیں[1]۔ اس فہرست میں ۴۔ اپریل ۱۸۰۲ء تک شائع شدہ اور زیر طباعت بعض کتابیں شامل نہیں ہیں۔

[1] گلکرسٹی شاگرد واشتے، فورٹ ولیم کالج ص ۸۴ - ۱۹۳

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

ضمیمہ (ب)

دلی کالج کا نصاب تعلیم (بابت ۱۸۵۳ء)

شعبۂ مشرقی

عربی درجات

درجۂ اول، فریقِ اول:-

(۱) درِ مختار ۱۰۰ صفحے (۲) دیوانِ حماسہ ص ۵۳۸ تا ۶۸۵
(۳) تاریخ یمینی ص ۲۴۲ تا ص ۲۷۶ (۴) مطوّل بحث قُلت تک (۵) پریم ساگر

درجۂ اول، فریق دوم:-

(۱) ہدایہ از باب الوکالت تا اختتامِ کتاب الغصل (۲) نورالانوار از ص ۱۰۰ تا آخر
(۳) دیوان متنبی تا ردیف لام، ۲۰۰ صفحے (۴) مسلّم، کل (۵) پریم ساگر از ص ۲۰۰ تا آخر

درجۂ دوم، فریق اول:-

(۱) تاریخ تیموری از ص ۲۰۰ (۲) شرح وقایہ از کتاب النکاح تا کتاب الوقف ۱۲۴ صفحے
(۳) فرائض سراجی، کل (۴) پریم ساگر از ص ۱۰۰ تا ص ۲۰۰

درجۂ دوم، فریق دوم:-

(۱) مقاماتِ حریری کے ۲۰ مقام (۲) قدوری، کتاب الوقف سے آخر تک
(۳) قطبی، دوسرے باب سے بحثِ قیاس تک۔ ، صفحے

درجۂ دوم، فریق سوم:-

(۱) کافیہ، مجرورات سے آخر تک (۲) شرح ملا، بحث فعل سے آخر تک
(۳) مقامات ہندی کے ۲۵ مقامات

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

درجۂ دوم، فریق چہارم:-

(۱) ہدایۃ النحو، کل (۲) کافیہ، مجرورات تک (۳) منتخبات عربی، دو باب

درجۂ دوم، فریق پنجم:-

(۱) دستور مبتدی، کل (۲) نحو میر، کل (۳) شرح مأۃ عامل، کل (۴) منتخبات عربی، دو باب

فارسی درجات

درجۂ اول، فریق اول:-

(۱) قصائد بدر چاچ، کل (۲) نصیرائے ہمدانی، کل (۳) وقائع نعمت خانِ عالی، کل

(۴) پریم ساگر از صفحہ ۲۰۰ تا ص ۳۰۰

درجۂ اول، فریق دوم:-

(۱) دیوانِ ناصر علی، کل (۲) جواہر الحروف

درجۂ دوم، فریق اول:-

(۱) ساقی نامۂ ظہوری، نصف اول (۲) طاہر وحید تا اصطلاب

(۳) عبد الواسع (۴) پریم ساگر ص ۵۰ تا ص ۱۵۰

درجۂ دوم، فریق دوم:-

(۱) نل دمن (۲) سہ نثر ظہوری (۳) قواعدِ فارسی (۴) بیتال پچیسی، نصف

درجۂ سوم، فریق اول:-

(۱) سکندر نامہ، تا جنگ دارا (۲) رقعات عالمگیری، کل (۳) بیتال پچیسی، ۱۲ قصہ

درجۂ سوم، فریق دوم:-

(۱) زلیخا، نصف اول (۲) انشائے خلیفہ، نصف اول

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

سائنس کے درجات

۱۸۵۰ء سے قبل عربی و فارسی کے درجات کے نصاب میں سائنس بھی شامل تھی لیکن ۱۸۵۰ء سے سائنس کی جماعت علاحدہ قائم کردی گئی تھی، جس کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔

نصاب بابت ۱۸۵۳ء

جماعت اول:۔

(۱) برنکلے (Brinklay) کی کتاب علم ہیئت صفحہ ۱۵۱ تا ص ۲۵۳

۲۔ Ward's Algebrical Geometry حصہ دوم ابتدا سے تیسرے باب تک اور باب ۶ اور ۷ ص ۴۸۴ تا آخر باب ہفتم

۳۔ تاریخ یونان

جماعت دوم۔

۱۔ احصائے تفرقات، کل

۲۔ Ward's Algebrical Geometry حصہ دوم اٹھویں باب سے دسویں باب تک (بشمول ہر دو باب)

۳۔ میکانکس، مصنفہ نیگ ۳۵ ویں فقرے سے ۷۲ فقرے تک (بشمول ہر دو باب)

جماعت سوم:۔

(۱) Diff. Cal. ابتدائے Maxima اور Minima تک

(۲) وارڈ کی کتاب Quadratic Eq مساوات درجۂ دوم سے Ellips بیلیجی تک

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۳۔ تاریخ انگلستان (اردو) ۱۰۰ صفحے (۴) ینگ کی کتاب میکانکس ۵۵ صفحے

جماعت چہارم:۔

۱۔ مفتاح الافلاک، نصف اول ۲۔ علم مثلث (ٹرگنامیٹری)

۳۔ الجبرا۔ دوسرا باب اور چوتھے باب کے تین حصے ۴۔ تاریخ انگلستان (اردو)

جماعت پنجم:۔

۱۔ اقلیدس کے چھ مقالے اور گیارہویں مقالے کی ۲۱ شکلیں ۲۔ رسالہ مساحت، کل

۳۔ تاریخ بنگال (اردو) کل (۴) الجبرا ۶۴ صفحے

جماعت ششم:۔

۱۔ اقلیدس، پہلے چار مقالے ۲۔ حساب

جماعت ہفتم۔

۱۔ اقلیدس پہلا مقالہ ۲۔ حساب تا کسورِ اعشاریہ

شعبہ انگریزی

نصاب بابت ۱۸۵۳ء

First English Class in Litterature:—

1. Shakespeare's Hamlet 2. Milton's Paradise Lost.
3. Bacon's Essays 4. Mackintosh's Ethical Philosophy
5. Elphinstone's History of India

First class—First Division in Math.

1. Differential and Integral calculus.
2. Mechanics and Conic Section.

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

2- Machanics and Conic Section.

3- Websters Hydrostatics

First Class Second Division in Math:-

1- Machanics. 2- Hammer's Conic Section.

3- Webster's Hydrostatics. 4- Surveying. 5- Drawing

Second class in Literature and Math —

1- Addison's Spectator, 100 Pages

2- Pope's Essay on Criticism.

3- Drydem's Absolom and Achitophel.

4- keighthley's History of Ingland Vol. 1 with corresponding Geography.

5. انوار سہیلی

6. باغ و بہار

7. Plane Trigonometry and the nature and use of Logarithims.

8. Algebra as far as the Geometric Progression.

9- Euclid 21st. Preposition 11th. Book with revision of whole.

Third class in literature and math.

1- Goldsmith's Traveller.

2- Combell's Pleasure of Hope.

3- Goldsmith's Essay to 61st letter.

4- Masshman's India the whole.

5- Euclid 6 Book, 21st Proposition of the 11th Book.

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

6. Bridge's Algebra as far as Quadratic Equations.

7. Natural Philosophy

۸۔ گل بکاولی

۹۔ مفید صبیان

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

ضمیمہ ج

سائنٹفک سوسائٹی سے ترجمے کے لیے عبداللطیف خاں کی پیش کردہ فہرست

۱۔ رسالہ ہیئت اور علم جہاز رانی جو اور صاحب کے دائرہ علوم میں سے لیے جاویں۔

۲۔ رابرٹسن اور پرسکٹ صاحب کا رسالہ درباب تحقیق ہونے امریکہ یعنی نئی دنیا کے۔

۳۔ ہمبولٹ صاحب کی سیاحی کے حالات اور نیز حالات سیاحی اور کسی مصنف کے

۴۔ تاریخ خلفاء عباسیہ ۵۔ گلیک صاحب کی تاریخ انگلستان

۶۔ رسالہ درباب ترکیب اور نظام سلطنت انگریزی

۷۔ رسالہ درباب سٹاک، بیلر

۸۔ ایک پرانس صاحب کا رسالہ درباب فن فوٹو گرافی، یعنی سورج کے عکس سے تصویر کھینچنے کا فن

۹۔ رسالہ درباب امریکہ کی ترکیب اور انتظام موجودہ کے

۱۰۔ تھارنٹن صاحب کی تاریخ ہندوستان

۱۱۔ حیات نامے مشہور مشہور زندہ لوگوں کے جن کا انتخاب اس کتاب میں سے کیا جاوے جو زمانے کے لوگوں کے نام ...... سے مشہور ہیں۔

۱۲۔ انگریزی اور سنسکرت کی کتابوں میں سے وہ رسالہ جو فن سنگ اور اشعار سنگ سے متعلق ہے۔

۱۳۔ کانب صاحب کا رسالہ درباب ترکیب جسم انسانی کے

۱۴۔ ڈاکٹر اے۔ کانب صاحب کی طبعیات متعلقہ تندرستی اور تعلیم

۱۵۔ ڈاکٹر سوئٹنر کا رسالہ درباب سلامتی عقل

۱۶۔ سرلیٹ صاحب کا رسالہ درباب حقوق انسانی اور حقوق کی حفاظتوں ملکی کے

۱۷۔ ڈاکٹر جارج ولسن صاحب کا رسالہ درباب تار برقی کے

۱۸۔ سمی پاینر صاحب کا رسالہ درباب استعمال بجلی متعلقہ ملمع کرنے کے

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۱۸۔ ایشوری پرشاد، ڈاکٹر نیو ہسٹری آف انڈیا (اردو ایڈیشن) انڈین پریس الہ آباد ۱۹۴۵ء

۱۹۔ امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد اول۔ چوڑی والان دہلی ۱۹۵۳ء

۲۰۔ 〃 〃 〃 جلد دوم۔ حسن زماں رحیم الدین لین کلکتہ

۲۱۔ 〃 〃 〃 جلد سوم۔ پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی ۱۹۶۲ء

۲۲۔ احمد عبدالرحیم جاگیردار، اردو نثر کا دہلوی دبستان، شالیمار پبلی کیشنز حیدرآباد ۱۹۷۵ء

۲۳۔ بہادر علی، حسینی میر، اخلاق ہندی مرتبہ وحید قریشی مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء

۲۴۔ تنہا، مولوی محمد یحیٰ، سیر المصنفین جلد اول، محبوب المطابع دہلی ۱۹۲۴ء

۲۵۔ 〃 〃 〃 جلد دوم، جامعہ ملیہ پریس دہلی ۱۹۲۸ء

۲۶۔ ۔ ۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ساتویں جلد (دوم) ۱۷۰۷ء-۱۸۰۳ء
پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۱ء

۲۷۔ ۔ ۔ ۔ 〃 آٹھویں جلد (سوم) ۱۸۰۳ء-۱۸۵۷ء
پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۱ء

۲۸۔ ۔ ۔ 〃 〃 نویں جلد (چہارم) ۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء
پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۲ء

۲۹۔ جاوید نہال، ڈاکٹر، انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب، اردو رائٹرس گلڈ کلکتہ

۳۰۔ جواں، کاظم علی، شکنتلا مرتبہ محمد اسلم قریشی، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء

۳۱۔ جہاں بانو بیگم، محمد حسین آزاد، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ۱۹۴۰ء

۳۲۔ حالی، الطاف حسین، حیات جاوید، نامی پریس کانپور ۱۹۰۱ء

۳۳۔ 〃 مقالات حالی، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۴ء

۳۴۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، لکشمی نرائن اگروال تاجر کتب آگرہ ۱۹۶۶ء

۳۵۔ حیدری، حیدر بخش، گلشن ہند، مرتبہ مختار الدین، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۶ء

۳۶۔ حکم چند نیر، سرور جہان آبادی حیات اور شاعری، ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۸ء

۳۷۔ خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر، ذوق و جستجو، ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۷ء

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۳۸۔ خواجہ احمد فاروقی چراغ رہ گزر

۳۹۔ خورشید نعمانی، ڈاکٹر، دار المصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات، رحیمی پریس بمبئی ۱۹۷۷ء

۴۰۔ رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، مطبع منشی تیج کمار لکھنؤ ۱۹۷۹ء

۴۱۔ رفیق مارہروی، ہندوؤں میں اردو، نسیم بک ڈپو لکھنؤ

۴۲۔ سید جعفر، ڈاکٹر، اردو مضمون کا ارتقا، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد ۱۹۷۲ء

۴۳۔ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دار المصنفین اعظم گڈھ ۱۹۷۰ء

۴۴۔ سید احمد خاں، تہذیب الاخلاق مرتبہ اے۔ صمد، ناز پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۴ء

۴۵۔ ″ ″ الخطبات الاحمدیہ

۴۶۔ ″ اسباب بغاوت ہند، مرتبہ فوق کریمی، کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۷۱ء

۴۷۔ ″ آثار الصنادید، سنٹرل بک ڈپو اردو بازار دہلی ۱۹۶۵ء

۴۸۔ سعادت حسین خاں، تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا، مرتبہ عطا کاکوروی، عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ ۱۹۶۸ء

۴۹۔ سلیمان محمود حسین، اردو کی نثری تاریخ میں سرسید کا مقام، نعمانی پریس دہلی ۱۹۷۷ء

۵۰۔ سرور، رجب علی بیگ، فسانہ عجائب، مرتبہ سید محمود رضوی، رام نرائن لال بینی مادھو الہ آباد ۱۹۶۶ء

۵۱۔ سید عبد اللہ، ڈاکٹر، میر امن سے عبد الحق تک، چمن بک ڈپو اردو بازار دہلی

۵۲۔ سری رام، لالہ، خمخانۂ جاوید (جلد سوم)، دہلی پرنٹنگ ورکس ۱۹۱۰ء

۵۳۔ سید محمد، مولوی، ارباب نثر اردو، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۷۷ء

۵۴۔ ـــــ سرسید اور علی گڑھ تحریک، آل انڈیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایجوکیشنل...

۵۵۔ ـــــ سیر سیاح (گلدستۂ سخن)، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۰۲ء

۵۶۔ شجاعت علی سندیلوی، تعارف تاریخ اردو، ادارۂ فروغ اردو، نامی پریس لکھنؤ ۱۹۶۶ء

۵۷۔ شیام سندر لال برق، بہار سخن، مطبع ال بی۔ سیتا پور ۱۹۰۳ء

۵۸۔ شانتی رنجن بھٹا چاریہ، اردو اور بنگال، سرکتی پرکاش بھٹا چاریہ اشاعت کلکتہ ۱۹۶۶ء

۵۹۔ ″ بنگال میں اردو زبان و ادب، نصرت پبلشرز لکھنؤ ۱۹۷۶ء

۶۰۔ ″ بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات، جینت پبلی کیشنز کلکتہ ۱۹۷۰ء

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

۶۱۔ شان محمد، ڈاکٹر سرسید تاریخی آئینے میں، انوار بک ڈپو علی گڑھ ۱۹۶۷ء

۶۲۔ شیو پرشاد، راجہ ستارۂ ہند آئینہ تاریخ نما (ترجمہ اتہاس تمرناشک) گورنمنٹ پریس الہ آباد ۱۹۰۸ء

۶۳۔ شمس اللہ قادری حکیم، اردوئے قدیم، نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۶۷ء

۶۴۔ صدیق الرحمٰن قدوائی، ماسٹر رام چندر، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۱ء

۶۵۔ صابر، مرزا قادر بخش، تذکرہ گلستان سخن جلد اول مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء

۶۶۔ عابد رضا بیدار، اردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار، انسٹی ٹیوٹ آف اورنٹیل اسٹڈیز رام پور ۱۹۶۹ء

۶۷۔ عبدالقادر سروری، اردو کی ادبی تاریخ، اعلیٰ پریس دہلی ۱۹۷۵ء

۶۸۔ عبدالحق، مولوی ڈاکٹر مرحوم دہلی کالج، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۴۵ء

۶۹۔ 〃 چند اہم عصر، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۷۱ء

۷۰۔ 〃 قواعد اردو، الناظر پریس لکھنؤ

۷۱۔ 〃 مطالعہ سرسید احمد خاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

۷۲۔ 〃 سرسید احمد خاں حالات و افکار، اردو مرکز دہلی ۱۹۶۰ء

۷۳۔ عبدالرحمٰن پرواز مفتی صدرالدین آزردہ، مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ ۱۹۷۷ء

۷۴۔ عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۳۶ء

۷۵۔ عبیدہ بیگم ڈاکٹر فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، نصرت پبلشرز لکھنؤ ۱۹۸۳ء

۷۶۔ غالب اسد اللہ خاں، خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر کشمیری بازار لاہور ۱۹۶۳ء

۷۷۔ 〃 اردوئے معلیٰ حصہ دوم، تدوین و حواشی سید مرتضیٰ حسین، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۰ء

۷۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۲ء

۷۹۔ فضلی، فضل علی، کربل کتھا، مرتبہ مالک رام اور مختار الدین، ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ ۱۹۶۵ء

۸۰۔ کریم الدین، مولوی، گلدستہ نازنیناں مرتبہ احمد لاری اور عطا کاکوری عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ ۱۹۷۲ء

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۸۱۔ کریم الدین اور ایف فیلن، طبقات الشعرائے ہند طبقہ چہارم مرتب عطا کاکوروی، بیبل بیتھک پریس پٹنہ ۱۹۶۴ء

۸۲۔ کریم الدین طبقات شعرائے ہند۔ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۳ء

۸۳۔ کلیم الدین، ڈاکٹر دو تذکرے، بیبل بیتھک پریس پٹنہ ۱۹۵۹ء

۸۴۔ گیان چند، ڈاکٹر، اردو کی نثری داستانیں، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۶۹ء

۸۵۔ گنپت سہائے سریواستو۔ اردو شاعری کے ارتقا میں ہندو شعرا کا حصہ، برج باسی لال گوڑ الہ آباد ۱۹۶۹ء

۸۶۔ گارساں دتاسی: خطبات گارساں دتاسی، انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد

۸۷۔ لطف، مرزا علی، گلشن ہند، دارالاشاعت پنجاب ۱۹۰۶ء

۸۸۔ مالک رام، قدیم دلی کالج، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۷۵ء

۸۹۔ مسیح الزماں، ڈاکٹر معیار و میزان، رام نرائن لال بینی مادھو الہ آباد ۱۹۷۰ء

۹۰۔ محمد زبیر، اردو نثر کا تاریخی سفر، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

۹۱۔ محمد عتیق صدیقی، ڈاکٹر گل کرسٹ اور اس کا عہد، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۰ء

۹۲۔ ″ ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۷ء

۹۳۔ ″ صوبہ شمال مغربی کے اخبارات و مطبوعات ۱۹۶۲ء

۹۴۔ محمد مبین کیفی چریاکوٹی، جواہر سخن، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۳۳ء

۹۵۔ محمد ایوب قادری، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء واقعات و شخصیات، پاکستان اکیڈمی کراچی ۱۹۷۶ء

۹۶۔ محمد اکرام اللہ ندوی، وقائع حیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۲۵ء

۹۷۔ مظہر عباس، ڈاکٹر وحید الدین سلیم حیات اور ادبی خدمات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۷۷ء

۹۸۔ مصحفی، غلام ہمدانی، تذکرہ ہندی (ریاض الفصحا) مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۳ء

۹۹۔ مسعود حسین خاں، اردو املا، مرتبہ خلیل احمد بیگ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۷۲ء

۱۰۰۔ میمونہ دلوی، ڈاکٹر بمبئی میں اردو، [illegible] بمبئی ۱۹۷۰ء

۱۰۱۔ ۔ ۔ ۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے ، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۶۳ء

۱۰۲۔ مختار الدین، احوال غالب ، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۳ء

۱۰۳۔ محمود الٰہی ڈاکٹر، بازیافت، دانش محل لکھنؤ ۱۹۶۵ء

۱۰۴۔ مشتاق حسین ، مکاتیب سرسید احمد خاں ، فرینڈس بک ڈپو ہاؤس علی گڑھ ۱۹۶۰ء

۱۰۵۔ محی الدین قادری زور ، اردو کے اسالیب بیان ، مکتبہ معین الادب لاہور ۱۹۶۲ء

۱۰۶۔ مہدی افادی ۔ افادات مہدی ، الیاس ٹریڈرس حیدر آباد ۱۹۷۴ء

۱۰۷۔ محبوب رضوی ،سید ، تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اول ، دارالعلوم دیوبند ۱۹۷۷ء

۱۰۸۔ میرامن ، باغ وبہار مرتبہ رشید حسن خاں ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۷۴ء

۱۰۹۔ " باغ وبہار مرتبہ سلیم اختر ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۷ء

۱۱۰۔ " گنج خوبی مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۶ء

۱۱۱۔ نادم سیتاپوری فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۹ء

۱۱۲۔ نظامی بدایونی ، قاموس المشاہیر ، نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۴ء

۱۱۳۔ نسیم قریشی ، علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۰ء

۱۱۴۔ نجم الدین نقوی ، منتخب سوانح اور خاکے ، انوار بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۷۷ء

۱۱۵۔ نساخ ۔ عبدالغفور ، قطعہ منتخب ، مطبع نول کشور لکھنؤ

۱۱۶۔ نور اللہ اور جے ۔ پی ۔ نایک ، تاریخ تعلیم ہند ، ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۷۳ء

۱۱۷۔ وفا راشدی ، بنگال میں اردو ، اردو پبلشنگ ہاؤس دہلی

۱۱۸۔ وحید قریشی ، یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی ادبی اور درسی سرمایہ ، لاہور ۱۹۷۰ء

۱۱۹۔ " کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ مکتب ادب جدید لاہور ۱۹۶۵ء

۱۲۰۔ وقار عظیم ، ہماری داستانیں ، ادبی دنیا اردو بازار دہلی ۱۹۶۴ء

۱۲۱۔ وقار الملک ، نواب ، خطوط وقار الملک ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۷۴ء

۱۲۲۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وقار ، مجلہ وقار الملک ہال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، مدیر عبید صدیقی ۱۹۷۷ء

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

[illegible] भारतीय हिन्दुस्तानी एकेडमी इलाहाबाद

135 ब्रजरत्न दास, खड़ी बोली हिन्दी साहित्य का इतिहास
हिन्दी साहित्य कुटीर बनारस सं. [illegible] वि०

136 वार्ष्णेय, डा० लक्ष्मी सागर, फोर्ट विलियम कालेज (१८००-१८५४)
यूनिवर्सिटी, इलाहाबाद सं० २००४ वि०

137 रामचन्द्र शुक्ल, हिन्दी साहित्य का इतिहास, नागरी
प्रचारिणी सभा काशी, संवत २०२५

عربی :-

۱۳۸ ۔ عبدالحی حسنی، مولانا، نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر، جلد ۷
دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد ۱۹۵۹ء

غیر مطبوعہ :-

۱۳۹ ۔ انجم رحمانی، برطانوی دور میں اردو کے فروغ میں پنجاب کے نظام تعلیم کا حصہ ۱۹۸۱ء
۱۴۰ ۔ بینی نراین دہلوی، تفریح طبع، مملوکہ ڈاکٹر حنیف نقوی، ریڈر شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی
۱۴۱ ۔ دیوایندر کمار گپتا، اردو کے تصنیفی و تالیفی ادارے ۱۹۸۰ء
۱۴۲ ۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ، تذکرہ تصانیف بنگال

اخبارات اور جرائد

۱۴۳ ۔ آج کل، دہلی اکتوبر ۱۹۶۲ء
۱۴۴ " اردو تحقیق نمبر، اگست ۱۹۶۷ء
۱۴۵ " جنوری ۱۹۸۰ء
۱۴۶ اکادمی، لکھنؤ جولائی ۱۹۸۱ء
۱۴۷ جامعہ، فروری ۱۹۸۰ء
۱۴۸ " جولائی ۱۹۸۰ء

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

۱۴۹۔ جامعہ جنوری ۱۹۸۳ء

۱۵۰۔ خبرنامہ، لکھنؤ فروری ۱۹۸۰ء

۱۵۱۔ ” اگست ۱۹۸۰ء

۱۵۲۔ رسالہ اردو دہلی، جولائی ۱۹۳۵ء

۱۵۳۔ سہ ماہی اردو، کراچی جولائی ۱۹۶۶ء

۱۵۴۔ تعمیر ہریانہ، چنڈی گڑھ (نول کشور نمبر) جولائی اگست ۱۹۷۶ء

۱۵۵۔ الزبیر (تحریک آزادی نمبر) ۔۔ ۱۹ء

۱۵۶۔ سہ ماہی صحیفہ لاہور، جولائی ۱۹۶۷ء

۱۵۷۔ ماہ نو کراچی ستمبر ۱۹۷۵ء

۱۵۸۔ معارف اعظم گڑھ جون ۱۹۲۰ء

۱۵۹۔ ” نومبر ۱۹۱۲ء

۱۶۰۔ ” جلد ۵۹ ۱۹۴۷ء

۱۶۱۔ مسلم انڈیا (اردو) جنوری ۱۹۸۷ء

۱۶۲۔ مشرب (تاریخ ادب اردو نمبر) جون جولائی ۱۹۵۹ء

۱۶۳۔ الناظر، لکھنؤ، نومبر ۱۹۱۵ء

۱۶۴۔ نقوش، لاہور، شخصیت نمبر، جنوری ۱۹۵۵ء

۱۶۵۔ ” اکتوبر ۱۹۵۱ء

۱۶۶۔ ” مکاتیب نمبر

۱۶۷۔ ” دسمبر ۱۹۶۶ء

۱۶۸۔ نوائے ادب اپریل [illegible]

۱۶۹۔ ” جنوری [illegible]

۱۷۰۔ ” اپریل [illegible]

۱۷۱۔ ” [illegible]

for More Books Click This Link
https://www.facebook.com/MadniLibrary

۱۷۲۔ نوائے ادب جنوری ۱۹۶۳ء

۱۷۳۔ " اکتوبر ۱۹۶۵ء

۱۷۴۔ " اپریل ۱۹۷۷ء

۱۷۵۔ " اکتوبر ۱۹۷۷ء

۱۷۶۔ نیادور لکھنؤ نومبر ۱۹۶۱ء

۱۷۷۔ " (اطفال نمبر) نومبر دسمبر ۱۹۷۹ء

۱۷۸۔ " اپریل ۱۹۶۵ء

۱۷۹۔ " اپریل ۱۹۸۰ء

۱۸۰۔ " اگست ۱۹۸۰ء

۱۸۱۔ " ستمبر ۱۹۸۰ء

۱۸۲۔ " اکتوبر ۱۹۸۰ء

۱۸۳۔ " جنوری تا مارچ ۱۹۸۶ء

۱۸۴۔ ہفتہ وار ہماری زبان علی گڑھ ۸ ستمبر ۱۹۷۰ء

۱۸۵۔ ہفتہ وار ہماری زبان دہلی یکم مارچ ۱۹۸۱ء

۱۸۶۔ ہندوستانی اپریل جون ۱۹۴۱ء

۱۸۷۔ پگڈنڈی سالنامہ ۱۹۵۹ء

(پہلا کارواں)

۱۸۸۔ فکرونظر سہ ماہی، علی گڑھ جنوری تا ستمبر ۱۹۸۵ء

۱۸۹۔ " دوسرا کارواں"

(انگریزی)

۱۹۰۔ Radiance, weekly, 13-19 Sept. 1987

ذخیرۂ محمد اقبال مجددی لاہور

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library

یہ ایک خاصا منصوبہ بند تحقیقی مقالہ ہے۔ مصنف نے تمام ممکن اور قابل حصول مواد سے کام لیا ہے اور بڑی کوشش اور احتیاط کے ساتھ نتیجہ خیز جزئیات کا استقصاء کیا ہے

کیوں نہ ہو، اس تحقیقی سفر میں مقالہ نگار کی رہنمائی ایک ذی علم اور اردو میں اپنی فہم و فراست اور تحقیقی تعمق کے اعتبار سے معتبر و معروف شخصیت ڈاکٹر حنیف نقوی نے کی ہے،

اس مقالے کے پہلے باب میں فورٹ ولیم کالج کے اہل قلم کی خدمات کو منظر عام پر لائے اور تازہ ترین علمی و تحقیقی مواد کو سامنے رکھ کر نہایت خوش سلیقگی سے انکی ادبی قدر و قیمت کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس موضوع پر اس قدر جامعیت اور اختصار کے ساتھ اردو کے موجودہ تنقیدی سرمایہ میں کوئی دوسری کتاب موجود نہیں جو ڈاکٹر سمیع اللہ کی اس تصنیف کے مدمقابل رکھی جا سکے

مقالہ کا دوسرا باب دہلی کالج کی ادبی خدمات کے اوراقِ پارینہ کو الٹ کر انکی قدر و قیمت سے ہمیں آگاہ کرانے کے لئے وقف ہے۔ اردو کے طلبہ کو مصنف کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ اس موضوع پر انھوں نے ہماری موجودہ نسل کی ایک بڑی مشکل آسان کر دی۔

مقالہ کا تیسرا باب علیگڈھ کی عہد ساز سائنٹفک سوسائٹی کے تجزیے پر مشتمل ہے جس کے تحت بہت سی معیاری علمی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا گیا چوتھے باب میں ان اداروں کے زیر اثر عالم وجود میں آنے والے اور بہت سے علمی و تحقیقی اداروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف نے آخر میں اس موضوع کے پورے دائرہ کار کا احاطہ کیا ہے اور اپنے نتائج کو اس انداز میں پیش کر دیا ہے کہ پوری تصویر واضح طور پر ابھر کر سامنے آجاتی ہے

یہ مقالہ صحیح معنوں میں ایک تحقیقی کارنامہ ہے اور اس بات کی شہادت بھی کہ مصنف صحیح فیصلہ کرنے اور تنقیدی جانچ پرکھ کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کا ادبی استو بھی معیاری ہے

ڈاکٹر سید عبد الباری
صدر شعبہ اردو۔ جی ایس پی جی کالج (اودھ یونیورسٹی) سلطانپور

for More Books Click This Link
https://archive.org/details/@madni_library